انبیاء علیہم السلام کے بعد دُنیا کے مقدس ترین انسانوں کی سرگزشت حیات

سِیَرُ الصحابہ رضی اللہ عنہم

تبع تابعین کرامؒ

دارُ الاشاعت کراچی

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ (القرآن)
اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے

انبیاء کرامؑ کے بعد دنیا کے مقدس ترین انسانوں کی سرگزشت حیات

تبع تابعین کرامؒ (حصہ اول)

جلد ہشتم

حصہ چہاردہم (14)

انیس ۱۹ جلیل القدر، تبع تابعین کے جن میں تفسیر و حدیث اور فقہ و تصوف کے نامور آئمہ کرام شامل ہیں۔
مفصل حالات زندگی اور ان کی وسیع علمی خدمات کا مفصل بیان

تحریر و ترتیب
مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی
رفیق دار المصنفین

دار الاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : ۲۰۰۴ء علمی گرافکس کراچی
ضخامت : ۴۲۶ صفحات

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

...... ملنے کے پتے ......

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
ادارۃ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی
ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ B-437 دیب روڈ لسبیلہ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

Islamic Books Centre
119-121, Halli Well Road
Bolton BL 3NE, U.K

Azhar Academy Ltd.
At Continenta (London) Ltd
Cooks Road, London E15 2PW

فہرست اسماء

تبع تابعین حصّہ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ :

خیر امتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الَّذِیْنَ یلونھم (بخاری ومسلم)

''میرے بہترین امتی میرے زمانہ کے لوگ ہیں (صحابہ) پھر وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کا زمانہ پایا (تابعین) پھر وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کا زمانہ پایا''۔ (تبع تابعین)

عام[1] علمائے اُمت نے ارشادِ نبوی ﷺ کے پہلے ٹکڑے کا مصداق صحابۂ کرام ؓ کی مقدس جماعت کو اور دوسرے اور تیسرے ٹکڑے کا مصداق تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے برگزیدہ کو قرار دیا ہے۔

اس مشہور بالخیر قرونِ ثلثہ میں صرف خلافتِ راشدہ کا تیس سالہ مبارک عہد (زمانہ) ایسا گزرا ہے جس میں عہدِ نبوی کی تمام سعادتیں اور برکتیں یا یوں کہئے کہ اسلام کی تمام اخلاقی وقانونی خوبیاں ایک تسلسل کے ساتھ حکومت ومعاشرہ دونوں میں مشاہد طور پر موجود تھیں۔ جن کو ہر آئندہ (دور میں) ایک سرسری نگاہ میں دیکھ سکتا تھا۔

چنانچہ اس عہد سعید میں جتنی کم سیاسی اور معاشرتی برائیاں پیدا ہوئیں۔ دنیا کی سیاسی ومذہبی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی، لیکن اس عہدِ سعید کے بعد اتفاق سے حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو اپنی بہت سی انفرادی اور اسلامی خصوصیات کے باوجود سیاسی میدان اور حکومت کے ایوان میں اپنی اجتماعی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں کو کماحقہ ادا نہ کر سکے، جس کے نتیجہ میں بہت جلد اسلامی خلافت شخصی حکومت میں تبدیلی ہوگئی۔ گو نام ابھی خلافت ہی تھا مگر اس میں خلافت کی روح باقی نہیں تھی۔

عہدِ راشدہ میں سیاست، مذہب واخلاق کے تابع تھی۔ اور اب مذہب واخلاق پر سیاست کو ترجیح دی جانے لگی تھی، اس سے پہلے خلاف کسی خاندان کی میراث نہ تھی۔ اور اب کسی نہ کسی خاندان کے لئے مخصوص ہوگئی تھی۔

---

[1] شاہ ولی اللہ ؒ صاحب نے غالباً بعض اعتراضات سے بچنے کے لئے پہلے ٹکڑے سے عہدِ نبوی اور دوسرے سے عہد صدیقی اور تیسرے سے عہدِ فاروقی مراد لیا ہے۔

حضرات خلفائے راشدین معاشرہ کی اصلاح وفلاح کو حکومت کی سب سے بڑی بلکہ ذاتی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ اور اب حکومت کا قیام اور اس کی بقا کے لئے سیاسی جوڑتوڑ خلفاء کا سب سے بڑا کام رہ گیا تھا۔

غرض یہ کہ اس تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ معاشرہ میں بعض نئی نئی اور بعض دبی ہوئی پرانی برائیاں پھر اُبھرنے لگیں۔ اور بہت سے سوئے ہوئے فتنے نئے نئے قالب پھر سر اُٹھانے لگے۔ لیکن ایوان حکومت سے باہر ابھی ممتاز صحابۂ کرام ؓ کی بڑی تعداد اور حضرات تابعینؒ کی پوری جماعت موجود تھی موجود عہدِ نبوی ﷺ اور عہدِ راشدہ کی تمام سعادتوں، برکتوں اور اسلام کی انفرادی واجتماعی خصوصیتوں کو ابھی تک اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھی، جس کے دل میں جہاد کی تڑپ اور اقامت دین کا جذبہ موجود تھا، جو **امر بالمعروف** ہی کو نہیں بلکہ **نھی عن المنکر** کو بھی سب سے بڑی ذمہ داری اور سعادت سمجھتی تھی۔

چنانچہ اس مبارک جماعت کے افراد انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقہ پر اس صورت حال کو بدلنے اور برائیوں اور فتنوں کو مٹانے کے لئے آگے بڑھے، اور اس راہ میں انہوں نے وہ سب کچھ جھیلا جو اس راہِ حق کے راہ روؤں کو جھیلنا اور سہنا پڑتا رہا ہے، یعنی کتنے اس مقابلہ میں شہید ہو کر خدا کے حضور سرخ رُو ہوئے، کتنوں نے دار ورسن کو لبیک کہا اور اپنے مولیٰ کی مرضی پائی، اور کتنے قید و بند کی کڑیاں جھیلتے جھیلتے جاں بحق ہوگئے اور کچھ موقع کی تلاش میں تھے۔

مِنَ الْمُؤمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَاعَاهَدُوا اللهَ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ من ينتظر۔ (احزاب)

''اہلِ ایمان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے خدا سے جو معاہدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ پھر بعض ان میں ایسے ہیں جنہوں نے اپنی نذر پوری کرلی، کچھ اس کے پورا کرنے کے آرزومند ہیں''۔

گو اس جماعت کی یہ کوششیں شخصی حکومت کو دوبارہ اسلامی خلافت میں تبدیل کردینے میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوئیں[۱]۔

مگر ایوان حکومت سے باہر معاشرہ کی اکثریت کو دینِ مبین پر قائم واستوار رکھنے، ان کو نئے نئے فتنوں سے بچانے اور علمی وعملی طور پر دین کی حفاظت میں ان کی جدوجہد اور قربانی کا غیر معمولی اثر ہوا،

---

[۱] اس کے بہت سے اسباب تھے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ''مکمل طور پر'' کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان کوششوں کا کچھ نہ کچھ اثر نظام حکومت اور ان کے چلانے والوں پر بھی ضرور پڑتا تھا مگر زیادہ تر اس کا اثر محدود اور وقتی ہوتا تھا۔ انہی کوششوں کا ایک ظہور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت تھی۔

اوران کی یہ سعی اس لحاظ سے سعی (کوشش) مشکور ثابت ہوئی ، اور دراصل ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے۔

حضرات تابعین کے بعد اس مبارک کام کو ان کی فیض یافتہ جماعت یعنی تبع تابعینؒ نے اپنے ہاتھ میں لیا، اور اپنے زمانہ کے حالات اور ضروریات کے مطابق اسے پورا کرنے کی کوشش کی، اس راہ میں ان کو بھی وہ تمام مصیبتیں اور صعوبتیں اٹھانی پڑیں جو ان کے پیش روں کو اٹھانی پڑی تھیں، صحابہ کرامؓ اور تابعین و تبع تابعین کی کوششوں کے دائرۂ عمل میں اتنا فرق ضرور ہے کہ حضرات صحابہؓ نے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے اصلاح حال کی سعی کی اور حضرات تابعین و تبع تابعین نے حالات اور پچھلے تجربات کی بنا پر بھی اور اس لئے بھی کہ امت مزید جنگ و جدال اور فتنہ و فساد سے محفوظ رہے۔ اپنا دائرۂ عمل اور انفرادی جدو جہد ہی تک محدود رکھا گو کہیں کہیں اجتماعی جدو جہد کی جھلک بھی ملتی ہے۔

قرآن مجید اور سیرۃ نبوی کا ایک اعجاز :

قرآن مجید اور سیرتِ نبوی ﷺ کا ایک بڑا اعجاز یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ دنیا کے علم و فن میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا بلکہ ان کے ذریعہ اس کا دامن ایک ایسی متحرک عملی و اخلاقی زندگی سے بھی مالا مال ہوا جو ایک خاص وقت میں پیدا ہو کر ختم نہیں ہو گئی ، بلکہ صدہا سیاسی اور تمدنی انقلابات کے باوجود وہ دوام تسلسل کے ساتھ آج تک باقی ہے، اور انشاءاللہ قیامت تک باقی رہے گی، اس نئی متحرک اخلاقی و عملی زندگی کا اولین نمونہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت نے قران و سیرت کی حفاظت کے بعد ان بزرگوں کی سوانح حیات اور سیرت کے معنوی خط و خال کو تحریری طور پر محفوظ و منقوش کر لینے میں سب سے زیادہ کوشش کی۔

گو ان نقوش کے ذریعہ ان قدسی صفات بزرگوں کی زندگی کی پوری کیفیتیں اور معنویتیں ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔ مگر پھر بھی ان کی زندگی کا جتنا حصہ بھی بذریعہ تحریر ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے پڑھنے سے آج بھی مردہ دلوں میں زندگی اور بجھی طبیعتوں میں سوز و گداز اور حرارت پیدا ہوتی ہے۔

ان کی سادہ سادہ باتوں سے دل میں خدا کی محبت کا جوش اور رضائے الٰہی کی طلب اور آخرت کا یقین بلکہ ذوق و مشاہدہ پیدا ہوتا ہے، ان کی زندگی کے عام واقعات کے سننے اور پڑھنے سے اقامت دین کا جذبہ، احیائے سنت کا ولولہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تڑپ پیدا

ہوتی ہے، ان کے زہد و اتقاء استغناء، بے نیازی اور خلفاء امراء سے ان کی بے تعلقی اور اظہارِ حق کے واقعات پڑھ کر دنیا کی بے حقیقتی اور اس کو ایمان کی راہ میں نثار کر دینے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک طرف اموی اور عباسی دور کی تاریخ پڑھ کر مایوسی اور شرمندگی پیدا ہوتی ہے، تو ان کے حالات کا مطالعہ کر کے شرمندگی اور مایوسی دور ہو جاتی ہے۔

اسی اہم ضرورت کے پیش نظر دارالمصنفین نے اپنے ابتدائے قیام ہی سے سیاسی و تمدنی تاریخ کی تدوین و ترتیب کے ساتھ اس مشہور بالخیر قرون ثلاثہ کے ممتاز بزرگوں کے سوانح حیات اردو زبان میں منتقل کرنے کا بھی پروگرام بنایا تھا۔

چنانچہ اس پروگرام کے مطابق قرن اول اور قرن ثانی کے برزرگوں کے اسوے اور سوانح حیات پر تقریباً ایک درجن کتابیں آج سے کئی برس پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ اب یہ قرن ثالث یعنی تبع تابعین کے سوانح حیات کا مرقع ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے، اور یہ اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ہے۔

تبع تابعین کے عہد کی تعین :

عہدِ صحابہ کی ابتدا بعثت نبوی کے ساتھ ہوئی، اور اس کا اختتام اس وقت ہوا جب کہ دیدار نبوی ﷺ سے شرف اندوز ہونے والے آخری صحابی حضرت انس ؓ بن مالک کا پہلی صدی کے اختتام پر انتقال ہوا۔

عہد صحابہ کی طرح عہد تابعین کے بارے میں تاریخ و سنہ کی تعین ساتھ یہ بات نا مشکل ہے کہ وہ کب سے شروع ہوا اور کب ختم ہوا، مگر واقعات اور قوی قرائن کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد کی ابتداء عہد نبوی ﷺ میں ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس عہد میں متعدد ایسے سلیم الفطرت لوگ موجود تھے، جنہوں نے اپنے سر کی آنکھوں سے تو روئے نبوی ﷺ کی زیارت نہیں کی تھی، لیکن جوں ہی دعوتِ حق کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی انہوں نے اس پر لبیک کہا اور اس کو اپنے سویدائے دل میں جگہ دی۔

مثلاً حضرت اویس قرنی ؒ، حضرت اصحمہ شاہ حبشہ وغیرہ، اس طرح تقریباً ایک صدی تک عہد صحابہ اور عہدِ تابعین ساتھ ساتھ چلتا رہا، لیکن پہلی صدی (سنہ) کے اختتام پر صحابہ کا عہدِ سعید ختم ہو گیا۔ اور اب حضرات تابعین کے ساتھ ان کی تربیت یافتہ جماعت اتباع تابعین کا عہدِ رشید اس میں منسلک ہو گیا اور تابعین کے ساتھ تبع تابعین کا دور قریب قریب پون صدی تک ساتھ ساتھ گذرا۔

عہدِ تابعین کی طرح، اتباع تابعین کے بارے میں بھی سنہ و تاریخ کی تعیین کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ کب سے شروع ہوا، اور کب ختم ہوا۔ مگر بعض اتباع، تابعین کے سنہ ولادت

اور بعض تابعین کے سنہ وفات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر سے اس عہد کی ابتداء ہوگئی تھی۔

مثال کے لئے امام شعبہؒ کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی اور امام ابوحنیفہؒ کی ولادت بھی ۸۰ھ میں ہوئی لیکن عام ارباب تذکرہ امام شعبہ کا شمار اتباع تابعین میں کرتے ہیں، امام صاحب کا تابعین ہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اتباع تابعین کا اصلی دور دوسری صدی کے ربع اول سے شروع ہو کر تیسری صدی کے ربع اول تک ختم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ بعض تابعین کی وفات ۱۶۴ھ اور بعض کی ۱۷۱ھ میں ہوئی، اس اعتبار سے جن ائمہ فقہ وحدیث کی ولادت ۱۵۰ھ اور ۱۶۴ھ کے درمیان ہوئی، ان کو بھی معاصرت کی وجہ سے اسی زمرہ میں شامل کر لیا گیا ہے، اگرچہ تابعین سے ان کے کسب فیض کرنے کا کوئی ظاہری ثبوت موجود نہیں ہے۔ مثلاً امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اسحاق ابن راہویہ، علی بن المدینی وغیرہ، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اموی خلیفہ ولید ثانی کے عہد سے لے کر عباسی عہد کے دسویں خلیفہ متوکل علی اللہ کے عہد تک اتباع تابعین کا خاص عہد رہا ہے۔

تبع تابعین سے کون لوگ مراد ہیں :

اس عہد میں گو بڑے بڑے صاحب سطوت خلفاء لائق ترین امراء اور سپہ سالار کامل ترین فلاسفہ و متکلمین اور بڑے بڑے زبان آور خطباء، ادباء و شعراء پیدا ہوئے۔ جن میں سے ہر ایک سے بواسطہ یا بلا واسطہ ملک وملت اور اسلامی علوم کی کوئی نہ کوئی خدمت انجام پائی۔ اور اس لحاظ سے ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بڑی احسان ناشناسی ہوگی، لیکن ان کو ہم زمرۂ تبع تابعین میں اس لئے شامل نہیں کرتے کہ صحابہ اور تابعین کی طرح تبع تابعین کا لقب بھی اُمت میں ان حضرات کے لئے مخصوص ہو گیا ہے جن کے علم وعمل میں یکسانیت اور ہم رنگی رہی ہو۔ جن کے ذریعہ دین یا علمِ دین کی حفاظت کا براہِ راست کوئی نہ کوئی کام انجام پایا ہو۔ جن کی زندگی میں سنتِ نبوی ﷺ اور صحابہ وتابعین کی سیرت کا رنگ غالب رہا ہو۔ جن کے علم وفضل، زہد وورع اور دیانت وتقویٰ پر ایک مخلوق کو اعتماد رہا ہو اور یہ اعتماد اب تک باقی ہو۔

اس لئے جن خلفاء، وزراء، شعراء، ادباء اور اہلِ علم کی زندگی اس معیار پر پوری نہیں اترتی ان کا ذکر مستقلاً اس کتاب میں نہیں آئے گا، یوں جس طرح اس عہد کی سیاسی تاریخ کے ضمن میں حضرات تبع تابعین کا ذکر ضمناً آجاتا ہے اسی طرح اس مرقع میں بھی اس کا ذکر ضمناً موقع بہ موقع آ گیا ہے۔

اس عہد کی خوبیاں اور خرابیاں :

تبع تابعین رحمہم اللہ کے عہد کی عکاسی اگر مختصر لفظوں میں کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ''عہدِ تضاد'' (مختلف زمانہ) تھا، یعنی اگر آپ اس عہد کی سیاسی اور ادبی تاریخ، فکری آزادی اور بعض معاشرتی خرابیوں کی داستان پڑھیں گے تو آپ کے دل ودماغ پر تھوڑی دیر کے لئے یہ احساس ضرور طاری ہوجائے گا کہ یہ عہد ظلم وجود عیش عشرت قبائلی عصبیت اور مختلف مذہبی وسیاسی فتنوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اسی آن اگر آپ کو اس عہد کے قابلِ اعتماد محدثین، فقہاء، علماء اور صلحا کے تذکرے دے دیئے جائیں اور ان کے ذریعہ آپ کو کچھ دیر کے لئے ان برگزیدہ نفوس حضرات کی صحبت ومجلس میں پہنچا دیا جائے تو یہی نہیں کہ منفی طور پر آپ کے پہلے احساس میں کمی آجائے گی، بلکہ مثبت طور پر آپ یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ آپ کے کانوں میں ہر گوشہ سے قال اللہ اور قال الرسول ہی کی آواز آرہی ہے۔ ہر گھر اور ہر مجلس میں دین اور علمِ دین ہی کا چرچا ہے۔ فقر وفاقہ کے باوجود دنیا اور اہلِ دنیا سے استغناء بے نیازی، زہد واتقاء، حق گوئی، بے باکی، اور ان کی سادگی وتواضع کے واقعات پڑھ کر آپ کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو عہدِ صحابہؓ سے قریب تر محسوس کرنے لگیں گے۔ ان کی علمی کاوشوں اور تفقہ واجتہاد اور قانونی دقت نظری کی اتنی کثرت سے مثالیں ملیں گی کہ اس عہد کی فلسفیانہ موشگافیوں کی آپ کے دل میں کوئی وقعت نہیں رہ جائے گی۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں یہ تضاد گو عہد راشدہ کے بعد ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ لیکن اس عہد میں بعض سیاسی اسباب اور بعض نئے فتنوں کی وجہ سے اس میں اضافہ ہوگیا تھا، عہدِ تابعین یعنی اُموی دور میں معاشرہ میں عام طور پر عربی اور بدوی رنگ غالب تھا اس لئے اس عہد کی برائیوں میں ملمع سازی نہیں سادگی تھی، لیکن عہدِ تبع تابعین یعنی عباسی دور میں جو سیاسی، علمی، مذہبی، معاشرتی برائیاں پیدا ہوئیں، ان میں عجمیت، اباحیت پسندی اور فلسفیانہ موشگافی کا رنگ غالب تھا، جاحظ کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ :

دولة بنی العباس اعجمية خراسانيه و دولة مروان عربية اعرابية [1]۔

''عباسی حکومت میں عجمی اور خراسانی رنگ غالب تھا اور بنوامیہ کی حکومت میں عربی اور بدوی رنگ غالب تھا''۔

---

[1] البیان والتبیین۔ جلد ۳۔ ص ۲۰۶

یہ تضاد دوسرے عناصر کے ساتھ یونانی، سریانی اور ہندی علوم خاص طور پر فلسفہ اور نجوم کی کتابوں کے عربی میں منتقل ہونے اور مدح خوان شعراء، ادباء اور مغنیوں کی حکومت کی طرف سے ہمت افزائی کی وجہ سے بھی پیدا ہوا اور اس کے بڑھانے میں قبائلی عصبیت اور ایرانی قومی حمیت نے بھی حصہ لیا، چنانچہ اس کے اثرات نہ صرف علمی زندگی میں پڑنے لگے، بلکہ اس کا اثر اسلامی علوم اور اسلامی عقائد پر بھی پڑا، اسلامی مملکت کے اکثر مقامات اور خاص طور پر کوفہ و بصرہ پایہ تخت ہونے کی وجہ سے نئے نئے مسائل اور نئے نئے مباحث کے آماج گاہ بن گئے تھے۔ شیعیت، خارجیت اور عربی عصبیت کے قدیم فتنے کیا کم تھے کہ ان میں قبائلی اور قومی عصبیت، شعوبیت، اعتزال، مرجیئت، قدریت اور جہمیت وغیرہ جیسے نئے نئے فتنوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اس پُرفتن اور پرشور دور میں جس میں آدمی کا اپنے ایمان کو سلامت رکھنا مشکل تھا۔ حضرات تبع تابعین نے نہ صرف یہ کہ ان تمام فتنوں کا سلبی طور پر مقابلہ کیا بلکہ ایجابی طور پر علومِ دینیہ کی حفاظت اور تدوین و ترتیب کا غیر معمولی کام بھی انجام دیا، اگر یہ برگزیدہ جماعت اس کام کی طرف متوجہ نہ ہوتی تو اُمت، اسلامی علوم کے نہ جانے کتنے بڑے حصہ سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی اور ان کی جگہ نہ جانے کتنے غیر اسلامی علوم نے لے لی ہوتی آئندہ صفحات میں ان کے سلبی اور ایجابی دونوں طرح کے کارناموں کی قدرے تفصیل کی جاتی ہے، لیکن ان کے ان کارناموں کی تفصیل سے پہلے ضرورت ہے کہ اس عہد کے فتنوں کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے، ان کا تذکرہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کتاب میں بار بار ان کا نام آئے گا اور اس لئے بھی کہ ان کی حقیقت جانے بغیر نہ تو تبع تابعین کے کارناموں کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اور نہ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ بعض آئمہ نے ان کے مقابلہ میں اپنے جسم و جان کا پورا سرمایہ کیوں لگا دیا۔

قبائلی عصبیت:

ظہورِ اسلام سے قبل عربوں میں قبائلی عصبیت اور ایرانیوں اور عیسائیوں میں قومی اور طبقاتی عصبیت اپنے شباب پر تھی، اسلام نے ان تمام عصبیتوں پر شدید ضرب لگائی اور اس کے بجائے اس نے شرف و امتیاز کو صرف ایک معیار قرار دیا۔

اِنَّا جَعَلْنَا کُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ ۔

''ہم نے تم کو مختلف قوموں اور مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو اور خدا کے نزدیک سب سے شریف اور معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو''۔

قرآن کی اس ہدایت کے مطابق نبی ﷺ نے بار باراور خاص طور پر اپنے آخری حج کے موقع پر اعلان فرمایا کہ " **لا فضل لعربي على عجمي و لا فضل لعجمي على عربي والاسود على الاحمر ولا لاحمر على الاسود الا بتقوى** "۔

اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ عربی، عجمی، رومی، ایرانی، کالے، گورے، غلام اور آقا ہر طبقہ وگروہ کے لوگ اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے، اور ان میں سے ہر ایک گروہ اور طبقہ کے لوگوں نے اپنی اپنی ذاتی صلاحیت وتقویٰ کی بنیاد پر بڑے سے بڑا شرف وامتیاز حاصل کیا لیکن اُموی حکومت نے جب اسلامی خلافت کی جگہ شخصی حکومت کی بنیاد ڈالی تو انہوں نے اپنی سیاسی مصلحت کی بنا پر اپنے گرد ایسے ہی لوگوں کو جمع کرنا شروع کیا اور انہی کی زیادہ ہمت افزائی کی جو ہر حال میں ان کی حمایت کریں۔

چونکہ یہ خود عربی النسل تھے، اور شام کے عربوں کی حمایت پر ان کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے عربی عصبیت کو ہوادی اور خاص طور پر عرب قبائل کو حکومت اور فوج میں زیادہ سے زیادہ دخیل کیا، اس دور کے عربی ادب شاعری میں یہ چیز عام طور پر نظر آتی ہے، اس عصبیت سے اموی حکومت کو کچھ سیاسی فائدے ضرور ہوئے لیکن اس ذہنیت نے عربوں میں بھی یمنی، مصری، اور عدنانی و قحطانی عصبیت کو پھر سے زندہ کر دیا، اور یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ اس عصبیت نے مشرق میں بھی اموی حکومت کا بیڑہ غرق کیا، اور مغرب یعنی اندلس میں بھی ایک مدت تک ان کو چین لینے نہیں دیا۔ یہ داستان بڑی لمبی اور دل دوز ہے، اموی خلفاء میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ایک ذات ایسی تھی، جو نہ صرف اس عصبیت سے دور تھے، بلکہ انہوں نے اس کے مٹانے کی بھی کوشش کی۔

غیر عربوں کی قومی عصبیت :

ایران وروم کی سیاسی شکست کے بعد وہاں کی دبی اور کچلی ہوئی عوام آبادی نے تو اسلام کو بطیب خاطر قبول کر لیا۔ اور اس کو اپنے لئے ایک نعمت ورحمت تصور کیا۔ مگر وہاں کے بااقتدار اور اونچے طبقے نے گو ظاہری طور پر اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ مگر ابھی تک اس کے دل سے طبقہ واریت اور قومی عصبیت کا ناپاک جذبہ نہیں نکلا تھا۔ اور جب بھی ان کو موقع ملتا تھا وہ اس جذبہ کو ظاہر کرتے رہتے تھے الا ماشاء اللہ، جس طرح اُمویوں نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت عربی عصبیت کو ہوا دی اسی طرح عباسیوں نے اپنی حکومت کے قیام اور پھر اس کے بقاء کے لئے عجمی عصبیت کو ابھارا جس کی وجہ سے ان کے پیر پورے طور پر جم گئے۔

چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عربوں یا مسلمانوں کے خلاف جتنی سیاسی بغاوتیں یا اسلامی ممالک میں جتنے مذہبی اور معاشرتی فتنے پیدا ہوئے ان کی ابتداء یا تو کسی عجمی کے ذریعہ ہوئی، یا کم از کم ان کی پشت پر ان کی مدد ضرور رہی، عباسی حکومت انہی کی مدد سے قائم ہوئی جس کا خود منصور کو اعتراف تھا اور بار بار اعلان کرتا رہا کہ

یا اهل خراسان انتم شیعتنا و انصار نا و اهل دعوتنا۔

(مسعودی۔ جلد۔ ص ۱۲۷)

''اے اہلِ خراسان تم ہمارے مددگار اور انصار اور ہماری حکومت کے داعی ہو''۔

مگر اس کے باوجود منصور کے زمانہ سے لے کر ہارون کے زمانہ تک جتنی بغاوتیں اور مذہبی فتنے پیدا ہوئے ان میں ایرانیوں کا ہاتھ ضرور تھا۔

مثال کے طور پر ۱۳۷ھ میں مضباد کی بغاوت ۱۴۱ھ میں فرقہ راوندیہ کی شورش میں انہی کا ہاتھ تھا۔ ۱۵۰ھ میں استاذ سیس نامی ایک خراسانی نے دعوائے نبوت کیا، جس کی دعوت کو سب سے زیادہ فروغ انہی میں ہوا۔ اسی ذہنیت کے نتیجہ میں منصور کو اپنے سب سے بڑے حامی ابو مسلم خراسانی کو قتل کرانا پڑا، عجمیت نوازی کے نتائج عباسی حکومت کے سامنے برابر آتے رہے، لیکن ایرانی اور غیر عربی عنصر عباسی حکومت میں اتنا دخیل ہو چکا تھا کہ اس کو بالکل نظر انداز کر دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس عجمیت نوازی سے گو عربوں کی اہمیت سیاسی طور پر قدرے کم ہوگئی تھی، لیکن پھر بھی جو عربی عناصر حکومت کے اندر اور باہر موجود تھے، انہوں نے شکست نہیں کھائی تھی، بلکہ وہ ہمیشہ اس ذہنیت کا مقابلہ کرتے رہتے تھے۔

چنانچہ امین مامون کی جنگ گو بظاہر دو بھائیوں کی جنگ تھی، لیکن حقیقۃً عربوں اور عجمیوں کی جنگ تھی، اگر امین فاتح ہوتا تو اس سے عربوں کی فتح ہوئی، کیونکہ اس کی ماں عربی النسل تھی، جس کی وجہ سے عربی عصبیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور یہی وجہ تھی اس کی پشت پناہی زیادہ تر عربوں نے کی، اور مامون کی جیت ہوتی تو اس سے عجمیوں اور غلاموں کی فتح ہوتی، کیونکہ وہ خود کنیز زادہ تھا اس لئے عجمیت نوازی اس کو ورثہ میں ملی تھی اور اہلِ عجم ہی اس کے پشت پناہ تھے۔

ان عجمیوں کی فتنہ پرور ذہنیت کا اندازہ نعیم بن حازم عربی کی اس گفتگو سے لگایئے جو اس نے مامون کے عجمی وزیر فضل بن سہیل سے کی تھی نعیم اور فضل میں مامون کے سامنے کسی بات پر سخت

گفتگو ہوئی، نعیم نے فضل سے صاف صاف کہا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ بنوعباس سے حکومت نکال کر آل علی میں پہنچادو، اور پھر آل علی سے چھین کر آل کسریٰ کی حکومت دوبارہ قائم کردو[1]۔

شعوبیّت:

اسی عجمی ذہنیت نے شعوبیت کا فتنہ پیدا کیا، بظاہر اس کا مقصد تو عربوں اور غیر عربوں میں مساوات پیدا کرنا تھا مگر اس کے اندر عرب دشمنی کے ساتھ کسی قدر اسلام دشمنی بھی پوشیدہ تھی۔ صاحب لسان العرب نے شعوبی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

والشعوبي هو الذی يصغر شان العرب ولا يری فضلاً علی غيرهم

''شعوبی اس کو کہتے ہیں جو عربوں کی اہمیت کو گھٹائے اور دوسروں پر ان کی فضیلت کو تسلیم نہ کرے''۔

یہ لوگ اپنے استدلال میں قرآن کی ان ..... آیات اور احادیث نبوی کو پیش کرتے تھے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فی نفسہ کسی خاص طبقہ کو کسی خاص طبقہ پر یا کسی خاص قوم کو کسی خاص قوم پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ جو کچھ فضیلت وفوقیت ہے وہ علم وتقویٰ کی بناء پر ہے، اس میں بہت سے لوگ خلوص سے اس مساویانہ ذہنیت کو فروغ دینا چاہتے تھے، لیکن اکثریت کے دماغ میں عجمی عصبیت اور عرب دشمنی بھری ہوئی تھی، اس تحریک کی بساط ایوانِ حکومت سے لے کر بزم علم تک پھیلی ہوئی تھی، یہ ایک مذہب اور مسلک بن گیا تھا۔ مامون کے مشہور وزیر فضل کے بارے میں ابن ندیم نے لکھا ہے کہ

کان فارسی الاصل شعوبی المذهب، شديد العصبية علی العرب وله في ذلک کتب کثيرة۔ (ص ۱۱۰)

''یہ ایرانی النسل اور شعوبی المذہب تھا اس کو عربوں سے سخت دشمنی تھی اس موضوع پر اس نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں''۔

اس طرح اس موضوع پر دوسرے، بہت سے عجمیوں نے کتابیں لکھیں، جن میں علان الشعوبی، سعید بن حمید، ہشیم اور ابوعبیدہ کی کتابیں بہت مشہور ہوئیں، ابن ندیم نے ان سب کا تذکرہ کیا ہے، خاص طور پر ابوعبید تو ان کا سرخیل تھا۔ ابن خلکان نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔

کان يبغض العرب والف لی مثالبها کتبا کثيرة۔ (جلد ۲۔ ص ۵۵۴)

''یہ عربوں سے نفرت کرتا تھا اور ان کے معائب میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں''۔

---

[1] کتاب ابوندا، ص ۳۹۷

یہ قرآن کی تفسیر میں بڑا آزاد مشرب تھا۔ جس میں پر اصمعی سخت تنقید کرتا تھا۔

اس تحریک نے صرف سیاسی طور پر عربوں کو کمزور نہیں کیا بلکہ اس کے ذریعہ اسلامی علوم کو بھی کافی نقصان پہنچا، انہوں نے ادب و تاریخ اور تفسیر میں ایران کے شاہی زمانہ کے کتنے فرضی قصے اور نہ جانے کتنی بے سروپا روایتیں داخل کر دیں۔ گو تبع تابعین اور ان کے بعد کے محدثین اور مفسرین نے ان قصوں اور روایتوں کی بڑی حد تک پردہ داری کی، لیکن اس کے باوجود تفسیر و حدیث کے ذخیرہ میں بہت سی روایتیں اہلِ عجم کی فضیلت کے سلسلہ میں اب بھی ایسی ملتی ہیں جن کو درایۃً تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

عربی عصبیت اور عجمی عصبیت کے ساتھ اسلامی مملکت میں ایک اور عنصر نے معاشرہ کے بگاڑنے میں حصہ لیا، وہ موالی یعنی غلاموں کا طبقہ تھا، طوالت کے خیال سے اس کی تفصیل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواص و عوام پر انہی کا اثر تھا، اور معاشرہ میں اس وقت اسلامی ذہنیت کا بالکل ہی فقدان ہو چکا تھا۔ اور اس کا مظاہرہ کرنے والے موجود نہیں تھے، بلکہ مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرات تبع تابعین کے عہد میں مسلمانوں کے حکمران اور غالب عجمی عنصر کا رجحان کیا تھا اور معاشرہ میں کیا خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں ورنہ اب بھی معاشرہ میں انہی لوگوں کی حقیقی عزت و عظمت تھی اور خواص اور عوام پر انہی کا اثر تھا۔ جو علم و تقویٰ کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ خواہ عربی ہوں یا عجمی، کالے ہوں یا گورے، اس ذہنیت کے پیدا کرنے اور پھر اس کے باقی رکھنے میں حضرات تبع تابعین ؒ نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔

ان کی مجلسوں کا دروازہ جس طرح ایک عجمی کے لئے کھلا ہوا تھا، اسی طرح ایک عربی کے لئے بھی۔ جس طرح ان کا چشمۂ فیض ہاشمیوں اور قریشیوں کے لئے جاری تھا، اسی طرح غلاموں کے لئے بھی، یہاں محمود و ایاز ایک ہی جیسے عربی النسل حضرات کی جو عظمت و عزت تھی، وہی عظمت و جلالت امام محمد، یحییٰ بن معین، امام اوزاعی، سعید القطان، ابن جریج، علی بن المدینی، عبدالرحمٰن مہدی اور عبداللہ بن مبارک جیسے غلامان اسلام کی تھی، ان حضرات کو جب بھی موقع ملا اس ذہنیت کو مٹانے اور اس پر ضرب لگانے کی کوشش کی، امام سفیان ثوریؒ کا انتقال غربت و مسافرت میں ہوا تھا، انتقال کے وقت آپ نے پوچھا کہ میرے وطن کا کوئی آدمی ہے، لوگوں نے عبدالرحمٰن بن عبدالملک اور حسن بن عیاش کا نام لیا، آپ نے عبدالرحمٰن کو نمازِ جنازہ اور حسن کو ترکہ کی وصیت کی، انتقال کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ عبدالرحمٰن نمازِ جنازہ پڑھائیں گے تو بنو تمیم کے لوگ یہ کہہ کر مانع ہوئے۔

یمنی یصلی علیٰ مضری

''ایک یمنی مضری کی نماز جنازہ پڑھائے گا''۔

یعنی امام سفیان مضری تھے، اور عبدالرحمٰن کندی یمنی تھے، اس لئے یہ شرف کسی مضری ہی کو ملنا چاہئے، جب لوگوں نے بنوتمیم سے یہ کہا کہ یہ امام کی وصیت ہے، تو پھر انہوں نے نماز جنازہ پڑھانے کی اجازت دی[1]، اس سے اندازہ لگانا چاہئے کہ سیاسی بازی گروں نے اس ذہنیت کو کہاں تک پہنچا دیا تھا۔

حضرت فضیل بن عیاض اور امام اوزاعی کے حالات میں پڑھیں گے کہ انہوں نے منصور اور ہارون جیسے باجبروت خلفا کے سامنے کس طرح اس ذہنیت پر ضرب لگائی۔

مذہبی فتنے :

حضرت تبع تابعین میں سے آپ جن بزرگ کا بھی تذکرہ کتاب میں پڑھیں گے، ان میں چند فرقوں کا کسی نہ کسی حیثیت سے ذکر ضرور آئے گا۔ جس طرح بعض سیاسی اسباب کی بناء پر بعض فتنے پیدا ہو گئے تھے، اسی طرح سیاسی انتشار اور نئی نئی قوموں کے اسلام میں داخلے اور پھر یونانی اور ہندی فلسفہ کے اثر سے بعض دینی فرقے پیدا ہوئے، جن میں سے بعض نے تبع تابعین کے زمانہ میں بڑا اثر رسوخ پیدا کر لیا تھا، اور ان کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں روزانہ نئے نئے مسئلے اور قضیئے پیدا ہونے لگے تھے۔

حضرت اتباع تابعین گو ان فرقوں اور ان کے پیدا کئے ہوئے مسائل سے صَرف نظر کر کے شریعت کی سادہ اور اعلیٰ تعلیم کی حفاظت اور اس کی ترویج میں لگے ہوئے تھے، مگر پھر بھی ان کو کبھی کبھی ان کے خلاف زبان کھولنی پڑتی تھی، ان کا ذکر کتاب میں بار بار آئے گا، اس لئے قدرے ان کی تفصیل کر دی جاتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ طاقت ور فرقے شیعہ، خوارج، مرجیہ، جبریہ جہمیہ، قدریہ یا معتزلہ تھے۔

شیعیت :

شیعیت گو ایک سیاسی تحریک ہے جو حضرت عثمان ؓ کے عہد میں ظاہر ہوئی، اور حضرت علی ؓ کے عہد میں اس نے زور پکڑا اور بنو اُمیہ کے عہد میں جوں جوں ہاشمیوں پر ظلم ہوتا رہا اس کا حلقۂ اثر بڑھتا رہا، بعد میں اس نے ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت اختیار کر لی، اس فرقہ کی تاریخ اسلامی حکومت کی

---

[1] تاریخ بغداد۔ جلد ۹۔ ص ۱۶۰

مخالفت سے پُر ہے، جب تک بنو اُمیہ کی حکومت رہی اس وقت تک یہ بنو ہاشم کے نام پر بغاوتیں اور سازشیں کرتا رہا، اور جب بنو امیہ کا خاتمہ ہو گیا تو پھر یہ بنو عباس کے درپے آزار ہو گیا، یہ اسی فرقہ کی سیاسی غلطی تھی کہ خانوادۂ نبوت کے نہ جانے کتنے معصوموں کو خاک وخون میں تڑپنے پر مجبور ہونا پڑا۔

اس فرقہ کو سب سے زیادہ عروج عراق اور پھر ایران میں ہوا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عراق مشرق ومغرب کا دروازہ ہے، جہاں اسلام سے پہلے بھی دوسری قوموں کی آمد ورفت تھی۔

حضرت علیؓ نے اپنا دار الخلافہ یہیں بنایا تھا۔ پھر بنو عباس نے بھی اپنا مرکز حکومت بنایا، جس کی وجہ سے یہ ۔۔۔۔۔ یہود و انصاری اور ہندی، مزدکی اور مانی فرقوں کی آماج گاہ بن گیا، ان فرقوں کے جو افراد مسلمان ہو جاتے تھے ان کو شیعے یہ کہہ کر بہ آسانی سے اپنا ہم نوا بنا لیتے تھے کہ خلافت کہ حق دار ہی لوگ زیادہ ہیں جو رشتہ ونسب کے لحاظ سے نبی ﷺ سے زیادہ قربت رکھتے ہیں ان نومسلموں کے ذہن میں یہ بات آسانی سے اس لئے بیٹھ جاتی کہ یہ نسبی وخاندانی بادشاہت ہی کے پروردہ اور اس کے عادی تھے۔

ان کی مذہبی وسیاسی کشمکش کی داستان بڑی طویل ہے، اس سلسلہ میں صاحب فجر الاسلام کا تبصرہ ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں، جس سے کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

> ''حق یہ ہے کہ شیعیت ان تمام لوگوں کے لئے جائے پناہ تھی، جو کسی قدیم عداوت یا حسد کی بنا پر اسلام کی بنیاد کو گرانا اور اسلاف واجداد کی تعلیمات کو اس میں داخل کرنا چاہتے تھے، مثلاً یہودی، نصرانی، زردشتی اور مزدکی وغیرہ، اسی طرح ان لوگوں کے لئے بھی یہ جائے پناہ تھی، جو اپنے ملک کو اسلامی مملکت سے کاٹنا اور حکومت کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے تھے، غرض یہ کہ ایسے تمام افراد، اہلِ بیت کی محبت کو آڑ بنا کر اپنے اپنے اغراض کی تکمیل چاہتے تھے، مثال کے لئے تشیع میں یہودیت کا اثر وظہور رجعت امام کے عقیدہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح یہود نے کہا تھا کہ ہم کو چند دن آگ جلائے گی، اسی طرح یہ عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں تشیع میں بھی ہے، نصرانیت سے ان میں یہ تصور آیا کہ امام کو خدا سے وہی نسبت ہے جو حضرت مسیحؑ کو خدا سے تھی، انہوں نے کہا لاہوت نے عالم ناسوت میں امام کا روپ دھار لیا ہے، اور نبوت ورسالت کبھی ختم نہیں ہوگی جس نے بھی لاہوت سے اتحاد پیدا کر لیا وہ نبی ہے، اسی طرح تناسخ ارواح، خدا کی تجسیم اور حلول کا عقیدہ ان میں برہمنوں اور فلاسفہ کے اثر سے آیا''۔

مقریزی نے لکھا ہے جب اہلِ ایران نے جنگ وجدل کے میدان میں شکست کھائی تو ان میں سے ایک جماعت نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا، اور جو لوگ اہل بیت سے محبت رکھتے تھے،

ان کو اُ کساا کسا کر اپنے گرد جمع کرنا شروع کیا یہاں تک کہ اخرجوھم عن طریق الھدی [۱]
ان کو راہ حق سے دور ہٹا لے گئے۔

جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا ہے، ابتدا میں یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس نے بعد میں ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت اختیار کر لی لیکن پہلی صدی تک یہ صرف تفضیلیت تک محدود رہی، یعنی اس خیال کے لوگ حضرت علیؓ کو حضرات شیخین سے افضل سمجھتے تھے لیکن عباسی دور میں دوسری قوموں اور خاص طور پر اہلِ فارس سے ان کا اختلاط کثرت سے بڑھا تو اس نے ایک نئے مذہب کا قالب اختیار کر لیا جس نے عقائد اسلامی کے بارے میں ایسے عجیب وغریب خیالات کا اظہار کیا جس سے اُمت واقف نہیں تھی، اس نے کتاب اللہ کی ایک نئی تفسیر وتاویل اور حدیث کی ایک ایسی اچھوتی اصلاح [۲] گھڑی، جس کا ثبوت عہدِ صحابہ اور عہد تابعین میں نہیں ملتا، تفصیل کے لئے مقریزی حصہ اول اور ملل ونحل کا مطالعہ کرنا چاہئے، یہ سب زیادہ تر عہدِ تبع تابعین میں ہوا۔

ائمہ کے تسلسل اور ان کی تعیین کے سلسلہ میں اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہوئے، جن میں خاص طور پر دو فرقے بہت مشہور ہیں، امامیہ اور زیدیہ، ان میں فرقۂ زیدیہ اہلِ سنت والجماعت سے سب سے زیادہ قریب تر ہے [۳]۔ فرقہ امامیہ کا دوسرا نام اثناعشریہ ہے، اسی اثناعشریہ امامیہ کی ایک شاخ باطنیت ہے [۴]، جو خاص عہدِ تبع تابعین [۵] کا فتنہ ہے، جس کی بنیادی گمراہی اس کا عقیدہ ہے کہ قرآن اور اسلامی تعلیمات کا ایک باطن ہے، اور ایک ظاہر ہے اور احکام میں اصل چیز اس کی باطنی حیثیت ہے، اس تقسیم کی بناء پر انہوں نے اسلام کے عقائد، عبادات اور دوسرے امورِ دین کو ایک فلسفہ بلکہ ایک مذاق بنا کر رکھ دیا ہے، انہی کو اسماعیلیہ بھی کہا جاتا ہے، ہندوستان میں ان کے دو حصے ہو گئے ہیں، عراق میں وہ قرامطہ اور خراسان میں ملحدہ وتعلیمیہ کے نام سے مشہور تھے، ہندوستان میں بھی ابتداً قرامطہ ہی کے نام سے ان کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے، یہ اپنے کو شیعوں سے جدا کرنے کے لئے شیعہ اسماعیلیہ بھی کہتے ہیں۔

خوارج :

عہدِ تابعین میں گو ان کا زور قدرے کم ہو گیا تھا، مگر ان کے اور شیعوں کے بعض عقائد کی جھلک معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کے عقائد میں بھی ملتی ہے، جو خاص اس دور کی پیداوار ہیں، اس لئے مختصراً

۱؎ جلد اول۔ ص ۳۲۶ ۲؎ ان کے نزدیک حدیث صرف نبی ﷺ کے قول وفعل اور تقریر کو نہیں کہتے بلکہ ان کے نزدیک ائمہ معصومین کے قول وفعل وتقریر کو بھی حدیث کہتے ہیں۔ گویا منصب نبوت ومنصب امامت میں تقدم وتاخر کے علاوہ کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ۳؎ یمن میں اس فرقہ کی حکومت ہے۔ ۴؎ اب اثناعشریہ ان کے خیالات سے اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ ۵؎ مامون کے عہد میں اس کی ابتداء ہوئی اور معتصم کے عہد میں اس کو فروغ ہوا۔

ان کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ خوارج کی ابتداء اس جنگ سے ہوئی جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان صفین میں ہوئی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے جب محسوس کیا کہ ان کو اب شکست ہو جائے گی تو انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ یہ معاملہ ثالث کے سامنے رکھ دیا جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے باوجودیکہ جنگ میں ان کا پلہ بھاری تھا، یہ تجویز منظور کر لی، اور حضرت معاویہؓ کی طرف سے عمرو بن العاصؓ اور حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ثالث مقرر کر دیئے گئے۔

اس تحکیم کے مسئلہ میں حضرت علیؓ کے کچھ موافقین نے جن میں خاص طور پر قبیلۂ بنو تمیم کے وہ افراد شامل تھے، جنہوں نے اس جنگ میں بڑی جاں فروشی دکھائی تھی، اس بنا پر اختلاف کیا کہ تحکیم تو اس مسئلہ میں ہونے چاہئے، جس میں فریقین میں سے کسی ایک فریق کے برسر حق ہونے میں شبہ ہو، لیکن یہاں تو حضرت علیؓ کا برسر حق ہونا واضح ہے، اور جب کوئی بات ظاہر ہو تو پھر اس میں خدا کے حکم کے علاوہ کسی دوسرے کو حکم بنانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ انہوں نے **لا حکم الا اللہ** کا نعرہ بلند کیا اور اس نے ایک بڑے طبقہ کو متاثر کیا، اور اس کے بعد حضرت علیؓ سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ سے حکم بنانے میں غلطی ہوگئی ہے، اس لئے آپ کو اپنی اس غلطی کا بلکہ اپنے کفر کا اقرار کر لینا چاہئے اور اس کے بعد توبہ کر کے تجدید ایمان کرنا چاہئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے جس اہم شرعی مصلحت کی بنا پر اپنی فتح کو شکست میں تبدیل کر لیا تھا، وہ اس مطالبہ کو کیسے منظور کر سکتے تھے۔ جب کہ ان سے یہ مطالبہ کرنے والوں کے استدلال کی بنیاد بھی صحیح نہیں تھی۔ حضرت علیؓ نے ان کے سامنے جو خطبہ دیا تھا اس میں ان کے استدلال کی غلطی واضح طور پر بیان کر دی تھی یعنی یہ کہ تحکیم کا حکم بھی خدا نے دیا ہے، اس لئے یہ تحکیم " ان الحکم الا اللہ " کے خلاف نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہے۔ ان کے اس نعرہ کے بارے میں حضرت علیؓ کا یہ مقولہ زبان زد خاص وعام ہے کہ کلمۂ حق ارید بھا الباطل، بات صحیح ہے مگر اس سے باطل وغلط کام لیا جا رہا ہے۔

حضرت علیؓ کے بعد یہ لوگ اُموی دور میں اُموی حکومت سے ہمیشہ برابر برسر پیکار رہے، خاص طور پر ان کے دو جنگی مرکز تھے، ایک مرکز بصرہ کے قریب نطائح تھا، دوسرا جزیرۂ عرب میں خاص طور پر یمامہ۔ حضرموت، یمن اور طائف میں ان کا کافی زور تھا۔

عباسی دور میں گو ان کا زور کچھ کم ہو گیا تھا، مگر پھر بھی متعدد بغاوتیں ان کی طرف سے ہوئیں، جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے، ان کی ابتداء ایک دینی مسئلہ کی سیاسی تعبیر کے سلسلہ سے ہوئی، اور ان کی یہی حیثیت برابر باقی رہی، بلکہ بعد میں ان پر دینی رنگ زیادہ غالب ہو گیا، شیعوں کی طرح ان کے بھی

متعدد فرقے ہو گئے تھے، جن میں مشہور یہ ہیں، ازارقہ، اباضیہ اور یزیدیہ دعوتیہ۔ یہ پچھلے دونوں فرقے مسلمانوں سے بہت زیادہ دور اور اباضیہ سب سے زیادہ قریب تھے۔

شیعوں کی طرح خوارج نے بھی سیاسی اور دینی دونوں طرح کے فتنے پیدا کئے، لیکن ان پر چونکہ دین کا غلبہ تھا، اس لئے ان کے عقائد و اعمال میں بعض خوبیاں تھیں، مثلاً وہ انتہائی عبادت گذار اور دیانت دار ہوتے تھے، وہ جو قدم اٹھاتے تھے ان میں دینی رنگ غالب ہوتا تھا، ان کا سب سے بہتر عقیدہ یہ تھا کہ خلافت کسی خاص خاندان یا کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ خلیفہ عام مسلمانوں کے انتخاب سے ہونا چاہئے، ان کا سب سے غلط عقیدہ یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

شیعوں کے مقابلہ میں ان میں خوبیاں زیادہ اور برائیاں کم تھیں۔ اس لئے اخیار اُمت کا سلوک ان کے ساتھ قدرے ہمدردانہ رہا، خود حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد خوارج سے جنگ نہ کی جائے، اس لئے کہ جس شخص نے حق طلب کیا مگر اس میں اس سے غلطی ہوئی، اس شخص کی طرح نہیں ہے جس نے باطل طلب کیا اور اسے پا بھی لیا۔ (فجر السلام۔ ص ۳۱۵)

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خوارج کو مخاطب کر کے فرماتے تھے کہ میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ موقف دنیا اور نتائج دنیا کی طلب کے لئے نہیں اختیار کیا ہے، بلکہ آخرت کی طلب کے لئے اختیار کیا ہے، مگر ۔۔۔۔۔ راستہ اختیار کرنے میں تم سے غلطی ہوئی۔ حضرت مالک بن انسؒ، عکرمہ مولی بن عباس اور حضرت حسن بصری وغیرہ تحکیم کے مسئلہ میں قریب قریب وہی رائے رکھتے تھے، جو خوارج کی تھی، البتہ وہ اس کو کفر و فسق نہیں رکھتے تھے۔ حضرت حسن بصری، حضرت علیؓ کا ذکر اپنی مجلس میں کرتے تو فرماتے کہ ان پر خدا رحم کرے، کامیابی ان کے پیر چوم رہی تھی یہاں تک کہ انہوں نے تحکیم مان لی، آپ نے کیوں تحکیم قبول کی جب آپ حق پر تھے۔ (ابن اثیر۔ جلد ۲۔ ص ۱۳۶)

مرجیہ :

شیعیت اور خارجیت کے غلو کے نتیجہ میں فرقہ مرجیہ پیدا ہوا، اگر یہ فرقہ ایمان و عمل کے مسئلہ میں غلو اختیار نہ کرتا تو اس کا شمار اہلِ سنت والجماعت میں ہوتا۔

مرجیہ کا عقیدہ :

اس کا وجود بھی گو سیاسی اختلافات ہی کے نتیجہ میں ہوا، مگر دوسرے فرقوں کی طرح جلد ہی اس نے ایمان و عمل کے مسئلہ تک اپنی توجہ مرکوز کر دی اور اس میں حد سے زیادہ مبالغہ سے کام لیا اور

اسی وجہ سے جمہور امت نے ان سے بیزاری کا اظہار کیا، اوران کی اس مبالغہ آمیزی کو گمراہی قرار دیا۔ ورنہ فی نفسہ نہ تو ان کی بات گمراہی تھی، اور نہ ان کا شمار فرقِ ضالہ میں ہے۔

حضرت عثمان ؓ کی شہادت کے بعد اُمت میں کچھ لوگ تو حضرت علی ؓ کے حامی ہو گئے، اور حضرت عثمان ؓ کی تنقیص کرنے لگے، اور کچھ لوگ حضرت عثمان ؓ کے حامی ہو گئے، اور حضرت علی ؓ کی تنقیص کرنے لگے، لیکن انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو کہتے تھے کہ ان میں سے کوئی نہ تو غلطی پر ہے اور نہ ان میں سے کسی کی تنقیص کرنی چاہئے۔ ہم کو ان دونوں کے ساتھ احترام کا شیوہ اختیار کرنا چاہئے اور ان کے آپس کے معاملات کو خدا کے سپرد کرنا چاہئے، وہ خود ہی فیصلہ کرے گا۔

مرجیہ ارجا سے نکلا ہے جس کے معنی موخر کرنے کے ہیں۔ چونکہ وہ ختنین کے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے فیصلہ کو قیامت پر موخر کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو مرجیہ کہا جانے لگا، گویا اس اعتبار سے وہ تمام صحابہ مرجیہ تھے، جنہوں نے ان اختلافات سے اپنا دامن بچائے رکھا، لیکن شیعیت اور خارجیت کو جوں جوں فروغ ہوتا گیا اور انہوں نے دینی مسائل میں مبالغہ آمیز رائیں دینی شروع کیں، ان لوگوں کی حیثیت بھی ایک مذہبی فرقہ کی ہوگئی، جس کی بحث کا دائرہ ایمان اور کفر اور مومن و کافر کی تعریف تک محدود ہو گیا۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک طرف شیعوں نے اپنے علاوہ سب کی تکفیر شروع کر دی اور امام معصوم کے اعتقاد کو ایمان کا ایک جز قرار دے دیا، دوسری طرف خوارج نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دینا شروع کر دیا، اور اپنے علاوہ سب کی تکفیر شروع کر دی، چنانچہ مرجیہ نے دونوں فرقوں کی مبالغہ آمیزی سے بچنے کے لئے ایمان کی یہ تعریف کی کہ

المعرفة بالله وبرسله

''اللہ اور رسول ﷺ کی معرفت کا نام ایمان ہے''۔

بس اب جس نے بھی کلمۂ طیبہ کا اقرار کر لیا اس کو معرفتِ ایمان حاصل ہو گئی۔ اب وہ مومن ہے، معرفتِ ایمان میں عمل کو کوئی دخل نہیں ہے۔ ایمان کی یہ تعریف ان خوارج کی بھی تھی جو کہتے تھے کہ ایمان صرف اللہ اور اس کے رسول کی معرفت کا نام نہیں ہے، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور کبائر سے اجتناب بھی اس میں شامل ہے (تو جو شخص ایمان کے بعد فرائض ترک کر دے، یا گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے وہ خوارج کے نزدیک کافر ٹھہرے گا اور مرجیہ اس کو کافر نہیں بلکہ مومن ہی کہیں گے) اسی طرح اس میں ان شیعوں کا جواب بھی تھا، جو امام کی اطاعت کو بھی ایمان کا ایک لازمی جزو سمجھتے تھے۔

یہاں تک تو مرجیہ کی بات اپنی جگہ پر درست تھی، لیکن بعضوں نے اس میں ذرا زیادہ مبالغہ سے کام لیا اور یہاں تک کہنے لگے کہ اگر کوئی شخص ایمان کے بعد کفر کا اظہار بھی زبان سے کر دے، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ ان کی یہ بات اس لئے غلط ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے، تو پھر کسی برائی پر نہ تو کسی کو ٹوکا جا سکتا ہے، اور نہ اس کے خلاف کوئی قانونی کاروائی کی جا سکتی ہے۔

معتزلہ عموماً ہر اس شخص کو مرجی کہنے لگے تھے، جس کا اعتقاد یہ نہ ہو کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ابدی جہنمی ہوتا ہے، غالباً انہی کے اثر کی وجہ سے بہت سے ائمہ کو اور خاص طور پر امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کو مرجی کہا جانے لگا۔ گو اس اعتبار سے تمام جمہور اہلِ سنت والجماعت کو مرجیہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر اور ابدی جہنمی قرار نہیں دیتے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ مرجیت اور خارجیت سے عام جمہور امت نے اپنا دامن بچائے رکھا مگر چونکہ یہ مسائل اُٹھ چکے تھے اور ان کا چرچا ہر جگہ عام ہو چکا تھا، خاص طور پر عہدِ تابعین میں ہر مجلس میں ان مسائل کا ذکر تھا۔ اس لئے ان بزرگوں کو بھی زبان کھولنی پڑتی تھی، اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہؒ نے جو رائے دی وہ مرجیت سے زیادہ قریب تھی اور عام محدثین اور ائمہ ثلاثہؒ نے جو رائے دی، وہ شیعیت اعتزال اور خارجیت سے کسی قدر قریب تھی، یعنی امام صاحب نے تو یہ فرمایا کہ ترک فرائض اور ارتکاب گناہ کی وجہ سے کوئی شخص خارج از اسلام نہیں ہو سکتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے یا گناہ کا اثر ایمان کی کیفیت پر نہیں پڑتا یا اظہار کفر سے بھی آدمی مومن ہی رہتا ہے۔

اسی بناء پر شہرستانی نے امام ابوحنیفہؒ کو مرجیہ اہلِ سنت میں شمار کیا ہے، اس کے برخلاف عام ائمہ و محدثین نے یہ فرمایا کہ عمل بھی ایمان کا جزو ہے اور ترک فرائض اور ارتکاب گناہ سے مومن کا ایمان کم ہو جاتا ہے لیکن خوارج و معتزلہ کی طرح ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ترک عمل سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ ائمۂ اہل حق کے درمیان اس مسئلہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے، لیکن منشا اور نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کی رایوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مسائل جبر واختیار:

دوسری صدی کے آخر میں جو نئے کلامی مسائل مسلمانوں میں رواج پذیر ہوئے ان میں مسائل جبر واختیار اور قضا وقدر بھی ہیں۔ قرآن کی بعض آیات اور بعض احادیث نبوی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنی ہدایت وضلالت (گمراہی) اور اپنے ارادہ وافعال میں مجبور محض ہے۔ اسی طرح بعض

آیات اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار میں مختار ہے اور اسی اختیار کی وجہ سے اس سے بازپرس ہوگی۔ ان مسائل پر جن لوگوں نے کسی ایک ہی پہلو اور ایک ہی قسم کی آیات و احادیث کی روشنی میں غور کیا۔ انہوں نے ٹھوکر کھائی اور اسلام کی راہ اعتدال سے ان کا قدم ہٹ گیا۔ چنانچہ ان مسائل میں جن فرقوں نے ایک پہلو پر زور دیا اور اس کے ذریعہ دین میں نئے نئے مسائل پیدا ہوئے، ان میں جبریہ و قدریہ بہت زیادہ مشہور ہوئے۔

گو بعد میں ان فرقوں کا دائرۂ بحث ان مسائل سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات وصفات تک پہنچ گیا، لیکن ان کی ابتدا قضاء و قدر کے مسائل سے ہوئی، قدریت کی مذمت کا ذکر بعض احادیث نبوی ﷺ اور آثار صحابہ میں بھی ملے گا، مگر اس زمانہ کی قدریت ریب و شک تک محدود تھی اور تبع تابعین کے عہد میں یہ انکار کی سرحد میں داخل ہوگئی تھی۔ تبع تابعین کے عہد میں جبریہ عموماً جہمیہ اور قدریہ عموماً معتزلہ کے نام سے موسوم تھے، ان دونوں فرقوں میں شدید اختلاف کے باوجود بعض مسائل میں دونوں کی دانستہ یا نادانستہ رائے ایک ہوگئی تھی۔ خاص طور پر صفات باری کی نفی میں دونوں بالکل متحد نظر آتے ہیں۔ ان دونوں فرقوں کے خیالات کی مزید تفصیل یہ ہے۔

جبریہ یا جہمیہ:

اس فرقہ کا عقیدہ تھا کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں اس کے ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا، جو کچھ کرتا ہے، اسے وہی کرنا ہی چاہئے تھا، خدا نے اسی کام پر اس کو مجبور کر دیا ہے۔ افعال کی صدور میں انسان اور جمادات و نباتات میں کوئی فرق نہیں ہے، محض مجازاً افعال کی نسبتً انسان کی طرف کر دی جاتی ہے، جیسے مجازاً یہ کہا جاتا ہے، کہ آسمان سے پانی برسا، درخت سے پھل نکلا، اسی طرح انسان کے بارے میں مجازاً کہا جاتا ہے کہ انسان نے لکھا، یا انسان نے پڑھا، انسان نے نافرمانی کی، یا اطاعت کی، ورنہ حقیقۃً وہ یہ سب کرنے پر مجبور تھا۔

اس عقیدہ کو سب سے زیادہ فروغ جہم بن صفوان نے دیا، اس لئے اس فرقہ کا دوسرا نام جہمیہ پڑ گیا، ائمہ تبع تابعین زیادہ تر اسی نام سے اس فرقہ کو یاد کرتے ہیں۔

جہم بن صفوان خراسان کا رہنے والا تھا، بڑا زبردست خطیب تھا، لوگوں کو اپنی تقریر سے فوراً متاثر کر لیتا تھا۔ ابتداءً میں اس کے مسلک کو خراسان کے علاقہ میں بڑا فروغ ہوا۔ ۱۲۸ھ میں بنو امیہ کے خلاف کے بغاوت میں قتل کیا گیا[۱]۔

---

[۱] فجر الاسلام، ص ۳۴۲

اس فرقہ نے مذکورہ بالا خیالات ہی کے اظہار پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس نے آگے چل کر خدا کو ایک مجرد ذات مان کر اس کی تمام صفات کا انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ خدا کی صفات اور اعضاء کا ذکر قرآن میں آیا ہے، ان سے مخلوق کے ساتھ تشبہ لازم آتا ہے۔ اس لئے ان تمام آیات واحادیث کی تاویل کرنی چاہئے۔ اسی کے نتیجہ میں انہوں نے کہا کہ قرآن یعنی کلام الٰہی مخلوق ہے۔ اسی نفی صفات کے نتیجہ میں قیامت میں خدا کے دیدار کا انکار کیا۔ یہ بھی کہا کہ دوزخ و جنت اہلِ دوزخ اور اہل جنت کے دخول کے بعد فنا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ ہر حرکت کی ایک ابتدا اور انتہا ہے، اس لئے ان کی بھی انتہا لازمی ہے۔ تبع تابعین اور ان کے تلامذہ اور بعد کے علما نے اپنی کتابوں میں ان عقائد وخیالات کی سخت الفاظ میں تردید کی ہے۔

قدریہ :

فرقہ جبریہ یا جہمیہ کے بالکل مقابل قدریہ تھے، ان کا خیال تھا کہ انسان اپنے ارادہ وعمل میں بالکل آزاد اور مختار ہے۔ خدا انسان کا خالق ہے، مگر اس کے ارادہ وافعال کے پیدا کرنے میں اس کے ارادہ ومشیت کو کوئی دخل نہیں ہے، وہ بھلی بری جو راہ چاہے اختیار کرے۔ اسی فرقہ نے بعد میں اعتزال کی صورت اختیار کر لی اور قدریت کے بجائے دنیائے اسلام، اعتزال کے فتنہ سے دوچار ہوئی، معتزلہ اور قدریہ کو جبریہ سے ارادہ ومشیت الٰہی کے سلسلہ میں شدید اختلاف تھا، لیکن نفی صفات میں وہ جبریت کے ہم نوا بن گئے تھے۔ غرض یہ کہ دوسری صدی میں قدریت کی مکمل اور نفی صفات کے سلسلہ میں جبریت کی جزئی نمائندگی یہی معتزلہ کر رہے تھے۔

قضا و قدر پر بحث ومباحثہ کی ابتدا تو عہدِ نبوی ہی میں ہو گئی تھی، جس سے آپ نے روک دیا تھا۔ ابتدا میں جو لوگ قضاء وقدر میں قیل وقال کرتے تھے، ان کو قدری کہا جاتا تھا۔ انہی کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ "القدرية مجوس هذه الامة"[1] لیکن دوسری صدی میں عیسائیوں اور زردشتیوں کے اثر سے قدریت ایک مستقل فلسفہ بن گئی۔ جس پر صدیوں تک متکلمین اسلام اور دوسرے فرقوں میں معرکہ آرائی رہی اور جس کا مقصد اسلام کے بنیادی عقائد میں رخنہ اندازی تھی۔ اس فرقہ کے مسلمان بانی معبد اور غیلان ہیں۔ مگر ان کے ذہن میں فلسفیانہ قدریت کا وجود کیسے ہوا، اس کے لئے ابن نباتہ کا بیان ملاحظہ ہو۔

---

[1] اگر اس کو پیشن گوئی سمجھا جائے تو اس کی زد میں تمام فرقے آتے ہیں، جو قضا وقدر میں اعتدال کی راہ سے ہٹ گئے تھے۔

قیل ان اوّل من تکلّم فی القدر رجل" من اھل العراق کان نصرانیا فاسلم ثم تنصّرو اخذ عنه معبد الجھنی و غیلان الدمشقی (شرح العیون)

"کہا جاتا ہے کہ پہلا شخص جس نے قدر کے بارے میں کلام کیا وہ ایک عیسائی تھا جس نے اسلام قبول کیا اور پھر عیسائی ہو گیا۔ اسی سے معبد جہنی اور غیلان دمشقی نے قدریت کا سبق لیا"۔

مؤرخین نے اس پر بحث کی ہے کہ اس قدریت کا منبع عراق ہے یا شام، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ بدعت سیّہ نصرانیت ہی کی دین ہے۔

قدریت کے داعی اول معبد اور غیلان دونوں عہدِ تابعین میں پیدا ہوئے اور ان کے خیالات اسی عہد میں پھیلنے شروع ہو گئے تھے اور علماء نے ان سے مباحثہ ومناظرہ بھی شروع کر دیا تھا، چنانچہ خود حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے غیلان سے گفتگو کے بعد تمام ممالک اسلامیہ میں ان خیالات سے بچنے کی ہدایت کی تھی، مگر اس کا زیادہ زور تبع تابعین کے عہد میں اس وقت ہوا جب اس نے اعتزال کی صورت اختیار کر لی۔

معتزلہ:

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ قدریت کی دوسری شکل اعتزال تھی اور نفی صفات کے سلسلہ میں وہ جبریوں کے ہم عقیدہ ہو گئے تھے۔ معتزلہ اپنے کو معتزلہ یا قدریہ کہلانا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ قدریت پر حدیث میں تنقید اور وعید آئی ہے اور اعتزال کے لفظ سے علیحدگی پسندی معلوم ہوتی ہے۔

وجہ تسمیہ:

عام طور پر علم کلام کی کتابوں میں معتزلہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اعتزال کے داعی اول واصل بن عطا حسن بصریؒ کی مجلس میں شریک ہوتا تھا۔ گناہ کبیرہ کے مسئلہ میں اس نے خوارج اور جمہور اُمت کی رائے سے اختلاف کر کے ایک نئی رائے یہ دی کہ کبیرہ کا مرتکب نہ تو کافر ہے، جیسا کہ خوارج کہتے ہیں اور نہ مومن فاسق ہے، جیسا کہ جمہور اُمت کا خیال ہے، بلکہ ان کے لئے کافر و مومن کے درمیان ایک دوسری منزل ہے۔

چونکہ یہ بالکل نئی بات تھی، اس لئے امام حسن بصریؒ نے اس کو اپنی مجلس سے نکال دیا اور وہ ان سے کنارہ کش ہو گیا۔ چونکہ کسی سے کنارہ کش ہو جانے کو عربی میں اعتزال کہتے ہیں، اس لئے ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

الفرق بین الفرق کے مصنف نے لکھا ہے کہ ان کو حسن بصریؒ کی مجلس سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اُمت کی عام رائے سے علیحدہ ہو جانے کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ ان کو معتزلہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر اور مومن دونوں سے علیحدہ ایک مقام تجویز کرتے تھے۔ مقریزی کے بیان سے پتہ چلتا ہے، اس نام سے وہ لوگ یاد کئے گئے جو نو مسلم اہلِ کتاب تھے۔ ان میں سے جس پہلو سے بھی دیکھا جائے ان کو معتزلہ کہنا صحیح تھا، لیکن ان کی وجہ تسمیہ کی سب سے زیادہ صحیح تعبیر صاحب الفرق بین الفرق نے کی ہے، بہر حال وجہ تسمیہ جو بھی ہو مگر دوسری صدی ہجری کا سب سے بڑا فتنہ یہی اعتزال تھا۔

اعتزال وشیعیت :

اعتزال کی طرف جو لوگ سب سے زیادہ بڑھے وہ یا تو نو مسلم تھے جن میں اکثریت اہلِ کتاب نو مسلموں کی تھی یا وہ لوگ تھے جو اپنی آزادروی میں کوئی پابندی لگانا پسند نہیں کرتے تھے یا فلاسفہ اور شیعوں نے اس کو لبیک کہا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس فتنہ کو پیدا فلسفہ نے کیا اور اس کو سب سے زیادہ فروغ شیعوں کی وجہ سے ہوا۔ صاحب الملل والنحل کا بیان ملاحظہ ہو۔

وہ لکھتے ہیں کہ واصل بن عطا نے حضرت زید بن علی سے استفادہ کیا تھا، جس کی وجہ سے صارت الزیدیہ کلہم معتزلہ (ص ۳۲) سارے زیدی معتزلہ کے ہم خیال بن گئے۔

اہل اعتزال اور شیعوں میں اصولی و بنیادی فرق ہے۔ لیکن تنقید صحابہ میں دونوں چونکہ ہم رائے ہیں، اس لئے شیعوں نے اعتزال کے قبول کرنے میں سبقت کی۔ شیعوں کے دخول سے پہلے معتزلہ صحابہ کے بارے میں اتنی سخت رائے نہیں رکھتے تھے، جتنی کہ اس کے بعد رکھنے لگے۔

چنانچہ اس کی تائید کے لئے ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ کی جلد ۴، ص ۴۵۴ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

خلفائے عباسیہ اور اہل بیت کے تعلقات ہمیشہ خراب رہے، مامون پہلا خلیفہ گزرا ہے جس نے اہل بیت کو اہمیت دی۔ حتیٰ کہ ان کے حق میں وہ خلافت چھوڑنے کے لئے بھی راضی ہو گیا تھا اور اتفاق سے اعتزال کو بھی سب سے زیادہ اہمیت دی، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حکومت کی پالیسی میں اس کا داخلہ اسی کی وجہ سے ہوا۔ گویا ان دونوں متضاد عناصر کا اتحاد تنقید صحابہ کے سلسلہ میں بھی ہوا اور مامون بھی اس کا واسطہ بنا۔

معتزلہ کے عقائد :

جن عقائد پر معتزلہ سب سے زیادہ زور دیا کرتے تھے، ان میں چند یہ ہیں :

(۱) خدا کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ اس کی صفات اس کی ذات سے کوئی علیحدہ اور زائد چیز نہیں ہے، اگر خدا کی ذات سے الگ صفات قدیمہ کا وجود تسلیم کیا جائے تو اس سے تعدد قدم ار تعدد الہ کا لزوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور کسی حیثیت سے بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اس عقیدہ سے حقیقۃً تو نہیں، مگر بظاہر صفاتِ الٰہی کی نفی لازم آتی تھی، اس لئے علمائے اُمت اور خاص طور پر اتباع تابعین نے اس کی تردید کی، اور پھر۔۔۔۔۔۔۔۔اسی عقیدہ سے خلق قرآن کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ان سب کی تفصیل آگے آتی ہے۔

(۲) ان کا دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ انسان خود اپنے اچھے اور برے اعمال کا خالق ہے اور اس پر پورے طور پر قادر ہے، خدائے تعالیٰ کی طرف خیر و شر کا تخلیق کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس نسبت سے بلند ہے۔

اس عقیدہ سے لازم آتا ہے کہ خلق کے بعد خدا تعالیٰ کا اپنے بندوں سے کوئی تعلق نہیں رہا، اور اب وہ معطل ہو کر صرف تماشہ دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی ذات کو معطل سمجھنا اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا۔ اس لئے اس کی تردید کی گئی۔

(۳) ان کا تیسرا عقیدہ منزلۃ بین المنزلتین تھا۔ یعنی وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو نہ تو جمہور اُمت کی طرح مومن فاسق کہتے تھے اور نہ خوارج کی طرح کافر۔ بلکہ کہتے تھے کہ ایمان و کفر کے درمیان ایک تیسری منزل ہے، جس میں یہ فاسق رکھے جائیں گے۔ خوارج کے مقابلہ میں ان کا عقیدہ جمہور امت سے زیادہ قریب ہے۔

ان کا چوتھا عقیدہ جس پر علم کلام سے لے کر اصول فقہ کی کتابوں تک میں آج بحث و تمحیص ہوتی ہے وہ یہ ہے۔

(۴) حسن و قبح یا بھلائی و برائی کے پہچاننے کے لئے صرف عقل کی راہنمائی کافی ہے۔ اگرچہ شریعت کسی برائی کو برائی اور کسی بھلائی کو بھلائی نہ بھی کہتی ہو۔ مثلاً صدق یعنی سچائی فی نفسہٖ سچائی ہے، اسی طرح جھوٹ فی نفسہٖ جھوٹ ہے، اس لئے شریعت کا علم ہو یا نہ ہو بندے پر لازم ہے کہ وہ سچائی اختیار کریں اور جھوٹ کو ترک کر دیں۔

اس عقیدہ کو تمام جمہور اُمت نے بالکل رد نہیں کیا ہے، بلکہ فقہائے احناف تو حسن و قبح کے عقلی ہونے کے قائل ہیں، البتہ ان کے اور معتزلہ کے طرزِ تعبیر میں تھوڑا فرق ہے۔ تفصیل اصول فقہ کی عام کتابوں میں موجود ہے۔

یہ تو ان کے اصولی مباحث ہیں، جن میں تمام معتزلہ کا اتفاق ہے، لیکن ان کے علاوہ بعض اور مباحث ہیں جن میں معتزلہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے، شہرستانی نے ان کے دس گیارہ فرقوں کا ذکر کیا ہے، مثال کے لئے حضرات شیخین کی افضلیت کے بارے میں بصرہ کے معتزلہ شیخین کو حضرت علیؓ سے افضل مانتے تھے، مگر بغداد کے معتزلہ حضرت علیؓ کو افضل سمجھتے تھے، اسی طرح حسن و قبح کے بارے میں بعض معتزلہ اشاعرہ کے ہمنوا ہو گئے۔

عہدِ تبع تابعین کے مشہور معتزلی علماء :

اس عہد کے مشہور معتزلی علماء، واصل بن عطا، عمرو بن عبید، نظام، جاحظ، ابوالہذیل، ہشام، الفوطی، بشر بن معمر، ابوالحسین الخیاط، قاضی ابو دؤاد وغیرہ۔

معتزلہ کے کارنامے :

یہاں پر اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے، معتزلہ کے چند فلسفیانہ خیالات اور عقائد میں ان کی موشگافی کو نظر انداز کر کے اگر دیکھا جائے، تو اس فرقہ کے لوگوں نے علمِ دین کی جو بے بہا خدمات انجام دی ہیں وہ کسی دوسرے گمراہ فرقہ نے نہیں دیں، خاص طور پر تفسیر، علوم القرآن اور ادب میں انہوں نے جو نقوش چھوڑے ہیں، ان کو اُمت نے ہمیشہ اپنے سینوں سے لگائے رکھا۔ انہوں نے شیعوں کی طرح نہ تو الگ اُمت بنائی، نہ نئی تفسیر، نئی حدیث، نئی فقہ ایجاد کی، بلکہ انہوں نے اسلامی علوم کی خدمت میں ہمیشہ اُمت کا ساتھ دیا۔ یہ اور بات ہے کہ قرآن کی تعبیر میں بعض جگہ ان سے غلطی ہوئی ہے، لیکن ان کی غلطی ایسی ہی تھی جیسی کہ خود اشاعرہ اور ماتریدیہ سے بعض مسائل میں غلطی ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے، اس لئے صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

علمی فتنے :

ان مذکورہ بالا فتنوں کے علاوہ اس عہد میں بعض علمی فتنے بھی پیدا ہوئے۔ یہ فتنے دو طرح کے تھے، ایک تو فلسفیانہ اور مشرکانہ علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ کا فتنہ، دوسرے ان علوم کی مدد سے مختلف فرقوں کا اپنے خیالات کا اسلامی علوم میں داخل کرنے کی کوشش اور اپنے اپنے مزعومات کے مطابق قرآن و سنت کی سادہ تعلیم کی توجیہ و تاویل۔

غیر اسلامی کتابوں کے ترجمہ کا فتنہ :

گو اسلام دوسری قوموں کے علوم و فنون سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کا عام حکم ہے کہ حکمت و دانائی مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے وہ جہاں پائے اس کو اپنے دامن میں سمیٹ لے،

لیکن اسلامی مملکت میں یونانی فلسفہ و نجوم نجم کی فقہ گوئی اور موسیقی ، ہندوستانی دیدانت کی کتابوں کا ترجمہ ایسے وقت میں شروع ہوا ، جب شخصی حکومت کی بے راہ روی اور عجمیت نوازی کی وجہ سے پورا معاشرہ سیاسی اور مذہبی انتشار سے دوچار تھا۔

چنانچہ ان علوم وفنون کے ترجمہ سے عربی زبان ضرور مالا مال ہوئی لیکن ان کی وجہ سے سادہ اور ٹھیٹ اسلامی ذہنیت اور دینی علوم کو بڑا نقصان پہنچا۔ انہی علوم کے نتیجہ میں نئے نئے خیالات اور مسائل پیدا ہوئے اور پھر انہی کی وجہ سے اُمت میں نہ جانے کتنے نئے نئے فرقے اور گروہ بن گئے۔

آپ اگر اسلامی فرقوں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان سب کو غذا انہی غیر اسلامی علوم اور مشرکانہ فلسفہ سے ملتی تھی۔ اوپر جہمیت اور اعتزال وغیرہ کے ذکر میں اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ، خاص طور پر شیعوں اور باطنیوں کے مذہب کی بنیاد تو حکمت شریعت کے بجائے سراسر حکمت یونان پر ہے۔ حکمت شریعت کا پردہ اس پر اس لئے ڈالا گیا تھا کہ اس عہد میں کوئی تحریک یہ نقاب ڈالے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی ، اس عہد میں نقل و ترجمہ کا جو کام ہوا اس کی تفصیل تو بڑی لمبی ہے ، مختصر طور پر اس کا تذکرہ سن لیجئے۔

یوں تو اُموی دور میں بھی نقل و ترجمہ کا کام ہوا ، خاص طور پر ہشام بن عبد الملک اور خالد اُموی نے اس میں بڑا حصہ لیا ، لیکن اس سلسلہ میں اصل کام عباسی دور میں ہوا۔ سب سے پہلے منصور نے اس کی طرف توجہ کی۔ پھر ہارون نے بیت الحکمۃ کے نام سے اس کے لئے ایک ادارہ قائم کیا ، اسی کے عہد میں برامکہ پیدا ہوئے جنہوں نے غیر اسلامی خیالات اور علوم کی ترویج میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ پھر مامون نے بیت الحکمۃ کو ترقی دی اور اس کام کو نقطۂ سورج تک پہنچایا۔ آل برمک کی علم دوستی قابل قدر چیز ہے ، لیکن ان کا نقطۂ نظر کیا تھا ، اس کو مشہور لغوی ادیب اصمعی کی زبان سے سنیئے :

اذا ذكر الشرك في مجلس اضاءت وجوه بني برمك واذ تليت عندهم ايات اتوا بالا حاديث عن مزدك .

"یعنی جب کسی مجلس میں شرک کی باتیں ہوتی ہیں آل برمک کے چہرے کھل جاتے ہیں اور جب قرآن کی آیات تلاوت کی جاتی ہے تو یہ مزدک کی باتیں شروع کر دیتے ہیں"۔

اسلامی عقائد میں بحث ومباحثہ بھی انہی برامکہ کا فیض ہے ، مسعودی نے لکھا ہے :

وكان يحيىٰ بن خالد ذا بحث نظر وله مجلس يجتمع فيه من اهل الكلام من اهل الاسلام وغيرهم .

''یحییٰ بن خالد صاحب بحث ونظر تھا، اس کی مجلس میں مسلمان متکلمین (یعنی معتزلہ) اور غیر مسلموں کا مجمع رہا کرتا تھا''۔

مامون کے عہد میں اس فرقہ نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی، ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کر کے اس نے آرمینیہ، شام، مصر اور سائپرس سے فلسفہ، ہیئت اور نجوم کی کتابیں جمع کرائیں۔ اس کے عہد میں جو لوگ اس کام پر مامور تھے، ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ تھی اور جن کو ہزار دو ہزار تک ماہوار تنخواہیں ملتی تھیں۔ مثلاً حجاج بن یوسف کوفی، قسطا بن لوقا، حنین بن اسحٰق، سہل بن ہارون، یعقوب کندی، یوحنا، ماسویہ وغیرہ۔ مامون کی اس فلسفہ نوازی کے نتیجہ میں اہل اعتزال کو اس کے دربار میں اقتدار خود حاصل ہوا کہ یہی مسلک اسلامی حکومت کا مذہب قرار پا گیا، جس کے خلاف علماء اور خاص طور پر امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی جان کی بازی لگا کر جدوجہد کی اور خدا نے ان کو کامیاب بنایا۔

اسلامی علوم میں فلسفیانہ خیالات کی آمیزش اور ان کے مطابق اسلامی مسائل کی توجیہ وتاویل :

تبع تابعین رحمہم اللہ کو اس فتنہ کے ساتھ ایک دوسرے علمی فتنہ سے بھی سابقہ پڑا۔ اس فتنہ کو " وضع و تلبیس " کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت تک اسلامی ملکوں میں جتنے فرقے پیدا ہو چکے تھے، گو وہ اصول وفروغ میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے تھے، لیکن اس " فتنۂ وضع وتلبیس " میں سب متفق تھے۔ اگر ایک طرف انہوں نے وضع روایات کی تحریک شروع کی تو دوسری طرف اسلامی عقائد اور اصول میں فلسفیانہ موشگافی کر کے ریب وشک پیدا کرنے کی سعی کی۔ پھر تیسری طرف انہوں نے قرآن کی بے شمار آیات اور احادیث نبوی کی من مانی توجیہ وتاویل کر کے وہ مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی، جو نہ تو صحابہ وتابعین نے سمجھا تھا اور نہ روح شریعت سے میل کھاتا تھا۔ ان تمام گوشوں کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، اس لئے چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

وضع روایات :

احادیث نبوی ﷺ کی تحدیث اور قدیم اسرائیلی قصص کی روایت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ عہد صحابہ تک اس پر قانونی اور اخلاقی دونوں طرح پابندی عائد تھی، اس لئے ہر شخص اس کی جرات نہیں کرتا تھا حضرت عمرؓ کے سامنے جب کوئی روایت بیان کی جاتی تھی، تو وہ اس پر اکابر صحابہ تک سے شہادت طلب کرتے تھے۔ اس قانونی پابندی کے ساتھ عہد صحابہ تک روایت حدیث کی اہمیت اور اس کی

ذمہ داری کا احساس بھی عام تھا۔ چنانچہ بعض جلیل القدر صحابہ اسی ذمہ داری کے شدتِ احساس کی بناء پر روایت حدیث سے گریز کرتے تھے۔

مگر بعد میں نہ اس پر سخت قانونی گرفت باقی رہی اور نہ وہ پہلا سا اخلاقی اثر رہا۔ پھر رواۃ حدیث کو معاشرہ میں عزت وشرف کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے اہل وصاحب کمال لوگوں کے ساتھ بعض نااہل بھی اس مجد وشرف میں شریک وسہیم بننے کے لئے اس منصب پر متمکن ہو گئے اور انہوں نے نہایت غیر ذمہ دارانہ طور پر احادیث نبوی ﷺ اور اسرائیلی قصوں کی روایتیں شروع کر دیں، خاص طور پر پیشہ ور واعظوں اور قصہ گویاں نے گرمی مجلس کی خاطر نہ جانے کتنی بے سرو پا روایتیں عوام میں پھیلا دیں، پھر اسی کے ساتھ اُموی اور عباسی کشمکش، عصبیت اور مختلف فرقوں نے اپنی اپنی تائید کے لئے نہ جانے کتنی روایتیں گھڑ ڈالیں اور وہ روایتیں زبان زد خاص وعام ہو گئیں۔ اس فتنہ کی پوری تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے، چند واقعات سے اس کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس عہد کے معروف محدث حماد بن زید فرماتے تھے:

وصنّف الزنادقة علی رسوله الله صلی الله علیه وسلّم اثنی عشر الف حدیث[1]

''زنادقہ نے تقریباً بارہ ہزار جعلی حدیثیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیں''۔

ہارون کے سامنے ایک گمراہ و بے دین شخص کو لایا گیا، اس نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ قتل کا حکم سن کر اس نے کہا کہ آپ مجھے تو قتل کر دیں گے، لیکن ان چار ہزار روایتوں کا کیا کریں گے جو میں نے لوگوں میں پھیلا دی ہیں، جن کا ایک حرف بھی صحیح نہیں ہے۔

عبدالرحمٰن واسطی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے موت کے وقت کہا کہ میں نے ستر حدیثیں صرف حضرت علیؓ کی فضیلت میں وضع کی ہیں۔ (ص ۳۷) ابن جوزیؒ کہتے ہیں:

معظم البلاء فی وضع الحدیث من القصاص لانهم یریدون احادیث ترقق وتنفق.[2]

وضع حدیث کا سب سے بڑا فتنہ واعظوں اور قصہ گویوں کی وجہ سے پیدا ہوا، اس لئے کہ یہ ایسی حدیثیں گھڑتے تھے جو دلوں میں رقت پیدا کرتی تھیں، اور آسانی سے رواج پذیر ہو جاتی تھیں۔

---

[1] الموضوعات الکبیر [2] الموضوعات الکبیر۔ ص ۱۳

ایک شخص محمد بن شجاع شلجی تھا، جو تشیع سے متعلق بہت سی احادیث وضع کر کے محدثین کی طرف منسوب کر دیتا تھا۔

آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی کی غلط توجیہ و تاویل :

شیعہ، باطنیہ، خوارج، مرجیہ، قدریہ اور جہمیہ وغیرہ جتنے اسلامی فرقے پیدا ہوئے ان سب نے اپنے اصل کی بنیاد آیات قرآنی اور احادیث نبوی کو بنایا، مگر ان کی رت مانی اور تاویل اپنی خواہش اور فرضی کے مطابق کی جس کی کچھ تفصیل اوپر گزر چکی ہے، اور کچھ یہ ہے، متکلمین جن میں احادیث اہلِ اعتزال کی تھی، ان کے بارے میں ابن قتیبہ نے لکھا ہے۔

فسروا القران باعجب تفسير يريدون ان يردوه الى مذاهبهم ويحملوا التاويل على محلهم ۔ [۱]

''یہ قرآن کی عجیب عجیب تفسیریں کرتے تھے، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس سے ان کے مذہب کی تائید ہو اور اس کی موقع محل کے خلاف اس کی تاویل کر سکیں''۔

اس کے بعد انہوں نے متعدد آیات کی تفسیر پیش کر کے اس کی تفصیل کی ہے۔ اسی طرح ابن فورک متوفی ۴۰۶ھ اپنی کتاب مشکل الحدیث میں لکھتے ہیں کہ خدا کی ذات وصفات اور مشیت وقدرت سلسلہ میں متشابہ آیات وحدیث کی تفسیر میں جمہور امت نے صحابہ وتابعین کی جو سادہ روش اختیار کی تھی، اس پر یہ تمام فرقے سخت اعتراض کرتے تھے، اس لئے کہ یہ چیز ان کی خواہش کے خلاف تھی [۲]۔

غرض یہ کہ انہوں نے یہی نہیں کہ متشابہ آیات واحادیث سے غلط استدلال کیا، بلکہ جمہور امت نے اس کا جو مفہوم متعین کیا ہے، اس پر بھی وہ اعتراض کرتے تھے۔

تبع تابعینؒ نے ان تمام فتنوں کا مقابلہ کیا :

حضرات تبع تابعین نے ان تمام فتنوں کا منفی ومثبت دونوں طریقہ پر مقابلہ کیا۔ ان میں سے کتنے فتنوں کا تو زور انہوں نے توڑ دیا اور کچھ خاص اسباب کی بناء پر جن کا زور ختم نہ ہو سکا کم از کم ان کے اثرات سے جمہور امت کو انہوں نے محفوظ کر لیا۔ اس کام کے سلسلہ میں حضرات تبع تابعین بھی دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ گو ان دونوں گروہوں نے اس میں حصہ لیا، مگر بعض اسباب کی بناء پر ان کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہو گئی تھی، جو بعض بزرگوں کی کوشش سے جلد ہی پٹ بھی گئی، وہ دو گروہ

۱۔ الموضوعات الکبیر۔ ص ۱۳ ۲۔ مشکل الحدیث۔ ص ۴

محدثین اور فقہاء کے تھے، یہ دونوں بعض مسائل کی تعبیر میں اختلاف کے باوجود ان فتنوں کے مقابلہ میں متحد تھے، البتہ دونوں کے کام کی نوعیت جدا تھی، ابن فورک نے لکھا ہے۔

فرقة منها هي اهل النقل والرواية الذين تشتدعنا تيهم بنقل السنن وتتوفر دواعيهم على تحصيل طرقها وحفظ اسانيدها والتميز بين صحيحها وسقيمها فغلب عليهم ذاك ويعرفون به وينسبون اليه۔

فرقة منها يغلب عليهم تحقيق طرق النظر والمقائيس والابانة تبرتيب الفروع على الاصول ونفي شبه المبلسين عنها ايضاح وجوه الحجج والبراهين على حقائقها۔

''ان میں سے ایک گروہ اہل نقل وروایت کا تھا، جن کی ساری توجہ احادیث نبوی ﷺ کی روایت ونقل پر مرکوز تھی، انہوں نے اپنی ساری کوشش اس کے طرق اور اسانید جمع کرکے اور صحیح وسقیم کے چھانٹنے میں لگادی، چنانچہ ان پر یہی کام غالب آگیا اور اسی نام سے وہ مشہور ہوئے اور اسی کی طرف ان کی نسبت کی جاتی تھی''۔　　　　(یعنی اہل نقل وروایت)

''اور ایک گروہ پر فکر ونظر کی راہوں کی تحقیق وجستجو کا شوق اور قیاس واجتہاد اور فروع کو اصول کے مطابق مرتب کرنے اور ان پر شبہ واعتراض کرنے والوں کے شبہ واعتراض ..ر کرنے اور ان کے دلائل وشواہد کی پردہ کشائی کرنے کا غلبہ ہوا''۔

ان دونوں گروہوں کے کام کی نوعیت ابن فورک کے نزدیک یہ تھی۔

فالفرقة الاولى للدين كالخزنة للملك والفرقة الاخرى كالبطارقة التي تذب عن خزائن الملك اعترض عليها اولمعترض لها۔

''تو دین کے لئے پہلے گروہ کی حیثیت بادشاہ کے خزانے کے خزانچ..ں ..ور..سیوں کی ہے، اور دوسرے گروہ کی حیثیت پاسبانوں اور نگہبانوں کی ہے جو با..ہ..ہ کے خزانے کو دست درازی اور نظر بد ڈالنے والوں سے محفوظ رکھتا ہے''۔

کتاب کے مطالعہ سے پتا چلے گا کہ عہد تبع تابعین کے تمام ہی محتاط اور قابل اعتماد محدثین اور فقہا نے کم وبیش ان فتنوں سے دین ور اہل دین کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ اگر آپ ایک طرف فقہائے، تبع تابعین، مثلاً امام مالک، امام ابو یوسف اور امام محمد کے حالات میں یہ پڑھیں گے کہ وہ لوگوں کو عقائد اور صفات باری کے سلسلہ میں کیف وکم اور تعین وتقید سے روکتے تھے، تو دوسری طرف

ممتاز اہلِ نقل اور روایت تبع تابعین جیسے سفیان بن عینیہ، یحییٰ بن معین، اسحٰق بن راہویہ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ کو ان مسائل میں ان کا ہم نوا پائیں گے، ان دونوں گروہوں کے دو دو ایک ایک حضرات کے اقوال ہم یہاں نقل کرتے ہیں، امام ابو یوسفؒ نے اپنے تلامذہ کو جو جامع نصیحت کی تھی، اس کا کچھ حصہ یہ ہے:

> اصول دین کے معاملہ میں شک، لڑائی اور کج بحثی کو چھوڑ دو اس لئے کہ دین بالکل واضح اور روشن ہے، خدا نے اس کے فرائض و واجبات متعین کر دیئے ہیں، اور اس کے حدود و قیود بھی مقرر کر دیئے ہیں، حلال کو حلال اور حرام کو حرام کر دیا ہے جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے کہ میں نے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر تمام کر دیا، اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کر لیا تو اس کے حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو، قرآن کی محکم آیات پر عمل کرو اور آیات پر ایمان و یقین رکھو اور اس کے اندر جو مثال ہیں ان سے عبرت حاصل کرو، اگر دین (عقائد) میں کج بحثی کوئی تقویٰ کی بات ہوتی تو اس کی طرف سب سے پہلے رسول اللہ اور آپ کے بعد آپ کے اصحاب...... سبقت کرتے تو کیا انہوں نے کبھی عقائد اور اصول دین میں بحث و مباحثہ کیا؟ اگر انہوں نے اختلاف اور بحث و مباحثہ کیا تو ان فقہی مسائل میں جن کا تعلق عملی زندگی سے ہے، مثلاً نماز، حج، طلاق، حلال و حرام وغیرہ، انہوں نے عقائد، صفاتِ باری اور اصول دین میں کبھی اختلاف اور منازعہ (جھگڑا) نہیں کیا۔ (دیکھئے اصل کتاب میں ص ۸۵)

امام محمد کے الفاظ ملاحظہ ہوں، مشرق سے مغرب تک تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن اور ان احادیث پر جن کو ثقات نے روایت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات پر بغیر کسی تفسیر، تشبیہ اور توصیف کے ایمان رکھنا چاہئے، جو شخص ان چیزوں کی تفسیر و توضیح کرتا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ اور سلف کے طریقہ سے علیحدہ روش اختیار کرتا ہے، جس شخص نے جہم بن صفوان کی طرح بات کی وہ سلف کی جماعت سے خارج ہو گیا اس لئے کہ وہ خدا کو ایسی صفات سے متصف کرتا تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

ان مسائل میں اسی طرح کا جواب آپ امام مالک، اوزاعی، ابن مہدی، سفیان ثوریؒ اور امام مالک احمد بن حنبل رحمہما اللہ سے بھی سنیں گے، کتاب میں تفصیل موجود ہے، عام طور پر ان مسائل میں قیل و قال سے گریز کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ محدثین اور فقہا اس سے درماندہ تھے، بلکہ اس میں کئی دینی مصلحتیں تھیں۔

ایک یہ کہ اسلام زندگی کے لئے ایک اخلاقی پروگرام اور عمل وتحریک پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، اگر اس کا دامن فلسفیانہ موشگافیوں اور بے نتیجہ دقیقہ سنجیوں میں اُلجھا دیا گیا تو پھر وہ بھی دوسرے مذہب کی طرح ایک فلسفہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہ جائے گا، اور یہ چیز سراسر اس کی روح کے منافی تھی۔

دوسرے یہ کہ اگر یہ حضرات ان مسائل میں الجھ جاتے، تو ان میں الجھانے والوں کا وہ مقصد پورا ہو جاتا، جس کے لئے یہ فتنے پیدا ہوئے تھے، یعنی دین اور علم دین کی تدوین وترتیب اور ترویج واشاعت میں یہ حضرات جس یکسوئی کے ساتھ لگے ہوئے تھے وہ ختم ہو جاتی۔ اور وہ قیمتی کام نہ ہو پاتا جو ہوا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

تیسرے یہ کہ منفی طور پر ان کا اس فتنہ سے دور رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عام معاشرہ میں ان مسائل میں بحث ومباحثہ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا، اور معاشرہ کے عام افراد ان سے اپنا دامن بچائے رکھنا ہی پسند کرتے تھے، اگر یہ حضرات ان موشگافیوں میں پڑ جاتے، تو پھر عوام کو ان سے بچانا مشکل تھا۔

ان اسباب ووجوہ کی بنا وہ زیادہ تر نئے نئے فلسفیانہ مباحث اور مسائل سے وہ رہنے کی ترغیب دیتے تھے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کوئی ضروری موقع آ جاتا جب بھی وہ اس کا جواب نہیں دیتے تھے، آپ امام اوزاعی، امام احمد بن حنبل اور بعض دوسرے بزرگوں کے حالات میں پڑھیں گے کہ انہوں نے شرعی حدود میں متعدد اہل فرق کے افراد سے بحث ومباحث کر کے بھی ان کو قائل کرنے کی کوشش کی، امام بخاری جو تبع تابعین کے سب سے بڑے علمی وارث ہیں، ان کی کتاب سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ انہوں نے ان فرقوں کے خیالات کی تردید کرنے میں کتنی کدوکاش کی تھی، البتہ استدلال میں انہوں نے متکلمین کی روش کے بجائے سلف کی روش اختیار کی ہے۔

یہاں پر دو اور باتوں کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، ایک یہ کہ ان فرقوں میں بھی بعض افراد ایسے تھے، جو خلوص سے یہ سمجھتے تھے کہ ان نئے مسائل ومباحث کا عقلی طور پر بھی جواب دیا جا سکتا ہے، اس لئے انہوں نے ان کا جواب دیا، اور انہی کو ہم متکلمین اسلام کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ کام عام طور پر معتزلہ نے انجام دیا مگر بعد میں اس میں اہل سنت والجماعت کے بعض افراد بھی شریک ہو گئے، مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اس سے نہ تو کوئی عملی فائدہ اسلام کو پہنچا اور نہ تبلیغی ودعوتی۔

دوسری بات یہ کہ عباسی خلفاء نے گوان فرقوں کو ذہنی غذا پہنچانے میں بامقصد یا بالقصد بڑی مدد کی لیکن اس کا اظہار نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی کہ ان میں بعضوں نے ان افراد کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی، اگر چہ یہ کارروائی زیادہ تر اس وقت ہوتی تھی، جب عوام میں یہ اپنے خیالات پھیلانے کی کوشش کرتے تھے، اور اس سے کسی عوامی شورش پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا، ورنہ دربار میں زیادہ تر ''رواداری'' کا سلوک ہوتا تھا۔ الا ماشاء اللہ۔

فتنۂ وضع حدیث کا مقابلہ :

اُوپر فتنۂ وضع حدیث کا مختصر ذکر کیا گیا، لیکن اس سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہ فتنۂ دین اور علم دین کے لئے کتنا بڑا خطرہ تھا۔ اس فتنہ کا مقابلہ حضرات تبع تابعین ؒ نے کئی طرح سے کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے صحیح اور غلط، مستند اور موضوع تمام روایتوں کے سارے ذخیرہ کو جمع کرنے کی کوشش کی، اور جمع کر کے پھر انہوں نے قرآن کی ہدایات، صحیح احادیث اور مختلف سلسلۂ اسناد کی روشنی میں ان کو پرکھا اور پھر صحیح و سقیم کو علیٰحدہ کر کے رکھ دیا امام سفیان ثوریؒ کا یہ قول حاکم نے نقل کیا ہے۔

''کبھی کسی حدیث کی صحت اور عدم صحت کے متعلق کو ملتوی کرنے کے لئے بھی ہم بعضوں کی روایتوں کو سن لیتے ہیں، اور بعضوں کی بیان کی ہوئی روایتوں کو ہم جانتے ہیں کہ مستحق توجہ نہیں ہیں، لیکن پھر بھی بیان کرنے والے کی روش اور مسلک کا پتہ چلانے کے لئے ہم اس سے روایت کرتے ہیں''۔[1]

حاکم ہی نے ایک دوسرا واقعہ امام احمد بن حنبلؒ کی زبانی یحییٰ بن معین کا نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں ہم لوگ یمن میں تحصیل حدیث میں لگے ہوئے تھے، ایک دن ابن معین کو دیکھا کہ وہ گوشہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں، جب کوئی آدمی سامنے آتا ہے تو اسے چھپا دیتے ہیں، میں نے پوچھا تو فرمایا کہ حضرت انسؓ کے نام سے جعلی حدیثوں کا ایک مجموعہ ابان کی روایت سے جو مروج ہے اسے نقل کر رہا ہوں، امام احمدؒ نے ان سے کہا کہ آخر ان جعلی اور موضوع روایتوں کو آپ کیوں نقل کر رہے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ

''میں جانتا ہوں کہ یہ ساری روایتیں جعلی ہیں، مگر اس کے لکھنے سے میری غرض یہ ہے کہ اگر کوئی ابان کی جگہ کسی معتبر راوی کا نام داخل کر کے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہے گا، تو میں یہ کہہ کر اس غلط فہمی کا ازالہ کر سکوں گا کہ ان روایتوں کا واضع ابان ہے''۔ (معرفہ ص ۲)

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۳۵

ابن معین کا ایک اور قول بھی کتاب میں ملے گا۔

اوپر یہ ذکر آ چکا ہے کہ ایک بدوین کو ہارون نے قتل کرنے کا حکم دیا، اس نے کہا کہ امیر المومنین آپ میرے قتل کا حکم کیوں دیتے ہیں، ہارون نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو تیرے فتنے سے بچانے کے لئے بولا کہ آپ قتل کر کے کیا کریں گے، میں نے جو چار ہزار روایتیں وضع کر کے عوام میں پھیلا دی ہیں، ان کا آپ کے پاس کیا علاج ہے۔ ہارون بولا کہ

این انت یا زندیق عن عبدا للہ بن مبارک و ابن اسحق القراری نخیلا نہ فیخرجانہ حرفاً حرفاً۔[1]

''اے ملعون تو کس خیال میں ہے عبداللہ ابن المبارک اور ابواسحٰق فزاری ان تمام جعلی حدیثوں کو چھلنی میں چھانیں گے اور جعلی روایتوں کا ایک ایک حرف علیحدہ کر کے رکھ دیں گے''۔

دوسری کوشش ان حضرات نے یہ کی کہ تحدیث کا ایک معیار مقرر کیا، روایت و راویت کے اصول وضع کیے، ان حضرات کے انہی اصولوں پر فن اسماء الرجال کی بنیاد کھڑی ہوئی۔ اس سلسلہ میں اس عہد (زمانہ) کے تمام ہی محدثین نے حصہ لیا، مگر ان میں حضرت ابن مبارک، امام شعبہ، ابن معین اور سعید القطان وغیرہ زیادہ ممتاز ہیں، امام نووی نے صالح بن محمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

اول من تکلم فی الرجال شعبۃ ثم تبعہ یحی القطان ثم احمد بن حنبل و یحییٰ بن معین[2]

''سب سے پہلے حدیث کے راویوں پر امام شعبہ نے کلام کیا، پھر یحیٰی قطان اور ان کے بعد ابن معین اور ابن حنبل وغیرہ نے اس میں حصہ لیا''۔

مزید تفصیل کتاب میں ملے گی۔

خاص طور پر روایت کے معیار پر کسی روایت کا جانچنا روایت کے معیار پر جانچنے سے بھی مشکل ہے، روایت کے معیار پر جانچنے کا دار و مدار قوت حافظہ پر ہے، اگر خدا نے اس نعمت سے نوازا ہے تو تھوڑی سی ذکاوت و ذہانت کے ساتھ کسی روایت کے مختلف سلسلۂ سند اور راوی کے عام حالات سے واقفیت کی روشنی میں فیصلہ کر لیا جا سکتا ہے، لیکن درایت کا فیصلہ ذرہ مشکل ہے، درایت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی روایت کی خارجی حیثیت پر نہیں بلکہ اس کی معنوی اور داخلی حیثیت پر بھی نظر رکھی جائے کہ اس میں کوئی بات اسلام کی روح یا قرآن کی صریح تعلیم کے

---

[1] کتاب الموضوعات، ملا علی قاری۔ ص ۱۳　　[2] تہذیب الاسماء

خلاف تو نہیں ہے، خواہ سند کے اعتبار سے اس میں کوئی عیب نہ ہو، ظاہر ہے کہ اس میں قوت حافظہ و وسعت علم کے ساتھ دقت نظر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، ائمہ حدیث کی اصطلاح میں اسی کا دوسرا نام علم علل الحدیث ہے۔ اس لئے اس فن کے جاننے والے امت میں بہت کم پیدا ہوئے، زمرۂ تبع تابعین میں اس میں سب سے زیادہ ممتاز ابن مہدی اور ابن مدینی تھے۔ ابن مہدی نے روایت کی ایک بہترین مثال دی ہے۔

''ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ ابوسعید آپ کسی روایت کو قوی اور کسی کو ضعیف قرار دیتے ہیں، کسی پر صحت اور کسی پر عدم صحت کا حکم لگا دیتے ہیں، آخر آپ کے پاس وہ کون سا معیار ہے جس پر پرکھ کر آپ یہ حکم لگاتے ہیں، فرمایا کہ جب تم کسی صرّاف یا روپیہ کے پارکھ کے پاس روپے اور ریز گاری لے جاتے ہو تو وہ دیکھتے ہی کھرا اور کھوٹا الگ کر کے رکھ دیتا ہے تو کیا تم اس سے پوچھتے ہو کہ یہ حکم کیوں اور کیسے لگایا یا بے چوں چراں تسلیم کر لیتے ہو، بولا نہیں تسلیم ہی کر لینا پڑتا ہے، فرمایا کہ یہی حال روایت کا بھی ہے، مگر یہ منصب ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے بڑی ممارست، اہلِ علم کی صحبت، تبادلہ خیال اور وفور علم کی ضرورت ہوتی ہے''۔

معرفت حدیث کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ''معرفت حدیث ایک طرح کا الہام ہے''۔ اس معیار پر انہوں نے صرف غیر ذمہ داریوں ہی کو نہیں پرکھا بلکہ اگر کسی شیخ وقت اور محدث معروف سے بھی کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو وہ اس کو ظاہر کر دیتے تھے، ان حضرات کی انہی کوششوں کے نتیجہ میں جو نااہل اس منصب پر فائز ہو گئے تھے ان کا پردہ فاش ہو گیا، اور ان کو خواص ہی نہیں بلکہ عوام تک پہچاننے لگے، اور غلط اور جعلی روایتوں کا سارا سرمایہ بے قیمت ہو کر رہ گیا، گو اب بھی حدیث و تفسیر کی کتابوں میں بعض روایتیں ایسی ملیں گی۔ مگر ان کے سقم و عیب کو بھی بعد کے محدثین نے واضح کر دیا ہے۔

علمی اور عملی کارنامے :

اب تک زیادہ تر ان کے منفی کارناموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے جو خالص مثبت کارنامے انجام دیئے، ان کی طرف بھی کچھ اشارے یہاں کر دیئے جاتے ہیں، پوری تفصیل کتاب میں ملے گی۔

علمی کارنامے :

ان کے علمی کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ علوم دینیہ کی تدوین وترتیب ہے، گو یہ کام عہدِ صحابہ سے لے کر عہدِ تابعین تک برابر جاری رہا، لیکن اس عہد میں اس کام میں اتنی ترقی ہوئی کہ بعد کی صدیوں میں اس پر بہت کم اضافہ ہوسکا۔

تابعین اور تبع تابعین کے کام میں فرق :

عہدِ تابعین میں بھی علوم دینیہ کی تدوین وترتیب کثرت سے ہوئی، لیکن ابھی تک ان علوم کی نہ تو فنی تقسیم ہوئی تھی، یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، مغازی، تاریخ ورجال ولغت وغیرہ فنون کے نام علیحدہ علیحدہ نہیں پڑے تھے۔ اور نہ ان کی علیحدہ علیحدہ تدوین ہوئی تھی، اس وقت عام طور پر ایک امام اپنے درس میں تفسیر، حدیث، تاریخ ومغازی اور ادب ولغت غرض ہر طرح کے مسائل سے گفتگو کرتا تھا، اور ان کے تلامذہ ان کے افادات کو اپنے اپنے صحیفوں میں لکھ لیا کرتے تھے اور وہی پھر دوسروں تک پہنچ جاتے تھے، گویا ان کی حیثیت اساتذہ کے نوٹس یا ذاتی ڈائری کی ہوتی تھی، بعض تابعین نے فنی تقسیم کے اعتبار سے بھی کتابیں لکھی مگر ان میں سے مشکل ہی سے دوچار کتابیں اس وقت موجود ہوں گی، لیکن عہد تبع تابعین میں ان میں سے ہر فن کی علیحدہ علیحدہ ترتیب وتدوین ہوئی، اور اس اونچے پیمانہ پر ہوئی، کہ وہ کتابیں آج تک اسی صورت میں موجود ہیں، اس کی پوری تفصیل مختلف ائمہ کے حالات میں ملے گی۔ یہاں ایک مجمل تبصرہ کردیا جاتا ہے، امام ذہبی نے ۱۴۳ھ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

> فی سنة ۱۴۳ سنة شرع علماء الاسلام فی هذاا العصر فی تدوین الحدیث والفقة والتفسیر فصنف ابن جریج [1] بمکة ومالک الموطا بالمدینة والاوزاعی باشام وابن عروبه وحماد بن سلمه وغیرهما بالبصرة ومعمر بالیمن وسفیان الثوری بالکوفة وصنف ابن اسحاق المغازی و صنف ابوحنیفة [2] رحمة الله الفقة والرای ثم بعد بیسیر صنف هشیم واللیث وابن لهیعه ثم بن مبارک ابو یوسف وابن وهب وکثر تدوین العلم وتبویه وذونت کتب العربیه واللغة والتاریخ وایام الناس وقبل هذاالعصر کان الائمة یتکلمون من حفظهم اویرون العلم من صحف غیر مرتبه [3]۔

---

[1] کتاب میں ص ۲۳۹ پر مزید تفصیل ملے گی　[2] یہ دونوں حضرات گویا تابعین ہی میں ہیں لیکن ان کا عہد تبع تابعین ہی میں شروع ہوا۔ اور انہی کے ذریعہ دنیا ان کی تصنیفات سے واقف ہوئی　[3] تاریخ الخلفاء ص ۱۰۱

''۱۴۳ھ سے عام طور پر علمائے اسلام نے اس عہد میں حدیث، فقہ اور تفسیر ہر ایک کی الگ الگ تدوین شروع کردی، مکہ میں ابن جریج نے مدینہ میں امام مالک نے شام میں امام اوزاعی نے بصرہ میں ابن عروبہ اور حماد بن سلمہ نے یمن میں معمر نے اور کوفہ میں سفیان ثوریؒ نے تصنیف وتالیف کا کام شروع کردیا، ابن اسحاق نے مغازی پر اور امام ابو حنیفہ نے فقہ ورائے پر تصنیف کی، پھر کچھ ہی مدت بعد ہشیم بن لہیعہ نے، پھر ابن مبارک، امام ابو یوسف، ابن وہب وغیرہ نے اس مبارک کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، پھر کثرت سے ہر فن میں تصنیفات کا اور اس کی تدوین وترتیب کا سلسلہ شروع ہوا اور عربی ادب ولغت تاریخ اسلام اور قدیم تاریخ پر بے شمار کتابیں مدون ہوگئیں، اور اس عہد سے پہلے عام طور پر آئمہ فن یا تو اپنے حفظ واستحضار سے کسی فن پر کلام کرتے تھے یا پھر غیر مرتب مجموعوں اور صحیفوں کے ذریعہ''۔

۱۴۳ اور اس کے کچھ بعد کے سالوں میں تدوین وتالیف کا جو اہم کام ہوا، اس کے بارے میں اشارہ کیا ہے، لیکن تدوین وتالیف کا سب سے زیادہ کام ۱۵۰ھ سے تیسری صدی کے نصف اول تک ہوا، ہر ہر فن پر اس عہد میں جو کچھ کام ہوا اس کی تفصیل تو طویل ہے، مگر ہر فن کے چند ممتاز اور صاحب تصنیف علماء کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

تفسیر :

قرآن کی تفسیر وتشریح میں تو تقریباً تمام ہی تبع تابعین نے حصہ لیا، کسی نے حدیث کے نقطۂ نظر سے کسی نے فقہ کے نقطۂ نظر سے اور کسی نے نحو وصرف، لغت وادب کے نقطۂ نظر سے، لیکن خاص طور پر جن لوگوں اس فن پر اپنی یادگاریں چھوڑیں اور جن کو عام علماء طبقہ مفسرین میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: اسحاق بن راہویہ، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری وکیع بن جراح وغیرہ۔

حدیث :

اس عہد میں حدیث کی نقل وروایت اور تدوین وترتیب کا جتنا کام ہوا اتنا دوسری صدیوں میں نہیں ہوا، اس طرح اس عہد میں جس کثرت سے ممتاز اور بلند مرتبت ائمہ حدیث پیدا ہوئے بعد میں اتنی کثرت سے نہیں پیدا ہوئے اس عہد کے آئمہ حدیث کے تذکرے پڑھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر مسجد اور ہر پڑھے لکھے گھر سے قال قال رسول اللہ ﷺ کی آواز سنائی دے رہی ہے، اس عہد کے ممتاز اور صاحب تصنیف محدثین کے نام یہ ہیں :

امام مالک، امام احمد حنبل، حماد بن سلمہ، ابن مبارک، یحییٰ بن معین، ابن مہدی، سفیان ابن عیینہ، سفیان ثوری، امام شعبہ، یحییٰ بن سعید، ابن المدینی ابوعوانہ، یحییٰ بن آدم، جرریر بن عبدالحمید محمد بن جعفر غندر، ولید بن مسلم، وکیع بن جراح، ہشیم بن بشیر، یونس بن بکیر، مکی بن ابراہیم ، امام بخاری کی ثلاثیات زیادہ تر انہی کی روایت سے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض آئمہ حدیث اور بھی ہیں جن کا ذکر فقہ مغازی کے ضمن میں آئے گا۔ ان میں بعض آئمہ نے ستر ستر کتابیں تصنیف کی ہیں۔

فقہ :

فن حدیث کی تدوین وترتیب اور اس کی تنقیح وتنقید میں تبع تابعین کے تلامذہ (شاگردوں) نے بہت کچھ اضافہ کیا اور ان کے بہت سے ادھورے کاموں کو مکمل کیا مگر فن فقہ کو ان حضرات نے خود اتنا مکمل اور مرتب کر دیا تھا کہ بعد کی صدیوں میں اس میں بہت کم اضافہ ہوسکا۔ اگر اضافہ ہوا تو صیح وتشریح کی حد تک اس عہد کے ممتاز فقہا کے نام یہ ہیں، آئمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل امام ابو یوسف امام محمد امام سفیان ثوری، امام اوزاعی، ابن ابی لیلیٰ، لیث بن سعد، امام زفر، ابن وہب، اسد بن فرات، داؤد ظاہری، اسحاق بن راہو یہ رحمہما اللہ وغیرہ ان میں بعض آئمہ کی اہم تصانیف کی تعداد سو سے متجاوز ہے تفصیل کتاب میں ملے گی۔

تاریخ :

عہد تابعین میں دوسرے فنون کی طرح تاریک کا فن بھی علیحدہ نہیں ہوا تھا لیکن عہد تبع تابعین میں یہ فن مختلف شعبوں میں بٹ گیا، اور ہر شعبہ پر علیحدہ علیحدہ کام ہوا، لیکن یہ تمام شعبے اسلامی فتوح، مغازی، سیرت اور طبقات سے متعلق تھے، کوئی عمومی تاریخ اس دور میں نہیں لکھی گئی، گو کہ اس کی نقل وروایت کا کام شروع ہو گیا تھا، جن لوگوں نے اس فن کی تدوین میں حصہ لیا، ان میں واقدی المتوفی ۲۰۷ھ، ابن سعد المتوفی ۲۳۰ھ ہشام الکلبی متوفی ۲۰۶ھ، عبدالملک بن ہشام متوفی ۲۱۴ھ، الشیخ محمد اسماعیل زیاد البکائی، متوفی ۱۸۳ھ ابو معشر نجیح متوفی ۱۷۰ھ قابل ذکر ہیں۔ ان میں شیخ محمد اسماعیل کی فتوح الشام اپنے موضوع پر غیر مسبوق ہے، ان میں ہشام الکلبی اور واقدی پر علماء نے کم اعتماد کیا ہے۔

نحو ولغت :

فن نحو کی تدوین کا آغاز عہد صحابہ ہی میں ہو گیا تھا، کیونکہ جب اہل عجم نے اسلام قبول کیا اور انہوں نے قرآن کے پڑھنے میں بڑی فاش فاش غلطیاں شروع کر دیں تو بعض صحابہؓ کے مشورہ سے

ابوالاسود دوئلی متوفی ۶۷ھ نے سب سے پہلے نحو کے کچھ قواعد مقرر کئے۔ پھر اس کے بعد اس فن میں برابر ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ عہد تبع تابعین میں اس فن نے آخری حد تک ترقی کرلی، اس میں سب سے زیادہ حصہ بصریوں نے لیا، گو بعد میں کسائی اور فرا کی وجہ سے کوئی بھی ان کے سہیم و شریک ہو گئے، اسی طرح لغت کی تدوین بھی اسی عہد میں ہوئی۔

اس عہد کے ممتاز نحوی جنہوں نے اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں ان میں ابوبشر سیبویہ متوفی ۱۸۳ھ، کسائی، معاذ الہرا، ابوزکریا، الفراء خاص طور پر ممتاز ہیں، سیبویہ کی ''کتاب'' اس عہد سے لے کر آج تک نحو کی سب سے معتبر تصنیف سمجھی جاتی ہے، لغت کی تدوین میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان میں سب سے ممتاز الخلیل ابن احمد ہیں جن کی کتاب آج بھی قابل وثوق سمجھی جاتی ہے، اسی طرح عربی نثر و نظم کا سارا ذخیرہ اسی عہد میں مرتب ہوا، جن لوگوں نے اس میں حصہ لیا، وہ ہماری فہرست سے خارج ہیں۔ اس لئے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اس دور کی شاعری گو اسلامی نقطۂ نظر سے بہت کچھ ہٹ گئی تھی، لیکن پھر بھی کچھ شعراء خاص طور تبع تابعین کے تربیت یافتہ ایسے موجود تھے، جن کے اشعار میں اسلام کے اخلاقی رجحانات کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔

عملی کارنامے :

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا کو ایک ایسی پاکیزہ عملی زندگی ملی جس کی نظیر تاریخ انبیا کے علاوہ کسی دوسری قومی، سیاسی، اور مذہبی تاریخ میں نہیں ملتی اور جہاں کہیں بھی اس کا کچھ سراغ ملتا ہے تو اس کی عمر بہت زیدہ طویل نظر نہیں آتی، لیکن اسلامی تاریخ کے ہر دور میں کچھ ایسے برگزیدہ افراد پیدا ہوتے جارہے ہیں، جن کو دیکھ کر ایک نظر میں اسلام کا عملی نقشہ سامنے آجاتا ہے، دوسری صدی میں یہ عملی زندگی حضرات تبع تابعین کی وجہ سے زندہ رہی۔

عملی زندگی کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے عقائد سے لے کر معاملات و معاشرت تک جو تعلیم دی ہے افراد کے عمل سے اس کا مظاہرہ ہو۔

چنانچہ آپ بزرگان تبع تابعین میں سے جن صاحب کا بھی تذکرہ پڑھیں گے، اس حیثیت سے وہ ممتاز نظر آئیں گے، پھر یہی نہیں کہ ان کے حالات پڑھنے کے بعد صرف ان کی عملی زندگی کی تصویر سامنے آجاتی ہے بلکہ اس میں اتنی تاثیر ہے کہ اپنے اندر عمل کا جذبہ اُبھرتا ہے، یقین و توکل، آخرت کی کامیابی کی آرزو خدا سے محبت کے واقعات پڑھ کر خدا کی محبت اور آخرت کا یقین پیدا ہوتا

ہے، ان کی جرات، حق گوئی اور احیائے سنت کے جذبہ وشوق سے مایوس کن حالات میں کچھ کرنے کا شوق اور ولولہ پیدا ہوتا ہے ان کی عبادت وتقویٰ کے قصے پڑھ کر دل میں عبادت وتقویٰ کا جوش پیدا ہوتا ہے، غرض یہ کہ ان کی عملی زندگی میں جذب وانجذاب دونوں ہیں۔

اللّٰهم احسن اليهمَ وَاجزمهم احسنَ الجزاءِ وَاحشرنا مِعَهم
ربنا تقبل منا انکَ انتَ السَمِيع العليم ۝

خادم

مجیب اللہ ندوی

۱۸۔ جولائی ۱۹۸۹ء

مطابق

۱۱۔ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت امام ابو یوسفؒ

نام ونسب :

یعقوب نام۔ ابو یوسف کنیت تھی، سلسلۂ نسب انصار سے مل جاتا ہے اُن کے جدّ اعلیٰ سعد بن حتبہؓ صحابی تھے، غزوۂ احد میں شرکت کی اجازت چاہی، مگر کم سنی کی وجہ سے اجازت چاہی، مگر کم سنی کی وجہ سے اجازت نہیں ملی، دو سال بعد غزوہ خندق پیش آیا تو اس میں شرکت کا شرف حاصل کیا، اس غزوہ میں انہوں نے بڑی جانبازی دکھائی، دشمنوں سے برسرپیکار تھے کہ حضور انور ﷺ کی نگاہ مبارک ان پر پڑی۔ فرمایا کون ہو۔ بولے مجھے سعد بن حتبہؓ کہتے ہیں پھر قریب بلایا۔ اور سر پر دست شفقت پھیرا۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے دست شفقت پھیرنے کی برکت ہم ابتک محسوس کرتے ہیں[1]۔

ان کے والد ابراہیم ایک غریب آدمی تھے، اور کوفہ میں محنت مزدوری کر کے گذر اوقات کرتے تھے۔

سنہ ولادت :

امام ابو یوسفؒ کوفہ میں ۱۱۳ھ یا ۹۳ھ میں پیدا ہوئے[2]۔

---

[1] مناقب موفق۔ جلد ۲۔ ص ۲۰۹، ۲۱۰ [2] عام ارباب تذکرہ ان کا سنہ ولادت ۱۱۳ھ لکھتے ہیں لیکن ابو القاسم علی بن محمد السمعانی متوفی ۴۹۹ھ اور صاحب مسالک الابصار نے لکھا ہے۔ کہ ان کی وفات ۸۹ برس کی عمر میں ہوئی۔ اور وفات کے بارے میں سب متفق ہیں کہ ۱۸۲ھ میں ہوئی۔ اس اعتبار سے ان کا سنہ ولادت ۹۳ھ قرار پانا چاہئے۔ علامہ زاہد الکوثری نے امام ابو یوسف کے سوانح اور امام ذہبی کے رسائل کے حاشیہ میں یہ ثابت کیا ہے۔ کہ ۹۳ھ زیادہ قرین قیاس ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۳ میں ۹ کا سر امٹ کر ۱۳ رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ ۱۳ھ رہ گیا ظاہر ہے کہ ۱۳ھ میں تو ان کی ولادت قرار پا نہیں سکتی تھی۔ اس لئے ارباب رجال نے قیاساً ۱۱۳ھ سمجھ لیا، عاجز کے بقیہ حاشیہ ۴۹ خیال میں اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ امام ابو یوسف اور امام ابو حنیفہؒ جو شیخین کہا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس تغلیب میں عمر کا کوئی تناسب تو ہونا چاہئے، اگر ان کی عمر ۱۱۳ھ قرار دی جائے تو امام صاحب اور ان کی عمر میں ۳۳ برس کا تفاوت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اتنے تفاوت کے ساتھ دونوں کو شیخین کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

تعلیم کا آغاز اور معاشی تنگی :

ابتدائے عمر ہی سے ان کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، مگر ان کے والد اپنی غربت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ حصول معاش میں ان کا ہاتھ بٹائیں، اس وجہ سے ان کو بہت دنوں تک باقاعدہ تحصیل علم کا موقع نہ مل سکا[1] مگر ان کے ذوق علم نے ان کو اتنا اکسایا کہ اسی تنگی و ترشی میں اپنے والد کے چھپکے علمائے کوفہ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے کوفہ میں اس وقت فقہ و حدیث کی بہت سی مجلسیں برپا تھیں، جن میں محمد بن ابی لیلیٰؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی مجالس درس کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ خصوصیت سے پہلے ابن ابی لیلیٰ کی مجلس درس میں حاضر ہوئے، اور تقریباً ۸۔۹ برس تک ان سے کسب فیض کرتے رہے، اس کے بعد امام صاحب کی مجلس درس میں شریک ہونے لگے، اور ان کو یہ مجلس ایسی بھائی کہ پھر امام صاحب کی زندگی میں اس سے علیحدہ نہیں ہوئے۔

ان کے والد کو طلب علم کی طرف ان کی حد درجہ توجہ اور انہماک اور کسب معاش سے بے پروائی بہت گراں گذرتی تھی، چنانچہ ایک دن یہ امام صاحب کی مجلس میں شریک تھے، کہ ان کے والد پہنچے اور زبردستی ان کو اٹھا کر گھر کو آ گئے، اور سمجھا کہ ابوحنیفہ کھاتے پیتے آدمی ہیں، تم ان کی ریس کیوں کرتے ہو[2] والد کی تعمیل حکم میں کئی روز وہ امام صاحب کی مجلس میں نہیں گئے، تو امام صاحب نے دریافت کیا، امام ابو یوسف کو جب اس کی اطلاع ملی، تو وہ امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، امام صاحب نے آتے ہی پوچھا کہ اتنے دن سے درس میں کیوں نہیں آئے، بولے

الشغل بالمعاش و طاعة والدی

''کسب معاش کی مشغولیت اور والدہ کی اطاعت مانع رہی''۔

---

[1] آگے کے واقعات سے معلوم ہوگا کہ باقاعدہ طلب علم سے پہلے ہی ان کی شادی بھی ہو چکی تھی، اور وہ صاحب اولاد بھی ہو گئے تھے، ان کے بال بچوں کی معاشی ذمہ داری کی وجہ سے ان کے والد اور زیادہ ان کو حصول معاش پر مجبور کرتے تھے۔

[2] مناقب موفق اور تاریخ بغداد میں ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ان کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا، ان کی والدہ کے لئے کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا جب ذرہ ہوشیار ہوئے، تو ان کی والدہ نے ایک کھانے کی دوکان پر ان کو نوکر رکھوا دیا، لیکن یہ گھر سے روانہ ہوتے تو بجائے ملازمت پر جانے کے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور تعلیم میں مشغول رہتے، شام کو گھر واپس آکر والدہ سے اس کا تذکرہ نہ کرتے، ایک مہینہ کے بعد ان کی والدہ نے کہا کہ دکان دار نے تم کو نہ کچھ سکھایا اور نہ کام کا کچھ معاوضہ ہی دیا، یہ خاموش رہے، اس پر ان کی والدہ نے ان کا ہاتھ پکڑا، اور دکان دار کے پاس پہنچیں، اور اس سے کہا کہ تم نے اس بچہ کو نہ کچھ سکھایا، نہ اس کی محنت اور کارگذاری کا کچھ معاوضہ ہی دیا، اس نے کہا کہ یہ تو ایک مہینہ سے میرے پاس آئے ہی نہیں، جب راز فاش ہوا، تو والدہ ان پر بہت خفا ہوئیں اور ان کو درس سے روک دیا، چنانچہ وہ امام صاحب کی مجلس میں کئی روز نہیں گئے، انہوں نے ان کو بلایا، اور کچھ رقم دی، اور کہا تعلیم جاری رکھو، (مناقب موفق۔ جلد ۲۔ ص ۲۱۹)

یہ کہہ کر مجلس درس میں بیٹھ گئے، تھوڑی دیر کے بعد اٹھنا چاہا تو امام صاحب نے روکا۔ جب مجلس برخاست (ختم) ہوگئی تو امام صاحب نے چپکے سے ان کو ایک تھیلی دی اور فرمایا کہ اس سے اپنی ضروریات پوری کرو، ختم ہو جائے تو پھر کہنا، گھر پہنچ کر تھیلی کھولی تو سو درہم تھے، اس کے بعد وہ برابر درس میں شریک ہونے لگے، جب چند دن گذر جاتے تو دوبارہ امام صاحب ان کو کچھ رقم عنایت کر دیتے۔

امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ لحاظ کی وجہ سے میں کبھی اپنی ضرورت اور ان کی دی ہوئی رقم کے ختم ہونے کا تذکرہ نہیں کرتا تھا، مگر وہ خود ہی اس کو محسوس کر لیا کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے اس وقت تک مدد جاری رکھی جب تک میں بے نیاز نہیں ہوگیا[1]۔

ایک دوسری روایت ہے کہ امام صاحب سے ان کے والد نے کہا کہ میرا لڑکا یعقوب آپ کی مجلس درس میں شریک ہوتا ہے اور رات دن حصول علم میں مشغول رہتا ہے، میرے کئی بچے ہیں اور پھر یہ بھی اللہ کے فضل سے میری طرح صاحب اہل وعیال ہے ان سے کہیئے کہ یہ دن کو آپ کے درس میں شریک ہوں اور اس کے بعد جو وقت بچے اس میں اپنے اہل وعیال کی کفالت کا سامان کریں۔

ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے ممکن ہے کہ ان کے والد کی گفتگو کے بعد ہی امام صاحب نے ان کی مدد شروع کردی ہوتا کہ حصول معاش میں ان کو دقت اٹھانی نہ پڑے اور ان کا وقت برباد نہ ہو۔

امام صاحب کی خدمت میں آمد کی وجہ :

امام ابو یوسف کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے بارے میں کوئی تفصیل کتابوں میں نہیں ملتی، اوپر کی روایات سے اتنا تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا اس میں ان کی ذاتی ذوق وشوق کے ساتھ امام صاحب کی مالی امداد اور تکفل کو بھی دخل رہا ہے ورنہ ان کے والدین کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ تعلیم کے لئے وقت نکال سکتے۔

اوپر یہ ذکر بھی آچکا ہے کہ امام ادب یوسف سب سے پہلے امام محمد بن ابی لیلیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کسب فیض شروع کیا مگر کئی برس کے بعد پھر وہ امام صاحب کی خدمت میں

---

[1] ان کے والد کے بارے میں جو روایتیں مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک زندہ رہے جب تک کہ امام ابو یوسف صاحب عیال نہیں ہو گئے مگر اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کو یتیم چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے مگر اس واقعہ میں بہت سی ایسی باتیں مذکور ہیں جن کی حیثیت قصہ کہانی سے زیادہ نہیں ہے۔ امام ذہبی نے اس روایت کو "حکی" کے لفظ سے بیان کر کے کمزور کر دیا۔ (ترجمہ ابی یوسف، مناقب موفق جلد ۲۔ ص ۲۱۴)

آنے جانے اوران کے درس میں شریک ہونے لگے۔امام ابو یوسفؒ نے ابن ابی لیلیٰ کی مجلس درس کو چھوڑ کر کیوں امام صاحب کی صحبت اختیار کی اس بارے میں ارباب تذکر بہت سی باتیں لکھتے ہیں مگر ان میں بعض باتیں بالکل بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں اس لئے ہم ان کی قدرے تفصیل کرتے ہیں۔

ان کے پہلے اُستاذ محمد بن ابی لیلیٰ ممتاز تابعی عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے صاحبزادے اور خود ممتاز تبع تابعین میں تھے، اُموی اور عباسی دونوں دوروں میں برسوں قاضی رہ چکے تھے اس لئے ان کے علم اور تجربہ دونوں وسیع تھا۔امام ابو یوسفؒ نے ان سے علمی اور عملی دونوں طرح سے فیض اُٹھایا تھا، لیکن اس زمانہ میں کوئی طالب علم وہ بھی فقہ کا امام اعظم کی مجلس درس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ابن ابی لیلیٰؒ باوجود اپنے ذاتی فضل وکمال اور علمی منزلت کے جب کوئی مشکل مسئلہ آتا تو سب سے پہلے امام صاحب کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس سے مجھ کو خیال پیدا ہوا کہ امام صاحب کے درس میں بھی ضرور شریک ہونا چاہئے مگر استاذ کا احترام ولحاظ اس میں مانع تھا، اس وجہ سے میری ہمت وہاں جانے کی نہیں پڑتی تھی لیکن بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ محمد بن ابی لیلیٰ کی مجلس سے منقطع ہو کر وہ ہمیشہ کے لئے امام صاحب کی مجلس سے وابستہ ہو گئے۔

اہل تذکرہ نے اس سلسلہ میں متعدد ایسے واقعات لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ اوران کے شیخ میں بعض مسائل میں اختلاف پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں انہوں نے ان کی مجلس درس چھوڑ دی اور امام اعظم کی مجلس درس میں آکر زانو سے تلمذ تہ کرنے لگے لیکن عاجز کے نزدیک متعدد وجوہ کی بناء پر یہ بات کلیۃً صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

۱۔　ایک یہ کہ اگر امام ابو یوسف کو اپنے استاد سے ایک یا متعدد مسائل میں اختلاف ہو گیا تھا تو یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ ان کی مجلس درس چھوڑ دیتے، کیا بعد میں خود امام ابو یوسفؒ نے امام صاحب سے متعدد امور ومسائل میں اختلاف نہیں کیا تھا اس لئے نفس اختلاف مسائل کو ترک درس کا سبب قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

۲۔　دوسری۔۔۔۔۔۔ یہ کہ اگر قاضی محمد بن ابی لیلیٰؒ سے اختلاف مسائل کی وجہ سے ان کو تنفر پیدا ہو گیا ہوتا اور اسی بنا پر ان کی مجلس درس چھوڑ بیٹھے ہوتے تو امام اعظم کی درسگاہ سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ خود مسند درس وقضا پر بیٹھے تو اپنے تلامذہ کے سامنے امام صاحب اور ابن ابی لیلیٰ کے اختلافی مسائل کو مساویانہ طور پر بیان نہ کرتے بلکہ ہر مسئلہ پر ابن ابی لیلیٰؒ پر نکیر کرتے لیکن انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

ایسے تمام مختلف فیہ مسائل کو امام محمدؒ نے ایک کتاب میں ''اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ'' میں...... جمع کر دیا ہے جو حیدرآباد میں چھپ گئی ہے اس کے دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے دل میں اپنے دونوں اساتذہ کا احترام آخر وقت تک باقی تھا۔

۳۔　تیسری۔۔۔۔۔یہ کہ امام سرخسی نے مبسوط کے آخر میں جہاں امام صاحب اور قاضی ابن ابی لیلیٰ کے اختلافی مسائل کا ذکر کیا ہے وہاں امام ابو یوسفؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ کے اسباب اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ نے ۹ برس ابن ابی لیلیٰؒ کی خدمت میں تعلیم حاصل کیا پھر اتنی ہی مدت امام صاحب کی خدمت میں رہے۔ (جلد ۳۰، ص ۱۲۸) اس کے بعد قیل (کہا گیا ہے) کے لفظ سے مذکورہ بالا سبب کا ذکر کیا ہے جو بعض لوگوں کے نزدیک استاد و شاگرد کے درمیان کشیدگی کا باعث ہوا مگر قیل کے لفظ سے اس واقعہ کا ذکر کرنا بجائے خود اس کے ضعف کو ظاہر کرتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ علوم دینیہ کے جمع و تدوین کا ابتدائی زمانہ تھا جو سینکڑوں اور ہزاروں اہل علم کے سینوں اور سفینوں میں منتشر تھے اس لئے اس وقت کا یہ دستور تھا کہ طلبہ زیادہ سے زیادہ اہل علم واصحاب درس کے پاس جا کر استفادہ کرتے تھے تا کہ ان منتشر اجزا کو وہ اپنے اپنے سینہ و سفینہ میں جمع کر سکیں، چنانچہ اس دور کا کوئی ایسا ممتاز اہل علم نہیں ملے گا جس کے سینکڑوں کی تعداد میں شیوخ نہ رہے ہوں اس لئے امام ابو یوسف جیسے طباع اور ذہین طالب علم صرف ایک استاد پر کیسے قناعت کر سکتے تھے، انہوں نے بھی دستور زمانہ کے مطابق مختلف شیوخ واساتذہ کی خدمت میں جا کر زانوے ادب تہ کیا ہوگا اور ازدیاد علم کا یہ شوق ان کو ابن لیلیٰ کی مجلس درس سے اُٹھا کر امام صاحب کی مجلس درس میں لایا ہوگا۔

اس لئے ایک شیخ کے یہاں سے دوسرے شیخ کے پاس جانے کی وجہ خواہ مخواہ کی ناراضگی ہی قرار دینا صحیح نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ امام صاحب اور ابن ابی لیلیٰ میں بعض فقہی مسائل میں اختلاف تھا اس لئے ابتداً خود امام ابو یوسف کو امام صاحب کی مجلس درس میں جانے میں تامل تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو اس سے تکلیف ہو مگر قاضی ابن ابی لیلیٰؒ سے کہیں یہ ثابت نہیں ہے کہ خود انہوں نے اس سے اپنے شاگرد کو روکا ہو۔

پھر امام صاحبؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ کا اختلاف نفسانیت پر مبنی نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے استفادہ میں مانع ہوتے۔ چنانچہ ابن ابی لیلیٰ کے بارے میں خود امام ابو یوسف کا بیان ہے کہ مشکل مسائل میں اعلانیہ امام صاحب کی رائے دریافت کرتے تھے[1]۔

---

[1] مناقب مکی جلد ۲۔ ص ۲۱۳

تحصیل علم کی مدت :

امام ابو یوسفؒ کی تحصیل علم یا استفادہ کی کل مدت کتنی ہے، تذکرہ نویسوں کی روایتیں اس کے بارے میں مختلف ہیں۔ یوسف بن ابی سعد نے خود امام ابو یوسفؒ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں میری آمد و رفت مسلسل ۹ برس رہی[1]۔ دوسری روایت ہے کہ سترہ برس ان کی صحبت میں رہا[2]۔ تیسری روایت امام سرخسی کی ہے جو اوپر نقل ہوئی ہے کہ ۹ برس ابن ابی لیلیٰ کی خدمت میں اور ۹ برس امام ابو حنیفہؒ کی مجلس درس میں رہے[3]۔

بظاہر ان میں دو روایتیں قابلِ تقسیم نہیں معلوم ہوتیں اگر پہلی روایت تسلیم کی جائے تو ان کی تعلیم کا زمانہ کم سے کم ۳۸ برس قرار پائے گا، ۹ برس ابن ابی لیلیٰ کی خدمت میں اور ۲۹ برس امام صاحب کی صحبت میں۔ دوسری روایت پر اعتبار کیا جائے تو مدت تعلیم ۲۶ برس ہوتی ہے اس میں اگر دوسرے شیوخ سے استفادہ کی مدت بھی شامل کر لی جائے تو معلوم نہیں یہ مدت کہاں سے کہاں پہنچ جائے اس لئے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اتنی طویل مدت صرف حصولِ تعلیم پر صرف کی ہوگی۔ امام سرخسی نے جو مدت بتائی ہے یعنی ۱۸ برس وہ بھی امام ابو یوسفؒ جیسے قوی الحافظہ، ذہین، طباع اور غیر معمولی فہیم طالب علم کے لئے گو بہت ہے تاہم اس کی صحت پر یقین کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ روایتیں اس وقت اور کمزور ہو جاتی ہیں جب کہ ان کا سنہ ولادت بھی تذکرہ نگار ۱۱۳ھ قرار دیتے ہیں اس لئے کہ امام ابو حنیفہؒ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے امام ابو یوسفؒ کی عمر ان کی وفات کے وقت صرف ۳۷ برس کی تھی جو پہلی روایت کے مطابق ان کی مدت تعلیم سے بھی کم ہے۔

ان روایتوں میں اس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے کہ پہلی روایت میں امام ابو یوسفؒ نے وہ عمر بتائی جو جس میں وہ امام صاحب کی خدمت میں گئے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو ان کی عمر کافی تھی اور صاحبِ اہل و عیال بھی تھے، جیسا کہ ان کے والد کے واقعہ میں ذکر آ چکا ہے۔ دوسری روایت میں انہوں نے پوری مدت تعلیم بتائی ہو اور تیسری روایت میں صرف امام صاحب کے ساتھ اپنی رفاقت کا زمانہ بتایا ہو، جس کو رواۃ نے باہم غلط کر دیا ہو، ان روایتوں سے بہر حال اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور طویل زمانہ ابن ابی لیلیٰ اور امام صاحبؒ کی خدمت و صحبت میں گزارا۔

۱؎ حسن التقاضی　　۲؎ ایضاً بحوالہ کروری　　۳؎ مبسوط جلد ۳۰ ص ۱۲۸

علمِ دین سے شغف :

اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام ابو یوسفؒ نہایت ہی غریب اور عسیر الحال باپ کے فرزند تھے اس لئے بچپن ہی میں حصول معاش کا سوال ان کے لئے پیدا ہوگیا تھا مگر ان کو طبعاً علم دین سے اتنا شغف اور ذوق تھا کہ معاش کی تنگی اور عسرت کی زندگی ان کی تحصیلِ علم کی راہ میں مانع نہ ہوسکی۔ اور اگر کبھی مانع ہوئی اور وہ مجبوراً کسبِ معاش کی طرف مائل ہوئے بھی تو ان کے مشفق استاد نے ضرورت پوری کر کے مانع کو دور کردیا۔

ان کے ذوق وشغف کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ یوسف بن سعید کا بیان ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے ایک مدت تک امام صاحب کی خدمت میں آمد ورفت کا سلسلہ جاری رکھا مگر اس طویل مدت میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جس میں وہ فجر کی نماز میں ان کے ساتھ شریک نہ رہے ہوں۔

امام ابو یوسفؒ کا خود بیان ہے کہ میں برسوں امام صاحب کی رفاقت میں رہا مگر بجز بیماری کے عید الفطر وعید الضحیٰ کے دن میں ان سے جدا نہیں ہوا[1]۔ غور کیجئے کہ ان دونوں کی خوشی ومسرت میں ہر شخص اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوتا ہے لیکن انہوں نے مجلس علم کی شرکت اور امام صاحب کی معیت ورفاقت کو عیدین کی خوشی ومسرت پر ترجیح دی۔

مناقب موفق میں ہے امام ابو یوسفؒ کے کسی بچہ کا انتقال ہوگیا مگر وہ اس کے جنازہ اور تدفین میں اس لئے شریک نہ ہوسکے کہ مبادا امام صاحب کے درس واملا کا کوئی حصہ چھوٹ نہ جائے۔ خود فرماتے ہیں :

> مَاتَ ابْن لِی فَلَمَ احضر جهازه ولا دفنه و تركته علىٰ جيرانی واقربائی مخافة ان يفوتنی من ابی حنيفة شيئی ولا تزهب حسرته عنی . (جلد ۲ . ص ۲۱۵)

''میرے ایک بچہ کا انتقال ہوگیا لیکن میں اس کی تجہیز وتدفین میں شریک نہیں ہوا اس کو اپنے پڑوسیوں اور عزیزوں کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امام ابوحنیفہ کے درس کا کوئی حصہ چھوٹ جائے اور مجھے اس کی حسرت رہ جائے''۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کو علم دین سے کتنا ذوق اور شغف تھا اور امام صاحب کی مجلس درس کی ان کی نگاہ میں کیا قدر وقیمت تھی۔

---

[1] حسن التقاضی

اس واقعہ سے اس عہد کی اسلامی معاشرت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس زمانہ میں ہمدردی، مواسات اور اخوت اس درجہ عام تھی کہ امام ابو یوسف نے اپنے لختِ جگر کے جنازہ اور تدفین میں اس لئے شرکت ضروری نہیں سمجھی کہ وہ گر نہ بھی شریک ہوں گے تو ان کے اعزہ، اقربا اور پڑوسی اس کام کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر پورا کردیں گے۔

مناقب کردری میں یہ بھی ہے کہ امام ابو یوسفؒ اپنے والد کے جنازہ میں بھی امام صاحبؒ کی مجلس درس کے چھوٹ جانے کے خیال سے شریک نہیں ہو سکے تھے ممکن ہے دونوں واقعے ایک ہی ہوں اور راویوں نے دو کردیا ہو۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ تنگی و عسرت کی وجہ سے ان کے والد ایک بار ان کو درس سے اٹھا لے گئے تھے۔ احمد بن مکی کے بیان کے مطابق درس سے اٹھا لے جانے کا واقعہ ایک ہی بار پیش نہیں آیا بلکہ بسا اوقات ایک ہی دن میں کئی کئی بار پیش آتا تھا، پورا واقعہ یہ ہے۔

عبدالحمید الحمانی کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف کے والد امام ابو حنیفہؒ کی مجلس درس میں آتے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لے جاتے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے والد کی نظر بچا کر پھر آجاتے، ان کے والد پھر آتے اور انہیں واپس لے جاتے، یہاں تک کہ ایک دن ان کے والد بہت غصہ میں مجلس میں آئے اور اپنے صاحبزادہ کو بہت سخت و سست کہا اور اہلِ مجلس سے مخاطب ہو کر کہا:

یعصنی ھذا الوالد انتم تعینو نہ[1]

''میرا لڑکا بار بار میری حکم عدولی کرتا ہے اور تم لوگ اس کی مدد کرتے ہو''۔

امام صاحب نے ان سے فرمایا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، بولے یہ بازار جا کر کچھ کمائیں اور اہل وعیال کی پرورش میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ امام صاحب نے فرمایا انشاء اللہ اس کارِ خیر میں ہم ان کی مدد کریں گے لیکن انہوں نے اس کو کچھ پسند نہیں کیا، بالآخر امام صاحب نے ذرا تلخ لہجہ میں فرمایا کہ اگر آپ ان کو تعلیم سے روکنا چاہتے ہیں تو اس میں آپ کی قطعی مدد نہیں کی جاسکتی، ہاں کفاف کے سلسلہ میں ہم ان کی مدد کے لئے تیار ہیں آپ براہ کرم واپس جایئے[2] اور اس مقدس کام سے نہ روکیے۔

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ علم دین سے ان کو جو شغف وانہماک تھا اس کی شکایت محض ان کے والدین ہی کو نہیں تھی بلکہ ان کی اہلیہ کو بھی تھی، فرماتی ہیں کہ وہ دن بھر تو امام صاحب کی خدمت میں رہتے تھے اور رات کو گھر آتے تھے اور کبھی کبھی رات کو بھی وہیں رہ جاتے تھے اور کئی کئی دن

۱؎ مناقب کردری۔ جلد ۲۔ ص ۲۱۵ ۲؎ ایضاً

گھر نہیں آتے تھے۔ایک دن یہ امام ابو یوسفؒ کی شکایت لے کر امام صاحب کی خدمت پہنچیں اور عرض کی کہ یہ آپ کے شاگرد ہمارے نان ونفقہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے ،صرف پڑھنے پڑھانے ہی میں لگے رہتے ہیں امام صاحبؒ نے ان کو سمجھایا اور صبر کی تلقین کی اور فرمایا کہ یہ عسرت اور تنگ دستی کے دن انشاء اللہ جلد ختم ہو جائیں گے اور تم لوگ ان سے جو توقع رکھتے اس سے زیادہ تم کو ملے گا[۱]۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ حصول علم دین کی راہ میں ان کے لئے کتنے مواقع تھے، جن کو کچھ تو ان کے طبعی ذوق وشوق نے دور کرلیا اور کچھ امام صاحب کی نظر التفات اور مالی مدد نے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر امام صاحب کی نظر التفات نہ ہوتی تو وہ بہت دنوں تک ان موانع کی تاب نہ لاسکتے ،اور علم دین سے محروم رہ جاتے۔

دوسرے شیوخ حدیث سے استفادہ :

قاضی ابن ابی لیلیٰ کے تلمذ اور امام صاحب جیسے فقیہ ومجتہد کی خدمت ورفاقت میں رہنے کے بعد کسی دوسرے صاحبِ کمال کے سامنے ان کو زانوے تلمذ تہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی ،، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

ماکان فی الدنیا مجلس احب الی من مجلس ابی حنیفه و ابن ابی لیلیٰ فانی مارایت فقیها افقه من ابی حنیفة و لا قاضیا خیر امن ابی لیلیٰ [۲]۔

’’مجھے دنیا میں کوئی مجلس درس امام ابوحنیفہ ؒ اور ابن لیلیٰ کی مجلس درس سے زیادہ محبوب نہیں ہے، اس لئے کہ نہ تو میں نے امام ابوحنیفہؒ جیسا بہتر فقیہ دیکھا اور نہ ابن ابی لیلیٰؒ جیسا قاضی‘‘۔

لیکن ہر استاد فن کی کچھ نہ کچھ خصوصیت ہوتی ہے،اس لئے متقدمین میں عام دستور تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اساتذہ فن کی خدمت میں حاضر ہو کہ ان سے کسب فیض کرتے تھے۔چنانچہ امام ابو یوسفؒ بھی بے شمار شیوخ حدیث وفقہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے چشمہ علم سے اپنی تشنگی (پیاس) بجھائی۔

امام ابو یوسفؒ نے جن شیوخ اور اساتذہ فقہ وحدیث سے استفادہ وروایت کی ہے ان کی تعداد سو سے متجاوز ہے، ہم ان میں سے ان چند مشاہیر کا نام یہاں درج کرتے ہیں۔جن کی روائتیں کتاب الخراج میں موجود ہیں۔

---

[۱] مناقب کردی۔جلد۲۔ص ۲۱۵ [۲] ایضاً

(۱) ابان بن عباس (۲) ابواسحاق الشیبانی (۳) اسرائیل بن ابی اسحاق (۴) اسمٰعیل بن ابراہیم المہاجر (۵) اسمٰعیل بن ابی خالد (۶) اسمٰعیل بن علیہ (۷) اسمٰعیل بن مسلم (۸) ایوب بن عتبہ (۹) ابوبکر بن عبداللہ الہذلی (۱۰) ثابت ابوحمزہ الشمالی (ترمذی کے رواۃ میں ہیں) (۱۱) ابن جریج (۱۲) حجاج بن ارطاۃ (۱۳) جریر بن عثمان (۱۴) حسن بن دینار (۱۵) حسن بن علی بن عمارہ (۱۶) حصین بن عمرو بن میمون (۱۷) حنظلہ بن ابی سفیان (۱۸) روح ابن مسافر (۱۹) سعید بن عروبہ (۲۰) سعید بن مرزبان (۲۱) سعید بن مسلم (۲۲) سفیان بن عیینہ (۲۳) سلیمان التیمی (۲۴) سلیمان بن مہران الاعمش (۲۵) سماک بن حرب (۲۶) طلحہ بن یحیٰی (۲۷) طارق بن عبدالرحمٰن (۲۸) عاصم الاحول (۲۹) عبداللہ بن سعید المقبری (۳۰) عبداللہ بن علی (۳۱) عبید بن عمر (۳۲) عبداللہ بن عمر (۳۳) عبداللہ بن محرر (۳۳) عبداللہ بن واقد (۳۴) عبداللہ بن ابولید المدنی (۳۵) عمرو بن دینار (۳۶) عمرو بن میمون بن مہران (۳۷) غیلان بن قیس الہمدانی (۳۸) الفضل بن مرزوق (۳۹) قیس بن الربیع (۴۰) قیس بن مسلم (۴۱) لیث بن سعید (۴۲) امام مالک بن انس (۴۳) مالک بن مغول (۴۴) محمد بن اسحاق صاحب (۴۵) المغازی (۴۶) محمد بن ابی حمید (۴۷) محمد بن السائب الکلبی (۴۸) محمد بن سالم (۴۹) محمد بن طلحہ (۵۰) محمد بن عبداللہ (۵۱) محمد بن عمرو بن علقمہ (۵۲) مسعر بن کدام (۵۳) مسلم الخزاعی (۵۴) مطرف ابن طریف (۵۵) بومعشر (۵۶) مغیر بن مقسم (۵۷) نافع مولی بن عمر (۵۸) نصر بن طریف (۵۹) ابن ابی نجیح (۶۰) ہشام بن عروہ (۶۱) ہشام بن سعید۔

اس فہرست میں بعض ممتاز تابعین کا نام بھی نظر آئے گا، اس میں ان شیوخ حدیث وفقہ کے نام بھی ہیں جن کو حدیث وفقہ میں امامت کا مقام حاصل تھا، علامہ زاہد الکوثری نے ان کے ۱۰۴ شیوخ کا تذکرہ کیا ہے، علاوہ بریں ان کی کتاب الخراج میں متعدد جگہ پر ''غیر واحد من علماء اہل المدینہ'' وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ میں ان کے شیوخ بکثرت تھے، حالانکہ اس فہرست میں صرف چند نام آئے ہیں۔

امام مالکؒ سے ملاقات :

امام ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ ہم عصر تھے، اور دونوں درجہ اجتہاد پر فائز تھے، اس لئے ان دونوں میں بعض اجتہادی مسائل میں اختلاف تھا، جن کے بارے میں بالمشافہ گفتگو بھی ہوئی، اور امام

ابو یوسفؒ نے باوجود معاصرت کے بعض مسائل میں امام مالکؒ کے رائے کو ترجیح دی، یہ اختلاف بعض ان فرعی مسائل میں تھا، جن کا تعلق تمدن، معاشرت اور معاملات سے تھا، مثلاً اس وقت تمام اسلامی ملکوں میں غلہ وغیرہ کے وزن کرنے کے لئے صاع، مد، اور رطل وغیرہ رائج تھے، مگر ان کا وزن ہر ملک میں مختلف تھا، اور ہر جگہ کے علماء اپنے یہاں کے پیمانوں کو صحیح سمجھتے تھے، اور ان ہی سے عشرہ صدقہ فطرہ، وغیرہ میں کام لینے کی ہدایت کرتے تھے، امام ابو یوسف" کوفہ کے رہنے والے تھے، اس لئے وہ کوفی پیمانہ کو صحیح سمجھتے تھے، مگر جب وہ امام مالکؒ سے ملے، تو انہوں نے ان کو مدنی صاع دکھایا، اور فرمایا کہ یہی رسول اللہ کا صاع ہے، اس کے بعد سے امام ابو یوسفؒ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا[1]۔

مؤطاے امام مالک کی تدوین کے وقت حدیث و آثار کا کوئی دوسرا جامع مجموعہ نہیں تھا، اس لئے اس عہد میں اس کی روایت و سماع سب سے زیادہ قابل فخر چیز سمجھی جاتی تھی، جن کو یہ فخر نصیب نہیں ہوتا تھا۔ ان کا بڑا نقص تصور کیا جاتا تھا۔ امام یوسفؒ نے مؤطا کا سماع براہ راست امام مالکؒ سے نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے مشہور اور جلیل القدر شاگرد اسد بن فرات صقلی سے کیا تھا، اسی بنا پر امام محمدؒ ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ امام ابو یوسفؒ نے علم حدیث کی صرف مہک پائی ہے[2]۔ یعنی انہوں نے تو امام مالک" کی خدمت میں رہ کر موطا کا سماع کیا تھا، اور امام ابو یوسف" کو یہ شرف حاصل نہیں تھا[3]۔

محمد اسحاق صاحب المغازیؒ، اور امام ابو یوسفؒ:

جس زمانہ میں امام ابو یوسفؒ امام صاحب کے حلقہ درس میں بیٹھ کر اکتساب فیض کر رہے تھے، اسی زمانہ میں محمد بن اسحاق کوفہ آئے، جو سیر و مغازی کے امام سمجھے جاتے تھے، ان کی علمی شہرت اور کشش امام ابو یوسف" کو ان کے حلقہ درس میں کھینچ لائی، ان کے ساتھ ان کے کئی رفقاء بھی تھے، جنہوں نے کتاب المغازی کے سماع کی خواہش ظاہر کی، اور وہ تیار ہو گئے، امام ابو یوسف" کا بیان ہے کہ میں کئی مہینہ تک سماع میں مشغول رہا، اور امام صاحب" کے حلقہ درس اور خدمت میں نہ جا سکا،

---

[1] اس روایت کے بارے میں زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ رجوع کا ذکر صحیح نہیں ہے اور پھر انہوں نے اس روایت کو نا قابل اعتبار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر یہ ان کی شدت پسندی ہے، جس کا وہ ہر مسئلہ میں اظہار کرتے ہیں، اس سے امام ابو یوسف کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ [2] حسن التقاضی۔ ص ۴۰

[3] امام ابو یوسف کا علم حدیث و آثار میں اتنا وسیع تھا، کہ ان کو براہ راست سماع کی ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ اس کا مطالعہ ان کے لئے کافی تھا، اور امام محمد کا مطالعہ چونکہ حدیث و آثار میں امام مالک کی خدمت میں وسیع ہوا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کی ضرورت محسوس کی ہوگی، اسی بنا پر انہوں نے امام ابو یوسفؒ کے بارے میں یہ رائے دی، مگر امام ابو یوسفؒ نے علمی یادگاریں چھوڑی ہیں، ان کے دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ان کو علم حدیث میں درک نہیں تھا۔

جب پوری کتاب ختم ہوگئی، تو امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، امام صاحب نے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی، تو کہا کہ میں محمد بن اسحاق سے ان کی کتاب المغازی کا سماع کر رہا تھا، اس لئے حاضر نہ ہوسکا، یہ سن کر امام صاحب نے محمد بن اسحاق کے علم وروایت پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا، مگر امام ابو یوسفؒ نے کمال ادب کے ساتھ اپنے شفیق ومہربان استاد کے سامنے صاحب مغازی کے علم وفضل کا اعتراف کیا[1]۔

حلقۂ درس :

اتنے ائمہ روزگار وشیوخ زمانہ سے استفادہ وحصول تعلیم کے بعد ان کو اپنا علیحدہ حلقۂ درس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور قائم بھی کرلیا مگر اس کی اطلاع امام صاحب کو نہیں دی، امام صاحب کو معلوم ہوا تو اپنے کسی شاگرد کے ذریعہ چند مسائل دریافت کرائے، جن کے جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا، اور اسی وقت اس کی تردید کی، اب امام ابو یوسف کو احساس ہوا، کہ انہوں نے قبل از وقت حلقۂ درس قائم کردیا، چنانچہ وہ امام صاحب کی خدمت میں آئے، اور اپنی اس تقصیر کا اعتراف کیا، امام صاحب نے فرمایا۔

تزبیت قبل اَن تحصرم[2]۔

''تم انگور ہونے سے پہلے ہی منقی بن گئے (یعنی پختہ کار ہونے سے پہلے ہی درس وتدریس کا کام شروع کردیا)''۔

اس سلسلہ کی ایک روایت یہ ہے کہ ایک بار وہ بیمار پڑے، امام صاحب ان کی عیادت کے لئے گئے، مزاج پرسی کے بعد امام صاحب نے فرمایا، کہ مجھ کو تم سے بڑی توقعات ہیں اور تم مسلمانوں

---

[1] مناقب۔ جلد ۲۔ ص ۲۳۲ اس روایت کو ابن خلکان نے بھی نقل کیا ہے، مگر اس میں یہ اضافہ ہے، کہ امام ابو یوسف نے امام صاحب کے جواب میں بے دھڑک کہا، کہ آپ بھی تو علم کے مدعی ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ غزوہ بدر پہلے ہوا ہے، یا غزوہ احد ظاہر ہے کہ یہ روایت کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی، جس کی مجلس درس امام ابو یوسف کے نزدیک سب سے زیادہ پرکشش اور محبوب ہو، اور جہاں انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور طویل حصہ گذارا ہو، اس کے سامنے امام ابو یوسفؒ یہ جسارت نہیں کرسکتے تھے، پھر امام محمد کی کتاب السیر الصغیر جس کو امام صاحب نے املا کرایا تھا، اس کے دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے، کہ امام صاحب خدانخواستہ مغازی وسیر سے ناواقف تھے، پھر امام ابو حنیفہ نے سیر ومغازی کی تکمیل امام شعبی سے کی تھی، جو اپنے زمانہ میں سیر ومغازی کے امام سمجھے جاتے تھے، جن کی وسعت علم اور تجر میں کسی کو کلام نہیں ہے، یہ ضروری ہے، کہ جس طرح امام صاحب نے قرآن وحدیث وفقہ کو اپنا خاص فن بنالیا تھا، اسی طرح ان کو اس فن کی طرف خاص توجہ کرنے کا موقع نہ مل سکا، ورنہ کون کہہ سکتا ہے، کہ وہ اس سے عاری تھے۔ اس روایت کا راوی معافی البحریری ہے جس کو ائمہ رجال نے ضعیف اور ناقابل اعتبار ٹھرایا ہے۔ (تاریخ بغداد تہذیب اور حسن التقاضی۔ ص ۴۰)

[2] حسن التقاضی

کے لئے بہت مفید ہو سکتے ہو[1]۔ جب امام ابو یوسف اچھے ہوئے تو ان کو اپنا الگ حلقہ درس قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا، جو عمل میں بھی آ گیا، مگر اس کے بعد بھی، امام صاحب کی مجلس درس میں آمد و رفت قائم رہی ایک بار آئے، تو کوئی دقیق مسلہ امام صاحب سے دریافت کیا، جس کو سن کر امام صاحب کو بڑا تعجب ہوا، فرمایا! سبحان اللہ ایک شخص جو اپنا الگ حلقہ قائم کرتا ہے، خدا کے دین پر گفتگو کرتا ہے، تلاندہ کی ایک بڑی تعداد کو خطاب کرتا اور درس دیتا ہے، وہ اجارہ کا ایک مسلہ اچھی طرح نہیں جانتا، پھر آپ نے بطور نصیحت فرمایا:

من ظن انه یستغنی عن التعلم لیبک علی نفسه[2]۔

"جو گمان کرتا ہے، کہ وہ حصول تعلیم سے مستغنی ہو گیا ہے اس کو اپنے اوپر رونا چاہئے"۔

غالباً یہ واقعہ اس وقت کا ہوگا، جب ابھی امام ابو یوسف کا علم پختہ نہیں ہوا تھا، اور ان میں میں مجتہدانہ شان نہیں پیدا ہوئی تھی، ایسا بہت ہوتا ہے کہ لوگ جلدی ہی اپنے کو استفادہ و تحصیل سے مستغنی سمجھنے لگتے ہیں، اور درس و افادہ شروع کر دیتے ہیں، خود امام اعظم ؒ نے اپنی فطری ذہانت و جودت طبع کی بنا پر اپنے اُستاد حماد بن سلیمان سے اپنے کو بے نیاز سمجھ لیا تھا، مگر فوراً ہی ان کو اس پر تنبہ ہو گیا، ور پھر آخر عمر تک ان کا دامن فیض نہیں چھوڑا امام صاحب کو امام ابو یوسفؒ سے خاص تعلق تھا، اور جس بڑے کام کے لئے وہ ان کو تیار کر رہے تھے، اس کے لائق ابھی نہیں ہوئے تھے، اس لئے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ افادہ و استفادہ کا سلسلہ باہم ابھی کچھ دنوں اور قائم رہے، تاکہ وہ پورے طور پر اس کام کی ذمہ داریوں کے سنبھالنے کے قابل ہو جائیں، ان میں یہی احساس پیدا کرنے کے لئے ان کے سامنے امام اعظمؒ نے ایسے مسائل پیش کئے، جن میں ان کو اپنے قصور علم اور نارسائی ذہن کا احساس ہوا اور نہ امام صاحب تو خود اُن کی برابر ہمت افزائی فرماتے اور ان میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، ایک بار امام زفرؒ اور ان میں کسی مسلہ میں مباحثہ ہو گیا، جب کئی گھنٹے گذر گئے، اور بحث جاری رہی تو امام صاحب نے امام زفرؒ سے فرمایا کہ علمی ریاست اور سیادت ابو یوسف کا حصہ ہے، تم اس کو لینے کی کوشش نہ کرو۔

اس کی مجلس درس کا کوئی ذکر تذکروں میں نہیں ملتا، لیکن ان کے تلاندہ اور مستفیدین کی کثرت تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے چاہے کوئی باقاعدہ مجلس درس نہ قائم کی ہو، لیکن تشنگان علم ان کے چشمہ علم سے سیراب ضرور ہوتے رہتے تھے، اور یہ سلسلہ تقریباً سولہ برس یعنی ۱۵۰ھ سے

---

[1] مناقب کردی۔　　[2] ایضاً

۱۶۶ھ تک جاری رہا، ۱۶۶ھ میں وہ عہدہ قضا پر مامور کردیئے گئے، اور تقریباً ۱۷ برس تک یہ خدمت انہوں نے انجام دی، گو قضاء کے زمانہ میں بھی درس وافادہ کا سلسلہ جاری تھا، اور مستفیدین برابر فائدہ اُٹھاتے رہے مگر ظاہر ہے کہ اس عہدہ کی مشغولیتوں کی وجہ سے درس کی طرف پہلی جیسی یکسوئی تو باقی نہیں رہ سکتی، چنانچہ ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ دن میں تو ان کو بالکل فرصت نہیں ملتی تھی، البتہ رات میں اس کے لئے وقت نکال لیتے تھے، اور درس دیتے تھے، ہارون سے کچھ لوگوں نے شکایت کی تو پہلے تو اس نے ان کے علم وتقویٰ کی تعریف کی، اس کے بعد کہا کہ۔

یقعد للناس ولیس معه کتاب ولا شینی درسه باللیل مع مشغله فی اعمالنا .

''عہدہ قضا۔۔۔۔۔کی مشغولیت کی وجہ سے رات کو لوگوں کو درس دینے کے لئے بیٹھتے ہیں اور ان کے علم کے استحضار کا حال یہ ہے کہ ان کے ہاتھ میں نہ کوئی کتاب ہوتی ہے اور نہ کوئی چیز لکھی ہوئی ہوتی ہے''۔

امام صاحبؒ کے درس کی خصوصیات امام ابو یوسفؒ کے درس ہیں :

امام صاحب اپنے معاصرین سے جہاں بہت سی چیزوں میں ممتاز تھے، وہاں ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ طلبہ کے ساتھ نہایت خیر خواہی اور حسن سلوک کیساتھ پیش آتے تھے۔ ان کی تعلیم میں نہ بخل سے کام لیتے تھے، نہ تضیع اوقات کرتے تھے، بلکہ کوشش کرتے تھے کہ وہ اپنے فن میں بڑی سے بڑی شان امتیاز حاصل کرلیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے ایسے صاحب علم وفضل، ذہین وطباع تلامذہ دوسرے ائمہ کو نہیں ملے۔

امام صاحب نے اپنے تلامذہ سے کہہ دیا تھا، کہ استاد و مربی ہونے کے باوجود میری کسی بات کو بغیر دلیل اور حجت کے نہ ماننا، استاد کے یہ اوصاف بڑی حد تک۔۔۔۔۔شاگردوں میں بھی موجود تھے، اور وہ بھی اپنے تلامذہ کے ساتھ نہایت فیاضانہ برتاؤ کرتے تھے، امام محمد بن حسنؒ کے حالات میں مذکور ہے، کہ وہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے مشہور افریقی شاگرد اسد بن فرات کو مجلس درس کے مقررہ اوقات کے علاوہ رات کو گھر پر پڑھاتے تھے، اور اُن کو کوئی ناگواری نہیں ہوتی تھی، اسد کو مالی امداد کی ضرورت ہوتی تھی تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، امام شافعیؒ کہتے تھے۔

لیس احدٌ امنّ علیّ من محمد بن حسن الشیبانی.

''امام محمد سے زیادہ میرے اُوپر کسی نے احسان نہیں کیا''۔

امام ابو یوسفؒ پر بھی اُستاد کا پر تو پڑا تھا، وہ بھی طلبہ کے ساتھ نہایت لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے، ان کے سوالات کا نہایت خندہ پیشانی اور کمال حلم وصبر کے ساتھ جواب دیتے تھے اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے، حسن بن زیادؒ جو امام صاحب کی شاگردی میں رہ چکے تھے، ان کی وفات کے بعد امام ابو یوسف اور امام زفر کے پاس استفادہ کے لئے آتے تھے، امام ابو یوسف کے بارے میں فرماتے ہیں، کہ

کان ابو یوسف اوسع صدراباً لتعلیم من زفر (حسن التقاضی .ص ۱۹)

''ابو یوسف تعلیم کے بارے میں زفر سے زیادہ کشادہ دل اور وسیع ظرف کے تھے''۔

انہی کا بیان ہے کہ میرے سامنے جب کوئی مشکل مسئلہ آتا، تو پہلے امام زفرؒ کے پاس جاتا، ان سے دریافت کرتا وہ جواب دیتے، میری سمجھ میں نہ آتا تو دوبارہ پوچھتا، یہاں تک کہ جب وہ تکرار سوال سے زچ ہو جاتے تو فرماتے، کہ تمہارے لئے یہ فن نہیں ہے، وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے تمہارے ذہن و دماغ کا یہی حال ہے، تو مجھے امید نہیں ہے، کہ تم حصول علم میں کامیاب ہو گئے، میں وہاں سے بہت غمگین واپس ہوتا، اور پھر امام ابو یوسفؒ کی خدمت میں جا کر مسئلہ دریافت کرتا، جب ان کا حل بھی میری سمجھ میں نہ آتا تو فرماتے اچھا گھبراؤ نہیں کیا تم کو اس مسئلہ کے مبادی سے بھی واقفیت نہیں ہے، کہتا کہ اس کے بہت سے گوشوں سے واقف تو ضرور ہوں، لیکن جو واقفیت اور جو اطمینان چاہتا ہو، وہ حاصل نہیں ہوتا، اور دل میں خلش باقی رہتی ہے، فرماتے کہ ہر ناقص چیز بدریج اتمام واکمال کو پہنچتی ہے، صبر سے کام لو، ذہن و دماغ پر زور ڈالو، امید ہے کہ تم رفتہ رفتہ اپنے گوہر مقصود کو پالو گے، حسن کہتے ہیں، کہ میں ان کے اس صبر و علم پر متعجب رہتا۔ شاگردوں سے فرماتے تھے کہ :

لو استطعت ان اشاطر کم ما فی قلبی لفعلت [۱]۔

''میرے قلب و دماغ میں جو کچھ علم و فضل ہے اگر اسے تم لوگوں (تلامذہ) میں تقسیم کر سکتا تو تقسیم کر دیتا''۔

اس سے تلامذہ کے ساتھ ان کی غیر معمولی دلسوزی، ہمدردی اور تعلق خاطر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جب تک عہدہ قضا پر مامور نہیں ہوئے تھے، درس وافادہ کا کام یکسوئی سے انجام دیتے رہے مگر جب قضارت کی ذمہ داری سنبھال لی، اور اس کے کاموں میں مشغول ہو گئے، تو ظاہر ہے، کہ یکسوئی اور انہماک باقی نہیں رہ سکتا تھا، لیکن پھر بھی اس سے جو وقت بچتا تھا، وہ افادہ و تعلیم ہی میں صرف ہوتا تھا،

---

[۱] رسائل ابن جوزی تذکرہ امام ابو یوسف۔ ص ۳۲

یہاں تک کہ حالت سفر میں بھی یہ فیض جاری رہتا تھا، ایک بار بصرہ تشریف لے گئے تو بڑا ہجوم ہوا، اصحاب حدیث چاہتے تھے کہ پہلے وہ استفادہ کریں اور اصحاب فقہ چاہتے تھے، کہ پہلے ان کو خطاب کیا جائے ، فرمایا کہ میں دونوں گروہوں سے تعلق رکھتا ہوں، کسی پر ترجیح نہیں دے سکتا، اس کے بعد انہوں نے ایک سوال کیا، جن لوگوں نے جواب دیا، ان کو اندر لے گئے اور دیر تک یہ مجلس درس و افادہ جاری رہی [1]۔

حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں بھی درس وافادہ کا سلسلہ جاری تھا، امام مالکؒ سے اسی سفر میں انہوں نے ملاقات کی اور دونوں میں علمی باتیں ہوئیں۔

غرض یہ کہ انہوں نے کوئی مخصوص مجلس درس تو قائم نہیں کی مگر تعلیم وافادہ اور درس وتدریس کا مشغلہ پوری زندگی جاری رہا، حتیٰ کہ موت سے چند لمحے پہلے تک یہ چشمۂ فیض جاری تھا، ان کے خاص شاگرد قاضی ابراہیم بن الجراح کا بیان ہے کہ امام ابو یوسفؒ جب آخری بار بیمار پڑے تو میں برابر ان کی عیادت کے لئے جایا کرتا، ایک روز گیا تو وہ بے ہوش پڑے تھے، ذرا ہوش ہوا تو فرمایا ابراہیم! پیدل رمی جمار کرنا بہتر ہے، یا سوار ہو کر، عرض کیا پیدل۔ فرمایا کہ غلط ہے۔ میں نے پھر عرض کیا، سوار ہو کر، ارشاد ہوا یہ بھی غلط ہے، پھر انہوں نے مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کی، ان کی خدمت سے اُٹھ کر ابھی دروازہ سے باہر نکلا بھی نہیں تھا کہ اندر سے آواز آئی کہ امام کی وفات ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ جس کا چشمہ علم تقریباً ۳۲ برس تک مسلسل جاری رہا ہو، اس سے پوری مملکت اسلامیہ کے نہ معلوم کتنے تشنگان علم نے اپنی پیاس رفع کی ہوگی، ان سب کے ناموں کا معلوم اور جمع کرنا بڑا مشکل اور دشوار کام ہے، مگر جو نام تذکروں میں ملتے ہیں، ان کی تفصیل بھی طوالت سے خالی نہیں، چند ممتاز اور مشہور تلامذہ وطالبان علم کے نام درج ذیل ہیں۔

قاضی ابراہیم بن جراح مازنی، ابراہیم بن سلمۃ الطیالسی، ابراہیم بن میمون البلخی، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے، کہ میں نے تین الماریوں کے بقدر کتابوں کا علم ان سے حاصل کیا ہے، اسد بن فرات امام مالکؒ کے مشہور شاگرد اسماعیل بن حماد، امام صاحب کے پوتے، اشرف بن سعید نیشاپوری، بشار بن موسیٰ، بشر بن یزید نیشاپوری، نوریہ بن سعد مروزی، جعفر بن یحییٰ برمکی (ہارون کا مشہور وزیر) حسن بن زیاد، الحسین بن ابراہیم بغدادی، حسین ابن حفص اصفہانی، ابوالخطاب، (امام ابو یوسف کے کاتب یعنی پرائیویٹ سکریٹری) خلف بن ایوب بلخی، داؤد بن رشید خوارزمی، سعید بن الربیع ہردی،

---

[1] مناقب کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۳۴

شجاع بن مخلد، ابوالعباس طوسی، عبدالرحمٰن بن مہر، عبدالرحمٰن بن عبدی، عبدوس بن بشر الرازی، عثمان بن بحر الجاحظ، عزرم ابن فردہ، حافظ علی جعد الجوہری، علی بن حرمہ کوفی، علی بن صالح جرجانی، علی بن المدینی، (مشہور حافظ حدیث) علی بن مسلم طوسی، عمرو بن ابی عمرو حرانی، فضیل بن عیاض، امام محمد بن حسن شیبانی، محمد بن ابی رجاء خراسانی، موسیٰ بن سلیمان جوزجانی، وکیع بن الجراح، ہلال بن یحییٰ بصری (صاحب احکام الوقف) یحییٰ بن آدم (صاحب کتاب الخراج) یحییٰ بن معین (امام جرح وتعدیل) یوسف (امام کے صاحبزادے، جو کتاب آلاثار کے راوی ہیں)۔

ان ناموں سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ امام ابو یوسفؒ کے فیض کا دائرہ کتنا وسیع تھا، ان میں آپ کو خراسان، جوزجان، بلخ، مرد، ہرات، رے، بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ، اور مغرب اقصیٰ تک کے شایقین علم، اس خرمن علم وکمال سے خوشہ چینی کرتے نظر آئیں گے، ان میں وہ بھی ہیں جن کی ریاست علم وفضل اور قدر کا ایک عالم معترف ہے۔

امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ کی ملاقات :

امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ معاصر تھے، اس لئے دونوں بزرگوں کی باہم ملاقات اور روایت کا امکان موجود ہے، اور اسی وجہ سے غالباً بعض اہل تذکرہ نے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے، اور بعض نے لکھا ہے کہ ہارون رشید کے سامنے دونوں میں ملاقات ہوئی تھی، اور بعض مسائل میں مناظرہ بھی ہوا، ایک صاحب تذکرہ نے تو یہاں تک تصریح کی ہے، کہ امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ ان سے مناظرہ میں پیش نہ پاسکے تو خلیفہ ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل پر آمادہ کیا، اس آخری روایت کے خلاف کوئی تاریخی ثبوت نہ بھی ہوتا تو بھی نفس واقعہ کے پیش نظر یہ روایت، کسی طرح قرین قیاس نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے کہ ان ائمہ کے بارے میں جن کے زہد وتقویٰ، بےنفسی وبےغرضی، اور صبر وتحمل پر سب کا اتفاق ہے، ان کی طرف ایسی رکیک باتوں کا انتساب تو بڑی بات ہے، ان کے متعلق اس کا کوئی گمان بھی نہیں کیا جاسکتا، یہ حقیقت ان رواۃ کا اختراع ہے، جو شافعیت اور حنفیت کے فتنہ کو ہوا دے کر اپنا کوئی ذاتی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، تعجب ہوتا ہے کہ اس روایت کو امام الحرمین، امام رازیؒ، اور امام نوویؒ جیسے محتاط بزرگوں نے اپنی کتابوں میں کیسے نقل کردیا، بہرحال اس کی تردید میں جو عقلی ونقلی دلائل ہمارے علم میں آئے ہیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

اہل تذکرہ نے امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ کی دو ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے، ایک مدینہ منورہ میں، اور دوسری بغداد میں، بغداد میں امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ کی ملاقات بالکل افسانہ ہے، اس لئے

کہ امام شافعیؒ عراق میں پہلی بار ۱۸۴ھ میں گئے ہیں، جب کہ دو سال پہلے ۱۸۲ھ میں امام ابو یوسفؒ کا انتقال ہو چکا تھا، پھر وہ امام فن کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے امام محمدؒ کی خدمت میں گئے تھے، خود فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن حسنؒ سے ایک اونٹ کے برابر علم حاصل کیا میری آنکھوں نے ان کے جیسا کسی کو نہیں پایا۔ ظاہر ہے امام شافعیؒ جو امام محمدؒ کی شاگردی کے لئے گئے تھے ان کا امام ابو یوسفؒ بفرض محال وہ زندہ بھی ہوتے تو مناظرہ کرنا اور پھر ان کو ساکت کر دینا کس طرح سمجھ میں آسکتا جب کہ امام ابو یوسفؒ ان کے استاد امام محمدؒ کے بھی اُستاد تھے، اس روایت کی تردید کرتے ہوئے حافظ ابن کثیرؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

من زعم من الرواة ان الشافعي اجتمع بابي يوسف كام يقول عبدالله بن محمد البلوى الكذاب[1] في الرحلة التي ساقها للشافعي فقد اخطاء في ذلك وانما ورد الشافعي بعداء في اول قدمة قدمها اليها سنة اربع و ثمانين ومائة[2]۔

''جب راویوں نے یہ گمان کیا ہے کہ امام شافعیؒ اور امام ابو یوسف میں ملاقات ہوئی جیسا کہ عبداللہ بن محمد البلوی کذاب نے ایک فرضی سفر امام شافعیؒ کی طرف منسوب کیا ہے، اس نے اس میں ایک فاش غلطی کی ہے بغیر کسی شبہ کے یہ بات مسلم ہے کہ امام شافعیؒ پہلی بار بغداد میں ۱۸۴ھ میں گئے۔ (اس سے دو برس پہلے امام ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا)

حافظ ابن حجرؒ جو خود شافعی المسلک میں انہوں نے امام شافعی کی سوانح عمری میں جو مستقل کتاب توالی التاسیس کے نام سے لکھی ہے، اس میں اس واقعہ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ما الرحلة المنسوبة الى الشافعي المروية من طريق عبدالله بن محمد البلوى فقد اخرجه الآبرى والبيهقي وغيرها مطولة ومختصرة ساقها الفخر الرازى في مناقب الشافعي بغير اسناد و معتمدا عليها وهو مكزوية وغالب ما فيها من الكذب قوله فيها ان ابو يوسف و محمد بن الحسن حرضا الرشيد علىٰ قتل الشافعي وهٰذا باطل من وجهين احدهما ان ابا يوسف لما دخل الشافعي

---

[1] عبداللہ بن محمد بلوی کے متعلق حافظ ابن کثیرؒ کی اس رائے کی تائید میں امام ذہبی نے میزان میں دار قطنی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ یضع الحدیث یہ حدیث وضع کرتا تھا۔ ابن حجر نے جو لکھا ہے وہ آگے منقول ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰۔ ص ۱۸۴)

[2] ان تصریحات کے باوجود اب تک اہل علم اپنی کتابوں میں اسے نقل کرتے ہیں اور بعض جگہ طلبہ کو پڑھاتے ہیں۔

بغدا د کان مات ولم یجتمع به الشافعي والثاني انهما کانا اتقی الله من ان یسعیافي قتل رجل مسلم لا سیما ولیس له الیهما ذنب .... هذا مالا یظن بهما وان منصبها وجلا تهما ء ما اشتهر من وفیها لیصد عن ذلک والذی تحدر لنا بالطرق الصحیحة ان قدوم الشافعي بغداد اول ماقدم کان سنة اربع وثمانین وکان ابو یوسف قدمات قبل ذلک بسنتین[1] .

''اور عبداللہ بن محمد البلوی کے واسطہ سے جو سفر نامہ امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہے اس کو آبری اور بیہقی وغیرہ نے مفصل اور مختصر طور پر نقل کیا ہے اور امام رازی نے اپنی کتاب مناقب الشافعیؒ میں بغیر کسی سند کے اس کو صحیح سمجھ کر نقل کر دیا ہے وہ بالکل افسانہ ہے ۔۔۔۔ سب سے بڑا جھوٹ جو اس میں بولا گیا ہے وہ یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے ہارون رشید کو امام شافعیؒ کے قتل پر اُکسایا، یہ بات دو وجوہ کی بناء پر بالکل رد کر دینے کے قابل ہے، ایک تو یہ کہ جس وقت امام شافعی بغداد پہنچے تھے اس وقت امام ابو یوسفؒ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان سے ملاقات نہیں ہوئی، دوسری یہ کہ ان دونوں بزرگوں کے دلوں میں جو خدا کا خوف اور تقویٰ تھا اس سے بالکل مستبعد تھا کہ وہ ان کے قتل کی کوشش کرتے اور پھر ایک ایسے مسلمان کا قتل کی کوشش کرتے جس کا کوئی گناہ نہیں تھا ۔۔۔۔۔ ان کے بارے میں اس کا گمان ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کا منصب، ان کی جلالت اور ان کی انسانیت دوستی کی جو شہرت ہے یہ تمام چیزیں قطعی اس کی تردید کرتی ہیں اور یہ بات صحیح طریقوں سے ہمارے نزدیک ثابت ہے کہ امام شافعیؒ ۱۸۴ھ میں پہلی بار بغداد گئے اور امام ابو یوسفؒ اس سے دو سال پہلے انتقال کر چکے تھے''۔

رجال کے سلسلہ میں حافظ ابن حجر کی رائے کا جو وزن ہے اس سے اہل علم واقف ہیں۔ پھر ان کے ساتھ امام بخاری جو رجال و حدیث کے دوسرے نقاد ہیں وہ اپنی کتاب مقاصد حسنہ میں اس روایت کی تکذیب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وهي موضوعة مکذوبة

''یہ موضوع اور سراسر جھوٹ ہے''۔

امام ابن تیمیہ نے بھی منہاج السنہ میں اسکی تردید کی ہے[2]۔

---

[1] قوالی التاسیس۔ ص ۱۷۱ [2] ایضاً۔ ص ۲۲۲

مدینہ منورہ میں ان کی ملاقات کی جو روایت ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ امام مالک کی موجودگی میں امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ سے صاع، وقف اور اقامت کے بارے میں مباحثہ ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام ابو یوسفؒ نے امام شافعی کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا[۱]۔

اُوپر بار بار ذکر آ چکا ہے کہ امام شافعی پہلی بار ۱۸۴ھ میں جب بغداد گئے ہیں تو اس وقت وہ طالب علم تھے اور امام ابو یوسف اس سے دو برس پہلے انتقال کر چکے تھے، ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ میں ان حضرات کی ملاقات اس سے پہلے ہی ہوئی ہوگی کیونکہ اس روایت میں امام مالکؒ کی موجودگی کا بھی ذکر ہے اور وہ ۱۷۹ھ میں وفات پا چکے تھے پھر تمام اہلِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ جب امام مالکؒ کی خدمت میں گئے ہیں تو بہت کم سن تھے اس لئے یہ کسی طرح قرینِ قیاس نہیں ہے کہ امام شافعیؒ اس وقت کسی خاص مسلک کے حامل رہے ہوں گے جس کو امام ابو یوسف نے اختیار کر لیا ہو گا جب کہ اس کے کئی برس کے بعد جب امام محمد کے حلقۂ درس میں گئے تو اس وقت بھی وہ ایک طالب علم ہی تھے۔ پھر امام مالکؒ کی مجلسِ درس اور ان کی عام مجالس کے آداب سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام مالکؒ کی مجلس میں کسی کو بلند آواز سے بولنے کی اجازت نہیں تھی ایسی صورت میں کسی شاگرد کو مناظرہ و مباحثہ کی اجازت کس طرح مل سکتی تھی۔

یہ امکان ضرور ہے کہ امام ابو یوسف اور امام شافعیؒ کی ملاقات مدینہ منورہ میں امام مالکؒ کی خدمت میں ہوئی، اس لئے کہ ان کی خدمت میں دونوں بزرگوں کا جانا اور کسبِ فیض کرنا بہر حال ثابت ہے مگر اس روایت میں جو ہارون رشید کی موجودگی کا ذکر ہے اس کے بارے میں امام بخاری لکھتے ہیں :

> **و کذالک ما ذکر ان الشافعی اجتمع بابی یو سف عند الرشید باطل فلم یجتمع الشافعی بالرشید الا بعد موت ابی یوسف .**
>
> **(مقاصد ص ۲۲۲)**

> ''اس طرح ذکر کیا جاتا ہے امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ میں ہارون رشید کی موجودگی میں ملاقات ہوئی یہ بالکل باطل ہے۔ ہارون رشید سے امام شافعی کی ملاقات امام ابو یوسفؒ کے انتقال کے بعد ہوئی''۔

اس بیان سے مدینہ کی ملاقات کا امکان بھی ختم ہو جاتا ہے۔

---

[۱] مغیث الحق ص ۸۱

ان تاریخی بیانات کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ ان دونوں اماموں میں ملاقات نہیں ہوئی۔ اس سلسلہ میں ایک اور چیز قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ امام شافعیؒ نے کتاب الام باب بیع الولاء اور مسند میں امام ابو یوسف سے امام محمدؒ کے واسطہ سے روایت کی ہے یعنی اور اگر وہ براہ راست اس سے استفادہ کرتے تو پھر امام محمد کے واسطہ سے کیوں روایت کرتے۔

امام ابوحنیفہؒ کے بعض مسانید میں امام شافعی کی براہ راست امام ابو یوسف سے روایت مذکور ہے اس کے بارے میں علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ غالباً یہ سبقت قلم ہے۔ امام شافعی کے ایک شیخ یوسف بن خالد ہیں ممکن ہے کہ بعض رواۃ نے غلط فہمی سے یوسف کے بجائے ابو یوسف کا نام روایت کر دیا ہو اور وہی زبان زد عام ہو گیا ہو۔

عہدۂ قضا:

عہدِ نبوی اور عہدِ صدیقی میں عہدۂ قضا اسلامی حکومت کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا بلکہ ہر صوبہ یا ضلع کا جو والی ہوتا تھا وہ انتظامی اور عدالتی دونوں امور انجام دیتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب اسلامی حدود مملکت میں بہت زیادہ وسعت (گنجائش) پیدا ہوئی اور گوں ناگوں مصالح اور ضرورتوں کی بنا پر انتظامیہ اور عدلیہ کو ایک ساتھ رکھنا مشکل ہو گیا اور پھر ولاۃ مملکت کی بے عنوانیوں کی خبریں بھی دربارِ خلافت میں پہنچنے لگیں تو حضرت فاروقؓ نے دونوں شعبوں کو الگ کر دیا اور دونوں کے الگ الگ ذمہ دار اور سربراہ کار مقرر کئے۔ اس کے دونوں کے شعبے ایک دوسرے سے آزاد ہو گئے جن کے عہدہ داروں کا تقرر خود خلیفۂ وقت کرتا تھا، عہدِ فاروقی کے بعد بہت دنوں تک اسی پر عمل درآمد تھا یعنی یہ کہ دونوں شعبے الگ تھے اور ان کے عہدہ داروں کا تقرر وقت کا خلیفہ کرتا تھا۔ مگر خلفائے بنو اُمیہ جن کو دین اور دین کے تقاضوں اور کاموں سے وہ شغف اور تعلق خاطر باقی نہیں رہ گیا تھا جو ان کے پیشروں کو تھا اس لئے انہوں نے عہدۂ قضا کی اہمیت کم کر دی اور قاضیوں کا انتخاب اور ان کا تقرر و عزل صوبوں کے والیوں کے ذمہ ہو گیا۔

قاضیوں کا انتخاب:

ظاہر ہے کہ جب خود خلفائے بنو امیہ کا دینی تصور کمزور اور ان کی دینی زندگی مضمحل ہو گئی تھی اور دین سے زیادہ ان پر دنیا طلبی غالب آ گئی تھی تو پھر ان کے مقرر کردہ والیوں کی دینی زندگی کا کیا اعتبار ہو سکتا تھا، غرض اس کی وجہ سے بے عنوانیوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا۔ مروان جو سلسلۂ بنی اُمیہ کا تیسرا فرمانروا ہے اس کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ جب وہ مصر پہنچا تو وہاں کے قاضی کو بلوایا، اس وقت وہاں کے قاضی عابس تھے اس نے ان سے پوچھا کہ قرآن یاد ہے؟ بولے نہیں پھر پوچھا فرائض

یعنی تقسیم وراثت میں پختگی پیدا کرلی ہے، جواب ملانہیں، مروان کو اس جواب سے حیرت ہوئی، بولا فبم تقضی پھر آپ فیصلہ کیسے کرتے ہیں۔

خلفاء کی اس بے توجہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دن بدن اس میں بے عنوانیاں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دور خلافت میں دوسرے شعبوں کی طرح اسکی طرف بھی توجہ دی مگر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

صرف یہی نہیں تھا کہ قاضیوں کے انتخاب میں اہل و نا اہل کا بہت کم خیال کیا جاتا تھا بلکہ، حکمران طبقہ قاضیوں کے فیصلوں تک میں بھی دخل اندازی کرتا تھا چنانچہ اموی اور عباسی دور کا مشکل سے کوئی ایسا قاضی ملے گا جس کے فیصلہ میں ارباب حکومت کی مداخلت کا کوئی نہ کوئی واقعہ نہ پیش آیا ہو۔ صرف اموی دور کے قاضی خیر بن معین اور عباسی دور کے قاضی حفص بن غیاث کے متعلق ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ارباب حکومت نے ان کو اپنے فیصلوں کے بدل نے پر مجبور کرنا چاہا تھا، مگر حکومت سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا ہوئی اور وہ اپنے فیصلوں پر قائم رہے۔ یہی وجوہ تھے کہ محتاط فقہا اور محدثین حکومت وقت سے کسی قسم کے تعاون کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی مجبوری کی بناء پر یا اضطراراً وہ تعاون کرتے بھی تھے تو اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک اضطرارہ سمجھ کر اسے انجام دیتے تھے۔ قاضی حفص بن غیاث فرماتے تھے کہ جب میری حالت یہ ہوگئی کہ مردار کھانا میرے لئے حلال ہو گیا تو اس وقت میں نے عہدۂ قضا قبول کیا، قاضی شریک کو مجبوراً عہدۂ قضا قبول کرنا پڑا تو انہوں نے اس کو دین کے فروخت کرنے سے تعبیر کیا ان کے الفاظ یہ ہیں۔

بعت دینی [1]　　　"میں نے اپنے دین کو بیچ دیا"۔

وہ لوگ مردار اور دین فروشی سے اس لئے اس کو تعبیر کرتے تھے کہ مسندِ قضا پر پہنچنے کے بعد اس جرات اور آزادی کے ساتھ دینی احکام کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے جس آزادی سے وہ عہدۂ افتا پر رہ کر کر سکتے تھے بلکہ جو لوگ حکومت سے اپنا تعلق قائم کرتے تھے ان کو یہ بھی بتانا پڑتا تھا۔ یافعی نے یزید بن عبدالملک کے زمانہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے:

اتوہ اربعین شیخا شهد واله ان الخلفاء لا حساب علیهم ولا عذاب

"ان کے پاس چالیس شیوخ آئے اور کہا کہ خلفاء کے لئے نہ حساب ہے اور نہ عذاب"۔

---

[1] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۳۵

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :

نعوذ باللہ مّما سیلقی الظالمون من شرۃ العذاب[1]

''ہم اللہ کی پناہ اس عذاب اور سزا سے مانگتے ہیں جن میں یہ ظالم جتلا ہوں''۔

لیکن ان میں جو بہت زیادہ غیر معمولی لوگ تھے انہوں نے کسی قیمت پر اس اضطرار کو اپنے لئے گوارا نہیں کیا۔ ان ہی لوگوں میں سفیان ثوریؒ، امام مالک، امام ابو حنیفہؒ اور ان کے بعض تلامذہ ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے بنو اُمیہ اور بنو عباس دونوں کا عہد دیکھا تھا اور دونوں عہدوں میں ان کے سامنے یہ لقمۂ تر پیش کیا گیا مگر انہوں نے قبول نہیں کیا اور کسی قسم کے تعاون اور اشتراک عمل کو صحیح نہیں سمجھا۔ ان کے اس عزم سے ان کو پوری زندگی بڑی بے اطمینانی اور بے چینی میں گزری مگر انہوں نے اپنے اس ارادہ و عزم میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہیں کی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وقت کی ان دینی اور اصلاحی تحریکوں کا علانیہ ساتھ دیا۔ جو نظام حکومت کے بدلنے اور اس میں انقلاب و اصلاح پیدا کرنے کے لئے اٹھیں جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ان کے تلامذہ میں امام زفرؒ بھی اسی عزم و ارادہ کے انسان تھے ان کے سامنے بھی جب عہدۂ قضا پیش ہوا تو اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا جب بہت زیادہ اصرار ہوا تو روپوش ہو گئے، حکم ہوا کہ ان کا مکان گرا دیا جائے جس کی تعمیل کی گئی لیکن وہ اپنے فیصلہ اور عزم راسخ پر قائم ہو گئے۔

امام محمدؒ کو امام ابو یوسفؒ نے ایک مصلحت کی بنا پر اس عہدہ کے قبول کرنے پر مجبور کیا جس کا رنج ان کو زندگی بھر رہا۔ انہوں نے حکومت کے خلاف بعض ایسے فیصلے دیئے کہ ان کو اس کے نتیجہ میں جیل جانا پڑا، تفصیل ان بزرگوں کے حالات میں آئے گی۔

لیکن امام ابو یوسفؒ نے اپنے استاد اور اپنے اصحاب کے روش کے برخلاف عہدۂ قضا قبول کیا جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کے وقت کے اس نظام سے اتنی نفرت اور بے تعلقی نہیں تھی جو اس کے پیش روں اور دوسرے ہم عصروں کو تھی اسی بنا پر بعض اہلِ تذکرہ نے ان کے بارے میں کچھ اچھی رائے نہیں دی لیکن ان کے بارے میں متعدد وجوہ کی بناء پر یہ گمان صحیح نہیں ہے[2]۔

صحیح ہے کہ جو لوگ حکومت کا کوئی عہدہ قبول کر لیتے تھے، ان کو عام طور پر اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ خصوصیت سے اہلِ تقویٰ اور اہل علم کا گروہ تو اس کو سخت ناپسند اور حقیر سمجھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت سے متعلق ہونے کے بعد آدمی کی دینی حمیت اور ملی غیرت کچھ سرد ضرور

---

[1] مراۃ الجنان۔ جلد ۱۔ ص ۲۲۷　[2] مفتاح اسعادہ۔ جلد ۲۔ ص ۱۱۴

پڑ جاتی تھی اور صحیح فیصلہ کے مقابلہ میں حکومت کے مصالح اور مفادات کا لحاظ اس کو زیادہ کرنا پڑتا تھا ایک شاعر کا قول ہے ؎

ان کل الناس اعداء لمن علی الاحکام هذا ان عدل[1]

چنانچہ اسی بنا پر امام ابو یوسفؒ کے بارے میں یہی عام طور پر غلط فہمی تھی اور ان کو عہدۂ قضا کے قبول کر لینے کی وجہ سے مطعون کرتے تھے۔ مگر ہم آئندہ تفصیل سے بتائیں گے کہ ان کے متعلق لوگوں کا گمان صحیح نہیں تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ انہوں نے بہت دنوں تک اس عہدہ کو قبول نہیں کیا۔ مگر بعد میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور اس عہدہ کو انہوں نے قبول کر لیا مگر باوجود اس کے انہوں نے کبھی حق و عدل سے اعتراض نہیں کیا ہمیشہ بے لاگ فیصلے کئے اور ہمیشہ اپنی دینی حمیت اور ملی غیرت کو باقی رکھا، اگر کبھی نادانستہ لغزش بھی ہو گئی تو اس پر سخت افسوس کرتے تھے۔ اوپر ہم نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جب تک امام صاحب حیات تھے ان کی اور ان کے بال بچوں کی کفالت کا خیال رکھتے تھے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد امام ابو یوسفؒ کی معاشی زندگی کا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا پھر بھی انہوں نے نہ حکومت کا رخ کیا اور نہ کسی کی امداد قبول کی، کئی برس تک خالصۃً لوجہ اللہ درس دیتے رہے اس درمیان میں گھر کا جو اثاثہ اور اسباب و سامان تھا اس کو بیچ بیچ کر گزر اوقات کرتے اور کام چلاتے رہے۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ جب میرے ذاتی اثاثہ کا ایک ایک تنکا بن گیا اور میری حالت انتہائی خستہ ہو گئی تو میں نے اپنے سسرالی مکان کی ایک کڑی نکلوا کر بازار میں بیچنے کے لئے بھیجی جس کو میری ساس نے پسند نہیں کیا اور مجھے برا بھلا کہا جس سے میرے دل پر بہت چوٹ لگی اور میں نے مجبور ہو کر بالآخر عہدۂ قضا قبول کر لیا[2]۔

لیکن صرف اتنی یہ وجہ امام ابو یوسفؒ کے عہدۂ قضا قبول کر لینے کے لئے کافی نہیں وہ سکتی تھی بلکہ ان کے سوانح حیات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دین کی مصلحت اسی میں سمجھتے تھے کہ اس عہدہ کو قبول کر لیا جائے اور اس کے ذریعہ اسلامی نظام کے ان قوانین کو نافذ کیا جائے جو امام صاحب اور ان کی وفات کے بعد خود انہوں نے اور ان کے احباب نے کتاب و سنت سے مستنبط کئے تھے۔ چنانچہ جس زمانہ میں امام محمدؒ کو عہدۂ قضا کے قبول کرنے میں عذر ہوا تو ان سے کہا گیا اگر آپ اس عہدہ کو قبول

---

[1] نجات النظر۔ ص ۱۲

[2] امام صاحب کی سیاسی زندگی ص ۳۵۷ مولانا مناظر احسن صاحب نے حوالہ نقل کیا ہے۔

کرلیں گے تو شام میں ہمارے مسلک [1] کی ترویج کا ایک ذریعہ ہاتھ آجائے گا۔ اس واقعہ کا ذکر امام محمدؒ کے حالات میں آئے گا۔

پھر امام صاحب اور دوسرے بزرگوں کی دربارِ خلافت سے بے تعلقی کی وجہ سے حکومت نے بھی اپنے رویہ میں بڑی حد تک تبدیلی پیدا کرلی تھی اب اس نے اسلامی حکام کے اجراء اور فیصلوں میں پہلے سے کہیں زیادہ مواقع اور آزادی دے رکھی تھی خاص طور سے قضاۃ کے فیصلوں میں بہت کم دخل دیتی تھی یہاں تک کہ بعض معاملات میں امام ابو یوسفؒ کے ہم عصر قاضیوں نے ارکان حکومت تو الگ رہے خود خلفا کے فیصلے صادر کئے اور حکومت کو برداشت کرنا پڑا۔

اس کے علاوہ امام صاحب نے اسلامی حکام کی ترویج کے لئے ایک جماعت تیار کی تھی اور اس کے افراد میں جو سیرت اور کردار پیدا کیا تھا اس کی بناپر ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ارکان حکومت یا وزرا یا خلفاء کے سامنے اظہار حق کے بجائے ان کی خوشامد کریں گے۔

ممکن ہے اسی بناء پر خود امام صاحب نے ان لوگوں کو عہدہ قضا کے قبول کرنے کی اجازت دے دی ہو تو کوئی تعجب نہیں جیسا کہ امام صاحب نے ان کے والد کو جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ آئندہ یہ بڑی حیثیت کے مالک ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔وہ خود فرماتے تھے کہ میرے یہ چھتیس اصحاب ہیں جن میں سے ۲۸ تو عہدۂ قضا کے لائق ہیں، ۶۰ مفتی ہو سکتے ہیں اور ۲ یعنی امام زفرؒ اور امام ابو یوسفؒ یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ قاضیوں اور مفتیوں کو تیار کریں اور ان کو اس کام کے لائق بنائیں [2]۔

عاجز کا خیال ہے کہ یہی وجوہ واسباب تھے جن کی بناء پر اب اہلِ علم اور اہلِ تقویٰ اصحاب عہدہ قضا کے قبول کرنے میں اتنے زیادہ سخت نہیں رہ گئے تھے جتنا کہ اس سے پہلے تھے۔ ممکن ہے کہ اس کے ساتھ معاشی تنگی و پریشانی نے بھی امام ابو یوسفؒ کو یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا ہو۔ ورنہ اگر ان کو یہ توقع نہ ہوتی کہ ان کے کئے ہوئے فیصلوں میں کوئی قوت حارج نہیں ہوگی۔ یا اپنے اندر اس قسم کی کمزوری پاتے کہ وہ ارباب حکومت کی خاطر اور پاسداری میں اظہار حق سے باز رہ جائیں گے تو یقیناً اُستاد کی طرح وہ بھی موت کو پسند کرتے لیکن اس عہد کے قریب نہ جاتے۔ آگے جو واقعات نقل کئے

---

[1] یہ مسلک جس کی ترویج کے لئے زور دے رہے تھے وہ وہی ہے جو امام صاحبؒ اور امام ابو یوسفؒ اور خود امام محمدؒ نے کتاب وسنت سے مستنبط کیا تھا صرف امام محمد نے ایک ہزار مسائل صرف قرآن پاک سے مستنبط کئے تھے۔

[2] تاریخ بغداد جلد ۱۴ مناقب وموفق جلد ۲۔ ص ۲۴۶

جائیں گے ان سے اندازہ ہوگا کہ انہوں نے ہمیشہ بے لاگ فیصلے کئے کبھی کسی کی ناحق رعایت نہیں کی، وزراء، وارکان حکومت تک کی شہادتیں رد کردیں۔ ہارون رشید جیسے باقتدار اور صاحب جبروت خلیفہ کو معمولی رعایا کی صف میں کھڑا کردیا اور اس کے سامنے کبھی اظہارِ حق سے باز نہیں آئے اور وہ استاد کی بات کیسے بھول سکتے تھے جو انہوں نے منصور کے جواب میں کہی تھی۔ منصور نے جب امام صاحب کو عہدۂ قضا قبول کرنے پر مجبور کیا تو آپ نے ان سے کہا تھا کہ قاضی ایسے شخص کو ہونا چاہئے جو آپ کے خلاف آپ کے بچوں کے خلاف اور آپ کے سپہ سالاروں کے خلاف فیصلہ کرسکے۔ (مناقب موفق۔ جلد ۱، ص ۲۱۵)

ہم ذیل میں ان کے زمانۂ قضا کے چند واقعات نقل کرتے ہیں:

امام ابو یوسفؒ تین عباسی خلفاء کے دور میں قاضی رہے، مہدی، ہادی اور ہارون رشید۔ مہدی نے انہیں صرف بغداد کا مشرقی حصہ کا قاضی مقرر کیا تھا مگر خلیفہ ہادی کے زمانہ میں وہ پورے بغداد کے قاضی بنادیئے گئے[1]۔ ایک باغ کے معاملے میں خلیفہ ہادی اور کسی عام آدمی میں اختلاف ہوگیا، ہادی نے حکم دیا کہ معاملہ قاضی کے روبرو پیش کیا جائے۔ امام ابو یوسفؒ کے سامنے ایسی شہادتیں گزریں جن سے باغ ہادی کا ثابت ہوتا تھا لیکن امام نے انہی شہادتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خفیہ تحقیقات کی جس سے معلوم ہوا کہ باغ خلیفہ کے مخالف فریق ہی کا ہے جس کے خلاف عدالت میں شہادتیں گزر رہی تھیں، قاضی صاحب نے مقدمہ تو اس وقت ملتوی کردیا ہادی سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ مقدمہ میں آپ نے کیا فیصلہ کیا، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ شہادتیں تو آپ کے موافق ہی گزری ہیں مگر مدعا علیہ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا ہے کہ مدعی (خلیفہ) سے حلف بھی لے لی جائے۔ ہادی نے پوچھا تو آپ کی کیا رائے ہے کیا آپ مدعی[2] کا حلف اٹھانا صحیح سمجھتے ہیں امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ کی تو یہی رائے ہے[3]۔ اس کے بعد ہادی نے کہا کہ اچھا تو باغ مدعا علیہ کے حوالہ کردیجئے[4]۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام ابو یوسف صحیح فیصلہ تک پہنچنے اور حق کو حق دار تک پہنچانے میں کتنی کدوکاش کرتے تھے۔

---

۱ بغداد کی آبادی اس وقت چھ سات لاکھ تھی۔

۲ حنفی مسلک کے مطابق قسم مدعی کے ذمہ نہیں بلکہ مدعا علیہ کے ذمہ ہے مگر امام ابو یوسف کے نزدیک ایک حق دار کے حق کو واپس دلانا اس سے زیادہ ضروری ہے کہ حنفی مسلک کی پیروی کی جائے۔

۳ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف وغیرہ امام صاحب کے قول کے خلاف کبھی فتویٰ نہیں دیتے یا فیصلہ نہیں کرتے تھے، صحیح نہیں ہے۔

۴ مناقب موفق۔ جلد ۲، ص ۲۱۷

اسی طرح کا ایک فیصلہ انہوں نے ہارون رشید کے خلاف بھی دیا تھا مگر اس میں ان سے ذرا سی غلطی ہوگئی تھی جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ سواد عراق کے ایک بڈھے نے ہارون کے خلاف یہ دعویٰ دائر کیا کہ فلاں باغ میرا ہے، لیکن خلیفہ نے اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے، اتفاق سے یہ مقدمہ اس روز پیش ہوا جس روز خود ہارون رشید فیصلے کے لئے بیٹھا تھا، قاضی ابو یوسفؒ فریقین کے بیانات اور ان کے دعویٰ ہارون کے سامنے پیش کر رہے تھے جب اس مقدمہ کی باری آئی تو انہوں نے خلیفہ کے سامنے اس کو پیش کیا اور کہا کہ آپ کے اوپر دعویٰ ہے کہ آپ نے فلاں آدمی کا باغ زبردستی لے لیا ہے مدعی یہاں موجود ہے حکم ہو تو حاضر کیا جائے بڈھا سامنے آیا تو قاضی ابو یوسفؒ نے پوچھا بڑے میاں آپ کا دعویٰ کیا ہے، اس نے کہا کہ میرے باغ پر امیر المومنین نے ناحق قبضہ کر لیا جس کے خلاف دادرسی چاہتا ہوں، قاضی نے سوال کیا اس وقت وہ کس کے قبضہ اور نگرانی میں ہے۔ بولا، امیر المومنین کے ذاتی قبضہ میں ہے۔ اب قاضی ابو یوسف نے ہارون رشید سے مخاطب ہو کر کہا کہ دعویٰ کے جواب میں کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں، ہارون نے کہا میرے قبضہ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں اس شخص کا حق ہو نہ خود باغ ہی میں اس کا کوئی حق ہے۔ قاضی نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد مدعی سے پوچھا کہ تمہارے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل بھی ہے، کہا ہاں خود امیر المومنین سے قسم لے لی جائے۔ ہاورن نے قسم کھا کر کہا کہ یہ باغ میرے والد مہدی نے مجھے عطا کیا تھا میں اس کا مالک ہوں۔ بڈھے نے یہ سنا تو اس کو بہت غصہ آیا اور یہ بڑبڑاتا ہوا عدالت سے نکل گیا۔ جس طرح کوئی شخص آسانی سے ستو گھول کر پی جائے اسی طرح اس شخص نے آسانی سے قسم کھالی[1]۔ ایک معمولی آدمی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہارون کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا، یحیٰ برمکی نے ہارون کو خوش کرنے کے لئے امام ابو یوسفؒ سے مخاطب ہو کر کہا آپ نے دیکھا اس عدل و انصاف کی نظیر دنیا میں مل سکتی ہے، امام او یوسفؒ نے اس کی تحسین کی کہا کہ مگر انصاف کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے اپنی جرات، دینی حمیت اور اظہارِ حق سے اس عہدہ کو جس پر علم دین سے ناواقف تک مقرر ہونے لگے تھے، کتنا اونچا اور بلند کر دیا کہ مطلق العنان خلفا تک کو ان کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دینا پڑتا تھا، موجودہ زمانہ میں شاید کوئی استعجاب کی بات نہ سمجھی جائے۔ مگر جس مطلق العنانی اور شخصی فرماں روائی کے دور کے واقعات ہیں، اس میں یہ بات حد درجہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے۔

---

[1] امام ذہبی نے لکھا ہے کہ مدعی نصرانی تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عدل و انصاف کا اس زمانہ میں کیا معیار تھا۔

ان واقعات سے ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت اسلامی نظام کے چلانے والوں اور خواص کے طبقہ میں گو دین کی وہ روح باقی نہیں رہ گئی تھی۔ جو قرون اولی میں تھی مگر چونکہ اسلامی نظام کا ڈھانچہ کسی نہ کسی شکل میں اب بھی موجود تھا جس کا اثر تھا کہ معاشرہ کے مستاہل اور دین سے غافل افراد کے دلوں میں بھی اتنا خوف خدا اور احساس ذمہ داری باقی تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی داعی حق حق کی دعوت دیتا یا ان کی کسی ناحق بات پر تنقید کرتا تو چاہے ان کی مرضی اور خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتا اس کو قبول ضرور کرتے تھے، اور اگر قبول نہ کرتے تو کم از کم ان کو اس پر ندامت ضرور ہوتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر عام علماء وفقہا نے تو اصی بالحق ادا کیا ہوتا تو نہ تو اسلامی نظام ہی کو دھکا لگتا نہ اس کے چلانے والے غلط راہ پر پڑ جاتے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی مجددانہ عزم وارادہ کا انسان حکومت کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو گیا ہے تو اس نے بڑی حد تک زمانہ کی رفتار اور حکومت کا رخ موڑ دیا ہے۔

مذکورہ بالا معاملہ میں امام ابو یوسفؒ نے انصاف کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر پھر بھی آخری وقت تک ان کو جب اس واقعہ کا خیال آجاتا تو فرماتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ میں اپنے اندر سخت کوفت، اذیت محسوس کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ میں نے انصاف میں جو کوتاہی کی ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا جواب دوں گا، لوگوں نے پوچھا آپ نے انصاف میں کیا کوتاہی کی، اور آپ اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے کہ ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا، فرمایا تم لوگوں نے نہیں سمجھا کہ مجھے کس خیال سے تکلیف ہوتی ہے۔ پھر افسوس کے لہجہ میں فرمایا کہ مجھے تکلیف اور کڑھن اس کی ہے کہ میں ہارون سے یہ نہ کہہ سکا کہ آپ کرسی سے اتر جائیے جہاں آپ کا فریق کھڑا ہے وہیں ایک فریق کی حیثیت سے آپ بھی کھڑے ہو جائیے یا پھر اجازت دیجئے کہ اس کے لئے بھی کرسی لائی جائے۔ (مناقب جلد ۲۔ ص ۲۲۴)

ان کی جرات وحق گوئی صرف فیصلوں ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ ہر موقع پر وہ اس کا ثبوت دیتے تھے، ہارون نے ان سے کتاب الخراج لکھنے کی فرمائش کی تو تعمیل کی، اور کتاب مرتب کر دی کہ اسلامی قانون کی تدوین کا ایک اہم اور بہت ضروری کام تھا۔ لیکن اس دیباچہ میں ہارون کو جس صفائی اور جرات کے ساتھ نصیحتیں اور ہدایتیں کی ہیں۔ وہ ان کی حق گوئی کی ایک زبردست یادگار ہے۔

بعض اہل تذکرہ نے جو امام ابو یوسف صاحب کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ دنیا نے ان کو مشغول کر لیا تھا، اس کی تردید میں دوسرے تذکروں اور تاریخوں سے جو بیانات نقل کئے جاتے ہیں،

ان میں تو شبہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے متعلق دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن انہوں نے خود اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ یہ نصائح و ہدایات کتاب کے صفحہ ۷۱۔۸۱ پر پھیلے ہوئے ہیں ۔ہم اس کا خلاصہ یہاں پیش کرتے ہیں۔

امیر المؤمنین خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک بڑی ذمہ داری (حکومت) آپ کے سپرد کی ہے اس کی ادائیگی کا ثواب بھی تمام ثوابوں سے بڑا اور اعلیٰ ہے اور اس میں کوتاہی کی سزا بھی تمام سزاؤں سے بدتر اور سخت تر ہے، آپ کے سپرد اس امت مسلمہ کے تمام معاملات کئے گئے ہیں۔ آپ دن رات کوشش کریں کہ ان کے حقوق کی بنیادیں مستحکم ہوں اور آپ ان کے جان و مال کے امین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ ذمہ داری ڈال کر آپ کی آزمائش کی ہے۔

میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ خدا کے خوف اور ڈر پر جس تعمیر کی بنیاد نہیں رکھی جائے گی اس کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ کس وقت خدائے قدوس اوندھے منہ بنانے والے کے اُوپر سے گرادے۔

تو آپ امت اور عام رعیت کے حقوق کی حفاظت اور ان کے معاملات کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کریں عمل میں خدا قوت بخشتا ہے۔

آج کے کام کو کل پر نہ اٹھا رکھیے اگر آپ نے ایسا کیا تو نقصان ہوگا وقت کو توقع اور امید کے ساتھ نہ رکھیے بلکہ وقت کو عمل کے ساتھ رکھیے یعنی امید پر کوئی کام اُٹھا نہ رکھیے بلکہ ہر کام وقت پر کرلیجئے۔

ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، وقت کے بعد کام بے کار ہے پھر بہت سی نصیحتیں کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

قیامت کے دن وہی حکمران سب سے زیادہ خوش بخت ثابت ہوگا جس نے اپنی رعیت کو خوش حال رکھنے کی کوشش کی۔

دیکھئے آپ کسی معاملے میں جادۂ مستقیم سے نہ ہٹئے گا ورنہ آپ کی رعیت بھی ہٹ جائے گی۔ خبردار ! کسی معاملہ میں خواہشِ نفس اور اپنے غیظ و غضب کو دخل نہ دیجئے گا۔

جب دین و دنیا میں کشمکش کی صورت پیش آئے تو چاہئے کہ آپ دین کے پہلو کو اختیار کریں اور دنیا کو چھوڑ دیں، دین باقی رہنے والی چیز ہے اور دنیا فانی ہے۔

آپ تمام لوگوں کو خدا کے قانون کے لحاظ سے برابر سمجھیں، خواہ وہ آپ کے قریب کے ہوں یا بعید کے ہوں، اللہ کے قانون کے نفاذ میں آپ ملامت کرنے والوں کی بالکل پرواہ نہ کیجئے۔

غرض اسی انداز سے انہوں نے ایک طویل نصیحت کی ہے اسی کے بعد موضوع کتاب پر بحث کی ہے۔

اس کے بعد کس کو شبہ ہوسکتا ہے کہ جس بلند مقصد کے لئے انہوں نے یہ عہدہ قبول کیا تھا اس کو انہوں نے پورے طور پر انجام نہیں دیا۔ ہارون خودرائی کے باوجود بہت سی خوبیوں میں دوسرے عباسی حکمرانوں میں ممتاز تھا۔ خصوصاً اس کی رعایا پروری کے واقعات تو اب تک زبان زد عام و خاص ہیں اور ان خصوصیات کے پیدا کرنے میں اس کی نیک فطرتی کے ساتھ ساتھ بلاشبہ امام ابو یوسفؒ کی معیت کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔

امام ابو یوسفؒ نے جب خلفاء کی پروانہیں کی تو وزراء اور ارکان حکومت کی پرواہ کیا کرتے، چنانچہ انہوں نے متعدد وزراء اور خواصِ حکومت کی شہادتیں رد کردیں۔ ایک بار علی بن عیسیٰ وزیر مملکت نے کسی معاملہ میں شہادت دی۔ تو امام ابو یوسف نے قبول نہیں کی۔ یہ ایک وزیر کی بڑی توہین تھی اس نے معاملہ ہارون رشید کے سامنے پیش کیا، ہاورن نے امام موصوف سے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے شہادت اس لئے رد کردی کہ میں نے اپنے کانوں سے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں تو خلیفہ کا عبد اور غلام ہوں اور جب یہ غلام ہیں تو غلاموں کی شہادت معتبر نہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا یہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے[۱] اس لئے میں نے ان کی شہادت رد کردی۔

ممکن ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعے ہوں یا امام نے دونوں باتیں کہی ہوں۔

قاضی القضاۃ کے عہدہ کی ابتداء :

امام ابو یوسفؒ خلیفہ مہدی کے عہدِ خلافت میں بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے، خلیفہ ہادی کے زمانہ میں بھی اسی عہدہ پر تھے ہارون کے ہاتھوں میں خلافت کی باگ ڈور آئی تو سال بھر تک تو اس نے ان کو اسی حیثیت میں رکھا مگر اس کے بعد تمام ممالک محروسہ کا قاضی القضاۃ بنادیا۔ مقریزی نے لکھا ہے کہ عراق، خراسان، شام، مصر میں ان کے حکم کے بغیر قضات کے منصب پر کوئی مقرر نہیں ہوسکتا تھا۔ (مقریزی جلد ۴۔ ص ۱۸۱)

جواہر مضیہ میں ہے۔

کان الیہ تولیۃ القضاء فی الآفاق من الشرق والغرب .

(جلد ۲ . ص ۲۲۱)

۱۔ موفق جلد ۲۔ ص ۲۳۹

''مشرق سے مغرب تک تمام اسلامی ملکوں میں قاضیوں کا تقرر انہی کے سپرد تھا''۔

خود حضرت امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:

فولانی قضاء البلاد کلھا[۱]

''پھر مجھ کو تمام ممالک محروسہ کی قضات کی ذمہ داری سونپ دی''۔

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسماً وتبرکاً قاضی نہیں بنائے گئے تھے بلکہ کہنا چاہئے کہ وہ حکومت کے محکمۂ عدلیہ کے پورے انچارج یا بالفاظ دیگر وزیر عدل وقانون تھے۔ یہ محکمہ اس سے پہلے کبھی قائم نہیں ہوا تھا یہ امام ابو یوسفؒ ہی کی ذات تھی جس نے عہدۂ قضاء کو جس کی خلافت راشدہ کے بعد کوئی قیمت باقی نہیں رہ گئی تھی اتنا باوقار بلند اور اہم بنا دیا کہ اس کو الگ الگ محکمہ اور عہدہ کی حیثیت حکومت کو دینی پڑی۔ اس کی تائید ابو الولید الطیالسی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، وہ کہتے تھے کہ

ھذا ھو الوزیر و قاضی القضاہ

''یہی وہ شخص ہے جو وزیر اور قاضی القضاۃ ہے''۔

ہارون رشید جیسا باجبروت وخود پرست خلیفہ اس کا اس قدر اعزاز واکرام کرتا تھا کہ ان کو ہمہ وقت اس کے دربار میں باریابی کی اجازت تھی ان کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں تھی، یہاں تک کہ باب خلافت تک پہنچ جانے کے باوجود بھی سواری سے نہیں اترتے تھے۔ حریم خلافت کا پردہ اٹھا دیا جاتا اور ان کی سواری اندر چلی جاتی تھی جب ہارون کا سامنا ہوتا تو وہ خود سلام میں سبقت کرتا اور یہ مصرع دہراتا تھا:

جاءت بہ معتجرا ببردوہ

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اعزاز واکرام اور بے پایاں اختیار واقتدار خلیفہ کے بعض حواریوں اور حاشیہ نشینوں کو برا لگا۔ ممکن ہے ان میں وہ وزیر اور عہدہ دار بھی رہے ہوں جن کی شہادتیں امام ابو یوسفؒ نے ان کے عہدہ ومنصب اور اقتدار واجلال کے علی الرغم رد کر دی تھیں اور ان لوگوں نے ہارون سے شکایت کے طور پر کہا:

وکان فقیھا عالمًا انک فعت ابا یوسف فوق المقدار وانزلۃ المنزلتہ الجلیلۃ الرفعیۃ فبای وجہ نال ذلک منک۔ (مناقب موفق ۲۔ ص ۲۳۲)

---

[۱] ایضاً

''وہ محض ایک عالم اور فقیہ تھے آپ نے ان کی حیثیت سے کہیں زیادہ ان کو بلند کر دیا اور غیر معمولی اعزاز و اکرام بخش دیا تو یہ مرتبہ آپ کے یہاں انہوں نے کس وجہ سے حاصل کر لیا ہے''۔

ہارون نے ان حاسدوں کو جواب دیا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے بہت سوچ سمجھ کر اور کافی تجربہ کے بعد کیا ہے، خدا کی قسم علم کے جس باب میں بھی میں نے ان کو جانچا کامل پایا، پھر کہا کہ ان کی علمی قابلیت کو ان کی طالب علمی کے زمانہ سے جانتا ہوں، پھر ان کی علمی امتیازات کے علاوہ میں نے مذہب میں ان کے قدم کو استوار اور ان کے دین کو تمام آلودگیوں سے محفوظ پایا۔ اگر کوئی قاضی ابو یوسفؒ جیسا ہو تو پیش کرو[1]۔

مذکورہ واقعات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ امام ابو یوسفؒ نے جس مقصد کی خاطر یہ عہدۂ قضا قبول کیا تھا اس میں وہ کتنے کامیاب تھے اور انہوں نے اپنے ذاتی کردار اور علم و تفقہ سے اس عہدہ کو بلند اور خود حکومت میں کتنا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ وزراء اور ارکانِ حکومت تک کے دل میں رشک و حسد پیدا ہونے لگا تھا اور یہ ہارون کے عہد کا واقعہ ہے جس میں برامکہ جیسے بیدر مغز وزراء اور ارکان دولت تھے۔

امام ابو یوسفؒ کے بعد اسی عہدہ پر جب وہب بن وہب المعروف بابی البختری کا تقرر ہوتا ہے تو وہ ہارون کے ہر کام کے جواز کے لئے حدیثیں وضع کرنے لگتے ہیں۔ مشہور ہے کہ انہوں نے کئی بار اسی طرح کا اقدام کیا دو ایک بار تو ہارون کچھ نہیں بولا مگر وہ بھی صاحب علم و نظر تھا اور پھر امام ابو یوسفؒ جیسے متدین اور محتاط قاضی　　کی رفاقت میں رہ چکا تھا، کب تک خاموش رہتا۔ چنانچہ ایک روز وہ کبوتر اڑا رہا تھا کہ وہب آ گئے پوچھا کہ کبوتر بازی کے لئے بھی کوئی حدیث آئی ہے، بے محابا شیخ نے یہ روایت سنا دی۔

مجھ سے ہشام بن عروہ نے روایت کی ہے کہ ان کے والد حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے بیان کرتے تھے کہ وہ فرماتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبوتر بازی کی ہے اور اس سے شغف فرمایا ہے۔

یہ سن کر ہارون آپے سے بارہ ہو گیا اور نہایت خشم گیں آواز میں بولا نکل جاؤ میرے سامنے سے۔ اگر تمہارا تعلق قریش سے نہ ہوتا تو میں تمہیں ابھی معزول کر دیتا اور یہی ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد معزول کر دیے گئے[2]۔

---

[1] موفق جلد ۲۔ ص ۲۳۲　　[2] تاریخ خطیب بغدادی۔ جلد ۸۔ ص ۴۵۳

عہدۂ قضاء کی مدت :

امام ابو یوسف عہدۂ قضا پر کتنے دنوں مامور رہے اس میں اختلاف ہے۔ایک مرتبہ خود انہوں نے اپنے شاگرد سے بیان کیا کہ میں ۱۷ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں (یعنی عہدۂ قضا پر)۔اوپر ذکر آچکا ہے کہ سب سے پہلے مہدی کے وقت قاضی مقرر ہوئے اور ان کی وفات ۱۸۲ھ ہجری میں عہدۂ قضا کی حالت میں ہوئی تو اگر ان کے تقرر کا ۱۵۹ھ مانا جائے تو قضا کی مدت ۲۲۔۲۳ برس ہوتی ہے۔اور اگر یہ مانا جائے کہ وہ ۱۷ برس عہدۂ قضا پر رہے تو اس اعتبار سے ان کا تقرر ۱۶۶ھ میں ہونا چاہئے،غرض پہلی صورت میں امام صاحب کی وفات کے ۹ برس کے بعد عہدۂ قضا قبول کیا اور دوسری روایت میں پندرہ برس کے بعد۔

علالت اور وفات :

موت سے کچھ دن پہلے بیمار پڑے ان کو بیمار ہونے سے پہلے ہی اپنی موت کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا،وہ برابر کہتے تھے کہ ۱۷ برس امام صاحب کی خدمت میں رہا اور ۱۷ برس دنیا کے کاموں میں اب میرا وقت قریب ہے،موت سے کچھ پہلے وصیت کی کہ میرے مال میں سے ایک ایک لاکھ درہم اہلِ مکہ،اہلِ مدینہ اور اہلِ کوفہ پر تقسیم کردیا جائے اس کے بعد وراثت تقسیم ہو[1]۔

علالت کے ایام میں ان پر عجیب رقت طاری رہتی تھی۔عہدۂ قضا کی ذمہ داریوں کو انہوں نے جس دیانت داری سے انجام دیا اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔لیکن آخر وقت میں وہ کہتے تھے کہ کاش میں فقر و فاقہ کی حالت میں اس دنیا سے چلا جاتا اور عہدۂ قضا نہ قبول کرتا،پھر بھی میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے قصداً نہ کسی پر ظلم کیا ہے اور نہ کسی فریق کی پاسداری کی ہے اور نہ میری خواہش ہوئی کہ فلاں فریق کامیاب ہو اور فلاں ناکامیاب[2]۔جس روز انہوں نے اس دارِ فانی کو چھوڑا ان پر عجیب کیفیت تھی اور زبان پر یہ کلمات تھے۔

''بار الٰہا تو جانتا ہے کہ میں نے کسی فیصلہ میں جو تیرے بندوں کے درمیان تھا خود رائی سے کام نہیں لیا اور نہ خلاف واقعہ فیصلہ کیا،ہمیشہ میری کوشش رہی کہ جو فیصلہ ہو وہ تیری کتاب اور تیرے رسول ﷺ کی سنت کے موافق ہو جب کسی مسئلہ میں مشکل پیش آتی تھی تو میں امام ابو حنیفہ ؒ کو اپنے اور تیرے درمیان واسطہ بناتا تھا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ امام ابو حنیفہ ؒ تیرے احکام کو خوب

---

[1] کردری جلد ۲۔ص ۱۱۹　　[2] موفق جلد ۲۔ص ۲۴۲

سمجھتے تھے اور عمداً وہ کبھی حق کے دائرہ سے باہر نہیں جاتے تھے۔ یہ بھی زبان پر تھا کہ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ پاک دامن رہا اور کبھی ایک درہم جان بوجھ کر حرام کا نہیں کھایا[1]۔

تعلیم و تعلم آخری سانس تک جاری تھا۔ ایک شاگرد کو کسی مسئلہ کی تفصیل بتا رہے تھے ابھی خاموش بھی نہیں ہونے تھے کہ چند منٹ کے بعد آواز ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی۔

معروف کرخی ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں یہ امام ابو یوسفؒ کے معاصر تھے ان کو جب بیماری کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ اگر یہ آج ان کی وفات ہو جائے تو مجھے اطلاع دینا میں جنازہ میں شریک ہوں گا۔ ان کے رفیق کا بیان ہے کہ جب میں دارالرقیق کے دروازہ پر پہنچا تو امام ابو یوسفؒ کا جنازہ نکل رہا تھا، میں نے خیال کیا کہ اگر میں معروف کرخی کو خبر کرنے جاتا ہوں تو مجھے جنازہ کی نماز نہ ملے گی۔

چنانچہ جنازہ کی نماز پڑھ کو ان کے پاس گیا اور خبر وفات سنائی تو ان کو سخت صدمہ ہوا اور بار بار انا للہ پڑھا اور فرمایا کہ انشاء اللہ ان کو جنت میں اچھا مقام ملے گا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ مقام ان کو کیوں کر حاصل ہوگا، فرمایا کہ تعلیم اور تعلم اور لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر کی بدولت۔ (تاریخ بغداد جلد ۱۴) یہ واقعہ جمعرات کے دن ظہر کے وقت ربیع الاول کی پانچویں تاریخ ۱۸۲ھ کو پیش آیا[2]۔

ان کی وفات کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا خصوصیت سے ہارون رشید بہت غمگین تھا۔ جنازہ نکلا تو مشایعت کی اور خود نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے خاص مقبرہ میں دفن کرایا[3] اس سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ تمام اہل اسلام کو چاہئے کہ ان کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کریں یعنی حادثہ ایک شخص یا ایک خاندان کا نہیں بلکہ پوری ملت کا ہے۔

شجاع بن مخلد کا قول ہے کہ ہم امام ابو یوسفؒ کے جنازہ میں شریک تھے، عباد بن عوام بھی ہمارے ساتھ تھے میں نے ان کو یہ کہتے سنا کہ اہلِ اسلام کو چاہئے کہ ابو یوسفؒ کی وفات پر ایک دوسرے کی تعزیت کریں[4]۔

اہل تذکرہ کا بیان ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے جنازہ میں ابو یعقوب خزیمی شاعر بھی شریک تھا، اس نے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ دوسرے امام کا خاتمہ ہوگیا، فقہ کا خاتمہ ہوگیا تو اس نے برجستہ ایک مرثیہ کہا جس کے چند اشعار ہیں[5]۔

---

[1] موفق جلد ۲۔ ص ۲۴۲ تاریخ بغداد جلد ۱۴　　[2] کردری ص ۱۲۶

[3] تاریخ بغداد جلد ۱۴۔ ص و شذرات الذہب، کردری جلد ۲۔ ص ۵۰　　[4] ایضاً　　[5] کردری جلد ۲۔ ص ۱۲۶

یا ناعی الفقه الی اهله　　ان مات یعقوب وما تدری
لم یمت الفقه و لکنه　　حول من صدر الی صدر
القاه یعقوب ابی یوسف　　فزال من ظهر الی ظهر
فهو مقیم فاذا ماثوی　　حل وحل الفقه فی قبر

حلیہ :

نہایت ہی پتلے دبلے اور پستہ قد تھے، ان کے ایک شاگرد قاسم بن زریق کہتے تھے کہ جب وہ مسندِ درس پر بیٹھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس میں ڈوب جائیں گے لیکن جب درس دینے لگتے تھے تو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔ ان کا جثہ دیکھ کر یہ کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ چاہے تو پرندہ کے پیٹ میں علم بھر دے۔

اولاد :

امام ابو یوسف ؒ کثیر الاولاد تھے مگر ارباب تذکرہ صرف ان کے دو صاحبزادوں کا تذکرہ کرتے ہیں، ایک تو بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئے اور ایک یوسف نام کے صاحبزادے تھے جنہوں نے علم دین امام ابو یوسف سے ورثہ میں پایا تھا۔ امام ابو یوسف ؒ کی زندگی ہی میں قاضی مقرر ہو گئے تھے۔ امام ابو یوسف ؒ پہلے بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی تھے جب وہ قاضی القضاۃ بنائے گئے تو ان کی جگہ پر ان کے صاحبزادے کا تقرر ہوا۔ والد کی وفات کے بعد پھر یہ رصافہ کے قاضی بنا دیئے گئے یہ جامع منصور کے امام بھی تھے۔

ان کے صاحبزادے فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے گھر میں تیس برس سے عہدۂ قضا ہے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسف ؒ کے بعد یہ بھی قاضی القضاۃ بنائے گئے تھے۔ مگر یہ روایت صحیح نہیں ہے بلکہ امام ابو یوسف ؒ کے بعد وہب بن وہب ابو بختری اس عہدہ پر مامور ہوئے، ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے لئے انہوں نے نیابت کا کام انجام دیا ہو، ۱۹۳ھ میں ان کی وفات ہوئی[۱]۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہ امام ابو یوسف کی کتاب الآثار کے راوی ہیں۔ کتاب الآثار لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد نے ۱۳۵۵ھ میں شائع کی ہے۔

محاسنِ اخلاق :

ان کا صحیفۂ اخلاق ہر قسم کے محاسن وفضائل سے پر ہے۔ عہدۂ قضا پر رہتے ہوئے انہوں نے جس اخلاق و کردار کا ثبوت دیا وہ ان کی خصوصیت ہے اس عہدہ پر پہنچنے کے بعد بڑے بڑے

---

[۱] موفق۔ جلد ۲۔ ص ۱۰

پاکبازلوگوں کادامن بھی آلودہ ہوجاتا ہے مگرانہوں نے اپنادامن کبھی داغ دار نہ ہونے دیا۔لوگوں سے ملنا جلنا،تواضع وخاکساری لوگوں کی امداداوراعانت،علم کی عزت وتوقیر،فیاضی وسیرچشمی یہ سب چیزیں اس زمانہ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح ہیں [1]۔

مشہور سیرت نگار واقدی امام ابو یوسفؒ کے ہمعصر تھے،امام ابو یوسفؒ حج میں گئے تو حجاز میں ان سے ملاقات ہوئی ان دنوں واقدی کی مالی حالت اچھی نہیں تھی ۔امام ابو یوسف ان کو اپنے ساتھ بغداد لائے اور ہارون کے دربار میں لے گئے،یحیٰی برمکی بھی موجود تھا پوچھا کہ قاضی صاحب مکہ سے کیا تحفہ لائے ہیں۔امام ابو یوسفؒ نے کہا کہ میں ایسا تحفہ تمہیں دوں گا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ملا ہوگا،یحیٰی نے کہا کہ کیا ہے؟انہوں نے واقدی کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہی تحفہ ہے اس کے بعد انہوں نے یحیٰی کے ذریعہ اس کی کافی مالی مدد کرائی [2]۔

ہارون ایک بار خطبہ دے رہا تھا ایک شخص کھڑا ہوا اور اس کو مخاطب کر کے کہا کہ خدا کی قسم!تم نے نہ تو مال کی تقسیم برابر کی اور نہ عدل وانصاف سے کام لیا بلکہ اس کے بجائے فلاں فلاں برائیاں کیں۔ہارون نے حکم دیا کہ اس کو گرفتار کرلیا جائے [3]۔نماز کے بعد وہ پیش کیا گیا،ہارون نے ایک آدمی امام ابو یوسفؒ کو بلانے کے لئے بھیجا امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میں آیا تو وہ آدمی دو عقابوں کے بیچ میں کھڑا تھا اور اس کے پیچھے دو جلاد کوڑا لئے کھڑے تھے،ہارون نے کہا کہ اس شخص نے مجھ سے آج ایسی گفتگو کی ہے کہ اس سے پہلے کسی نے نہیں کی۔یہ موقع بڑا نازک تھا لیکن امام ابو یوسفؒ نے نہایت جرات کے ساتھ ہارون کو اسوۂ نبوی کی طرف متوجہ کیا،کہا کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے غنیمت تقسیم کی تو آپ سے بھی اسی طرح کی بات چیت کی گئی تھی ۔

ما اريد بها وجه الله

''غنیمت کی تقسیم مرضی الٰہی کے خلاف ہوئی ہے''۔

یہ کتنی سخت بات تھی مگر آپ ﷺ نے معاف کردیا کسی نے کہا آپ نے عدل سے کام نہیں لیا فرمایا کہ اگر میں عدل نہ کروں گا تو اور کون کرے گا،پھر کہنے والے سے کوئی بازپرس نہیں کی۔حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری نے آپ کے سامنے کوئی معاملہ پیش کیا آپ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کے حق میں فیصلہ کردیا،انصاری نے غصہ میں کہا کہ اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں آپ نے فیصلہ کردیا لیکن آپ ﷺ نے اس گستاخی سے درگزر کیا اور کچھ نہ فرمایا۔

---

[1] موفق۔جلد۲۔ص ۱۱ [2] حسن التقاضی۔ص ۵۰ [3] ایضاً۔ص ۶۴

ہارون کے سامنے جب یہ اسوۂ نبوی ﷺ آیا تو اس کا غصہ بالکل سرد ہو گیا اور اس شخص کو چھوڑ دینے کا حکم دے دیا۔

فیاضی اور شکر گزاری :

بچپن سے فقر و فاقہ کی زندگی تھی مگر کبھی اس پر ناشکری کے کلمات زباں سے نہیں نکلے۔ فقر و فاقہ کے ساتھ ان کی شکر گزاری کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے، عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھ سے معاشی تنگی کی شکایت کی میں نے تسلی دی۔ جب ان کے پاس سے چلنے لگا تو دیکھا کہ مٹی کا ایک میلا سا برتن ان کے پاس رکھا ہوا ہے وہ اتفاق سے میرے دامن سے لگ کر ٹوٹ گیا اور اس کی وجہ سے ان کے چہرہ پر شکن آ گئی اور رنگ فق ہو گیا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا، میں نے کہا کیا بات ہے، فرمایا یہ ایک برتن تھا جس سے میں اور میری والدہ وضو کرتے تھے اور اسی سے پانی بھی پیتے تھے۔ عبداللہ بن مبارکؒ ان کا یہ حال سن کر بہت متاثر ہوئے اور کچھ رقم ان کو دی[1]۔

قاضی القضاۃ ہوئے تو مال و اسباب کی کافی فراوانی ہوئی اور اس منصب کے لحاظ سے بھی کچھ ساز و سامان زیادہ ہو گیا مگر اس پر نہ وہ کبھی مغرور ہوئے اور نہ کبھی دروازہ پر دربان بٹھایا بلکہ آخر تک اپنی زندگی بالکل طالب علمانہ رکھی پھر بھی اپنے ساتھ دنیاوی ساز و سامان رکھنے کا ان کو افسوس رہا۔ آخر وقت میں فرماتے تھے، ''کاش میں فقر و فاقہ ہی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا اور یہ عہدۂ قضا قبول نہ کرتا''۔

وہ قاضی القضاۃ ہوئے تو ان کو دو ہزار روپے سے زیادہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی[2]۔ پھر ہارون رشید کے دربار سے سال میں لاکھوں روپے کے انعامات ملتے تھے اس لئے وفات کے وقت ان کے پاس کافی دولت موجود تھی لیکن اس دارِ فانی سے رخصت ہونے لگے تو سب کو غرباء پر تقسیم کرنے کی وصیت کر گئے۔ چنانچہ تقریباً چار لاکھ روپے اہلِ مکہ، اہلِ مدینہ، اہلِ کوفہ اور اہلِ بغداد کو تقسیم کیا گیا[3]۔

ہارون نے ان کو کچھ خراجی زمین بھی دی تھی جس پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا اس سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ صدقہ کر دیتے تھے[4]۔

نرم خوئی اور احساسِ ذمہ داری :

نہایت نرم خو اور فیاض تھے مگر ان کی نرم خوئی اور فیاضی احساسِ ذمہ داری سے خالی نہیں تھی۔ گو یہ دونوں صفتیں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ مگر ان میں یہ دونوں چیزیں جمع تھیں۔

---

[1] کردری جلد ۲۔ ص ۱۴۳ [2] ایضاً، اس وقت کے سکہ کے لحاظ سے دینار اور ایک ہزار درہم تھی۔

[3] جواہر مضیہ جلد ۲۔ ص ۵۲ [4] جواہر مضیہ جلد ۲۔ ص ۱۴۰

ذیل کے واقعہ سے اس کا اندازہ ہو جائے گا :

ایک بار ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے فلاں شخص سے آپ کی طرف سے ایک خط لکھ کرا تنے روپے حاصل کر لئے تھے اب وہ مجھ سے مانگتا ہے اس سے مجھ کو چھٹکارا دلا یئے ، امام ابو یوسفؒ نے اس کو قید کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ جب تک روپیہ واپس نہ کرو گے اس وقت تک قید سے رہائی نہیں مل سکتی ، اس نے کہا میں نے ایک بار اسی طرح آپ کے استاد امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے بھی ایک فرضی خط ایک شخص کو لکھ کر روپے حاصل کئے تھے ۔ مگر جب میں نے ان کو اس کی اطلاع دی تو انہوں نے وہ روپیہ میری طرف سے ادا کر دیا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرمایا کہ جس شخص کے بارے میں یہ خیال ہو کہ وہ میرا خط دیکھ کر تمہیں روپیہ دے دے گا تو تم خط لکھ کر منگا لیا کرو ، آپ بھی انہی اصحاب میں ہیں آپ سے بھی مجھے یہی توقع تھی ۔ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا میں امام ابوحنیفہؒ نہیں ہوں ۔ وہ ایک جلیل القدر اور فقیہ تھے ، لوگ ان کا ان کے علم و فضل کی وجہ سے احترام و اعزاز کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے نام پر روپیہ دے دیتے تھے اور میں حکومت کا ایک ذمہ دار ہوں ، اس لئے اس بات کا امکان ہے کہ جس کو تم نے خط لکھا ہو وہ روپے نہ دینا چاہتا ہو ۔ مگر میرے خوف سے اس نے دے دیا ہو ۔

ایک دن تک اس کو مایوس رکھا پھر دوسرے دن اس کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ جس سے تم نے روپے لئے تھے میں نے اس کو واپس کر دیئے اور تم کو رہا کرتا ہوں ۔ اگر وہ دوبارہ وہ رقم بطیب نفس بھی تمہیں واپس کرے تو نہ لینا جاؤ اور آئندہ ایسا نہ کرنا [1] ۔

حکومت کے تعلق اور اس کے ذمہ داروں کے نام سے عام طور پر جو فائدے حاصل کئے جاتے ہیں ، امام ابو یوسفؒ نے اس کے سد باب کے لئے اس کو قید کر دیا مگر ان کی طبعی فیاضی اور نرم خوئی کا اثر تھا کہ روپیہ بھی ادا کر دیا ۔

تقویٰ اور خوفِ آخرت :

نہایت پاک دامن اور عفت مآب تھے ، فرماتے تھے کہ بارالہا تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی کوئی حرام فعل نہیں کیا اور نہ حرام کا ایک پیسہ کھایا [2] ۔

فرماتے تھے یہ بارالہا ! تو جانتا ہے کہ جب دو آدمی میرے پاس کوئی معاملہ لائے تو میں نے کبھی کوئی جانبداری نہیں کی اور نہ میری یہ کبھی خواہش ہوئی کہ فلاں کے حق میں فیصلہ ہو [3] ۔ خواہ وہ خلیفۂ وقت ہی کیوں نہ ہو ، بارالہا ! اس کے بدلہ میں مجھے معاف کر دے ۔

---

۱ ؎ موفق جلد ۲ ۔ ص ۲۲۵　　۲ ؎ موفق جلد ۲ ۔ ص ۲۴۲　　۳ ؎ ایضاً

ابو حفص ان روایتوں کے راوی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ انہوں نے آخر وقت میں ایسی بات کہی ہے جس پر زندگی میں کاعمل نہیں تھا بلکہ ان کی ساری زندگی اس کی آئینہ دار تھی۔

علی بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ میں ایک بار ایسے وقت میں امام ابو یوسفؒ کے پاس آیا کہ مجھے گمان تھا کہ وہ آرام گاہ میں ہو گے اور ملاقات نہ ہو سکے گی، میں نے اطلاع کرائی تو فوراً اندر بلا لیا، دیکھا کہ ایک علیحٰدہ کمرے میں لنگی باندھے ہوئے بیٹھے ہیں اور ان کے گرد کتابوں کا انبار ہے، میں نے کہا میں تو سمجھتا تھا کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی، امام ابو یوسف نے فرمایا کہ دیکھو اس کمرے کے چاروں طرف یہ الماریاں ہیں ان میں کتابیں اور کاغذات کے بہت سے پوٹ رکھے ہوئے ہیں، یہ تمام میرے فیصلوں کی نظیریں ہیں قیامت کے دن جب مجھ سے باز پرس ہوگی کہ تم نے فیصلے کس طرح کیے تو خدا کے حضور اس کے جواب میں یہی پیش کر دوں گا [1]۔

قرآن مجید کا احترام اور عبادت :

امام ابو حنیفہؒ کے درس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ حفظ قرآن کے بغیر اپنے درس میں کسی کو شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ امام محمد صاحب پہلی بار ان کی خدمت میں آئے تو ان کو پورا قرآن متحضر نہیں تھا اس لئے ان کو واپس کر دیا۔ جب پورا قرآن ان کو متحضر ہو گیا تو پھر ان کو درس میں شریک ہونے کی اجازت دی۔ قرآن کے احترام اور اس کی تلاوت میں بھی وہ ضرب المثل تھے۔

امام ابو یوسفؒ بھی حافظ قرآن تھے۔ قرآن کا اعزاز و احترام بھی انہوں نے استاذ سے سیکھا تھا۔ ایک بار کہیں جا رہے تھے راستہ میں دو آدمی خرید و فروخت میں جھگڑا کر رہے تھے، ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا کہ میری اور تمہاری مثال تو قرآن کی اس آیت کے مطابق ہے اس کے بعد اس نے سورہ ص کی یہ آیت پڑھی۔

هٰذَا اَخِیْ لَهٗ ، تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا .

"یہ میرا بھائی ہے جس کے پاس ۹۹ دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے، یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دو"۔

امام ابو یوسفؒ نے یہ سنا تو ان پر غصہ اور افسوس سے ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی، قریب تھا کہ بے ہوش ہو جائیں جب ذرا یہ کیفیت دور ہوئی تو اس شخص سے بڑے درشت لہجہ میں کہا کہ

---

[1] موفق جلد ۲۔ ص ۲۴۴

''تو اللہ سے ذرا بھی ڈرتا نہیں، کلام الٰہی کو تو نے معمولی بات چیت بنالی ہے، قرآن کے پڑھنے والے کو چاہئے کہ وہ اس کو نہایت خشوع وخضوع اور خوف و ہیبت کے ساتھ پڑھے ایسا نہ ہو کہ وہ ناراضگی کا سبب بن جائے، میں تجھ میں یہ کیفیت بالکل نہیں پاتا کیا تیری عقل جاتی رہی ہے کہ تو نے کلام الٰہی کو لہو ولعب بنالیا ہے'' [۱]

اسی طرح ایک بار ایک شخص کو سورہ طٰہٰ کی کوئی آیت پڑھتے ہوئے سنا تو اس کو بھی بہت ڈانٹا۔ محمد بن فضیل فرماتے ہیں کہ میں امام ابو یوسف کو اس لئے ناپسند کرتا تھا کہ یہ حکومت کے ارکان سے اختلاط رکھتے ہیں لیکن جس روز سے ان کو یہ تنبیہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا اس روز سے ان سے محبت کرنے لگا [۲]۔

کردری نے لکھا ہے کہ دین کے تمام کاموں میں وہ بڑا اہتمام کرتے تھے [۳] دعا کرتے تھے تو دونوں ہاتھ چادر کے اندر نہیں رکھتے تھے بلکہ باہر نکال کر دعا کرتے تھے [۴]۔

موفق اور قرشی دونوں حضرات نے لکھا ہی کہ عہدۂ قضا کے قبول کر لینے کے بعد وہ سو رکعت روزانہ نماز پڑھتے تھے، روزہ کا بھی اہتمام کرتے تھے، خصوصیت سے رجب وشعبان میں پورے مہینہ روزہ رکھتے تھے [۵]۔

احسان شناسی

امام ابو یوسفؒ، امام ابو حنیفہؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ دونوں حضرات کے خاص شاگرد تھے، ان دونوں اساتذہ کی احسان شناسی سے وہ پوری زندگی گراں بار رہے۔ ہمیشہ دونوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میں نے جب بھی کوئی نفل یا فرض نماز پڑھی تو ان کے لئے دعا ضرور کی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ اپنے والدین سے پہلے امام صاحب کے لئے دعا کرتے تھے۔

حاضر جوابی :

امام ابو یوسفؒ نہایت ذکی اور ذہین تھے اس لئے جب کوئی بات یا مسئلہ سامنے آتا تو اس کا وہ فوراً جواب دیتے۔ ایک بار ہارون کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے ظہر یا عصر کے وقت انہوں نے امامت کی چونکہ یہ مسافر تھے اس لئے قصر کیا یعنی دو رکعت کے بعد سلام پھیر کر نمازیوں سے کہا کہ اپنی

---

[۱] موفق جلد ۲۔ ص ۲۴۴　[۲] موفق جلد ۲۔ ص ۱۴۵　[۳] ایضاً ۱۴۰　[۴] اس میں سنت کی موافقت بھی مقصود رہی ہوگی اور اس صورت میں تضرع کی کیفیت بھی زیادہ پیدا ہوتی ہے۔　[۵] موفق جلد ۲۔ ص ۲۳۱

نمازیں پوری کرلو میں مسافر ہوں[۱]۔ اہل مکہ میں سے ایک شخص نے نماز ہی میں کہا ہم لوگ یہ مسئلہ تم سے اور جس نے تم کو سکھایا ہے اس سے بہتر جانتے ہیں۔ امام ابو یوسف نے کہا یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر تم کو یہ مسئلہ معلوم ہوتا تو نماز میں بات چیت نہ شروع کر دیتے۔ اس جواب پر ہارون بہت خوش ہوا اور اس نے کہا کہ اگر نصف سلطنت کے بدلے مجھے یہ جواب مل جاتا تو بھی میں پسند کرتا[۲]۔

ایک بار ہارون نے ان سے کہا کہ آپ میرے پاس بہت کم آتے ہیں میں آپ کی صحبت و زیارت کا مشتاق رہتا ہوں۔ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ یہ اشتیاق اسی وقت تک کا ہے جب تک میں کم آتا ہوں جب زیادہ آنے لگوں گا تو یہ اشتیاق و اعزاز باقی نہیں رہے گا، ہارون نے اس جواب کی تحسین کی[۳]۔

ایک لطیفہ :

ایک صاحب امام ابو یوسفؒ کی خدمت میں ہمیشہ خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ ایک بار ان سے فرمایا کہ تم کچھ بولتے نہیں؟ کہا کہ بہت اچھا، کچھ دیر بعد بولے روزہ کب افطار کرنا چاہئے، فرمایا جب آفتاب غروب ہو جائے بولے اگر آفتاب آدھی رات تک غروب نہ ہو تو، یہ سن کر امام ابو یوسفؒ ہنس پڑے اور کہا کہ تمہارا خاموش رہنا ہی اچھا تھا تمہاری زبان کھلوا کر میں نے خطا کی[۴]۔

قوتِ حافظہ :

نہایت قوی الحفظہ تھے۔ امام ذہبی نے انہیں حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، ابن جوزی نے ان کو امت کے ان سو قوی الحفظ لوگوں میں شمار کیا ہے جو ضرب المثل تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اپنے شیوخ حدیث سے جب وہ سماع حدیث کرتے تھے تو بسا اوقات ایک ہی مجلس میں انہیں پچاس ساٹھ حدیثیں مع سند زبانی یاد ہو جاتی تھیں۔ ابن عبدالبر کے بیان سے بھی اسی کی تائید ہوئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے حسن بن زیادہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک بار بیمار تھے اسی حالت میں سفیان بن عینیہ نے چالیس حدیثیں سنائیں اور وہ سب ان کو اسی وقت یاد ہو گئیں اور ان کے جانے کے بعد اپنے رفقاء کو وہ تمام حدیثیں مع سند سنا دیں، رفقاء کو ان کی قوت حافظہ پر سخت تعجب ہوا[۵]۔

ابو معاویہ کہتے ہیں کہ میں اور ابو یوسف دنوں سماع حدیث کے لئے جاتے تھے میں تو شیخ سے سنی ہوئی تمام حدیثیں لکھ لیا کرتا تھا اور انہیں بغیر لکھے زبانی یاد ہو جاتی تھیں۔ خلیفہ ہارون رشید بھی

---

۱ حسن التقاضی۔ ص ۱۷، کردری جلد ۲۔ ص ۱۳۱　۲ یہی مسنون طریقہ ہے　۳ مفتاح السعادہ جلد ۲۔ ص ۱۰۴
۴ ایضاً ص ۱۰۶　۵ تاریخ بغداد۔ جلد ۱۴

ان کا ہم سبق رہ چکا تھا۔ اس سے ایک بار لوگوں نے امام ابو یوسفؒ کی شکایت کی تو اس نے کہا میں ان کے علم وفضل و بچپن سے جانتا ہوں یہ درس میں حدیثیں لکھتے نہیں تھے، مگر حافظہ ایسا قوی تھا کہ ان کو سب حدیثیں زبانی یاد ہو جاتی تھیں اور درس کے بعد لکھنے والے ان کے حفظ سے اپنی مکتوبہ احادیث کی تصحیح کرتے تھے[1]۔

علم وفضل :

امام ابو یوسفؒ کے صحیفۂ زندگی کا سب سے جلی عنوان یہی ہے۔ امام ابو یوسفؒ، آئمہ تابعین اور تبع تابعین کے اس دور میں تھے جس میں علم وفن کا چرچا گھر گھر تھا، دینی علوم تفسیر وحدیث وفقہ، سیرت، رجال وطبقات اور مذاہب اربعہ کے ائمہ اور اعاظم رجال علماء اسی دور میں تھے، مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام مالک، سفیان ثوری، امام اوزاعی، عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عیینہ، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، محمد بن اسحٰق، یحییٰ بن معین، وکیع بن جراح رحمہما اللہ وغیرہ۔ ان آئمہ کبار کی موجودگی میں کسی دوسرے کے علم وفضل کا چراغ اس وقت تک نہیں جل سکتا تھا جب تک وہ غیر معمولی حیثیت کا مالک نہ ہو۔ ان میں سے متعدد ائمہ امام ابو یوسفؒ کے استاذ تھے اور متعدد شاگرد تھے اور ان میں سے ہر ایک نے ان کے علم وفضل کا جن الفاظ میں اعتراف کیا ہے ان سے امام ابو یوسف کی علمی عظمت اور بلند پائیگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ جو آسمانِ علم کے مہر درخشاں تھے اور جن کے فیضِ صحبت سے ابو یوسف، امام ابو یوسفؒ ہوئے تھے وہ بھی ان کے مداح تھے۔ ایک بار امام ابو یوسفؒ بیمار پڑے امام صاحب عیادت کے لئے گئے جب وہ باہر نکلے تو بہت متفکر نظر آئے کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا یہ جوان مر گیا تو زمین کا سب سے بڑا عالم اُٹھ جائے گا[2]۔

علی بن صالح جو امام شعبہ اور ابن ابی ذہب جیسے ائمہ کی صحبت میں رہ چکے تھے، جب امام ابو یوسفؒ سے روایت کرتے تھے تو فرماتے تھے سید العلماء افقہ الفقہاء علماء کے سردار سب سے بڑے فقیہ یعنی ابو یوسفؒ نے یہ روایت کی ہے[3]۔

علی بن جعد درس دے رہے تھے، اثنائے درس میں امام ابو یوسفؒ کا تذکرہ آ گیا کسی نے کہا آپ جیسا آدمی بھی درس میں امام ابو یوسفؒ کا تذکرہ کرتا ہے، ان کو بڑا رنج ہوا اور اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا کہ امام ابو یوسفؒ کا نام لینے سے پہلے چاہئے تھا کہ تم اپنا منہ اشنان (ایک گھاس) اور

---

۱ حسن التقاضی ص ۵۱، یہ تمام واقعات صیمری، موفق الانتقاد جواہر مضیہ اور تاریخ بغداد وغیرہ میں مذکور ہیں۔

۲ موفق۔ جلد ۲۔ ص ۳ صیمری۔ جلد ۲۔ ص ۱۲۷

گرم پانی سے صاف کر لیتے پھر فرمایا کہ مارایت مثلہ میں نے ان کے جیسا کوئی صاحب علم نہیں دیکھا۔ یہ علی بن جعد امام مالک، سفیان ثوری، لیث بن سعد، شعبہ بن حجاج رحمہما اللہ وغیرہ ائمہ فقہ وحدیث کے فیض یافتہ تھے اس لئے ان کی رائے بہت ہی اہمیت رکھتی ہے[1]۔

حضرت بشر بن ولید نے ایک شخص سے کہا کہ تم امام ابو یوسفؒ کی تعظیم نہیں کرتے، میں نے ان کے مثل کسی کو نہیں پایا[2]۔

حضرت ہلال الرائے کہتے تھے کہ امام ابو یوسف تمام علوم کے جامع تھے فقہ ان کے علوم میں اقل العلوم تھی[3]۔

حضرت طلحہ بن جعفر فرماتے تھے کہ امام ابو یوسف مشہور ومعروف تھے۔ ان کا علم وفضل بلند درجہ تھا ان سے بڑھ کر ان کے زمانے میں کوئی نہیں تھا، علم وحکمت اور ریاست وقدر میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہؒ کا علم تمام عالم میں پھیلایا[4]۔

امام صاحب کے پوتے اسمٰعیل بن حماد فرماتے ہیں کہ میرے دادا (ابوحنیفہ) کے خاص اصحاب دس تھے لیکن اس میں کوئی امام ابو یوسفؒ سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔

امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی جیسے ائمہ جرح وتعدیل نے بھی ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے اور ان کی توثیق کی ہے۔ ان ائمہ کے اقوال آگے آئیں گے۔

ان اقوال سے ان کے علم وفضل کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا اس لئے کہ معاصرین اور ائمہ رجال کے اقوال وآراء کے آئینہ میں بھی اسلاف کی زندگی کے حسن وقبح اور ۔۔۔۔۔۔۔ خط وخال بڑی حد تک نظر آجاتے ہیں۔ لیکن یہ ان کے علم وفضل کا بہر حال ایک اجمالی خاکہ کہا جائے گا۔ تفصیل کے لئے ضرورت ہے کہ ان تمام فنون پر بحث کی جائے جن میں انہوں نے اپنے اجتہاد کے نقوش چھوڑے ہیں۔ خصوصیت سے قرآن اور حدیث وآثار کے سلسلہ میں۔

قرآن:

اوپر ذکر آچکا ہے کہ وہ قرآن کے حافظ تھے۔ قرآن سے ان کو اتنا انس وشغف تھا کہ بغیر خشوع وخضوع اور توجہ الی اللہ کے کسی کو پڑھتے ہوئے دیکھتے تو اس کو سخت تنبیہ کرتے تھے۔

---

[1] حسن التقاضی۔ ص ۳۰۔ [2] حسن التقاضی۔ ص ۳۰ [3] حسن التقاضی۔ ص ۲۹
[4] مقصد یہ ہے کہ علماء امام صاحب کے مستنبط کو سب سے زیادہ اشاعت انہی کے ذریعہ ہوئی۔

اُوپر یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ امام صاحب کے عام درس میں تو نہیں مگر ان کا جو خاص شورائی درس ہوتا تھا اس کی شرکت کے لئے حفظ قرآن پہلی شرط تھی۔ چنانچہ ان کے مخصوص تلامذہ میں امام محمدؒ، امام زفرؒ، حسن بن زیادہؒ، داؤد طائیؒ فضیل بن عیاضؒ سب حافظ قرآن تھے۔

امام صاحب نے یہ شرط ایک بڑے مقصد کی خاطر لگائی تھی، وہ یہ کہ امام صاحب کا طریقہ استنباط یہ تھا کہ ہر معاملہ میں وہ پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے، اس کے بعد آثار واحادیث کی طرف، اور اسی طریقہ پر وہ اپنے تلامذہ کی بھی تربیت کرتے تھے، پھر وہ اپنے اجتہاد واستنباط کو اپنے تلامذہ پر تھوپتے یا ان کی صرف املا نہیں کراتے تھے، بلکہ وہ ہر مجتہد فیہ اور مستنبط مسئلہ کو اپنی مجلس علمی میں پیش کرتے تھے، اس کے بعد سب کو قرآن وسنت میں غور کر کے رائے دینے کا اختیار دیتے تھے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کسی ایسے شاگرد کا اس مجلس میں گذر نہیں ہوسکتا تھا، جو حافظ قرآن نہ ہو، اور پھر اسی کے ساتھ اس میں قرآن سے اجتہاد اور استنباط مسائل کی پوری پوری صلاحیت موجود نہ ہو۔

امام صاحب کی اس مجلس درس میں امام ابو یوسفؒ کی جو حیثیت تھی، اس کا ذکر خود امام کی زبانی اوپر آچکا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کو قرآن میں غور وخوض اور اس سے تخریج مسائل کا کتنا ملکہ رہا ہوگا۔

فرماتے تھے کہ میں نے جن مسائل میں فتوے دیئے تھے، ان میں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے موفق تھے، انہیں تو باقی رکھا اور جو خلاف تھے ان سب سے رجوع کرلیا[1] یعنی امام صاحب کی مجلس درس میں جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کو دوبارہ کتاب وسنت کے معیار پر پرکھا، پھر اس کو اختیار کیا یا چھوڑا۔

قرآن پر غور وخوض اور اس سے نتائج اخذ کرنے کے لئے، حدیث وآثار کے علاوہ لُغت عرب اور بعض دوسرے علوم سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ ان تمام علوم کے جامع تھے، جن کی ضرورت ایک مجتہد کے لئے ضروری ہے، قرآن سے ان کے استدلال اور استنباط کی دو چار مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

مصارف زکوۃ کے سلسلہ میں قرآن کی یہ آیت :

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا .

'' زکوۃ، فقراء، مساکین اور ان کے وصول کرنے والوں کا حق ہے ''۔

کو آخر تک نقل کرنے کے بعد اس کی مجتہدانہ تفسیر وتفصیل کرتے ہیں۔

---

[1] موفق۔ جلد ۲۔ ص ۱۳۱

انہوں نے تفسیر میں آیت کی ترتیب بدل دی ہے یعنی پہلے انہوں مولفۃ القلوب کو لیا ہے، ان کے بارے میں عام ائمہ کی طرح ان کی بھی رائے یہی ہے کہ اب یہ مصرف باقی نہیں رہا[1]۔ پھر عاملین زکوٰۃ کا تذکرہ کرتے ہیں، اس میں انہوں نے ایک خاص بات یہ لکھی ہے، ان کو اتنا معاوضہ دینا چاہیے، کہ ان ضرویات زندگی پوری ہوسکیں، اس میں نہ تو اسراف کیا جائے، اور نہ بخل سے کام لیا جائے، اگر چہ معاوضہ اس کے اصل حصہ سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے[2]۔

پھر فقراء مساکین اور غارمیں کا ذکر کرنے کے بعد ابن السبیل (مسافر) کی تشریح کی ہے، انہوں نے یہ اجتہاد کیا ہے کہ اس میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ ان کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری، مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر وغیرہ بھی داخل ہوسکتی ہے، ان کی اصل عبارت یہ ہے۔

وفی ابناء السبیل سھم یحملون بہ ویعاونون۔

(کتاب الخراج۔ ص ۳۶)

''ایک حصہ مسافروں کا ہے جس کے ذریعہ ان کے لئے سواری اور راحت رسانی کا سامان کیا جائے''۔

اس کے بعد رقاب (گردن چھڑانا) کا تذکرہ کیا ہے، پھر فی سبیل اللہ کے مصرف کی تفصیل کی ہے، اس سلسلہ میں ان کا رجحان فی سبیل اللہ میں وسعت کی طرف معلوم ہوتا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں

وسھم فی اصلاح طرق المسلمین[3]۔

''ایک حصہ مسلمانوں کے عام اصلاح وترقی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے''۔

انہوں نے لکھا ہے کہ فقراء مساکین کا حصہ ومساکین کا حصہ تو خود اس بستی یا شہر کے مستحقین میں تقسیم کردیا جائے۔ مگر دوسرے مصارف میں امام وقت کو اختیار ہے، خواہ اسی جگہ صرف کردے یا دوسری جگہ بھیج دے۔

---

[1] امام شافعی، امام داؤد، اور دوسرے ائمہ کی رائے ہے کہ یہ اب بھی باقی ہے [2] یعنی صدقہ میں ۸ مصارف ہیں، ان میں مولفۃ القلوب کو نکال دیا جائے، تو عاملین کا حصہ ۱/۷ ہوا، اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ خواہ ان کو اصل حصہ یعنی ۱/۷ سے زیادہ ہی کیوں نہ مل جائے، مگر بہر حال ان کی ضروریات پوری کی جائیں، (کتاب الخراج۔ ص ۳۶)

[3] یہ بات راقم کو کسی اور جگہ نظر نہیں آئی

اسی طرح غنیمت وفئی کا جہاں تذکرہ کیا ہے، وہاں قرآن کی تمام آیات کو جمع کر کے بہت سے لطیف نکتے پیدا کئے ہیں، ہم یہاں ان کی پوری عبارت نقل کرتے ہیں، تا کہ ان کی وسعت نظر کا اندازہ کیا جا سکے۔

وَاعْلَمُوا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْئٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ ۔

''جان لو کہ بیشک جو تم مال غنیمت حاصل کو اس میں میں پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور ذوالقربیٰ کا ہے''۔

یہ آیت غنیمت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس میں ۱/۵ توان کا حصہ ہے، جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے، اور ۴/۵ فوج کا ہے، اور جوج میں وہی لوگ شامل نہیں ہیں، جو باقاعدہ حکومت کے ملازم ہیں یا ان کو حکومت نے مقرر کیا ہو بلکہ اس میں وہ لوگ بھی حصہ دار ہوں گے، جو رضا کارانہ شریک جہاد ہوئے ہیں [1]۔

اس سلسلہ میں ایک بحث یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس مختلف قسم کی سواریاں ہیں ان میں سے کس کو کتنا حصہ ملنا چاہیئے، مثلاً کسی کے پاس اچھے قسم کا گھوڑا ہے، دوسرے کے پاس ذرا گھٹیا قسم کا، اسی طرح دوسری سواریاں، تو کیا ان سب کو برابر حصہ ملے گا، یا سب کو ان کی سواری کی حیثیت کے مطابق ملے گا، بعض لوگ اس میں حیثیت کا لحاظ کرتے ہیں، مگر امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے کہ۔

ولا یفضل الخیل بعضھا علیٰ بعض

'' اور بعض گھوڑوں کی بعض پر ترجیح نہیں ہوگی ''۔

استدلال میں وہ قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا ۔

'' ہم نے گھوڑے اور خچر پیدا کئے تا کہ سواری کرسکو ''

دوسری جگہ قرآن میں ہے۔

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم ۔ (توبہ)

''اپنی طاقت بھر تیار کرو اسلحہ اور پلے ہوئے گھوڑوں تا کہ ان کے ذریعہ رعب ڈال سکو خدا کے اور اپنے دشمنوں پر''۔

---

[1] یہ بات راقم کو کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔

مقصد یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تخصیص نہیں ہے، بلکہ فائدہ کے لحاظ سے سب کو ایک ہی صف میں رکھا گیا ہے، مزید استدلال کے لئے وہ عربوں کے استعمالات سے بحث کرتے ہیں۔

وَالعرب تقول هذالخيل وفعلت الخيل لا يعنون بذالك الفرس ودن لبرذون

''اعلیٰ درجہ کے گھوڑے ہی مراد نہیں لیتے ہیں بلکہ کم تر درجہ کے گھوڑے بھی مراد لیتے ہیں''۔

اس استدلال کے بعد اس پر دیگر مسائل کو قیاس کرتے ہیں۔

ولا يفضل الفرس القوى على الفرس الضعيف ولا يفضل الرجل الشجاع التام السلاح على الرجل الذى لاسلاح له الاسيفه[1]

''اس سلسلہ میں کسی تندرست گھوڑے کو کمزور پر ترجیح نہیں ہوگی اور نہ کسی بہادر آدمی کو جو اسلحہ سے پورے طور پر لیس ہو اس شخص پر ترجیح ہوگی جس کے پاس ایک تلوار کے علاوہ کچھ نہ ہو''۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوسکتا ہے، کہ وہ قرآن میں کس قدر غور و خوض کرتے تھے، اور اس سے نتائج کے اخذ کرنے میں کتنی وسعت نظر سے کام لیتے تھے، اور اجتہاد و استنباط میں شریعت کی روح کو کس قدر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان کے اجتہادات سے دو باتیں خاص طور پر واضح ہوتی ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ حکومت کی فوج کے افراد اور وہ مجاہدین جو رضا کارانہ طور پر شریک جہاد ہوں دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے گا۔ (۲) دوسرے یہ کہ صرف سامان کی فراوانی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز نیت اور وہ جذبہ ہے جو اسے اس خدمت پر کھینچ کر لایا ہے، ممکن ہے ایک ہوائی جہاز سوار کے دل کے اندر کوئی جذبہ خیر موجود نہ ہو اور ایک خالی ہاتھ مجاہد جو مجاہدین کی معمولی خدمت میں لگا یا ہو اس میں طیارہ سوار سے زیادہ جذبہ موجود ہو، اس کا اندازہ تو بہر حال لگایا نہیں جاسکتا۔ اس لئے صرف سامان کی زیادتی کی بنا پر کسی کو زیادہ حصہ دینا اور کسی کو کم دینا مناسب نہیں ہے، بلکہ جب باطن کا حال معلوم نہیں ہے، تو حکم ظاہری پر ہونا چاہیئے، یعنی جو بھی ایک طرح کے کام میں لگا ہوا ہے، اس کو برابر حصہ ملنا چاہئے، اور پھر جن کی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک ہی طرح کے کام کرنے والوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے ورنہ معمولی کاموں کو لوگ دلچسپی کے ساتھ انجام نہ دیں گے۔

---

[1] کتاب الخراج۔ ص ۱۰

حدیث وآثار :

حدیث وآثار میں ان کی حیثیت امام کی تھی، اُوپر ذکر آچکا ہے، کہ سماع حدیث کا اتنا شوق تھا کہ ایک طرف امام صاحب کی مجلس درس میں فقہ کی تحصیل کرتے تھے، پھر وہاں سے فرصت پانے کے بعد ان شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، جن کے یہاں صرف حدیث کا املاوسماع کرایا جاتا تھا، بعض روایتوں میں ہے کہ یہ جس وقت امام صاحب کے درس میں شرکت کے لئے گئے تھے اس وقت ان کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا تھا[۱] - یہ بات تعجب خیز اس لئے نہیں ہے کہ ان کے حافظہ کا حال یہ تھا کہ وہ ایک مجلس میں جتنی حدیثیں سُنتے تھے وہ ان کو مع سند زبانی یاد ہو جاتی تھیں[۲]۔

ابو معاویہ ایک محدّث ہیں، جو بغداد میں درس حدیث دیتے تھے، ان کے پاس مشہور محدّث حجاج بن ارطاۃ کی مرویات کا ذخیرہ بہت تھا، انہوں نے اپنے تلامذہ سے فرمایا کہ امام ابو یوسفؒ کی موجودگی میں میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے۔ حجاج کی روایت کا ذخیرہ ان کے پاس ہم سے زیادہ ہے ان کا حال تو یہ تھا کہ ہم درس حدیث میں جو حدیثیں سُنتے تھے، انہیں لکھ لیتے تھے، اور ان کو بغیر لکھے ہوئے زبانی یاد ہو جاتی تھیں، اور یاد بھی اس صحت کے ساتھ ہو جاتی تھیں کہ ہم اپنی مکتوبہ احادیث کی ان سے صحت کرتے تھے[۳] اسی طرح ہارون اور دوسرے ائمہ حدیث نے بھی ان کے حفظ حدیث کی توثیق کی ہے۔

امام ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث کے چھٹے طبقہ میں شمار کیا ہے، جس میں یحییٰ بن معین، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عنیہ رحمہما اللہ وغیرہ ہیں۔

امام ذہبی نے امام ابو یوسفؒ کے حالات پر ایک الگ رسالہ لکھا ہے، جو اب احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

امام مزنی سے کسی نے آئمہ عراق کے بارے مین پوچھا تو انہوں نے امام صاحب کے بارے میں کہا سید ہم سب کے سردار، امام ابو یوسفؒ کے متعلق کہا۔

اتبعھم للحدیث

''ان میں سب سے زیادہ حدیث کی پیروی کرنیوالے''۔

۱؎ کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۲۶　　۲؎ یعنی راویوں کے ساتھ حدیث کا حفظ بہت غیر معمولی بات ہے۔

۳؎ تاریخ بغداد۔ جلد ۱۴۔ و تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ا۔ ص ۲۶۱

امام محمد کی بابت کہا سب سے زیادہ مسائل اخذ کرنے والے اور امام زفرؒ کے بارے میں کہا، قیاس میں سب سے زیادہ بہتر[1] یحییٰ بن معین فرماتے تھے۔ میں نے آئمہ مجتہدین میں ان سے زیادہ ثبوت اور حفظ فی الحدیث اور صحیح روایت کرنے والا نہیں پایا، انہی کا قول ہے کہ امام ابو یوسفؒ صاحب سُنت تھے، وہ اصحاب حدیث کی طرف مائل تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ اوّل جب مجھ کو حدیث کی تحصیل کا خیال پیدا ہوا، تو امام ابو یوسفؒ کی خدمت میں گیا[2] اور ان ہی کا قول ہے : **کان منصفافی الحدیث** حدیث میں انصاف پسند تھے[3]۔

علی المدینی فرماتے تھے کہ ابو یوسف صدوق حد درجہ سچے تھے۔

حدیث و آثار کے بارے میں یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل اور ابن المدینی کی رائے بہت قیمتی سمجھی جاتی ہے، ان تینوں بزرگوں کی متفقہ رائے ہے کہ امام ابو یوسفؒ حدیث میں مہارت رکھتے تھے، لیکن اگر ان ائمہ میں کسی کی رائے ہم کو نہ بھی معلوم ہوتی تب بھی حدیث و آثار میں ان کا جو کارنامہ اور ان کی جو قلمی یادگاریں ہیں، وہ خود حدیث میں ان کی مہارت اور غیر معمولی درک کا پتہ دیتی ہیں، حدیث و آثار کے سلسلہ میں ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک کتاب الآثار جس کے راوی ان کے صاحبزادے یوسف ہیں دوسری کتاب الخراج جس کو خود انہوں نے مرتب کیا ہے، کتاب آلا ثار میں احادیث و آثار کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے، کتاب الخراج کا موضوع گو خالص فقہی ہے، مگر اس میں مشکل سے کوئی مسئلہ ایسا ہوگا، جس کے لئے قرآن یا حدیث یا آثار نبوی یا آثار صحابہ سے دلیل نہ لائی گئی ہو۔

امام ابو یوسفؒ کے زمانہ میں عام طور پر درس کا طریقہ یہ تھا کہ شیوخ حدیث اپنے تلاندہ کو حدیث کا املا کرادیتے تھے، اور ائمہ فقہ صرف فقہ کا درس دیدیتے تھے، لیکن امام ابو یوسف کے درس کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہ دونوں کا مجمع البحرین ہوتا تھا، وہ درس میں نہ تو صرف **اخبرنا و حدثنا** ہی پر اکتفا کرتے تھے، اور نہ **قال اقول** ہی پر بلکہ اگر ایک حدیث سناتے تھے، تو اسی کے ساتھ اس سے اخذ کیے ہوئے نتائج و مجتہدات کو بھی طلبہ کے سامنے رکھتے جاتے تھے۔

---

[1] جزء الذہبی۔ ص ۴۰ [2] امام احمد بن حنبلؒ کا یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے، اس دور میں بیشمار محدثین تھے مگر حدیث کے سلسلہ میں منصفانہ مزاج رکھنے والے بہت کم تھے ایک طرف کچھ لوگ محض روایت پرستی میں مبتلا تھے، دوسری طرف کچھ اس سے بے نیاز ہوگئے، تفصیل آگے آتی ہے

امام علی مدینی فرماتے ہیں کہ جب امام ابو یوسفؒ ۱۸۰ھ میں بصرہ آئے، تو ہم لوگ ان کی خدمت میں استفادہ کے لئے پہنچے ان کا طریقہ درس یہ تھا کہ اگر وہ دس حدیثیں بیان کرتے، تو دس فقہی رائیں بھی ان کے ساتھ پیش کرتے تھے [1]۔

حدیث دانی صرف اس کا نام نہیں ہے کہ جو روایت اپنے شیخ سے سُنی اس کو طلبہ کے سامنے رکھ دیا یا املا کرا دیا بلکہ اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے مسائل اخذ کئے جائیں اس سے اجتہاد و استنباط کیا جائے، تا کہ احادیث رسُول سے زندگی کے ہمہ گیر نظام کے لئے زائد سے زائد روشنی حاصل کی جا سکے، چنانچہ حدیث کے سلسلہ میں انہوں نے بھی دونوں طرح کی خدمتیں انجام دیں مگر ان کا اصلی کارنامہ سُنت رسُول ﷺ سے استخراج مسائل ہے، اعمش مشہور امام حدیث (ان کے شیوخ میں ہیں) نے ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ سے کوئی مسئلہ پوچھا، جواب سُن کر فرمایا کہ یہ کہاں سے اخذ کیا؟ کہا کہ فلاں حدیث سے اعمش نے ہنس کر کہا کہ یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے، جب تمہارے والدین کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، مگر میں اس سے مسئلہ مستنبط نہ کر سکا تھا۔

''خراج'' کے موضوع پر خود ان کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، مگر سب کی سب بغیر استثنا نقل و روایت کا مجموعہ ہیں اجتہاد و استنباط کی کوئی علامت ان میں نہیں پائی جاتی، مزید تفصیل تصانیف اور اجتہاد و استنباط کے عنوان کے تحت آئے گی، یہاں صرف ان کا ایک قول نقل کر دیا جاتا ہے، فرماتے تھے کہ بارالہا! میں کتاب اللہ سے اس کے بعد سُنت رسول ﷺ سے اخذ مسائل کیا ہے لیکن جہاں مجھے سُنت نبوی نہیں ملی، وہاں میں نے امام صاحب کے قول پر عمل کیا۔

مختصر طور سے یہ کہنا صحیح ہوگا، کہ امام ابو یوسفؒ، امام صاحب کے اصحاب میں سب سے زیادہ حدیث دان تھے، لیکن ان کا یہ اصول تھا کہ وہ تحدیث روایت کو بغیر روایت کے صحیح نہیں سمجھتے تھے فرماتے تھے کہ جو شخص کثرت روایت کے ساتھ جو حدیث طلب کریگا وہ رسُول اللہ ﷺ پر کچھ نہ کچھ ضرور جھوٹی تہمت لگا دے گا [2] ان کا دوسرا بیان ہے کہ جو مشہور و معروف احادیث کو چھوڑ کر، شواذ کے پیچھے دوڑے گا، ہو آپ پر جھوٹ باندھے گا۔

فقہ :

ان کے علم و فضل کا سب سے وسیع میدان یہی ہے، اس میں انہوں نے تمام علوم سے زیادہ اپنی جودت طبع اور جولانی فکر کا ثبوت دیا ہے اور فقیہ ہی کی حیثیت سے دنیا ان کو جانتی ہے، امام صاحب

---

[1] جزء الذہبی۔ ص ۱۴۲ [2] کردری۔ ص ۳۳۰۔ جلد ۲ موفق۔ جلد ۲۔ ص ۲۳۴

ان کو افقہ اصحابی میرے اصحاب میں سب سے زیادہ فقیہ فرماتے تھے، علی بن صالح ان کو افقہ الفقہاء، اور سید الفقہاء کہتے تھے، یحییٰ بن معین فرماتے تھے، افقھم۔۔۔۔۔۔ اہل عراق میں سب سے زیادہ افقہ تھے، فقہ میں ان کی متعدد یادگاریں ہیں جن کا تذکرہ آگے آئے گا ان کی صرف ایک کتاب ''اختلاف ابن ابی لیلیٰ وابی حنیفہ ان کے تفقہ کے ثبوت کے لئے کافی ہے تفصیل آگے آئے گی۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ اصول فقہ کی تدوین ہے[۱]۔ باقاعدہ اصول فقہ کی تدوین اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی[۱]۔ امام ابو یوسفؒ پہلے شخص تھے، جنہوں نے اس فن کو باقاعدہ مدون کیا، افسوس ہے کہ یہ کتاب ناپید ہے، تذکرون میں صرف اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی منقول ہے، کہ وہ اصول فقہ کے سب سے پہلے مولف ہیں، یہ دونوں باتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں، اس لئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی طرح، اصول فقہ کی بھی تجدید کی، اور ان کی تجدید صرف فروغ تک نہیں بلکہ اصول میں بھی تھی، اس لحاظ سے ان کو اس فن کا پہلا مولف قرار دے سکتے ہیں، مگر حقیقتاً تقدم۔۔۔۔۔ امام صاحب اور ان کے تلانذہ ہی کو حاصل ہے۔

فقہ حنفی کی جس کتاب کو بھی اُٹھا کر دیکھیے اس میں امام ابو یوسفؒ کے اقوال، مجتہدات اور استنباطات ملیں گے، لیکن پھر بھی ان کا فقہی کارنامہ امام محمد کے مقابلہ میں کم ہے، گو امام محمدؒ کی کتابیں ان سے استفادہ کی بہت زیادہ مرہون منت ہیں۔

فرائض :

فرائض یعنی وہ فن جس میں وصیت اور وراثت کی تقسیم کے مسائل بیان کیے جاتے ہیں، فقہ ہی کا ایک شعبہ ہے، مگر اہمیت کے لحاظ سے یہ مستقل ایک فن ہوگیا ہے، اس فن کے لئے سب سے زیادہ ضرورت حساب ذاتی کی ہے، امام صاحب کے تلانذہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد دونوں اس حیثیت سے ممتاز تھے، امام ابو یوسفؒ فرماتے تھے کہ میں نے فرائض کے مسائل ایک مجلس میں امام صاحب سے سیکھ لئے تھے، امام ابو یوسفؒ اس سے صرف واقف ہی نہیں تھے بلکہ اس میں مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، صحابہ میں اس فن کے جاننے والے متعدد حضرات تھے مگر ان میں حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت علیؓ خاص

---

[۱] باقاعدہ کی قید اس سے لگائی گئی ہے کہ یہ فن امام ابو یوسف کا ایجاد کردہ نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت کے کلیات کو سامنے رکھ کر صحابہ اور تابعین نے بہت سے مسائل مستنبط کئے تھے، انہی اصول و کلیات اور صحابہ سے مستنبط مسائل کی روشنی میں انہوں نے اصول فقہ مرتب کیا امام ابو یوسف سے پہلے اس موضوع پر ایک کتاب خود امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھی تھی جو کتاب الرائے کے نام سے مشہور ہے۔ [۲] کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۳۷

طور پر ممتاز تھے، چنانچہ امام ابو یوسف اس میں اکثر انہی کا اتباع کرتے تھے، کہتے تھے کہ جہاں ان دونوں بزرگوں میں اختلاف ہوجاتا ہے وہاں میں حضرت علیؓ کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں [1] اس کی وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت علیؓ حضرت زیدؓ سے زیادہ قوت فیصلہ رکھتے تھے، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ اقضا کم علیؓ، تم سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں۔

ان علوم کے علاوہ دوسرے دینی علوم جو قرآن وسنت کے لئے ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً تاریخ، سیرت، ادب ونحو اور ایام عرب وغیرہ سے بھی واقف تھے، اسی بنا پر امام صاحب فرماتے تھے، کہ میرے اصحاب میں یہ سب سے زیادہ جامع العلم ہیں [2] ان کی مہارت کا اندازہ ان کی کتابوں سے ہوتا ہے، خصوصیت سے ''کتاب الخراج'' میں اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ سیرت ومغازی میں انہوں نے محمد بن اسحاق سے استفادہ کیا تھا، جو اس وقت اس فن کے امام تھے، عربی ادب ولغت کا بصرہ کے بعد دوسرا مرکز کوفہ کا تھا وہی ان کا مولد ہے، پھر امام ابو یوسفؒ خالص عربی النسل تھے، اس لئے ان علوم کی تحصیل کی ان کو قطعاً ضرورت نہیں تھی، اسی طرح نحو یعنی قواعد عرب کے سیکھنے کی بھی ضرورت ان کو نہیں تھی، مگر پھر بھی وہ ایک فن بن گیا تھا، اس لئے اس کو بقدر ضرورت حاصل کیا، خود فرماتے ہیں، کہ میں نے ایک ماہر نحوی سے نحو کے مسائل کو ایک مجلس میں حاصل کرلیا، ممکن ہے اس سے مراد کسائی یا سیبویہ ہوں۔

علم تاریخ سے ان کی واقفیت کا اندازہ لگانے کے لئے ان کی کتاب الخراج کا مطالعہ کافی ہے، ان کا طریقہ یہ ہے کہ جو باتیں تاریخ سے متعلق ہوتی ہیں، ان کی مختصر تاریخی حیثیت واضح کرنے کے بعد پھر شرعی حیثیت بیان کرتے ہیں، مثلاً اہل سواد کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے خراسان، مصر، افریقہ، اور سندھ وغیرہ پر بڑی جامع گفتگو کی ہے۔ پھر اسی طرح جزیہ کے بیان کے سلسلہ میں بعض مقامات اور قبائل کی تاریخی حیثیت واضح کی ہے، اگر کسی جگہ کے بارے میں ان کو خود علم نہ ہوتا تھا تو وہ جاننے والوں سے دریافت کرکے لکھتے تھے۔ چنانچہ جب ہارون نے ان سے اہل شام اور اہل جزیرہ کے بارے میں دریافت کیا، تو امام ابو یوسف کو چونکہ ان کی تاریخی حیثیت معلوم نہیں تھی، اس لئے انہوں نے حیرہ کے کسی صاحب نظر واقف کار کو لکھا، چنانچہ ان کا جو جواب آیا، امام ابو یوسفؒ نے اسی کتاب میں نقل کردیا ہے، اس کے چند ابتدائی الفاظ یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

---

[1] کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۲۷ [2] کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۲۶

جزیرہ قبل اسلام دو حصوں میں منقسم تھا، ایک رومی عیسائیوں کے قبضہ میں تھا، دوسرا ایرانیوں کے اوران میں سے ہر ایک حکومت اپنی فوج رکھتی تھی، اور محصل مقرر کرتی تھی، راس العین سے فرات تک کا علاقہ حکومت روم کے قبضہ میں تھا، اور نصیبین اور اس کی پشت کا علاقہ دجلہ تک حکومت ایران کے ماتحت تھا، اسی طرح سیل ماردین اور دارا سے سنجار تک کا حصہ اہل فارس کا مقبوضہ تھا، اور جبل ماردین ودارا وطور وعبدین اہل روم کا ان حکومتوں کی سرحدوں پر ایک سرحدی چوکی کے طور پر ایک قلعہ تھا، جو حصن سرجا کے نام سے مشہور تھا۔

قبل از اسلام کی تاریخ بیان کرنے کے بعد اسلام کے بعد کی تاریخ بیان کی ہے خط دو تین صفحہ کا ہے، مگر اس میں پچاسوں صفحے کے مضمون کو انہوں نے سمیٹ لیا ہے۔

بہر نوع امام ابو یوسفؒ کے اندر وہ تمام صلاحیتیں اور علم وفضل کی وہ تمام لیاقتیں موجود تھیں جو ایک مجتہد کے لئے ضروری ہیں، اب ہم ان کے اجتہاد واستنباط پر مفصل بحث کرتے ہیں۔

اجتہاد واستنباط :

عموماً مجتہدین کی دو قسم مانی جاتی ہے، ایک مجتہد مطلق غیر منتسب[1] دوسرے مجتہد منتسب مطلق یا مجتہد مطلق مقید مذہب، متاخرین علمائے احناف کی کتابوں میں ائمہ مجتہدین اور اصحاب فتاویٰ کے درجات کی جو تقسیم کی گئی ہے، اس میں یہ کہا گیا ہے کہ امام ابو یوسف امام محمد وغیرہ مجتہد مطلق نہیں بلکہ مجتہد فی المذہب تھے، مجتہد مطلق سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں نے کتاب وسنت سے براہ راست اجتہاد کے اصول مرتب کیے، اور اس سے تفریع مسائل کی، جیسے ائمہ اربعہ تھے، مجتہد فی المذہب یا مجتہد منتسب ان کو کہتے ہیں کہ جنہوں نے ان ائمہ کے مرتب کردہ اصول کی روشنی میں مسائل کی تخریج کی، جیسے امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور دوسرے ائمہ کے مشہور تلامذہ۔

بعض فقہ وتذکرہ کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے، کہ صاحبینؒ فرماتے تھے، کہ ہم نے امام صاحب سے جہاں اختلاف کیا ہے، اور ان کے قول کو مرجوع قرار دیا ہے، وہ بھی امام صاحب ہی کا قدیم قول تھا، جسے انہوں نے مرجوح سمجھ کر ترک کر دیا تھا، اسی طرح کے اور بھی اقوال منقول ہیں، جن سے ان کا مجتہد مقید بہ مذہب ہونا معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] اگر مجتہد مطلق غیر منتسب کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اجتہاد کسی کے فیض تربیت کا مرہون منت بھی ہے تو پھر اسی لحاظ سے مجتہد مطلق غیر منتسب تو سوائے رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، مجتہد مطلق منتسب کی تعریف میں ائمہ اربعہ داخل ہو سکتے ہیں، مگر عام طور پر ائمہ اربعہ کو پہلی قسم میں شمار کیا گیا ہے حالانکہ ان ائمہ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی صحابی یا تابعی کی طرف منتسب ہے۔

مگر یہ کہنا بڑا ظلم ہے۔۔۔۔۔۔ کہ صاحبین امام صاحب کے مقلد محض تھے۔۔۔۔۔۔ حالانکہ ۔۔۔۔۔ کہ وہ خود امام اور مجتہد مطلق تھے، یہ ان کی احسان شناسی ہے کہ انہوں نے اپنی ذات اپنے اساتذہ سے بے نیاز کر کے دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا، حالانکہ وہ کر سکتے تھے۔ پھر امام ابو یوسف ؒ کو اور امام محمدؒ کو اجتہاد و استنباط میں ائمہ ثلاثہ امام مالک امام شافعی اور امام احمد سے گھٹانا اور کم رتبہ قرار دینا بھی بڑی زیادتی ہے، جب کہ خود ان ائمہ اور ان کے مشہور تلامذہ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ لوگ اجتہاد و استنباط میں ان سے کسی طرح کم نہ تھے، اس کی تفصیل تو ہم آئندہ کریں گے، ہم پہلے مختصراً اجتہاد و استنباط کی تعریف اس کے اصول و شرائط پر بحث کرتے ہیں، تا کہ اندازہ ہو جائے، کہ یہ ائمہ فقہ خصوصیت سے امام ابو یوسف مجتہد مطلق تھے یا مجتہد منتسب، اجتہاد کی تعریف علماء نے یہ کی ہے۔

هوا استفراغ المجهود في استنباط الحكم الفرعي عن دليله [1]۔

"اصل سے کسی فرعی سلسلہ کے استنباط میں اپنی وسعت بھر کوشش کرنے کا نام اجتہاد ہے"۔

اجتہاد کے اصول و شرائط کیا ہونے چاہئیں، اس میں مختلف رائیں ہیں، جو چیزیں سب میں مشترک ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) کتاب اللہ کا عالم ہو، یعنی قرآن کے لغوی اور شرعی معانی سے واقف ہو اس کے طرز کلام کو جانتا ہو، افراد و ترکیب اور ناسخ و منسوخ پر اس کی نظر ہو۔

(۲) سنت رسول اللہ میں اسے درک ہو، یعنی روایات کی سند اور ان کی متون سے واقفیت ہو، بعض لوگوں نے قرآن کی آیات اور احادیث کی تعداد پر بھی بحث کی ہے، یعنی یہ کہ مجتہد ــ لئے کتنی آیتوں اور حدیثوں میں بصیرت پیدا کرنا ضروری ہے، مگر یہ بحث فضول ہے، مجتہد کے لئے پورے قرآن اور احادیث کے تمام متداول ذخیروں پر نظر ضروری ہے۔

(۳) اجماع کے موارد اور مواقع سے واقف ہو۔

(۴) قیاس کے شرعی طریقوں سے واقف ہو۔

ان شرائط کو سامنے رکھیئے۔ اور پھر امام ابو یوسف کے علم و فضل اور کتاب و سنت آثار صحابہ اور تعدیل صحابہ سے ان کی واقفیت کا جو ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس پر ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ کیا ان کے

---

[1] اصول فقہ کی کتابوں میں اس کی متعدد تعریفیں کی ہیں، یہ تعریف بڑی جامع اور مانع ہے، تفصیل کے لئے ارشاد الفحول امام شوکانی اور المستصفی امام غزالی اور الاحکام آمدی کی طرف رجوع کرنا چاہئے

مجتہد مطلق قرار دینے کے لئے وہ کافی نہیں ہے، پھر امام صاحب کا طریقہ درس اس قدر مجتہدانہ ہوتا تھا، کہ اس میں موارد اجماع اور وجود قیاس کی ہر روز مشق ہوتی تھی، اوپر امام صاحب کے طریقہ درس کا مختصرا تذکرہ آچکا ہے، اس سلسلہ میں چند اور باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

امام صاحب کے سامنے جب کوئی نیا مسئلہ پیش ہوتا وہ اپنے ممتاز تلامذہ سے پوچھتے کہ تم لوگوں کے پاس، اس بارے میں کوئی حدیث نبوی یا اثر صحابہ موجود ہے، تلامذہ اپنی اپنی معلومات کے بقدر آثار واحادیث پیش کرتے اس کے بعد امام صاحب کو جو معلومات ہوتیں وہ سب کے سامنے رکھتے، پھر وہ اس میں غور کرتے۔ اگر آثار مختلف ہوتے تو جس قول کی تائید میں نقلی دلائل ان کو زیادہ مل جاتے، تو اسی کے مطابق فیصلہ کردیتے، اگر آثار تقریباً برابر ہوئے تو پھر غور خوض کر کے کوئی رائے قائم کرتے، ظاہر ہے کہ یہ مشق وتمرین اسی لئے تو کرائی جاتی تھی کہ ان میں شان اجتہاد پیدا ہو، اسی بنا پر امام صاحب کے مسلک کو شورائی مسلک کہا جاتا ہے، کروری کا بیان ہے۔

مذهبه شورى بينهم ولم يستبدفيه بنفسه دونهم اجتهادامنه في الدين

"ان کا مسلک شورائی تھا یعنی وہ اپنے تلامذہ سے ہر مسئلہ میں مشورہ کرتے تھے اور کسی دینی مسئلہ میں اجتہاد کرتے وقت وہ نہ تو خود رائی سے کام لیتے تھے، اور نہ اپنی رائے کو تلامذہ پر تھوپتے تھے"

پھر ان کے طریقہ درس کے بارے میں لکھتے تھے۔

فكان يطرح مسئله مسئله لهم ثم يسئال ماعندهم ويقول ماعنده وهم نياظرهم في كل مسئله شهرا اركثروياتي يدلائل ثم يثبتها الامام ابويوسف في الاصول [1]

"وہ ایک ایک مسئلہ کو باری باری تلامذہ کے سامنے رکھتے تھے، پھر اس کے بارے میں ان سے سوال کرتے تھے، اور اس بارے میں انکی رائے اور دلائل سننے کے بعد اپنی رائے اور اپنی دلیل پیش کرتے تھے، اور پھر ان سے مباحثہ کرتے تھے یہاں تک کہ ایک ایک مسئلہ میں بحث ومباحثہ کرتے ایک مہینہ یا اس سے بھی زیادہ دن لگ جاتے تھے، پھر اس کے بعد امام ابو یوسفؒ اس مسئلہ کو اصول مذہب میں داخل کرلیتے تھے"

---

[1] کروری۔ جلد ا۔ ص ۵۰

اور نہ صرف ان کا طریقہ درس ہی ایسا تھا کہ اس سے اجتہاد و استنباط کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی، بلکہ تلامذ کو یہ عام ہدایت تھی کہ۔

لایحیل لا حد ان یقول بقولی مالم یعلم من این قلت

(حسن التقاضی ص ۲۲)

''کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ میری کسی رائے کے مطابق کوئی فتوی دے جب تک کہ اس کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ میں نے یہ رائے کس دلیل کی بنا پر قائم کی ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کے جن مجتہدات کو ان کے تلامذہ نے اپنی تحقیق میں کتاب و سنت کے مطابق نہیں پایا، ان سے اختلاف کیا، اور ان کے مقابلہ میں اپنے مجتہدات پیش کیے، اور یہ اختلاف صرف دو چار مسائل میں نہیں ہے بلکہ بعض فقہاء کے قول کے مطابق امام صاحب سے دو ثلث مسائل میں صرف صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے اختلاف کیا ہے، امام زفرؒ کے اختلافات اس کے علاوہ ہیں۔

ان تصریحات سے آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مجتہد مطلق تھے یا مجتہد فی المذہب۔

عام فقہائے احناف نے اجتہاد و استنباط کے لحاظ سے مجتہدین کے درجات کی جو تقسیم کی ہے، اس موقع پر اس کو مختصر پیش کرنے کے بعد اس کی تردید میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا پیش کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مجتہدین کے درجات کی تفصیل ابن حجر مکی نے ''شن الغارۃ'' میں جو کی ہے اسی کو شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور مولانا عبدالحئی صاحبؒ وغیرہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

ابن کمال بارہویں صدی کے مشہور علمائے دولت عثمانیہ میں گذرے ہیں، انہوں نے مجتہدین اور فقہاء کے طبقات پر ایک رسالہ لکھا ہے۔ متاخرین فقہاء نے عام طور پر اسی کو اختیار کیا ہے ہم یہاں اس کا تھوڑا سا خلاصہ نقل کرتے ہیں۔

اعلم ان الفقهاء علی سبعة طبقات الطبقة الاولیٰ طبقة المجتهدین فی الشرع کالائمة الاربعة الثانیة طبقة المجتهدین فی المذهب کابی یوسف و محمد و سائر اصحاب ابی حنیفة......فانهم و ان خالفوه فی بعض الاحکام الفرعیة لکنهم یقلدونه فی قواعد الاصول[1]۔

---

[1] حسن التقاضی ص ۲۵

'' فقہا کے سات طبقہ اولیٰ کے فقہا میں وہ ائمہ مجتہدین ہیں جو مجتہدین فی الشرع کہے جاتے ہیں جیسے ائمہ اربعہ دوسرا طبقہ۔۔۔۔مجتہدین فی المذہب کا ہے جیسے امام ابو یوسفؒ امام محمد اور دوسرے اصحاب ابو حنیفہؒ۔۔۔۔۔ان لوگوں نے بعض فروعی احکام میں امام صاحب کی مخالفت کی ہے لیکن اصول میں ان کے مقلد ہیں ''

اسی طرح انہوں نے سات درجات میں تمام فقہائے احناف کو تقسیم کیا ہے، ہم نے طوالت کے خیال سے اتنا ہی عبارت نقل کی ہے، ابن کمال کے اس رسالہ کا بیشتر حصہ قابل تقلید ہے، چنانچہ خدا جزائے خیر دے علامہ مرجانی متوفی ۱۳۰۶ھ کو کہ انہوں نے بڑی تفصیل سے اس پر بحث کی ہے، اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے جتنا حصہ ہمارے موضوع سے متعلق ہے، ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔

هذا ماذكره و قداورده اليتمي في طبق اته بحر وفه ثم قال وهو تقسيم حسن جداواقول بل هو بعيد عن الصحة بمراحل فضلاً عن حسنه جدافانه تحكمات باردة و خيالات فارعة و كلمات لاروح لها و الفاظ غير محصلة المعنى.... فليت شعري مامعنى قوله ان ابايوسف و محمد اوزفروان خالفواابا حنيفة في الاحكام لكنهم يقلدونه في قواعدالاصول ماالذى يريدمن الاصول ؟ فان اراد منه الاحكام الاجماليته التى يبحث عنها في كتب اصول الفقه فهي قواعد عقيلة و ضوابط برهانية يعرفها المرء من حيث انه ذو عقل و صاحب فكر ونظر سواء كان مجتهد اولا تعلق لها بالاجتهادقط و شان الائمة الثلاثه ارفع واجل........ وحا لهم في الفقة ان لم يكن ارفع من مالك والشافعي و امثالهما فليسوا بدونهما وجرى مجرى الامثال قولهم (ابو حنيفة ابويوسف) بمعنى ان البالغ الى درجة القصوى في الفقاهته هوابويوسف وقولهم (ابويوسف ابوحنيفة) بمعنى ان ابا يوسف بلغ الدرجة القصوى من الفقاهته

'' ابن کمال نے جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ خلاصہ ہے، اس تقسیم کو تیمی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اور اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بہترین تقسیم ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ صحت اور حقیقت سے اس کو انتہائی بعد ہے اس تقسیم میں بے دلیل دعوے، بے کار خیالات آرائی،

بے روح اور بے مغز باتیں ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے اس قول کے کیا معنی ہیں کہ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر نے اگرچہ بعض احکام میں، امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ہے مگر اصولی باتوں میں ان کی تقلید کرتے ہیں؟ اصول سے ان کی کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد وہ اجمالی احکام ہیں جن سے اصول فقہ میں بحث کی جاتی ہے تو یہ قواعد تو عقل اور دلائل کی مدد سے مرتب کئے گئے ہیں جن کو ہر صاحب عقل اور صاحب فکر و نظر جانتا ہے خواہ وہ مجتہد ہو یا غیر مجتہد اجتہاد سے اس کا قطعی تعلق نہیں ہے۔ اور ان آئمہ ثلٰثہ کی شان بہر حال اس سے بلند ہے کہ ان کو اس درجہ میں رکھا جائے حالانکہ فقہ و اجتہاد میں امام ابو یوسف اور امام محمد وغیرہ کا مرتبہ امام مالک اور امام شافعی سے بلند نہیں ہے تو ان سے کمتر بھی نہیں ہے اور یہ بات تو ضرب المثل بن گئی ہے کہ ابوحنیفہ تو ابو یوسف ہیں یعنی فقاہت میں امام ابو یوسف امام صاحب کے رتبہ تک پہنچ گئے ہیں اور بعض لوگوں کا یہ قول بھی ہے کہ ابو یوسف ابوحنیفہ ہیں۔ یعنی مرتبہ اجتہاد میں امام صاحب اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے''۔

اس کے بعد انہوں نے تمام ممتاز فقہاء اور ائمہ کے وہ اقوال نقل کئے ہیں جن سے ان کے مجتہد مطلق ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

وكفى بذالك شهادة له ولكل واحد منهم اصول مختصة به تفردوا بها عن ابى حنيفة وخالفوا فيها ومن ذلك ان الاصل فى تخفيف النجاسة تعارض الا دلة عند هما عند ابى حنيفة رحمة الله واختلاف الا ئمة.

''ان ائمہ کی یہ شہادتیں ان کے مجتہد مطلق ہونے کے لئے کافی ہیں ان میں سے ہر ایک کے کچھ مخصوص اصول تھے جن میں انہوں نے امام صاحب سے تفرد اختیار کیا تھا اور ان ہی میں ان سے اختلاف کرتے تھے۔ انہی اصول میں سے ایک یہ ہے کہ تخفیف نجاست میں اصول یہ ہے کہ اس کے دلائل میں تعارض ہے اور صاحبین کے نزدیک ائمہ کے اختلاف کی وجہ سے اس میں تخفیف سے کام لیا گیا ہے''۔

اس کے بعد یہ امام غزالی اور امام الحرمین کے اقوال نقل کرتے ہیں

قال الغزالى انهما خالفا ابا حنيفة فى ثلثى مذهبه و نقل النووى فى كتابه تهذيب الاسماء واللغات عن ابى المعالى الجوينى ان كل

ام اختارة المزنی اری انه تخریج ملتحق بالمذهب فانه لا یخالف اقال الشافعی لا کابی یوسف و محمد فانهما یخالفان اصول صاحبهما .

''امام غزالی نے لکھا ہے کہ صاحبین نے دو تہائی مسائل میں امام صاحب سے اختلاف کیا ہے اور امام نووی نے تہذیب الاسماء میں امام جوینی سے نقل کیا ہے کہ امام مزنی نے جن مسائل کو ترجیح دی ہے وہ امام شافعی کے کسی قول ہی سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ امام شافعی کے اقوال کی اس طرح مخالفت نہیں کرتے جس طرح امام ابو یوسف اور امام محمد امام ابوحنیفہ سے اصول وفروع میں اختلاف کرتے ہیں''۔

پھر انہوں نے امام ابوجعفر طبری کی یہ رائے نقل کی ہے کہ وہ امام احمد بن حنبل ؒ کو مجتہدین میں شمار نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو وہ صرف حفاظ حدیث میں شمار کرتے تھے اسی طرح ابن خلدون نے لکھا ہے کہ

و امام احمد بن حنبل فمقلده قليل لبعد مذهبه عن الا جتهاد [1] .

''اور امام احمد بن حنبل ؒ تو ان کے مقلدین اس لئے بہت کم ہیں ان کے مسلک میں اجتہادی خصوصیت کم ہے''۔

تو امام احمد ؒ کو مجتہدین مطلق میں شمار کیا جائے اور امام ابو یوسف ؒ اور امام محمد ؒ جن کے اجتہادات سے امام احمد ؒ نے استفادہ کیا ہو ان کو مقلد قرار دیا جائے۔ یہ ایک طرح کا ظلم ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اجتہاد کے مآخذ وشرائط یعنی کتاب وسنت، اجماع، قیاس اور آثار صحابہ پر بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کسی چیز میں بھی وہ امام صاحب کے مقلد نہیں تھے بلکہ وہ براہ راست ان مآخذ سے استنباط مسائل کرتے ہیں۔

یہ اتنی مفصل بحث ہے کہ اس کے بعد کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اب ہم ان کی کتابوں سے چند ایسے مسائل کا جو ان کے اور امام صاحب کے درمیان مختلف فیہ ہیں، تذکرہ کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ وہ محض فروع میں نہیں بلکہ اصول میں بھی مخالفت کرتے ہیں۔

اس وقت امام ابو یوسف کی تین کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں۔ کتاب الآثار، کتاب الخراج اور اختلاف ابی لیلیٰ وابی حنیفہ۔ ان ہی سے انتخاب کرکے چند مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] اوپر ذکر آچکا ہے کہ حدیث میں سب سے پہلے امام احمد نے ابو یوسف سے استفادہ لیا، کسی نے فقہی مسائل کے بارے میں پوچھا کہ یہ مسائل آپ نے کہاں سے معلوم کئے تو انہوں نے فرمایا کہ ''امام محمد کی کتابوں سے''۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ فقہی مسائل میں انہوں نے خود اجتہاد کیا ہے۔

(۱)　دریا سے اگر زیورات اور بڑی مچھلیاں برآمد ہوں تو ان کا خمس لیا جائے گا یا نہیں؟ اس بارے میں ان ائمہ کی رائیں ملاحظہ ہوں، امام صاحب کی رائے ہے کہ اس میں خمس نہیں لیا جائے گا اور اس کی اصولی دلیل یہ ہے کہ جس طرح چھوٹی مچھلیوں پر کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا اس میں بھی نہیں لیا جائے گا۔

امام ابویوسفؒ نے ان سے اختلاف کیا ہے، ان کی رائے ہے کہ ۱/۵ تو حکومت لے گی اور ۴/۵ اس شخص کا حصہ ہے جس نے ان کو نکالا ہے۔ امام صاحب سے ان کا اختلاف اس اصول پر ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اختلاف فروعی نہیں بالکل اصولی ہے، وہ یہ ہے کہ دریا کے حاصلات ہی میں حکومت کو ٹیکس لینے کا حق ہے یا نہیں، اور ہے تو کس حد تک اور نہیں ہے تو کس حد تک۔

(۲)　حدود کے سلسلہ میں بحث ہے کہ مشرکین جو دار الاسلام میں موجود ہوں ان پر حدود جاری کئے جائیں گے یا نہیں امام صاحب کی رائے ہے کہ اہلِ شرک پر حدود جاری نہیں کئے جائیں گے۔ امام ابویوسفؒ کی رائے ہے کہ ان پر بھی حدود جاری کئے جائیں گے۔ سرخسی نے مبسوط میں تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور دونوں کے اصولی دلائل نقل کئے ہیں۔ اس مسئلہ میں امام محمدؒ کی رائے دونوں بزرگوں سے مختلف ہے، کیا یہ اختلاف صرف فروع کا ہے یا اصول کا۔

ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے، اگر ۔۔۔۔۔۔۔ ان آئمہ کے اصول اور فروعی اختلافات دیکھنا ہوں تو اختلاف ابی لیلیٰ وابی حنیفہ کا مطالعہ کر لینا چاہئے۔

اس بحث کو صرف اس لئے طول دیا گیا ہے تاکہ یہ واضح طور پر دیکھا جائے کہ امام صاحب کے کم از کم تین تلامذہ کے بارے میں یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ مجتہد مطلق نہیں تھے یا اپنے اجتہاد میں وہ ان اصولوں کے پابند تھے جو امام صاحب نے مقرر کر دیئے ہیں۔

جیسا کہ علامہ مرجانی نے لکھا ہے کہ یہ تو معمول نہیں کہ وہ اصول ہیں۔ کیا جن سے یہ آئمہ باہر نہیں گئے اگر ان سے مراد وہ چار اصول کتاب اللہ، سنتِ رسول، اجماع اور قیاس ہیں تو پھر اس حیثیت سے تو امام صاحب بھی مجتہد مطلق نہیں ہیں کہ وہ خود اہلِ عراق[۱] کے متبع ہیں۔

---

[۱] اہل عراق سے مراد وہ صحابہ اور تابعین ہیں جن کے فقہ وفتاویٰ پر اہل عراق امام صاحب سے پہلے عمل کرتے تھے اور جن کی رائے کا امام صاحب سب سے زیادہ لحاظ کرتے تھے۔

پھر یہ بھی ایک بڑی زیادتی ہے کہ بعض ان بزرگوں کو جن میں اجتہاد و استنباط کی اتنی بھی صلاحیت نہیں تھی جتنی کہ ان بزرگوں میں تھی ان کو تو مستقل مجتہد تسلیم کیا جائے اور صاحبین کو مقلد فی الاجتہاد کا رتبہ دیا جائے :

علمِ کلام :

امام ابو یوسفؒ کے زمانہ میں علم کلام کے مسائل کا چرچا اور اس میں بحث و مباحثہ ایک عام چیز بن گئی تھی۔ اس بحث سے نہ تو خلفاء و امراء کے دربار خالی تھے نہ فقہا و محدثین کی مجالس درس اور نہ عوام اور بازاری لوگوں کے حلقے، خصوصیت سے ایمان کی کمی و زیادتی، قرآن کے مخلوق و غیرہ مخلوق ہونے، گناہ کبیرہ کے مرتکب کے کافر ہونے اور خدا تعالیٰ کی تجسیم و عدم تجسیم و غیرہ کے مباحث کا تقریباً ذکر ہر مجلس اور ہر گھر میں تھا۔

یہی مسائل اس وقت کی ثقاہت و عدم ثقاہت اس سے بھی بڑھ کر فسق و فجور، صلاح و تقویٰ بلکہ ایمان و کفر کا معیار بنے ہوئے تھے جس نے کسی گروہ کے خیالات سے اختلاف کیا جھٹ دوسرے فریق نے اس کو زندیق، فاسق بلکہ کافر تک بنا دیا۔

فقہا اور محدثین میں جو حضرات محتاط تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ان مسائل پر گفتگو کرنے اور ان پر رائے دینے سے احتراز کیا اور اپنی حد تک دوسروں کو بھی وہ اس سے روکتے رہے مگر پھر بھی بسا اوقات انہیں اپنی رائے ظاہر ہی کرنی پڑتی تھی۔ اب وہ رائے جن لوگوں کے خلاف پڑتی تھی، وہ ان کو مطعون کرتے تھے اور ان کے اثر سے بعض اوقات ہمارے فقہاء و محدثین بھی اس شخص کے بارے میں رائے قائم کر لیتے تھے اور ان کو مطعون کرتے تھے، اسی اثر سے بعض خلفاء نے بڑے بڑے ائمہ سے وہ سلوک کیا جو ایک معمولی آدمی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ امام احمد اسی طرح کے ابتلا میں پڑے تھے۔ مثال کے طور پر ارجاء کے مسئلہ کو لیجئے یعنی یہ کہ آدمی کی نجات کے لئے عمل ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا ایمان کافی ہے یہ مسئلہ اس خیال کا ردِ عمل ہے کہ آدمی اگر گناہ کبیرہ کرے تو وہ مومن نہیں رہتا، ظاہر ہے کہ یہ کتاب و سنت سے خلاف بات تھی اس لئے اس پر بعض ائمہ نے اپنی زبان کھولی، خصوصیت سے امام صاحب نے۔ انہوں نے کہا کہ ایمان ایسی سیال چیز نہیں ہے جو کسی معمولی اشارہ سے بہہ جائے بلکہ ٹھوس حقیقت ہے اس کو بے عملی یا ارتکاب معاصی زائل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سے ان کا یہ مقصد بالکل نہیں تھا کہ آدمی عمل کرنا چھوڑ دے مگر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی یا پھیلائی گئی کہ امام صاحب اس معنی میں مرجیہ ہیں کہ وہ عمل کو کوئی ضروری چیز نہیں سمجھتے جس سے ہمارے سیدھے سادھے محدثین بھی متاثر ہو

گئے حالانکہ اگر کوئی امام صاحب کی زندگی ہی پر ایک سرسری نظر ڈال لے تو اس سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ تمام آئمہ بلکہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ عامل بالسنۃ صالح اور متقی تھے، کیا ان کے قول اور عمل میں کوئی تضاد تھا؟ نہیں بلکہ لوگوں نے ان کی بات سمجھنے میں سخت غلطی کی۔

امام صاحب سے چونکہ لوگوں نے یہ سوء ظن قائم کر لیا تھا اس لئے اس جرم میں ان کے تلامذہ بھی شریک کر لئے گئے اگر آپ صرف تاریخ بغداد ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خطیب تمام مناقب اور فضائل کے ذکر کے بعد ان ائمہ کے بارے میں یہ رائے دیتے ہیں کہ یہ مرجیہ تھے، خلق قرآن کے قائل تھے۔ جہمیہ تھے اسی طرح بعض دوسرے تذکرہ نگار بھی ان اقوال کو نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ امام ابو یوسفؒ کی طرف بھی یہ تمام جرائم منسوب کئے گئے ہیں مگر ہم خود امام ابو یوسفؒ کے اقوال نقل کر دیتے ہیں جس سے ان تمام الزامات کی تردید ہو جائے گی جو ان پر اس سلسلہ میں لگائے گئے ہیں۔

خلق قرآن :

امام ابو یوسفؒ کے زمانہ میں اس مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی[1]۔ ان سے بھی اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ :

''قرآن اللہ کا کلام ہے اور جو شخص یوں اور کیسے کی شق نکالتا ہے اور اس کے بارے میں ردوکد کرتا ہے وہ قید و بند اور سخت تعزیز کا مستحق ہے''۔ (حسن التقاضی ص ۳۵)

یہ کہنے کے بعد وہ اپنے تلامذہ سے کہتے تھے کہ اس بات کو اچھی طرح گرہ دے لو۔

ایک بار ایک شخص نے لوگوں میں یہ مشہور کیا کہ امام یوسف خلق قرآن کے قائل ہیں۔ ان کے تلامذہ نے سنا تو ان کو بڑی تشویش ہوئی وہ ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے بارے میں یہ بات معلوم ہوئی ہے آپ تو اس سے پہلے برابر ہم لوگوں کو اس مسئلہ میں پڑنے سے روکا کرتے تھے، انہوں نے سنا تو بڑے غصہ میں فرمایا :

اے کم عقلو! یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ سکتے ہیں ان کو میرے اوپر کوئی بہتان تراش لینے میں کیا باک ہو سکتا ہے۔

پھر فرمایا ! کہ

اهل بدع يحكون كلامهم ويكذبون على الناس (ص ۳۶)

''اہل بدعت بات اپنی طرف سے کہتے ہیں اور لوگوں پر جھوٹ باندھتے ہیں''۔

---

[1] اس کی پوری تفصیل امام احمد کے حالات میں ملے گی۔

جہمیت :

ان کے خاص خاندان کے ایک نوجوان نے ایک بار جہمیت [1] کا اظہار کیا تو انہوں نے ۳۵ کوڑے کی سزادی۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ اس کی شہادت قبول کرتے ہیں جو اس بات کا قائل ہے کہ اللہ کسی چیز کو اس کے وقوع سے پہلے نہیں جانتا، فرمایا ایسے شخص اگر توبہ نہ کرے تو میں قتل کردوں گا نہ کہ اس کی شہادت قبول کروں گا۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قصداً ان ائمہ کے بارے میں بعض معاندین کیسی کیسی بے سروپا باتیں اڑاتے رہتے تھے۔

ایمان :

ایمان کے سلسلہ میں بھی امام ابو یوسفؒ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کہی جاتی تھیں یہاں تک کہ بعض لوگوں نے کہا کہ وہ اپنا اور حضرت جبریل کا ایمان برابر سمجھتے ہیں، جب ان کو معلوم ہوا تو اس کی تردید کی۔

من قال ایمانی کایمان جبریل فهو صاحب بدعة [2]

''جو یہ کہتا ہے کہ میرا ایمان حضرت جبریل کے ایمان کی طرح ہے وہ بدعتی ہے''۔

وہ فرماتے تھے کہ خراسان میں بھی دو گروہ ہیں جن سے برابر دنیا میں کوئی نہیں ہے، ایک مجسمہ [3]، دوسرے جبریہ۔ انہوں نے ایک بہت جامع نصیحت تمام تلامذہ کو کی تھی جس کا خلاصہ یہاں نقل کردیتے ہیں:

ذروا الخصومة فی الدین والمراء فیه والجدال، فان الدین واضح بین قد فرض الله عزو جل فرائضه و شرع سننه وجدوده واحل

---

[1] یہ فرقہ جہم بن صفوان کی طرف منسوب ہے۔ نفی صفات کے سلسلہ میں ان کا اور معتزلہ کا ایک ہی عقیدہ ہے، ان کے پانچ اصول ہیں، ایک یہ کہ جن صفات سے بندہ متصف ہے اس سے خدا کو متصف نہ ہونا چاہئے۔ مثلاً انسان میں علم وقدرت تو خدا تعالیٰ کو ان صفات سے خالی ہونا چاہئے نعوذ باللہ دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ کو اگر کسی چیز کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا علم نہیں ہوتا یعنی اس کا علم حادث ہے جو خلق کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ انسان اور عام مخلوقات مجبور محض ہیں، چوتھے یہ کہ خلود کو وہ ہمیشگی پر محمول نہیں کرتے ہیں، پانچویں یہ کہ جس شخص کو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اگر وہ زبان سے کفر کا اظہار کرے جب بھی کافر نہیں ہوتا۔ ان اصولوں کی تمام اہل سنت نے تردید کی ہے تفصیل کے لئے ملل والنحل دیکھی جائے۔ [2] کردری۔

[3] مجسمہ یعنی وہ لوگ جو خدا کے لئے جسم واعضا ثابت کرتے ہیں۔ جبریہ جو انسان کو مجبور محض رکھتے ہیں گناہ وثواب کا اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے۔

حلاله وحرم حرامه فقل اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام ديناً فاحلوا حلال القرآن وحرموا حرمه واعلموا بحكم وآمنو بالمتشابه منه واعتبروا بالا مثال فيه . فلو كانت الخصومة في الدين تقوى عند الله بسق اليها رسول الله صلى الله عليه وسلم واصحابه بعده فهل اختصموا في الدين تنازعوا فيه وقد اختصموا في الفقه تكلموا فيه واختصموا في الفرائض والصلاة والحج والطلاق الحلال والحرام ولم يختصموا في الدين ولم يتنازعوا فيه فاقتصروا على تقوى الله وطاعته والزموا ما جرت السنة ودعوا ما احدث المحدثون من التنازع في الدين . وقد انزل الله عزوجل في كتابة اذا رايت الذين يخوضون في اياتنا فاعرض عنهم ولو شاء انزل في ذالك جدلاً وحجاباً ولكنه ابى ذالك وقال ولا تقعدوا معهم وقال فان حاجوك فقل اسلمت وجهي الله ومن اتبعن ولم يقل وحاجهم .

''دین کے بارے میں شک لڑائی کج بحثی اور جدال چھوڑ دو اس لئے کہ دین بالکل واضح ہے۔ خدا نے اس کے فرائض بھی مقرر کر دیے ہیں اور اس کی سنتیں بھی اور اس کے تمام حدود مقرر کر دیے ہیں اور حلال کو حلال اور حرام کو حرام کر دیا ہے جیسا کہ اس نے خود فرمایا ''میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر تمام کر دیا اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا تو اس کے مطابق حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔ قرآن کی محکم یعنی واضح آیات پر عمل کرو اور متشابہ آیات ہیں ان پر ایمان و یقین رکھو اور اس کے اندر جو امثال ہیں یعنی مثالیں ان سے عبرت حاصل کرو''۔ اگر دین کے مسائل میں کج بحثی کوئی تقوی کی بات ہوتی تو اس کی طرف سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ، آپ کے بعد آپ کے اصحاب اس کی طرف سبقت کرتے تو کیا انہوں نے کبھی عقائد کے مسائل میں بھی کج بحثی کی۔ انہوں نے اگر اختلاف اور بحث و مباحثہ کیا تو فقہی مسائل میں جن کا تعلق عمل سے ہے، انہوں نے اگر گفتگو کی تو فرائض، نماز، حج، طلاق جیسے مسائل میں اور حلال اور حرام میں انہوں نے ایمانیات میں کبھی قیل و قال نہیں کیا۔ انہوں نے خدا کے تقوی اور اس کی اطاعت پر بس کیا اور انہوں نے سنت متواترہ کو

مضبوط پکڑ لیا تھا اور جوان مبتدعین نے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو انہوں نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ جب دیکھو کہ وہ ہماری آیات میں کرید کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنی کتاب میں جدال اور قیل وقال کا طریقہ بھی نازل فرما سکتا تھا مگر اس سے اس نے گریز کیا اور یہ حکم دیا کہ ان کے ساتھ نہ بیٹھو'' ، اور نبی ﷺ سے کہا کہ ''اگر وہ تم سے حجت کریں تو کہہ دو کہ میں نے اور جن لوگوں نے میری اتباع کی ہے اپنی پوری توجہ خدا کی طرف مبذول کر لی ہے آپ سے یہ نہیں کہا گیا کہ آپ بھی ان سے بحث مباحثہ اور قیل وقال کیجئے''۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام ابو یوسفؒ کا دامن ان الزامات سے پاک ہے جو ان پر بعض لوگوں نے عائد کرنے کی کوشش کی ہے ان کا یہ قول آج تک زبان زد عام ہے کہ

جس نے دین علم[۱] کلام کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی اس نے بے دینی کو راہ دی۔

جرح وتعدیل :

وہ ائمہ اور بزرگان دین جو صدیوں سے کروڑں آدمیوں کے متبوع چلے آرہے ہیں اور جن کی جلالت اور امامت پر سب کا اتفاق ہے ان کی عدالت وثقاہت پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ان کے بارے میں کوئی جرح قابلِ اعتنا ہے۔ مگر پھر بھی ایک سوانح نگار کا کام ہے کہ وہ جس کی سوانح عمری لکھ رہا ہے۔ اس کی زندگی کے ہر گوشہ کو اجاگر کرے اور اس کے بارے میں اگلوں نے جو رائے دی ہے اسے بھی من وعن نقل کر دے اس لئے یہاں مختصراً اس سے بحث کی جاتی ہے۔

امام احمدؒ، یحییٰ بن معین، ابن مدینی اور امام کزی جو جرح وتعدیل کے امام ہیں ان سب نے ان کی توثیق کی ہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا مختصر تذکرہ لکھا ہے اس کے بعد الگ ایک رسالہ ان کے حالات میں لکھا ہے جو اب چھپ کر بازار میں آگیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں :

ان کے علم وفضل میں کسی کو شبہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے جن لوگوں نے ان پر جرح کیا ہے وہ ناقابلِ اعتبار ہے[۲]۔

---

[۱] مقصود وہ مباحث ہیں جن میں خصوصیت کے خدا کی ذات وصفات کی بحث ہوتی ہے وہ چونکہ انسانی دسترس سے باہر ہیں اس لئے انسان ان کے بارے میں اٹکل پچو تیر چلاتا ہے۔　[۲] جزء الذہبی۔ ص ۴۶

ابن جوزی نے ان کو ان سو حفاظ میں شمار کیا ہے جو پوری اُمت میں ممتاز ہیں۔ اسی طرح ابن حبان، ابن عبدالبر نے بھی ان کی ثقاہت وعدالت کی توثیق کی ہے۔

ابن جریر فرماتے ہیں: ''یہ حفظ حدیث میں مشہور ومعروف ہیں''۔

ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم ان سے حدیث کی روایت نہیں کرتے تھے۔

لیکن ابوزراعہ اور ابن ابی حاتم کی رائے یحییٰ بن معین، ابن مدینی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی پھر ابن حاتم نے تو امام بخاری پر بھی جرح کی ہے، ظاہر ہے کہ ان کی رائے زیادہ محتاط نہیں کہی جاسکتی۔

خطیب نے عقیلی اور ابن ثابت کی جرح بھی نقل کی ہے۔ امام ذہبی اس جرح کے بارے میں لکھتے ہیں:

واخبار فی الحط علیه بعضها لیس بصحیح اوروها العقیلی وابن ثابت فی تاریخ بغداد وغیرها

''ابو یوسف کو گرانے کے لئے جو باتیں عقیلی اور ابن ثابت کے ذریعہ تاریخ بغداد اور غیرہ میں منقول ہیں ان میں بعض بالکل صحیح ہیں''۔

ایک جرح خطیب نے نقل کی ہے اس میں ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ ان کا ذکر اچھے الفاظ سے نہیں کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد کسی نے ان کی موت کی اطلاع دی تو انہوں نے مسکین یعقوب (یعنی دنیا سے خالی گئے) کے الفاظ فرمائے۔

ظاہر ہے کہ اس روایت کی غلطی دو وجہوں سے ثابت ہے ایک تو یہ کہ عبداللہ بن مبارک امام ابویوسفؒ سے دو سال پہلے وفات پاچکے تھے مگر یہاں ان کو زندہ اور امام ابویوسف کو مردہ دکھایا جارہا ہے۔ دوسری یہ کہ اس روایت میں کئی راوی غیر ثقہ ہیں۔

اسی طرح دارقطنی کی جرح بھی نقل کی گئی ہے۔ مگر دارقطنی نے اپنی کتاب ''غرائب مالک'' میں امام محمدؒ کو ثقہ قرار دیا ہے پھر خطیب نے ان سے یہ نقل کیا ہے کہ امام ابویوسف کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ

هو اقوی من محمد بن حسن

''وہ محمد بن حسن سے زیادہ قابلِ اعتماد تھے''۔

ظاہر ہے کہ امام محمدؒ سے زیادہ ثقہ قرار دینے کے معنی تو ان کی تعدیل ہوئی۔ اب اگر کوئی جرح ان سے ثابت بھی ہو جائے تو تعدیل کو جرح پر ترجیح ہونی چاہئے۔

ایک جرح یہ نقل کی ہے کہ اس حدیث میں جس میں رسول اللہ ﷺ کے حج کا ذکر ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ غابہ سے ثنیۃ الوداع تک گئے، خطیب نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کو غابہ کا تلفظ تک معلوم نہیں تھا اور وہ غابہ (ب) کے بجائے غایہ (ی) کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس نے بارہا حج کیا ہو اور ان مقامات کو خود دیکھا ہو اور مغازی و سیر محمد بن اسحٰق سے پڑھی ہو، امام اوزاعی کی سیرت پر نقد کیا ہو اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں کس طرح قابلِ اعتبار ہو سکتی ہیں۔

غرض یہ کہ امام ابو یوسفؒ پر جتنی جرحیں کی گئی ہیں وہ زیادہ تر یا تو سوءِ ظنی کی بنا پر ہیں یا امام صاحب سے تلمذ کی وجہ سے اس لئے کہ اس وقت امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی اور سوءِ ظنی قائم تھی کہ یہ لوگ حدیث و آثار کے مقابلہ میں قیاس و رائے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ صرف سوءِ ظنی اور غلط فہمی ہے، ممکن ہے اس وقت سوءِ ظنی کسی حد تک صحیح رہی ہو۔ مگر اس وقت جب کہ امام صاحب کی مجلس مشاورت اور ان کے تلامذہ کے اجتہادات سے جو بنا بنایا مسلک ہمارے سامنے موجود ہے اس کے بارے میں کیا یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے کوئی نسبت نہیں ہے اور وہ صرف رائے و اجتہاد کا مجموعہ ہے۔ پھر اس میں امام صاحب اور ان کے تلامذہ کو جو قبول عام حاصل ہو وہ بھی بہت سے معاصرین کے لئے وجہ خلش تھا۔

حیل :

اما ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی طرف تذکرہ میں بہت سے حیل منقول ہیں۔ ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ کوئی ایسی لطیف تدبیر کرنا جس سے نہ تو شریعت کا حکم بدلتا ہو نہ وہ کسی نص صریح سے ٹکرانی ہو نہ اس سے کسی کا حق مارا جاتا ہو اور نہ اس سے کسی باطل کو ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو، کوئی ممنوع چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ مباح ہے۔ مثال کے طور پر ہجرت کے واقعہ کو سامنے رکھئے جب کسی نے راستہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ سے آنحضرت ﷺ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ

رجل یھدینی السبیل ۔   "ایک شخص ہیں جو مجھے راستہ بتا رہے ہیں"۔

غور کیجئے! کہ آپ نے کتنے لطیف انداز سے سائل کا جواب بھی دے دیا اور خطرہ سے آپ ﷺ کو بچا بھی لیا اور واقعیت میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ جن آئمہ نے حیلوں سے کام لیا ہے یا ان کو مباح قرار دیا ہے ان کے سامنے بھی یہی مثال تھی نہ کہ مکر و فریب کو حیل سمجھتے تھے، حاشا و کلا۔

امام ابو یوسفؒ نے ایک بار ایک شخص کو اس کا مال بچانے کی ایک جائز تدبیر بتائی جس پر ان کے شاگرد ابوالقیظان نے ان سے کہا کہ یہ تو وہی بات ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے لئے چربی حرام کر دی تھی تو انہوں نے یہ کیا کہ اس کو پگھلا کر فروخت کر دیتے اور اس کی قیمت اپنے مصرف میں لاتے۔ امام ابو یوسف نے فرمایا اگر انہوں نے ایک حرام کو حلال کرنے کے لئے ایسا کیا تھا مگر ہم کوئی تدبیر اگر کرتے تو اس کے لئے کہ حلال کو حرام نہ ہونے دیں [1]۔

مثال کے لئے ایک اور واقعہ نقل کیا جاتا ہے ایک بار امام ابو یوسف کے یہاں خلیفہ ہادی کے خلاف ایک باغ کا مقدمہ پیش ہوا۔ ظاہری طور پر حق خلیفہ کا معلوم ہوتا تھا، شہادت وغیرہ بھی اسی کی طرف سے گذری تھی مگر امام ابو یوسف نے تحقیق کی تو حق اس غریب دعویٰ کرنے والا ہی کا معلوم ہوا جس کے خلاف شہادت گزر چکی تھی۔ امام ابو یوسفؒ نے مقدمہ اس وقت ملتوی کر دیا، ہادی سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ میرے معاملہ میں کیا فیصلہ ہو فرمایا مدعی آپ سے قسم لینا چاہتا ہے پوچھا کیا آپ اس کو صحیح سمجھتے ہیں، امام ابو یوسف کا اپنا ذاتی مسلک یہ نہیں تھا اس لئے انہوں نے اپنی کوئی رائے نہیں دی بلکہ یوں کہا "ابن ابی لیلیٰ اس کو صحیح سمجھتے تھے"۔

ہادی نے کہا اچھا تو پھر آپ باغ اس کو واپس کر دیجئے۔

ظاہر ہے کہ یہ تدبیر شرعی نقطہ نظر سے کوئی قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان ائمہ کو بہت سے مظلوموں کی جان بچانے اور کتنے لوگوں کے حق واپس کرنے کے لئے بھی اس قسم کی تدبیریں کرنی پڑتی تھیں، اگر اسی کا نام حیلہ ہے تو پھر شرعی نقطہ نظر سے اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔

خطیب بغدادی اور دوسرے بعض سوانح نگاروں نے امام ابو یوسف کی طرف بہت سے ایسے حیلے منسوب کئے ہیں جو انہوں نے ہارون رشید کے لئے کئے تھے مگر وہ اس لئے ناقابلِ اعتبار ہیں کہ ان کی پوری زندگی جس کا نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے اس سے ان کی تردید ہوتی ہے۔

امام ابو یوسفؒ کی طرف منسوب کتاب المخارج والحیل کے نام سے ایک مستقل کتاب مصر کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہے۔ ایک جرمن مستشرق جوزف شخت نے طبع کرا دیا ہے مگر اس پر نام امام محمد کا درج ہے۔

زرّیں اقوال :

امام ابو یوسفؒ کے بہت سے حکیمانہ مقولے اور زریں اقوال کتابوں میں درج ہیں۔ ان میں سے چند کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ فرماتے تھے کہ

---

[1] مناقب موفق جلد ۲۔ ص ۲۲۱

بارالٰہا! میرے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش آیا تو پہلے میں نے کتاب اللہ میں غور کر کے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی اگر کتاب اللہ میں اس کا جواب نہیں پایا تو پھر سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیا اگر اس میں بھی جواب نہ ملا تو آثار صحابہ اور ان کے تعامل پر غور کیا اگر اس میں بھی جواب نہ ملا تو میں نے امام صاحب کو اپنے اور آپ کے درمیان واسطہ بنایا (یعنی ان کے قول پر عمل کیا)۔

اے اللہ تو جانتا ہے کہ جب میرے پاس دو فریق آئے اور ان میں سے ایک ضعیف اور دوسرا اقوی تھا تو میں نے دونوں میں ہمیشہ مساوات رکھی، میں نے اس بارے میں خلیفہ اور ایک بازاری آدمی کو یکساں سمجھا، میرا قلب کبھی کسی کی وجاہت وقوت کی طرف مائل نہیں ہوا، اے اللہ! اگر میں نے ایسا کیا ہے تو میری مغفرت کر دے۔

فرماتے تھے کہ بسا اوقات مجھ سے کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کیا گیا اور اس کی علت بھی میری سمجھ میں آ گئی مگر زبان سے اس کے اظہار پر قادر نہیں تھا اس وقت میری مثال اس شخص کیسی ہوتی تھی جس کے سامنے ایک درہم رکھا جائے اور اس سے پوچھا جائے کہ یہ کھرا ہے یا کھوٹا، تو جواب میں کھرا یا کھوٹا کہے مگر جب اس سے اس کی علت اور وجہ دریافت کی جائے تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے حالانکہ وہ اس کا کھرا کھوٹا ہونا جانتا ہے اور اس کا قلب اس پر مطمئن ہے مگر زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ فرماتے تھے کہ بعض اوقات میں نے دو مسئلوں میں بال برابر فرق کیا ہے اور بعض اوقات پہاڑ کے برابر اور بعض وقت کو دل میں محسوس کر لیا۔ مگر زبان سے یارائے اظہار نہیں تھا۔

تلامذہ فرماتے تھے کہ اے لوگو! صرف رضائے الٰہی کے لئے علم حاصل کرو، اس میں کوئی دوسری غرض شامل نہ ہو۔ میرا خود اپنا حال یہ تھا کہ جس مجلس میں متواضع ہو کر شریک ہوا۔ اس سے بلند ہو کر اٹھا اور جس مجلس میں علم کے غرور و پندار کے ساتھ گیا اس میں ذلت وفضیحت ہوئی، پس خبردار اللہ ہی کے لئے علم حاصل کرو۔

فرمایا اس شخص کی صحبت سے بچو جو قیامت کی ذلت اور رسوائی سے نہیں ڈرتا۔

فرماتے تھے کہ تین نعمتیں اصل ہیں ایک اسلام کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ دوسری صحت کہ اس کے بغیر کوئی راحت خوشگوار نہیں ہو سکتی، تیسری فارغ البالی کہ اس کے بغیر زندگی پرسکون نہیں ہوتی۔

فرماتے تھے کہ علم ایسی چیز ہے کہ جب تم اپنی پوری زندگی اس کو دے دوگے تب جاکر اس کا کچھ حصہ تم کو ملے گا، جب تم کو اس کا بعض حصہ ملے گا تو اس پر تکیہ نہ کرو بلکہ برابر اس میں لگے رہو۔

فرماتے تھے کہ حکومت کے ذمہ داروں کا پھٹے حال رہنا اور موٹی جھوٹی زندگی اختیار کرنا ذلت کا باعث ہے اور قضاۃ اور علماء کے لئے سادہ زندگی قابلِ فخر ہے۔

فرماتے تھے کہ جو شاذ و نادر حدیث کے پیچھے پڑے گا اور آنحضرت پر بہتان تراشی میں ضرور مبتلا ہو جائے گا اور جو علم کلام کے ذریعہ دین حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ گمراہی میں پڑ جائے گا اور جو کیمیا سازی کے ذریعہ مال و دولت کمانے کی کوشش کرے گا وہ مفلس ہی رہے گا۔

تصانیف :

امام ابو یوسف ان بزرگوں میں ہیں جنہوں نے ابتدائی صدیوں میں علوم دینیہ کی تدوین میں حصہ لیا تھا بلکہ بعض فنون کی تدوین میں انہیں اولیت حاصل ہے۔ اس کا شمار کثیر التصانیف علماء میں ہوتا ہے۔ کشف الظنون میں ہے کہ

ان الا مالی لا بی یوسف فی ثلثمائة مجلد .

''امام ابو یوسف کی امالی تین سو جلدوں میں تھیں''۔

ابن ندیم نے متداول کتابوں کے علاوہ ان کی ایک امالی کا ذکر کیا ہے جو ۳۶ مباحث پر مشتمل تھی اور دوسری کتاب ''کتاب الجوامع'' کا ذکر بھی کیا ہے جس کے ۴۰ حصے تھے۔ اس کے اندر علماء کے فقہی اختلافات و آراء کا مفصل تذکرہ ہے یہ کتاب انہوں نے یحییٰ بن برمکی کی فرمائش پر لکھی تھی۔

ابن ندیم نے ایک کتاب اختلاف (علماء) الامصار کے نام سے بھی ان کی تصانیف میں شمار کی ہے لیکن یہ تمام کتابیں زمانہ کی دستبرد کی نذر ہو گئیں۔

ایک کتاب انہوں نے امام مالک کے دور میں لکھی تھی جس میں ان کے بعض فقہی مسائل پر تنقید تھی۔

ان کی سب سے اہم کتاب اصول فقہ پر تھی جس کی تدوین میں ان کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

اس کتاب کے بارے میں محمد بن جعفر کہتے ہیں۔

داول من وضع الکتاب فی اصول الفقه[1] علی مذهب ابی حنیفة

''وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ کے مسلک کے مطابق اصول فقہ کی تدوین کی''۔

---

[1] مفتاح السعادۃ و کردری و موفق وغیرہ۔

لیکن تاتاریوں کے حملوں اور مصر کے آئے دن کے انقلابات میں نہ جانے اس طرح کے کتنے گنجہائے گرانمایہ خاک کی نظر ہوگئے انہی میں یہ کتابیں بھی تلف ہوگئیں۔

امام شافعیؒ کے بارے میں بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے اصول فقہ پر انہی نے الرسالہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اہلِ علم کے ہاتھوں میں موجود ہے مگر ان دونوں رایوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے حنفی مسلک پر اصول فقہ کی تدوین کی تھی اور امام شافعی نے خود اپنے مسلک کے اصول متعین کئے تھے اس لئے دونوں کی اولیت کی حیثیت جداگانہ ہے۔ پھر امام شافعیؒ کی اولیت اس لحاظ سے بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی کتاب آج بھی موجود ہے اور امام ابو یوسف کی کتاب کا سراغ نہیں ملتا لیکن اس کے باوجود زمانہ کے اعتبار سے امام ابو یوسف متقدم ہیں۔

امام ابو یوسف کی جو کتابیں اس وقت مطبوعہ یا مخطوطہ موجود ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب الآثار اس میں وہ احادیث و آثار جمع کر دیئے ہیں جو حنفی مسلک کے ماخذ ہیں، اس میں انہوں نے زیادہ تر امام ابو حنیفہ ہی سے روایتیں کی ہیں اور دوسرے شیوخ کی بہت کم روایتیں اس میں ہیں۔ بعض جگہ اپنی مرویات کا اضافہ بھی کر دیا ہے اس کو مسندِ ابو یوسف بھی کہا جاتا ہے اس میں ایک ہزار سے زیادہ احادیث و آثار ہیں۔ کتاب کے راوی امام ابو یوسف کے صاحبزادے یوسف ہیں جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، اس کتاب کو لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد نے شائع کیا ہے اس پر مولانا ابوالوفا افغانی مدظلہ صدر مجلس کے بہت سے مفید حواشی بھی ہیں۔

(۲) اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ ذکر اوپر آچکا ہے کہ امام ابو یوسف پہلے ابن ابی لیلیٰ[۱] کے یہاں تحصیل علم کرتے تھے۔ اس کے بعد امام صاحب کی خدمت میں گئے امام صاحب اور ابن ابی لیلیٰ میں بہت سے فقہی مسائل میں اختلاف تھا۔ امام ابو یوسفؒ نے اپنے ان دونوں اساتذہ کے اختلافات کو کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے، اس کتاب میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ بیسیوں جگہ امام ابو یوسفؒ نے امام صاحب کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور ابن ابی لیلیٰ کی رائے کو ترجیح دی ہے اور بعض جگہ اپنے دونوں اساتذہ سے اختلاف رائے کیا ہے۔ یہ کتاب ان دونوں اماموں کے مجتہدات کے ساتھ امام ابو یوسف کے مجتہدات اور استنباطات کا بھی بہترین نمونہ ہے، کتاب کے راوی یا مولف امام محمد ہیں اس کا کچھ حصہ امام سرخسی نے مبسوط میں بھی نقل کیا ہے[۲]۔ اس کتاب کو بھی "لجنۃ المعارف" نے شائع کیا

---

[۱] ابن ابی لیلیٰ کا خانوادہ علم اور دین کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ ان کے والد ممتاز تابعین میں تھے، یہ خود اپنے وقت کے امام تھے کوفہ میں امام صاحب کا اگر کوئی ہمسر تھا تو یہی تھے۔ [۲] جلد ۳۰۔ ص ۱۲۸

ہے، کتاب کی افادیت کو علامہ ابوالوفاء کے حواشی نے کئی گنا زیادہ کردیا ہے بلکہ وہ خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۳)　''الرد علی سیر الاوزاعی'' امام ابوحنیفہ نے سیر و مغازی پر اپنے تلامذہ کو جو کچھ املا کرایا تھا اس کو انہوں نے مدون کردیا تھا، چنانچہ امام محمدؒ نے خاص طور پر اس کے لئے السیر الصغیر مرتب کی، جب یہ کتاب امام اوزاعی کے سامنے جو اس وقت اہلِ شام کے مرجع و ماویٰ تھے.........آئی تو انہوں نے کہا کہ اہلِ عراق سیر و مغازی کیا جانیں، اور اس کی تردید میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھی۔ امام محمد کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے اس کتاب کے جواب میں السیر الکبیر لکھی۔ اور امام ابو یوسفؒ نے بھی اس کا جواب دیا۔ امام ابو یوسفؒ کی کتاب الرد علی السیر الاوزاعی کے نام سے حیدرآباد میں چھپ گئی ہے اس کے دیکھنے سے حدیث و آثار پر امام ابو یوسف کی وقت نظری اور امام صاحب کی سیر و مغازی سے پوری.......واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۴)　کتاب الخراج، امام ابو یوسفؒ کی سب سے اہم کتاب یہی ہے۔ ''خراج'' اسلامی ریاست کا ایک شعبۂ آمدنی ہے مگر یہ لفظ امام ابو یوسف نے تقریباً اسلامی مالیات کے ان تمام مداخل و مخارج کے لئے استعمال کیا ہے جن کا تعلق حکومت یا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے معاصرین اور اس کے بعد کے بہت سے علماء نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، خصوصیت سے یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج، ابن عبید کی کتاب الاموال، ابن رجب کی استخراج احکام الخراج وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی کتاب ان خصوصیات کی حامل نہیں ہے جن کی امام ابو یوسف کی کتاب حامل ہے۔ ابن عبید کی کتاب اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل اور ضخیم ہے۔ مگر کیفیت کے لحاظ سے وہ امام ابو یوسفؒ کی کتاب سے کم درجہ کی ہے اس موضوع کے دوسرے مصنفین خصوصیت سے ابن عبید نے یہ کہا ہے کہ اس موضوع پر جو قرآن کی جو آیات، احادیث نبوی ﷺ، آثار صحابہ اور اقوال تابعین ملے ہیں وہ سب جمع کردیئے ہیں۔ استخراج احکام انہوں نے بہت کم کیا ہے لیکن امام ابو یوسف صرف نقل روایات پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ جہاں تاریخی مباحث آجاتے ہیں ان پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے معانی کی تشریح اور تعیین میں لغتِ عرب اور استعمالاتِ ادیار سے بھی بحث کرتے ہیں پھر سب سے زیادہ اس کی افادیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ حکومت اور عامہ مسلمین کی نئی نئی ضروریات و مشکلات کا قرآن و حدیث اور آثار صحابہ سے یا ان کی روشنی میں اجتہاد کر کے حل پیش کرتے ہیں۔

اس کتاب کا طریقہ بیان یہ ہے کہ جب کوئی بحث شروع کرتے ہیں تو پہلے قرآن کی آیت پیش کرتے ہیں۔ پھر حدیث نبوی اور آثار صحابہ اور اس کے بعد ضرورت ہوتی ہے تو امام صاحب یا دیگر آئمہ کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر ضرورت مقتضی ہوتی ہے تو وہ خود اجتہاد کرتے ہیں۔ یہ کتاب ہارون رشید کی فرمائش سے انہوں نے لکھی تھی عموماً امراء و سلاطین کی فرمائش پر جو کتابیں علماء نے لکھی ہیں ان میں بہت کم ایسی کتابیں ملیں گی جن میں موقع کے لحاظ سے جرات و حق گوئی کا پورا اظہار بھی ہوا اور ان کو نصیحت بھی کی گئی ہو۔ مگر امام ابو یوسف ؒ کی یہ کتاب اس لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے انہوں نے مقدمہ کتاب میں ہارون کو جو نصیحتیں کی ہیں اور جس جرات و حق گوئی کے ساتھ کی ہیں اس کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب عباسی خلفاء اور خصوصیت سے ہارون رشید کی خود رائی اور اس کے استبداد کی تاریخ کو بھی سامنے رکھا جائے۔ اُوپر اس کا کچھ حصہ ہم نقل کر آئے ہیں۔ تطویل کا خیال نہ ہوتا تو اس کا پورا حصہ یہاں نقل کیا جاتا۔

یہ کتاب کئی بار چھپی ہے سب سے پہلے مطبعہ بولاق سے ۱۳۰۲ھ (۱۸۹۱ء) میں شائع ہوئی اس کتاب کو ایک فرانسیسی مستشرق نے فرنچ میں بھی ترجمہ کیا ہے جو ۱۹۲۹ء میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔

(۵)　کتاب المخارج والحیل، امام ابو یوسف کی طرف یہ کتاب بھی منسوب ہے۔ یہ کتاب آستانہ سے شائع ہو چکی ہے جس کو ایک جرمن عالم نے ایڈٹ کیا ہے۔ اور اس نے اس کو امام محمد کی تصنیف بتایا ہے۔ مگر اس کے بارے میں علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ مصر کے متعدد کتب خانوں میں اس کتاب کے قلمی نسخے موجود ہیں اور یہ امام ابو یوسف ؒ کی تصنیف ہے۔

مرجوع مسائل :

اجتہاد و استنباط کا تعلق اس دینی بصیرت سے ہے جو علوم دینیہ میں غور کرتے رہے اور اس سے غیر معمولی شغف وانہماک رکھنے کی وجہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بصیرت علم و تجربہ کی زیادتی کے لحاظ سے روز بروز بڑھتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ کرام کے بہت سے مجتہدات جن پر ابتداء میں ان کو پورا وثوق اور اعتماد تھا۔ علم دین اور فہم و بصیرت کی زیادتی کے بعد ان میں ان کو تبدیلی کرنی پڑی۔ امام ابو حنیفہ ؒ کے سینکڑوں مسائل اور استنباطات ایسے ملیں گے جن کو انہوں نے ترک کر دیا یا ان میں ترمیم کر دی، اسی طرح امام مالک ؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ کا حال بھی ہے خصوصیت سے امام شافعی نے تو امام محمد کے تلمذ کے بعد تقریباً اپنے تمام مسائل پر نظر ثانی کر کے انہیں بدل ڈالا

چنانچہ شافعی فقیہ کے لئے ان کے قدیم وجدید اقوال میں فرق کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

امام ابو یوسفؒ بھی مجتہد تھے اس لئے انہوں نے بھی اپنے بہت سے استنباطات میں جزوی ترمیم کی ہے اور بہت سے مسائل سے بالکل رجوع کرلیا ہے آئمہ کے مرجوع مسائل کو ذہن میں نہ کرنے کی وجہ سے بسا اوقات ان کے اور ان کے مسلک کے بارے میں بہت شدید غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ غالباً اسی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر مفتی مہدی حسن صاحب (دیوبند) نے امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے جتنے مرجوع مسائل ہیں ان کو ایک کتابی شکل میں جمع کر دیا ہے یہ رسالہ عربی میں ہے اس لئے اردو داں اصحاب کے لئے تو بیکار ہے مگر عربی خواں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

امام صاحبؒ کی وصیت :

امام ابوحنیفہؒ کی وہ مشہور وصیت جس میں انہوں نے اہل سنت والجماعت کے تمام عقائد تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں اس سے اہلِ علم تو عام طور پر واقف ہیں۔ مگر اس کے علاوہ ایک اور وصیت بھی ہے جو انہوں نے خاص طور پر امام ابو یوسف کو لکھ کر دی تھی جس میں اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست کے متعلق بہت سے قیمتی ہدایتیں اور زریں اقوال ہیں جن سے ہر خاص و عام فائدہ اٹھا سکتا ہے اس لئے ہم اس کا خلاصہ ذیلی عنوانات کے تحت یہاں نقل کرتے ہیں۔

حکومت واہلِ حکومت سے تعلقات :

سلاطین کے پاس بہت کم آمدورفت رکھنا، ان سے ہر وقت اس طرح پرخطر رہنا[1] جس طرح آدمی آگ سے پرخطر رہتا ہے جب تک کوئی خاص ضرورت نہ ہو دربارِ شاہی میں نہ جانا اس لئے کہ اس سے اپنا اعزاز واکرام قائم رہتا ہے اور اس لئے بھی کہ سلطان اپنے مقابلہ میں کسی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا اور جب وہ اپنے حاشیہ نشینوں میں ہوتا ہے تو اس وقت اس سے زیادہ گفتگو نہ کرنی چاہئے اس لئے کہ اس موقع پر اس کی خواہش یہ ہوگی کہ ان کے سامنے اپنے کو تم سے زیادہ عالم اور صاحبِ فضل ظاہر کرے۔ تو خواہ مخواہ تمہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرے گا اور اس سے لوگوں میں تمہاری ذلت ہوگی۔

---

[1] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت اور ارکانِ حکومت کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ امام صاحب نے ہر جگہ سلطان کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ اس وقت صاحب امر امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ خلفاء کے لئے سلطان کا لفظ بہت بعد میں مستعمل ہوا ہے اس لفظ سے غالباً انہوں نے تغلب انفراد بالمجد اور ڈکٹیٹری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اگر سلطان تم کو عہدۂ قضا پر مقرر کرنا چاہے تو پہلے دریافت کرلو کہ وہ تمہارے فقہی مسائل اور طریقہ اجتہاد سے واقف ہے یا نہیں، ایسا نہ ہو کہ حکومت کے دباؤ سے تم کو اپنے فیصلہ کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہونا پڑے[۱] اور پھر یہ بھی سوچ لینا کہ اگر تم نہیں قبول کرتے ہو تو اس جگہ پر کوئی ایسا آدمی تو مقرر نہیں کیا جائے گا جو اس کا اہل نہیں ہے اور اس سے عام لوگوں کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے پھر یہ بھی معلوم کرلو کہ تمہارا یہ تقرر علم وفضل کی وجہ سے کیا جارہا ہے[۲]۔

سلطان کے وزراء اور اس کے حاشیہ نشینوں سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہ کرنا صرف سلطان سے تعلقات قائم کرنا، اس میں بھی خود پیش قدمی نہ کرنا اس لئے کہ جب خود پیش قدمی کرو گے تو وہ اپنے اغراض تمہارے سامنے رکھیں گے۔ اگر تم انہیں پورا کرو گے تو پھر وہ تمہارے توہین کریں گے اور اگر پورا نہ کرو گے تو وہ تمہاری عیب چینی کریں گے۔

اظہارِ حق اور امر بالمعروف :

اظہارِ حق میں کسی کی پرواہ نہ کرنا خواہ وہ سلطان ہی کیوں نہ ہو اگر کوئی شخص دین میں کسی بدعت کا موجد ہو رہا ہو تو علانیہ اس کی غلطی کو ظاہر کر دینا، اگر چہ وہ شخص صاحب وجاہت وصاحب حکومت ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اظہارِ حق میں خدا تعالیٰ تمہارا معین اور مددگار ہوگا۔ اور اپنے دین کا محافظ و حامی ہے اگر تم ایسا کرو گے تو لوگوں کو دین میں رخنہ اندازی کی جرات نہ ہوگی۔ اور وہ تمہارے اظہارِ حق سے بھی خائف رہیں گے۔ خود بادشاہ سے اگر کوئی نامناسب اور دین کے خلاف حرکت صادر ہو تو صاف کہہ دینا کہ عہدۂ قضا کے لحاظ سے میں آپ کا مطیع ہوں لیکن کسی غلطی پر آپ کو مطلع کر دینا میرا فرض ہے۔ خصوصیت سے جس کا تعلق علمِ دین سے ہو۔ اگر اس کے بعد بھی وہ نہ مانے تو تنہائی میں اس طرح سمجھانے کی کوشش کرنا کہ آپ کا یہ فعل کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہے۔ اگر وہ سمجھ جائے تو خیر ورنہ خدا سے دعا کرنا کہ وہ تم کو اس کے شر سے محفوظ رکھے اس میں اتنا زیادہ اصرار نہ کرنا کہ وہ زچ ہو جائے اور تمہارا قلع قمع کر دے اس سے دین کو نقصان ہوگا۔ اس حد تک اظہار حق کرو جس سے وہ تمہاری دینی جدوجہد اور امر بالمعروف[۳] سے واقف ہو جائے۔

---

[۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب شروع میں عہدۂ قضا قبول نہ کرنے پر جس قدر مصر تھے اب ان کا اتنا اصرار باقی نہیں تھا جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام صاحب نے حکومت سے استغنا رکھا کر اب عہدۂ قضا کی اہمیت کو کافی بڑھا دیا تھا، اسی وجہ سے چند شروط کے ساتھ اس کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ ان شروط کی تفصیل آگے آتی ہو۔

[۲] یعنی یہ تو نہیں ہے کہ وہ کہیں اپنے اغراض کے استعمال کے لئے انتخاب کر رہے ہیں۔

[۳] بڑی حکیمانہ بات ہے اس لئے کہ جب اس جذبہ کا اظہار ہو جائے گا تو وہ خود ہی بے راہ روی سے پرہیز کرے گا۔

علم اور اہلِ علم سے تعلق :

تحصیلِ علم کو سب پر مقدم رکھنا جب اس سے فراغت ہو چکے تو اس کے بعد جائز ذرائع سے مال حاصل کرنے کی کوشش کرنا کیونکہ ایک وقت میں علم و دولت دونوں حاصل نہیں ہو سکتے۔

کسی شہر میں جاؤ تو وہاں کے علماء وفضلا سے اس طرح ملو کہ ان کو رقابت کا خیال نہ ہو کسی علمی گفتگو کا موقع آئے تو جو بات کہو خوب سوچ سمجھ کر کہو اور وہی بات کہو جس کا کافی ثبوت تمہارے پاس موجود ہو۔ اگر کبھی علمی مباحثہ کا موقع آجائے تو نہایت جرات اور استقلال کے ساتھ اس میں حصہ لو، دل میں ذرہ برابر بھی خوف و ہراس رہے گا تو خیالات منتشر ہو جائیں گے اور زبان میں لغزش آجائے گی جو لوگ علمی مجالس کے آداب سے واقف نہ ہوں بلکہ مکابرہ یعنی بحث و جدال کرنا چاہتے ہوں ان سے ہرگز گفتگو نہ کرو۔ اپنے اساتذہ کو برا بھلا نہ کہو ورنہ تمہارے تلامذہ بھی تم کو برا بھلا کہیں گے اپنے ساتذہ اور جن لوگوں سے تم نے استفادہ کیا ہے ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہا کرو۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسے خلوص و محبت سے پیش آؤ کہ دوسرا دیکھے تو سمجھے کہ یہ تمہاری اولاد ہیں۔ شاگردوں میں سے اگر کسی کو درس کی اجازت دو تو خود بھی اس کی مجلس درس میں شریک ہو کر اس کی صلاحیت کا اندازہ کرو۔

اگر اس سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو بتا دو ورنہ تمہارے چپ رہنے سے لوگوں کو گمان ہوگا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے صحیح کہا ہے۔ جب تم سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو بقدر ضرورت اس کا جواب دو اپنی طرف اس میں کچھ اضافہ نہ کرو۔ علمی مجالس میں خصوصیت سے غصہ نہ کرو۔

مہمات امورِ دین :

مہمات دین اور عقائد کے اختلافی مسائل میں عوام سے کوئی گفتگو نہ کرو، ہر بات میں تقویٰ اور امانت کو پیش نظر رکھو، ظاہر و باطن ایک رکھو خدا کے ساتھ وہی معاملہ رکھو جو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو دنیا کا نظام اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ظاہر و باطن ایک نہ کر دیا جائے [1]۔

اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہو، علم کی نگہداشت رکھو دنیا کو بالکل حقیر سمجھو، دنیا کے کسی کام مطمئن ہو کر نہ لگ جاؤ، اللہ تعالیٰ کے یہاں تمام باتوں کی باز پرس ہوگی اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔

---

[1] دعوت دین اور اقامت دین کے نقطۂ نظر سے یہ بڑی اہم ہدایت ہے۔

اتنی ہی عبادت پر اکتفا نہ کرو، جتنی عام لوگ کرتے ہیں جس وقت اذان کی آواز آئے فوراً نماز کی تیاری اور مسجد میں پہنچنے کی کوشش کرو، ہر نماز کے بعد کچھ دیر قرآن کی تلاوت اور ذکرِ الٰہی میں مشغول رہو۔ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرو، کہ اس نے دین پر جمے رہنے کی توفیق دی اور طرح طرح کی نعمتیں عطا کیں، تلاوت قرآن پر مدامت رکھو جب تک لوگ تم کو خود امام نہ بنائیں آگے نہ بڑھو، ہر مہینہ میں دو چار دن روزہ کے لئے مقرر کر لو، زیارت قبر کی عادت ڈالو، موت کو ہمیشہ یاد رکھو۔

معاشرت وآداب معاشرت :

جو لوگ اپنی خواہشات کے بندے ہو چکے ہیں ان سے ربط ضبط نہ رکھو مگر تبلیغ اور دعوتِ دین کی غرض سے ان سے ملنا یا تعلق قائم کرنا مناسب ہے کسی پر لعن طعن نہ کرو اگر کسی انسان میں اپنی طرف سے برائی دیکھو تو اس کے لئے بھلائی چاہو اور بھلائی کے ساتھ اس کا تذکرہ کرو مگر یہ برائی اگر دین کے بارے میں ہے تو لوگوں سے اس کا تذکرہ کرو تا کہ لوگ اس کا اتباع نہ کریں اور اس برائی سے محفوظ رہ سکیں۔

تجارت اور کاروباری معاملات کے بارے میں زیادہ گفتگو نہ کرو ورنہ لوگوں کو خیال ہوگا کہ تم مال کے حریص ہو یہ بھی گمان ہوگا کہ تم رشوت لیتے ہو عام آدمیوں اور خصوصیت سے دولت مندوں سے کم میل جول رکھنا ورنہ ان کو گمان ہوگا کہ تم ان سے کچھ توقع رکھتے ہو۔

اگر تم دس برس بھی کسی ذریعۂ معاش کے بغیر رہو تو علم دین سے گریز نہ کرنا اگر گریز کرو گے تو اس آیت کے مصداق ہو گے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا :

''جس نے ہماری یاد سے منہ موڑا اس کے لئے معاشی تنگی ہے''۔

اس وقت شادی کرنا جب یہ یقین ہو جائے کہ اہل وعیال کی تمام ذمہ داریاں اُٹھا سکو گے۔

حتی الامکان ایسی عورت سے نکاح نہ کرنا جو دوسرے شوہر سے اولاد رکھتی ہو۔

عام لوگوں کو ذلیل نہ سمجھو بلکہ ان کی توقیر کرو جب تک یہ لوگ خود تعلقات قائم نہ کریں، خود اس کی کوشش نہ کرو[1]۔

زیادہ نہ ہنسا کرو اس سے قلب مردہ ہو جاتا ہے جو کام کرو اطمینان اور وقار کے ساتھ کرو، جلدی نہ کرو۔

کوئی شخص پیچھے سے پکارے تو جواب نہ دو اس لئے کہ پیچھے سے پکارنا جانوروں کے لئے مخصوص ہے۔ راستہ چلو تو دائیں بائیں نہ دیکھو بلکہ نیچی نظریں کر کے چلو بازار میں زیادہ نہ جایا کرو۔

---

[1] اوپر ذکر آ چکا ہے کہ دعوتِ دین کے سلسلہ میں ان سے ملنا جلنا اور تعلق قائم کرنا چاہئے، یہ ہدایت عام ہے۔

گفتگو میں نہ سختی درشتی ہو اور نہ آواز بلند ہو بلکہ متانت و وقار پیش نظر ہے، لہو ولعب سے پرہیز کرو، لوگوں کے راز افشا نہ کرو جو تم سے مشورہ کرے تو اپنی معلومات کے بقدر بتانے میں کوتاہی نہ کرو اس سے اللہ کا تقرب حاصل ہوگا، اپنے ہمسایہ کی کوئی برائی دیکھو تو پردہ پوشی کرو اس لئے کہ یہ امانت ہے۔

بخل سے پرہیز کرو، حریص نہ بنو اور نہ کبھی جھوٹ بولو، بازاری لوگوں کی صحبت نہ اختیار کرو۔ ہر معاملہ میں اپنی عزت اور وقار کا خیال رکھو، ہمیشہ قلب میں استغناء رکھو، دنیا کی طمع و رغبت بالکل نہ کرو اپنی طرف سے ہمیشہ استغنا کا اظہار کرو خواہ تم مفلس ہی کیوں نہ ہو۔

ہر معاملہ میں ہمت و جرات سے کام لو اس لئے کہ جس کی ہمت کمزور ہو جاتی ہے اس کا رتبہ بھی گر جاتا ہے، عام عورتوں سے بات چیت نہ کرو اور نہ ان کے ساتھ اُٹھو بیٹھو۔ اس سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، بیوی کے ساتھ بھی بہت زیادہ بات چیت میں مشغول نہ رہو بقدر ضرورت خلا ملا کرو۔ اور اس اثنا میں ذکرِ الٰہی سے غافل نہ ہو، اپنی بیوی کے سامنے دوسری عورتوں کا ذکر نہ کرو اس لئے کہ پھر وہ بھی غیر مردوں کا تذکرہ شروع کر دیں گی۔ اس لئے آپس میں اختلاف ہوگا۔

نوخیز لڑکوں سے بات چیت نہ کرو اس لئے کہ اس سے فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے، چھوٹے بچوں سے پیار کرنے اور اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

بازار میں زیادہ نہ جایا کرو راستہ میں نہ بیٹھا کرو۔ اگر راستے میں بیٹھنے کی ضرورت آجائے تو پھر مسجد میں چلے جایا کرو۔

میں نے مختصر طور سے پوری وصیت کا ترجمہ کر دیا ہے اس میں میں نے اتنی تبدیلی ضرور کی ہے کہ بعض جملوں کو مقدم اور بعض کو مؤخر کر دیا ہے اور ان پر سرخیاں قائم کر دی ہیں تا کہ ایک مضمون سے متعلق تمام باتیں یکجا ہو جائیں۔

اس وصیت کو سامنے رکھ کر اگر امام ابو یوسفؒ کے صحیفۂ زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اُستاد کی اس نصیحت کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنا لیا تھا گو یہ وصیت امام صاحب نے خاص طور پر امام ابو یوسفؒ کے لئے کی تھی مگر اس میں ہر شخص کی زندگی کے لئے بہترین مشورے اور نہایت قیمتی ہدایتیں موجود ہیں جو انسان بننا چاہتا ہو، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کی توفیق دے۔ آمین!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت امام محمد شیبانیؒ

نام ونسب :

محمد نام ہے۔ ابوعبداللہ کنیت۔ مختصر شجرۂ نسب یہ ہے : محمد بن الحسن الفرقد الشیبانی[1]۔

ولادت :

ان کے والد دمشق کے ایک گاؤں حرستا[2] کے رہنے والے تھے، ترک وطن کر کے یا بہ سلسلۂ ملازمت عراق آئے اور وہیں کے ایک گاؤں واسط میں حکومت اختیار کر لی، امام محمدؒ یہیں ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے[3]۔

تعلیم وتربیت :

واسط میں ابھی عمر کے چند ہی سال گزرنے پائے تھے کہ ان کے والد وہاں سے شامی لشکر کے ساتھ کوفہ چلے آئے، اور پھر وہیں مستقل بود وباش اختیار کر لی، کوفہ اس وقت علم وفن کا مرکز اور علماء ومشائخ کا گہوارہ تھا، علمی اعتبار سے اسے تمام ممالک اسلامیہ میں " ام البلاد " کی حیثیت حاصل تھی، اسی مادر علمی کی آغوش میں امام محمدؒ کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا، اور اسی ماحول میں انہوں نے نشو ونما پائی سب سے پہلے قرآن کی تعلیم ہوئی، اس کے بعد ادب ولغت کی ابتدا کی گئی[4]، ادب ولغت کی

---

[1] ان کی یہ کنیت ولائی ہے یعنی ان کے والد حسن بنوشیبانی کے غلام تھے، اسی نسبت سے وہ شیبانی مشہور ہیں۔

[2] ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ جزیرہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد فوجی ملازمت کے سلسلہ سے شام آئے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے، خطیب بغدادی کا خیال ہے کہ وہ دمشقی تھے اور وہاں سے واسط چلے آئے تھے۔ قاضی ابوحازم کا بیان ہے کہ وہ قریۂ رملہ (فلسطین) کے قریب کے رہنے والے تھے (کردری جلد ۲۔ ص ۱۴۶)۔ ان بیانات میں زیادہ تضاد نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ ان کے والد نے شامی لشکر کی ملازمت کے سلسلہ میں ان تمام مقامات پر قیام کیا ہو اس لئے کہ حرستا اور رملہ دونوں شام کے ملحقہ علاقے ہیں، اور جزیرہ بنوشیبان کی چراگاہ تھی، اور وہاں برابر ان کی آمد ورفت رہا کرتی تھی، اس بنا پر امام محمد کے وطن کی نسبت اس طرف ہو جانا کوئی تعجب خیز نہیں ہے لیکن یہ غلط ضرور ہے ہم نے اس سلسلہ میں سمعانی اور امام نووی کے بیانات کو ترجیح دی ہے۔

[3] بعض روایتوں میں ان کا سنہ ولادت ۱۳۵ھ اور بعض میں ۱۳۱ھ درج ہے لیکن صحیح ۱۳۲ھ ہے تاریخ بغداد جلد ۲۔ ص ۱۷۲ ذیل جواہر مضیہ۔ [4] بلوغ الامانی ص ۵

ابتدائی تعلیم کے بعد کوفہ کے بڑے بڑے شیوخ کے درس میں شریک ہونے لگے، فطری استعداد و صلاحیت اور کوفہ کے علمی ماحول نے کم سنی ہی میں انہیں ایک جوہر قابل بنا دیا۔

امام ابوحنیفہ ؒ کی خدمت میں آمد :

ابھی تیرہ چودہ سال کا سن تھا، کہ ایک مسئلہ دریافت کرنے کی غرض سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ مسئلہ یہ تھا کہ اگر نابالغ عشاء کی نماز پڑھ کر سو جائے اور اسی رات میں وہ بالغ ہو تو عشاء کی نماز دہرائے گا یا نہیں۔ امام صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔ یہ سوال چونکہ انہوں نے اپنے متعلق کیا تھا اس لئے وہاں سے فوراً اٹھے وضو کیا اور مسجد کے ایک گوشہ میں جا کر عشاء کی نماز دہرائی۔ امام صاحب نے یہ دیکھ کر حاضرین سے فرمایا کہ انشاء اللہ یہ لڑکا رشید ہوگا[1]۔

امام صاحب سے شرف تلمذ :

گو یہ ایک معمولی واقعہ تھا لیکن یہی واقعہ تفصیل فقہ اور امام صاحب سے ان کی عقیدت و تلمذ کا سبب بن گیا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقۂ تلمذ میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی[2]۔

امام صاحب کا دستور تھا کہ وہ قرآن کو مستحضر کئے بغیر کسی کو اپنے حلقۂ درس میں بہت کم لیتے تھے، حسب دستور اس سے بھی فرمایا کہ قرآن حفظ کر لو، پھر میرے پاس آؤ۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ دوبارہ امام صاحب کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں نے قرآن حفظ کر لیا[3]، اس کے بعد انہوں نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، امام صاحب نے ان سے پوچھا کہ یہ مسئلہ تم کسی سے سن کر دریافت کر رہے ہو یا تمہارا طبع زاد ہے، امام احمد نے کہا کہ یہ سوال خود میرے ذہن میں آیا ہے امام صاحب نے ان سے فرمایا کہ تم تو بڑے لوگوں جیسا سوال کرتے ہو، تم برابر میرے حلقۂ درس میں آتے جاتے رہو[4]۔ اس کے بعد امام محمد ؒ مستقل طور پر امام صاحب کے سلسلۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے اور ہمیشہ سفر و حضر میں ان کے ساتھ ساتھ رہے، اور ان کی حیات تک کسی دوسرے حلقۂ درس میں نہیں گئے[5]۔

امام ابویوسف ؒ کی شاگردی :

امام محمد ؒ کو امام صاحب سے صرف چار برس استفادہ کا موقع ملا، لیکن یہ مدت فقہ جیسے دقیق اور وسیع فن کے لئے کافی نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے امام صاحب کی وفات کے بعد امام ابویوسف ؒ کی

---

۱ مناقب کروری جز ۲۔ ص ۱۵۵ ۲ ایضاً ۳ مناقب کروری جزء ثانی ص ۱۵۵
۴ مناقب کروری جزء ثانی ص ۱۵۵ ۵ جواہر مضیہ جلد ۲۔ ص ۴۴

طرف رجوع کیا جو امام صاحب کے محبوب اور سب سے زیادہ ذی علم تلامذہ میں تھے، اور ان کے حلقۂ درس میں جاکر فقہ کی تکمیل کی، اور بجز چند آخری سالوں کے[1] ان سے بہت کم جدا ہوئے۔

امام ابو یوسف ؒ علم اور عمر دونوں میں امام محمد ؒ سے بڑے تھے لیکن اس کے باوجود وہ امام محمد کا کافی لحاظ کرتے تھے، طحاوی نے اسماعیل بن حماد سے روایت کی ہے کہ امام محمد ؒ کا دستور تھا کہ وہ بالکل سویرے دوسرے شیوخ حدیث کی مجالس درس میں چلے جایا کرتے تھے، اور ہم لوگ علی الصباح امام ابو یوسف ؒ کی مجلس فقہ میں پہنچ جاتے تھے، امام محمد جب وہاں سے امام ابو یوسف کے درس میں واپس آتے تو اس وقت تک بہت سے مسائل گزر چکتے تھے، لیکن جب وہ آجاتے تو امام ابو یوسف ؒ ان تمام مسائل کو پھر ان کے لئے دہراتے[2]۔

امام محمد ؒ بھی ان کے مرتبہ شناس تھے، چنانچہ جب امام ابو یوسف ؒ بغداد کے قاضی تھے۔ امام محمد نے کوفہ سے انہیں لکھا کہ میں آپ کی ملاقات کے لئے بغداد آنا چاہتا ہوں، لیکن امام ابو یوسف ؒ نے لکھا کہ اہلِ کوفہ کو آپ سے فائدہ پہنچ رہا ہے، یہاں آنے میں ان کا نقصان ہوگا، ان کو فائدہ پہنچایئے[3]۔ امام محمد ؒ فرماتے تھے کہ ''علم کی توقیر کرنی ہمیں امام ابو یوسف نے اس طرح سکھائی کہ جب میں پہلی بار امام صاحب کی خدمت میں گیا تو مجلس میں پہنچ کر میں نے پوچھا کہ امام ابوحنیفہ ؒ کون صاحب ہیں، امام ابو یوسف ؒ نے اشارہ سے مجھ سے کہا کہ بیٹھ جاؤ جب بیٹھ گیا تو انہوں نے اشارہ سے بتایا کہ فلاں صاحب ہیں[4] سوال کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں تھا اس لئے انہوں نے ٹوکا''۔

تحصیل حدیث :

قرآن وفقہ کے علاوہ حدیث کا ذوق بھی امام محمد کو شیخین ہی کی صحبت میں پیدا ہو چکا تھا لیکن اس حلقۂ درس کی اصلی خصوصیت فقہ وقرآن تھی، اس لئے ان کو کسی ایسے استاد کی ضرورت تھی جو خالص حدیث کا ذوق رکھتا ہو، اس کے لئے انہوں نے دربارِ نبوی کا رخ کیا، اور امام مالک ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

امام مالک ؒ سے سماع حدیث :

کوفہ وبصرہ میں بڑے بڑے شیوخ حدیث موجود تھے کہ مکہ میں سفیان بن عیینہ اور خراسان میں عبداللہ بن مبارک ؒ مرجع اخلاق تھے۔ خود مدینہ منورہ میں ابراہیم ابن محمد اور عبید اللہ بن محمد وغیرہ کے حلقۂ درس قائم تھے۔

---

[1] مناقب امام محمد ذہبی ص ۵، آخری سالوں میں عہدۂ قضا کے معاملہ میں جس کا تذکرہ آگے آئے گا ان سے اور امام ابو یوسف سے کچھ شکر رنجی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے دونوں کی ایک دوسرے کے یہاں آمد ورفت بند ہوگئی تھی۔

[2] بلوغ الامانی ص ۳۵　[3] مناقب کروری جلد ۲۔ ص ۱۵۴

[4] حنفی فقہاء کی اصطلاح میں امام صاحب اور امام ابو یوسف کو شیخین کہا جاتا ہے۔

لیکن امام مالک کے درس حدیث کی چند ایسی خصوصیتیں تھیں، جن کی وجہ سے حدیث میں وہ ساری دنیائے اسلام کے مرکز توجہ بن گئے تھے، اور یہی چیز امام محمدؒ کو کشاں کشاں کوفہ سے کئی سو میل دور مدینہ لے گئی، یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں جس طرح فقہ کی تعلیم کے لئے امام صاحب جیسا استاد ملا۔ اسی طرح حدیث کی تحصیل کے لئے اس وقت کے سب سے بڑے شیخ کی صحبت نصیب ہوئی۔

مدینہ میں قیام کی مدت :

امام محمدؒ تین برس تک دیارِ نبوی ﷺ میں رہے، اور بالالتزام امام مالک سے سماع حدیث کرتے رہے، انہوں نے کم وبیش ۷۰۰ حدیثیں ان سے سنیں، خود فرماتے ہیں:

اقمت علی باب مالک ثلاث سنین او اکثر و سمعت منه سبعمائة حدیث [۱] (کردری ۲، ص ۱۶۰)

''میں امام مالک کے دروازہ پر تین برس یا اس سے زیادہ قیام پذیر رہا، اور اس مدت میں سات سو حدیثیں ان سے سنیں''۔

امام مالک کے علاوہ مدینہ منورہ کے دوسرے شیوخ حدیث سے بھی انہوں نے استفادہ کیا، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

---

[۱] یہ بات قابلِ غور ہے کہ امام محمد مسلسل تین برس تک امام مالک کی خدمت میں رہے، لیکن ان سے صرف ۷۰۰ حدیثیں سماع کیں، آخر اس قلت سماع کی کیا وجہ ہے۔

قلت سماع کی وجہ : بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس قلت سماع کی وجہ یہ تھی، امام مالک امام محمد کے کثرت سوال اور مسائل میں زیادہ کرید کرنے کی وجہ سے جو علمائے عراق کا خاصہ تھا کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے وہ ان کو موطا کا سماع نہیں کراتے تھے، مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھے رہتے تھے، لوگ مسجد میں امام مالک سے مسائل دریافت کرنے آیا کرتے تھے، وہ حدیث وآثار کی روشنی میں جو کچھ جواب دیتے تھے، امام محمد اسے حفظ کرتے جاتے تھے۔ اسی طرح تین برس میں انہوں نے سات سو حدیثیں سنیں، اس روایت کے نقل کرنے کے بعد ابن البزار کردری لکھتے ہیں، **وانما کان یفعل ذالک لما کان بینه بین الامام** امام محمد ایسا اس لئے کرتے تھے کہ ان کے اور امام مالک کے درمیان کچھ رنجش تھی (جلد۲ ص۱۶۰) کردری نے یہ روایت حافظ ابو العلاء کے واسطہ سے نقل کی ہے، روایت کا پورا سلسلۂ سند معلوم نہیں ہو سکا کہ راویوں کی جرح یا تعدیل کی جاسکے، بہرحال سند کے اعتبار سے روایت کا جو پایہ ہو لیکن اپنے متن اور مفہوم کے اعتبار سے صحیح معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ امام محمد جیسا شخص جو برسوں امام صاحب اور امام ابو یوسف کی مجلس فقہ وحدیث کا خوشہ چین رہ چکا ہے، اور جو ذکاوت اور قوت حافظ کی بھی غیر معمولی روایت سے بہرہ ور ہو، اتنی لمبی مدت میں اس کا صرف سات سو حدیثوں کا سماع کرنا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے جب کہ ان سے کم درجہ کے لوگ اس سے کم مدت میں کئی گناہ زیادہ حدیثیں سماع اور حفظ کر لیا کرتے تھے، اور پھر امام محمد گھر بار چھوڑ کر امام مالک کی خدمت میں اسی غرض سے گئے تھے، اگر یہ رویت صحیح ہے تو سب سے امام محمد کے عزم واستقلال اور تحصیل حدیث کے غیر معمولی شوق کا پتہ چلتا ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ امام محمد نے موطا میں امام مالک کی سند سے جو مرفوع یا غیر مرفوع روایتیں نقل کی ہیں، ان کی تعداد ۱۰۰۵ ہے۔

شیوخ حدیث کی تعداد :

امام صاحب کی صحبت اور امام ابو یوسف اور امام مالک سے استفادہ کے بعد کسی دوسرے استاد کی ضرورت نہیں تھی، لیکن پھر بھی ہر شیخ اور ہر استاد کے درس کی کچھ نہ کچھ علیحدہ خصوصیت ہوتی ہے جس میں وہ اپنے ہمعصروں سے ممتاز ہوتا ہے، نیز اس وقت کا یہ عام دستور بھی تھا کہ طلبہ جس قدر زیادہ سے زیادہ اساتذہ اور شیوخ کی خدمت میں پہنچ سکتے تھے پہنچ کر ان سے استفادہ اور روایت کرتے تھے، اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ جو علمی جواہر پارے سینکڑوں گوشوں میں منتشر ہوتے تھے، اسی طرح ایک جگہ سمٹ جایا کرتے تھے، چنانچہ امام محمدؒ بھی اس غرض سے اس وقت کے تمام قابل الذکر شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔

امام محمدؒ نے اپنی کتابوں میں جن لوگوں سے روایتیں کی ہیں، ان کی تعداد ۱۰۰[1] سے متجاوز ہے، لیکن ان سب کا شمار ان کے اساتذہ میں نہیں ہے بلکہ اس میں کافی تعداد ان کے قرآن واصاغر کی بھی ہے جن سے انہوں نے روایتیں تو کی ہیں لیکن ان کے سامنے زانو سے تلمذ تہ نہیں کیا ہے۔

علامہ زاہد الکوثری[2] نے امام محمد کے شیوخ حدیث کی تعداد ستر بتائی ہے، لیکن انہوں نے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے، مگر ان کی وسعت نظر پر اعتماد کرتے ہوئے ہم ان کی دی ہوئی فہرست کو یہاں نقل کرتے ہیں، ان میں سے جن ناموں کے ماخذ[3] معلوم ہو سکے ہیں، ان کے حوالے دے دیئے گئے ہیں، مقامات کے لحاظ سے شیوخ کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

---

[1] صرف کتاب الحج میں جن لوگوں سے روایتیں کی ہیں، ان کی تعداد ۱۰۸ ہے، اور کتاب الآثار میں جن شیوخ سے روایتیں کی ہیں ان کی تعداد ۱۵ ہے، لیکن بعض نام دونوں میں مشترک ہیں۔

[2] انہوں نے عربی میں امام محمد کی سوانح حیات ''بلوغ الامانی'' بڑی تحقیق وتدقیق سے لکھی ہے، یہ کتاب مصر سے چھپ کر بازار میں آگئی ہے، پہلے میرا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ کردوں، مگر اس میں بعض باتیں اپنے ذوق اور اعتدال کے خلاف معلوم ہوئیں اس لئے اس ارادہ سے باز رہا، اور اب ماخذ سے ان کے حالات لکھ رہا ہوں، جہاں اصل ماخذ کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکا ہے مصنف کی وسعت نظر پر اعتماد کرتے ہوئے اس کتاب کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

[3] اس سلسلہ میں کتاب الحج کا ذکر بھی آئے گا، لیکن یہ کتاب دار المصنفین کے کتب خانہ میں نہیں ہے، قبلہ سید صاحب کے ساتھ ۱۹۴۵ء میں سوات جانے کا اتفاق ہوا تھا، وہاں مفتی مہدی حسن صاحب کے کتب خانہ میں یہ کتاب مل گئی تھی جن سے میں نے بہت سرسری طور پر ان کے شیوخ کی فہرست تیار کر لی تھی، اس فہرست پر اعتماد کرتے ہوئے یہاں کتاب الحج کا حوالہ دیا گیا ہے، لیکن اس میں غلطی کا امکان ہے، اس لئے جو صاحب غلطی دیکھیں براہ کرم مجھے اس سے آگاہ کریں۔

کوفہ :

امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، اسمٰعیل بن ابی خالد الاحمسی، سفیان بن سعید الثوری، مسعر بن کدام، مالک بن مغول، قیس بن ربیع، عمر بن زر، بکیر بن عام، ابوبکر النہشلی، عبداللہ بن قطاف، محل بن محرز الضبی ابو کدینہ یحییٰ بن المہلب، عبدالرحمٰن بن عبداللہ عتبہ، اسرائیل بن یونس، بدر بن عثمان، ابوالاحوص، سلام بن سلیم، سلام بن سلیمان، ابومعاویہ النصریہ، محمد بن حازم، امام زفر، اسمٰعیل بن ابراہیم البجلی، فضیل بن غزوان، حسن بن عمارہ، یونس بن ابو اسحٰق السبیعی، عبدالجبار بن العباس، محمد بن ابان الصالح القرشی، سعید بن عبید الطائی، ابوفردہ عروہ بن الحارث، ابوزہیر العلاء بن زہیر۔

مدینہ :

امام مالک، ابرہیم بن محمد بن ابی یحییٰ، عبیداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمر بن حفص، خارجہ بن عبداللہ ابن سلیمان، محمد بن صلال، ضحاک بن عثمان، اسمٰعیل بن رافع، عطاف بن خالد، اسحٰق بن حازم، ہشام ابن سعید، اسامہ بن زید اللیثی، داؤد بن قیس الفراء، عیسیٰ بن ابی عیسیٰ الخیاط، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب، خثیم بن عراک۔

مکہ :

سفیان بن عینیہ، زمعہ بن صالح، اسمٰعیل بن عبدالملک، طلحہ بن عمرو، سیف بن سلیم، ابراہیم بن یزید الاموی، زکریا بن اسحٰق، عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن یعلی الثقفی۔

بصرہ :

ابوالعوام عبدالعزیز بن الربیع البصری، ہشام بن ابی عبداللہ الربیع بن الضبی، ابوجرہ واصل ابن عبدالرحمٰن، سعید بن ابی عروبہ، اسمٰعیل بن ابراہیم البصری، مبارک بن فضالہ۔

واسط : عباد بن العوام، شعبہ بن الحجاج، ابومالک عبدالملک۔

شام :

ابوعمرو عبدالرحمٰن الاوزاعی، محمد بن راشد المکحولی، اسمٰعیل بن عیاش الحمصی، ثور بن یزید الدمشقی۔

خراسان : عبداللہ بن مبارک۔

یمامہ : ایوب بن عتبۃ الشیمی۔

یہاں صرف ان ستر شیوخ کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو ان کے اکابر میں شمار کیے جاتے ہیں، ورنہ اقران واصاغر کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔

مغازی کی تعلیم :

سیر وتعلیم حدیث ہی کا ایک شعبہ ہے، لیکن اس وقت تک یہ ایک علیحدہ فن ہو چکا تھا، اور خاص خاص شیوخ کی تعلیم دیتے تھے، اور اہلِ علم خصوصیت سے اس فن کی سند حاصل کرتے تھے، امام محمدؒ نے فن مغازی میں محمد بن عمر الوقدی سے جو فن کے مشہور شیخ تھے، استفادہ کیا تھا۔ واقدی امام محمد کے تلامذہ میں ہیں اور انہوں نے امام محمد سے جامع صغیر خاص طور سے پڑھی تھی، فن مغازی اور سیر میں واقدی کو اس وقت خاص خصوصیت حاصل تھی، اس لئے امام محمدؒ نے ان سے اس فن میں فائدہ اٹھایا[1]۔

عربیت میں کسائی سے تبادلہ خیالات اور استفادہ :

یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ ادب ولغت کی ابتدائی تعلیم کس سے حاصل کی اور تکمیل کہاں کی، لیکن کروری کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسند درس پر متمکن ہونے کے بعد تک پھر ادب اور لغت میں ائمہ فن سے تبادلہ خیالات اور استفادہ کرتے رہے، بشر بن یحییٰ کا بیان ہے کہ کسائی نحو اور لغت کے مشہور امام اکثر امام محمدؒ کے پاس آیا کرتے تھے، ایک روز انہوں نے امام محمد سے کہا کہ آپ لوگ یعنی فقہا اکثر اپنے کلام کے ثبوت میں یہ جملہ کہا کرتے ہیں کہ " اسی طرح لوگ بولتے ہیں اور یہی محاورہ ہے"، تو آپ لوگوں کو یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہئے، عرب کے محاوروں کو تو اس فن کے خداق ہی جانتے ہیں۔

امام محمد نے ان کی بات تسلیم نہیں کی اور کہا کہ ہم لوگ اس چیز کو بہتر طور سے جانتے ہیں، لیکن جب کسائی کی آمد و رفت ان کے پاس برابر ہوتی رہی، اور امام محمدؒ ان کے مبلغ علم سے واقف ہوئے تو ایک روز فرمایا کہ بے شک تم لوگ (لغویین اور نحویین) زبان اور محاوروں سے زیادہ واقف ہو۔ اس کے بعد امام محمدؒ نے ان سے عربیت میں انتفاع حاصل کیا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فانتفع محمد فی العربیة

''پھر امام محمد نے ان سے عربیت میں استفادہ کیا''۔

امام سرخسیؒ نے لکھا ہے کہ کسائیؒ، امام محمدؒ کے خالہ زاد بھائی تھے، سیر کا جو خاص باب کتاب الاعیان ہے جس میں فقہائے حنیفہ نے کمال دقیقہ سنجی سے کام لیا ہے۔ اس کے لغوی اور نحوی مسائل میں امام محمد نے کسائی سے خاص طور سے مدد لی ہے[2]۔

---

[1] مناقب کروری جلد ۲۔ص ۱۵۱ [2] شرح السیر الکبیر جلد ۲۔ص ۱۶۸

طالب علمی میں فراغت قلب :

اکثر و بیشتر اہل علم اور ائمہ فن کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زمانہ طالب علمی بڑی عسرت اور تنگی میں گزرا ہے، لیکن امام محمد کے ساتھ خدا تعالیٰ کا یہ بڑا فضل شامل حال رہا کہ ان کی طالب علمی کا پورا زمانہ نہایت خوشحالی اور فارغ البالی میں گزرا اور انہیں کبھی کوئی مالی دقت پیش نہیں آئی، جب تک ان کے والد زندہ رہے ان کی کفالت کرتے رہے، جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے ترکہ میں ایک بڑی رقم چھوڑی جس کو امام محمدؒ نے اپنی تعلیم پر صرف کیا، خود فرماتے ہیں، مجھے اپنے والد سے تیس ہزار درہم وارثت میں ملے تھے، ۱۵ ہزار میں نے شعر و ادب لغت اور نحو کی تحصیل پر اور ۱۵ ہزار فقہ وحدیث کے حصول پر صرف کیا[1]۔

علم کا فطری ذوق اور مطالعہ میں انہماک :

علم وفن کا ذوق امام محمد میں فطری تھا، وہ آغاز شعور ہی سے مسائل میں ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ بڑوں کی نگاہیں بھی وہاں تک کم پہنچیں تھیں، ان کے اسی فطری ذوق اور استعداد کو دیکھ کر امام صاحب نے فرمایا تھا کہ "انشاء اللہ یہ لڑکا رشید ہوگا، ایک روز ان کے ایک سوال پر فرمایا کہ تم تو بڑوں جیسا سوال کرتے ہو، میرے پاس آمد ورفت رکھو"۔

محمد بن سماعہؒ جو ان کے خاص تلامذہ میں ہیں، فرماتے تھے کہ امام محمدؒ کو مطالعہ میں اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کو سلام کرتا تو انہماک و بےخبری میں (جواب دینے کے بجائے) اس کے لئے دعا کرنے لگتے، پھر جب وہ شخص کچھ اور الفاظ زیادہ کر کے دوبارہ سلام کرتا تو وہی الفاظ دہراتے تھے[2]۔

ان کے نواسے فرماتے ہیں کہ (امام محمد کی وفات کے بعد) میں نے اپنی والدہ سے دریافت کیا کہ نانا گھر میں رہتے تھے تو کیا کرتے تھے، انہوں نے اشارہ کر کے بتایا کہ فلاں کوٹھری میں رہا کرتے تھے، اور گرد و پیش کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا، میں نے مطالعہ کے وقت ان کو کبھی بولتے ہوئے نہیں سنا بجز اس کے کہ وہ ابرو اور ہاتھ کے اشارہ سے اپنی ضرورت بتلا دیا کرتے تھے[3]۔

علمی شغف کا یہ حال تھا کہ کپڑے میلے ہو جاتے تھے، لیکن جب تک کوئی دوسرا شخص کپڑا نہ بدلوا دیتا، وہ کپڑے نہیں اتارتے تھے۔

۱۔ تاریخ خطیب جلد ۲۔ ص ۱۷۲   ۲۔ بلوغ الامانی   ۳۔ کردری جلد ۲۔ ص ۱۶۴

گھر میں ایک مرغ پلا ہوا تھا جو رات میں اکثر بانگیں دیا کرتا تھا، انہوں نے اہل خانہ سے کہا کہ اسے ذبح کر دو۔ اس کی بانگ بے ہنگام کی وجہ سے (علمی) کام میں خلل پڑتا ہے[1]۔

آپ نے گھر میں کہہ رکھا تھا کہ مطالعہ کے وقت مجھ سے دنیا کی کسی ضرورت کا ذکر نہ کیا جائے کہ میرا قلب اس کی طرف متوجہ ہو، جو کچھ کہنا ہو میرے وکیل (منتظم خانہ) سے کہو[2]۔

ذکاوت وذہانت:

نہایت ذکی، ذہین اور طبّاع تھے، ان کے تمام اساتذہ ان کی ذہانت اور ذکاوت کے قائل تھے، امام مالکؒ ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ مشرق سے اس نوجوان (امام محمد) جیسا کوئی ذکی اور طباع آدمی میرے پاس نہیں آیا[3]، حالانکہ اس وقت ان کے درس میں اہل مشرق ہی سے عبداللہ بن مبارک وکیع بن جراح، عبدالرحمٰن بن مہدی جیسے ائمہ حدیث موجود تھے۔

امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ میں نے امام محمدؒ جیسا فربہ اندام ذکی نہیں دیکھا، دوسری روایت میں ہے کہ میں نے ان کے جیسا عاقل اور فہیم نہیں دیکھا[4]۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ **دکان من اذکیاء العالم** دنیا کے ذکی اور فہیم تر انسانوں میں تھے۔

قوّتِ حافظہ:

فہم وذکا کے ساتھ ساتھ قوت حافظہ کا عطیہ بھی قدرت کی طرف سے انہیں وافر ملا تھا، اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام صاحب نے ان سے قرآن حفظ کرنے کے لئے فرمایا کہ تو ایک ہفتہ کے اندر انہوں نے پورا قرآن حفظ کرلیا۔

ایک مرتبہ امام ابو یوسف کے درس میں شریک تھے، امام نے کسی گذشتہ مسئلہ کے متعلق ان سے دریافت کیا، انہوں نے جواب دیا تو امام نے فرمایا کہ یہ جواب صحیح نہیں ہے، امام محمد نے اپنے جواب پر اصرار کیا، تھوڑی سی رد وقدح کے بعد کتاب کی طرف رجوع کی گیا، امام محمد کا جواب صحیح نکلا، پھر امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ:

هكذا يكون الحفظ (بلوغ الامانی)

''حافظ ایسا ہی ہوتا ہے''۔

---

[1] مناقب کروری جلد۲۔ ص۱۶۲　[2] مناقب کروری جلد۲۔ ص۱۶۲
[3] بلوغ الامانی ص۵۵　[4] تاریخ بغداد جلد۲۔ ص۱۷۲ جواہر مضیہ جلد۲۔ ص۴۲

مجلس درس :

اسی ذکاوت وذہانت اور علمی ذوق وانہماک کا نتیجہ تھا کہ بیس ہی برس کی عمر میں مسند درس کی زینت بنا دیئے گئے اور کوفہ، بصرہ، شام، ہرات، نیشاپور، حلب، بخارا اور اقصائے مغرب غرض دنیائے سلام کے گوشہ گوشہ سے تشنگان علم آکر اس سرچشمۂ علم سے سیراب ہونے لگے۔

تلامذہ :

امام محمد کی عمر کا بیشتر حصہ درس وتدریس اور افادہ وتعلیم کے مشغلہ میں گزرا ،سینکڑوں اشخاص نے ان کے سامنے زانو سے تلمذ تہ کیا ہوگا ،ان سب کے ناموں کا استقصا نہایت دشوار ہے۔جن تلامذہ کے ناموں کا پتہ چل گیا ہے، ان کی فہرست بھی کافی لمبی ہے، اس لئے یہاں ان مشاہیر تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے، جنہیں کوئی امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

ابو حفص الکبیر البخاری، یہ امام بخاری کے شیوخ میں ہیں ابوسلیمان موسیٰ بن سلیمان الجوز جانی انہی کی روایت سے ظاہر الروایۃ کی چھ کتابیں مشرق ومغرب میں پہنچیں، امام شافعی، ابوعبیدہ قاسم بن سالم ہروی اپنے وقت کے مجتہد تھے، عمرو بن ابی عمرو الحرانی محمد بن سماعہ التیمی علی بن معبد بن شداد جامع کبیر اور جامع صغیر کے ایک راوی یہ بھی ہیں، اسد بن فرات امام مالک کے خاص شاگرد اور ان کے مسلک کے مدون بھی ہیں اور مدونہ کے مرتب شیخ سحنوں کے استاد بھی محمد بن مقاتل الرازی ابن جریر طبری کے استاد ہیں۔ یحییٰ بن معین، امام جرح تعدیل ابوجعفر احمد بن محمد بن مہران المنسوری موطا امام محمد کے راوی ہیں، شعیب بن سلیمان الکیسانیات کے راوی علی بن صالح الجرجانی جرجانیات کے راوی، اسمٰعیل بن توبتہ القروینی السیر الکبیر کے خاص راوی، ابوبکر بن ابراہیم نوادر کے راوی، ابوزکریا محی بن صالح ابوحاتم امام بخاری کے شامی شیوخ میں ہیں، ابوموسیٰ عیسیٰ بن ابان البصری کتاب الحج کے راوی اور کتاب الحج الکبیر اور کتاب الحج الصغیر کے مصنف ہیں، ایک کتاب انہوں نے امام شافعی اور مریسی کے رد میں بھی لکھی تھی، سفیان بن سحبان البصری کتاب العلل کے مصنف ہیں۔

درس کا طریقہ :

اس وقت درس وتدریس کے مختلف طریقے رائج تھے، بعض شیوخ اپنے حافظہ پر اعتماد کر کے طلبہ کو زبانی املا کراتے تھے، بعض لوگ اپنی لکھی ہوئی تحریر تلامذہ میں سے کسی ایک کو دے دیتے وہ اس کی قرات کرتا جاتا اور عام طلبہ اسے لکھتے یا حفظ کرتے جاتے تھے، امام مالک ؒ کے درس کا یہی طریقہ تھا، بعض حضرات کا یہ طریقہ تھا کہ انہیں جو کچھ املا کرانا ہوتا تھا وہ پہلے لکھ لیتے تھے، اور پھر خود ہی

طلبہ کے سامنے اس کی قرات کرتے، اور طلبہ اسے نوٹ کرتے جاتے تھے۔ امام محمد کا بھی غالباً عام دستور یہی تھا کہ وہ خود قرات کرتے تھے۔

یحییٰ بن صالح[1] وحاظی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حج میں محمد بن حسن کا رفیق سفر تھا، ایک روز میں نے ان سے کہا کہ اپنی کتاب کی تحدیث کیجئے، انہوں نے کہا اس وقت طبیعت موزوں نہیں ہے، میں نے کہا کہ میں قرات کرتا ہوں، انہوں نے کہا کہ کیا تم اپنی قرات کو میرے لئے آسان سمجھتے ہو، میں نے کہا ضرور، اس پر انہوں نے فرمایا کہ نہیں میری قرات زیادہ آسان ہوگی اس لئے کہ میں قرات کروں گا تو محض زبان اور آنکھ استعمال کروں گا، لیکن جب تم قرات کرو گے تو مجھے آنکھ، کان اور ذہن تمام اعضاء استعمال کرنے پڑیں گے، اس لئے تمہاری قرات میرے لئے زیادہ مشکل ہوگی[2]۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ درس میں وہ قرات کرنا پسند کرتے تھے، اسد بن فرات کا بیان بھی ہے کہ وہ قرات خود کرتے تھے[3]۔

درس میں طلبہ کے سامنے جو تقریر کرتے تھے، وہ نہایت ہی صحیح اور حشو و زوئد سے پاک ہوتی تھی، امام شافعیؒ یہ دیکھ کر فرماتے تھے کہ امام محمدؒ جب کسی مسئلہ کو لیتے اور اس پر تقریر کرتے تھے، تو کلام میں ایک حرف کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا ان پر قرآن کا نزول ہو رہا ہے[4]۔

موطائے امام مالک کا درس :

اہلِ عراق میں امام محمدؒ غالباً پہلے شخص تھے جنہوں نے مدینہ میں تین برس تک رہ کر امام مالکؒ اور دوسری شیوخ مدینہ سے استفادہ کیا، اور ان کی مرویات کا ایک بڑا سرمایہ اپنے ساتھ عراق لائے، متعدد وجوہ کی بنا پر امام مالکؒ کی مرویات کو اس وقت ایک خاص خصوصیت حاصل تھی، اس لئے امام محمدؒ نے ان کی روایتوں کے درس کے لئے ایک خاص دن معین کر دیا تھا تاکہ وہ لوگ جو امام دار الہجرت کی خدمت میں نہیں پہنچ سکتے تھے، وہ ان کی مرویات سے مستفیض ہو سکیں۔

چنانچہ جس روز وہ امام مالک کی روایتوں کی تحدیث کرتے تھے۔ اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ مجلس میں جگہ ناکافی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام محمدؒ نے حاضرین سے فرمایا کہ تم لوگ اپنے اصحاب کے بارے میں کتنے برے ہو کہ جب میں امام مالک سے روایت کرتا ہوں تو ٹوٹ پڑتے ہو اور جب تمہارے اصحابِ حدیث (اہل عراق) سے روایت کرتا ہوں تو بادل ناخواستہ شریک ہوتے ہو[5]۔

---

[1] امام محمد کے شاگرد اور امام بخاری کے شیخ ہیں۔ [2] بلوغ الامانی ص ۴۴ [3] معالم الایمان جلد ۱۔ ص ۵
[4] تاریخ بغداد جلد ۲۔ ص ۱۷۶، ۱۷۵، مناقب کروری۔ [5] تاریخ بغداد جلد ۲۔ ص ۱۷۳
[6] اسد بن فرات امام مالک اور امام محمد دونوں کے شاگرد ہیں آگے ان کا تذکرہ آئے گا۔

امام مالک کی وفات کے بعد جب ان سے براہ راست سماع کی امید منقطع ہوگئی تو یہ مجمع اور زیادہ بڑھنے لگا، اسد بن فرات[۱] کے الفاظ میں اس کی کیفیت سُنیے، فرماتے ہیں کہ ایک دن تمام لوگ امام محمد کے درس میں شریک تھے کہ ایک شخص مجلس میں کودتا پھاندتا ہوا تیزی سے امام محمدؒ کے پاس پہنچا، اور اس نے ان سے کچھ آہستہ سے کہا ہم نے سنا کہ امام نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا کہ کتنی بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی کہ امام مالک امیر المؤمنین فی الحدیث کی وفات ہوگئی، اس کے بعد تمام مجمع میں ماتم برپا ہوگیا[۱]۔ اسد کا بیان ہے کہ اس کے بعد سے امام محمدؒ جس دن امام مدینہ کی مرویات کا درس دیتے تھے، اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ راستہ بند ہوجاتا تھا۔

راستہ کے وقت درس کا سلسلہ :

امام محمدؒ دن کے علاوہ رات کے وقت بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، لیکن یہ درس عام نہیں ہوتا تھا بلکہ جو طلبہ دور دراز سے خاص ذوق لے کر ان کی خدمت میں آتے اور ان کے پاس وقت کم ہوتا تھا، تو ان کے لئے وہ رات کے وقت مجلس درس منعقد کرتے تھے۔

چنانچہ اسد بن فرات قیروان سے ان کی خدمت میں پہنچے تو کچھ روز درس میں شرکت کے بعد انہوں نے امام محمد سے عرض کیا کہ میں ایک کم عمر اور مسافر آدمی ہوں، آپ کے درس میں اس قدر مجمع ہوتا ہے کہ مجھے پورے طور پر استفادہ کا موقع نہیں ملتا۔

امام محمدؒ نے فرمایا کہ تم دن کے وقت عام اہل عراق کے ساتھ سماع کیا کرو، اور رات کے وقت میرے یہاں چلے آیا کرو، میں تمہیں وقت دوں گا، اسد کا بیان ہے کہ میں روزانہ رات کے وقت ان کے یہاں جایا کرتا تھا، جب میں پہنچتا تو ہو ایک پیالہ پانی اپنے ساتھ رکھ لیتے اور قرات ودرس کا سلسلہ شروع کردیتے، جب رات زیادہ گزر جاتی تو مجھے غنودگی طاری ہونے لگتی، وہ کیا کرتے کہ پیالہ سے ایک چلو پانی لے کر میرے چہرے پر چھڑک دیتے، پھر درس کا سلسلہ شروع کرتے جب پھر مجھے غنودی طاری ہوتی تو پھر ایسا ہی کرتے، یہی روزانہ کا معمول ہوگیا تھا[۲]۔

اسد بن فرات کے علاوہ امام شافعی اور ابو عبید کے لئے بھی انہوں نے رات کو مخصوص طور پر وقت نکالا تھا[۳]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام محمد اپنے تلامذہ کے وقت کو کس قدر عزیز رکھتے تھے، اور ان کے افادہ کے لئے خود کتنی مشقتیں برداشت کرتے تھے۔

۱۔ بلوغ الامانی ص ۱۵، ۱۶ ۲۔ معالم الایمان جلد ۲۔ ص ۴ ۳۔ بلوغ الامانی

عورتوں کا درس :

کبھی کبھی آپ کے پاس عورتیں بھی استفادہ کے لئے آیا کرتی تھیں، ان کے لئے بھی آپ نے رات ہی کا وقت رکھا تھا۔ محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ ایک بار دس رومی لونڈیاں انشاء اور عربیت میں ماہر ہوکر (غالباً فقہ میں) استفادہ کے لئے آپ کے یہاں آئی ہوئی تھیں۔

تلامذہ کے ساتھ حسن سلوک :

تلامذہ کے ساتھ ان کا تلطف اور حسن سلوک صرف درس وتدریس اور وقت کی قربانی ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ روپیہ پیسہ کے بارے میں ان کا یہ وصف اور زیادہ نمایاں ہوجاتا تھا، ایک بار اسد بن فرات کا خرچ چک گیا، انہوں نے کسی سے ذکر نہیں کیا، ایک دن امام محمدؒ نے دیکھا کہ وہ چشمہ سے پانی پی رہے ہیں انہوں نے وجہ دریافت کی اسد نے صرف اتنا کہا میں مسافر آدمی ہوں، امام محمدؒ سمجھ گئے اور چپکے ہو رہے اور رات کے وقت خادم کے ذریعے ان کے پاس اسی دینار بھجوا دیئے[1] (سونے کے موجودہ بھاؤ کے اعتبار سے دو ہزار سے زیادہ روپے ہوتے ہیں)

امام شافعیؒ کی بھی کئی بار انہوں نے مالی امداد کی، ایک بار انہوں نے پچاس دینار ان کو دیئے اور کہا اس میں ننگ وعار محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، امام شافعی نے فرمایا اگر مجھے ننگ وعار ہوتا تو مجھ پر آپ جو احسانات کرتے ہیں ان کا بار میں کیوں اٹھاتا[2]، امام محمدؒ دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک کے موقع پر اس مصرع کے مصداق ہوتے تھے۔

كانك تعطيه الذى انت سائله

''جب تم کسی کو کچھ دیتے ہو تو اس کے سامنے (اپنی عاجزی وکسرِ نفسی کی وجہ سے) تم ایسے معلوم ہوتے ہو کہ تم خود اس سے مانگ رہے ہو''۔

عراق کے زمانۂ قیام میں ایک بار امام شافعیؒ قرض کے سلسلہ میں نظر بند کردیئے گئے تھے، امام محمدؒ نے قرض خواہ کا قرضہ ادا کرکے انہیں رہا کرایا[3]۔

امام شافعیؒ سے خاص تعلق :

امام محمدؒ کو امام شافعیؒ سے بڑا تعلق خاطر تھا۔ وہ جب آجاتے تو ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوجاتے تھے۔ ایک بار کسی ضرورت سے دارالخلافہ جانے کے لئے تیار

---

[1] معالم الایمان ۲۔ ص ۵ [2] جواہر مضیہ ۲۔ ص ۴۵ [3] مناقب کردری ۲۔ ص ۱۵۰

ہو چکے تھے کہ امام شافعیؒ آ گئے، انہوں نے دارالخلافہ جانے کا قصد ترک کر دیا اور پورے دن ان کے ساتھ مشغول رہے، ایک مرتبہ امام شافعیؒ نے امام محمدؒ کے پاس ایک منظوم خط لکھا کہ وہ اپنی کتابیں عاریۃً بھیج دیں، امام محمدؒ نے اپنی تمام کتابیں ہدیۃً بھیج دیں[1]۔

اس دور میں جب کہ طباعت و کتابت کے موجودہ طریقے رائج نہیں ہوئے تھے، کسی کو کوئی کتاب ہدیۃً دے دینا موجودہ زمانہ کی مطبوعہ کتابوں کا ایک کتب خانہ دینے سے زیادہ مشکل کام تھا، انہی تمام احسانات اور تعلقات کی بناء پر امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ:

لیس علی منة فی العلم و اسباب الدنیا مالمحمد (کروری ص ۱۵۰)

''علم اور دنیاوی اسباب کے سلسلہ میں مجھ پر امام محمد کا جتنا احسان ہے اتنا کسی دوسرے کا نہیں ہے''۔

انہی احسانات کی بنا پر ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ قیامت تک ہر شافعی پر ضروری ہے کہ وہ امام محمدؒ کا ممنون رہے اور ان کی مغفرت کی دعا کرتا رہے۔ (شذرات الذہب جلد ۲)

طلبہ کے سوالات کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے:

اکثر اساتذہ طلبہ کے سوالات اور مسائل میں کرید کرنے سے گھبراتے اور چیں بجبیں ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات غصہ و غضب تک نوبت پہنچ جاتی ہے، لیکن امام محمدؒ کی یہ خاص خصوصیت تھی وہ عمیق سے عمیق سوال اور دقیق سے دقیق مسائل میں رد و قدح کرنے سے چیں بجبیں نہیں ہوتے تھے، بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے تمام باتوں کا جواب دیتے تھے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے جس سے بھی کوئی مسئلہ دریافت کیا اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا[2]، لیکن محمد بن حسن اس سے مستثنیٰ تھے، ایک دوسری روایت میں ہے کہ جس سے بھی کوئی دقیق مسئلہ دریافت کیا میں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی پر شکن آ گئی لیکن امام محمدؒ کا حال اس سے بالکل جدا تھا[3]۔

علمی مباحثے:

امام محمدؒ شروع ہی سے تفحص اور تعمق کے عادی تھے اور فقہی اور علمی مسائل ان کی نظر ہمیشہ مجتہدانہ پڑتی تھی، اس لئے بسا اوقات انہیں اپنے اساتذہ اور ہمعصروں کے ساتھ بحث و مباحثہ کی نوبت آ جاتی تھی، ایک بار کسی مستفتی نے قاضی ابو یوسف سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، قاضی صاحب نے اس کا جواب دیا، مستفتی وہاں سے امام محمدؒ کے پاس آیا اور وہی مسئلہ دریافت کیا، امام محمدؒ نے نہایت

---

[1] ایضاً ص ۱۴۹　[2] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۴　[3] الانتقاء ص ۹۹

مدلل طور پر اس کا مسلک کا کوئی دوسرا جواب دیا، مستفتی نے امام محمد سے کہا کہ اس مسئلہ میں امام ابو یوسف کو دوسری رائے ہے، اگر آپ دونوں صاحبان ایک جگہ جمع ہو کر اس مسئلہ پر گفتگو کر لیتے تو مسئلہ صاف ہو جاتا۔

چنانچہ امام محمد اور امام ابو یوسف کا کسی مسجد میں اجتماع ہوا اور اس مسئلہ پر گفتگو شروع ہوئی، مستفتی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر تک تو میں نے صاحبین کی گفتگو سمجھی لیکن اس کے بعد گفتگو اس قدر دقیق ہوگی کہ میں بالکل نہیں سمجھ سکا[1]۔

موطا کے سماع سے پہلے ایک مرتبہ امام محمدؒ کو آغازِ شباب میں امام مالک کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا، انہوں نے امام مالک سے دریافت کیا کہ ایک شخص کو غسل کی ضرورت ہے اور مسجد کے اندر پانی رکھا ہوا ہے اور اسے مسجد کے سوا کسی دوسری جگہ پانی میسر نہیں ہے، کیا وہ مسجد جا کر پانی لے سکتا ہے، امام مالک نے فرمایا کہ جنبی (ناپاک آدمی) مسجد میں نہیں جا سکتا، امام محمدؒ نے کہا نماز کا وقت بالکل قریب آ گیا ہے اور پانی اس کے سامنے موجود ہے وہ کیا کرے۔ امام مالک نے پھر وہی جواب دیا، اسی طرح امام مالک مکرر سہ کرر یہی فرماتے رہے کہ جنبی مسجد میں نہیں داخل ہو سکتا، لیکن جب امام محمدؒ کا اصرار بہت بڑھا تو امام مالک نے ان سے فرمایا کہ اس بارے میں آپ ہی بتائیے۔ امام محمد نے کہا کہ "وہ تیمم کرلے اور مسجد میں جا کر پانی لے آئے اور پھر غسل کرلے" اس کے بعد امام مالک اور ان میں کچھ اور باتیں ہوئیں، جب وہ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں نے امام مالکؒ سے کہا کہ یہ محمد بن حسن امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں[2]۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب کبھی فقہ وغیرہ کے مسائل میں مباحثہ کا موقع آتا تو امام کا دستور تھا کہ وہ ایک حکم مقرر کر دیا کرتے تھے، تاکہ وہ فریقین کو مناسب ہدایت اور فیصلہ کر سکے۔

چنانچہ عموماً ان کی مجلس مباحثہ کے حکم عیسیٰ بن ہارون ہوا کرتے تھے[3]۔

امام محمدؒ کے علمی مباحثوں اور مناظروں کے سلسلہ میں بعض غلط روایتیں بھی رواج پا گئی ہیں، آگے ہم ان روایتوں پر ناقدانہ نظر ڈالیں گے۔

عہدۂ قضا:

اسلاف میں بہت سی ایسی ہستیاں ملیں گی، جنہوں نے اپنے فضل و کمال کے باوجود حکومت کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، اور نہ امراء و سلاطین کی صحبت کو پسند کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بسا اوقات سلاطین اور ارکان دولت کے دباؤ سے انہیں ایسا کام کرنا پڑتا تھا جو ان کے ضمیر اور حمیت دینی کے خلاف ہوتا تھا،

---

[1] کردری ۲۔ ص ۱۵۷　[2] تاریخ بغداد اور مناقب کردری ۲۔ ص ۱۵۸　[3] بلوغ الامانی۔ ص ۴۸

اور اس طرح ان کی زندگی کے سارے زہد واتقا پر پانی پھر جاتا تھا، لیکن ان میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ملیں گی جو کسی دینی مصلحت یا کسی اور مجبوری کی بناء پر حکومت سے منسلک ہو گئی تھیں۔

چنانچہ امام ابوحنیفہ سے منصور نے عہدۂ قضا قبول کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "میں اس عہدہ کی صلاحیت نہیں رکھتا"۔ امام صاحب کے شاگردوں میں امام ابو یوسف ؒ نے کچھ خاص وجوہ کی بناء پر عہدۂ قضا قبول کر لیا تھا، لیکن انہی میں امام محمد اور عبداللہ بن مبارک اور امام زفر بھی تھے جو حکومت سے کوئی تعلق قائم کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ امام محمد ؒ اس بارے میں اتنے سخت تھے کہ جب امام ابو یوسف ؒ نے عہدۂ قضا قبول کیا تو انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا[1] لیکن بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آ گئے کہ امام محمد ؒ بھی عہدۂ قضا قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔

امام ابو یوسف ؒ نے عہدۂ قضا اس مصلحت سے قبول کر لیا تھا کہ اس کے ذریعہ امام صاحب کے مسلک کی ترویج واشاعت ہو گی، اسی لئے ان کی خواہش تھی کہ امام محمد ؒ بھی اس عہدہ کو قبول کر لیں، تاکہ ان کے نقطۂ نظر کو مزید تقویت ہو، اتفاق سے اسی زمانہ میں [2]رقہ میں قاضی کے تقرر کا مسئلہ درپیش ہوا اور اس سلسلہ میں امام ابو یوسف سے مشورہ کیا گیا، انہوں نے امام محمد کے انتخاب کا مشورہ دیا، امام محمد ؒ اس وقت کوفہ میں تھے کوفہ سے بغداد بلائے گئے۔

چنانچہ وہ بغداد آئے اور پہلے امام ابو یوسف کے پاس گئے اور ان سے اپنے انتخاب کی وجہ دریافت کی، امام ابو یوسف ؒ نے ان سے پورا واقعہ بیان کر دیا اور کہا کہ میں نے یہ مشورہ اس لئے دیا ہے کہ کوفہ اور بصرہ میں تو ہمارے مسلک کی بہت کافی اشاعت ہو چکی ہے۔ اگر آپ شام میں چلے جائیں گے تو وہاں بھی اس کی ترویج کا ذریعہ پیدا ہو جائے گا۔

امام محمد نے اس مصلحت کو اپنے انتخاب کے لئے پسند نہیں کیا اور کہا کہ اس میں براہ راست مجھ سے گفتگو کرنی چاہئے تھی۔ اس گفتگو کے بعد امام ابو یوسف ؒ نے ان سے یحییٰ برمکی کے پاس چلنے کے لئے کہا، دونوں صاحب یحییٰ کے پاس گئے، امام ابو یوسف نے یحییٰ سے کہا کہ محمد بن حسن سامنے موجود ہیں ان سے (عہدۂ قضا کے) معاملات طے کر لیجئے۔ یحییٰ نے امام محمد پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ عہدۂ قضا قبول کرنے پر مجبور ہو گئے[3]۔

امام محمد ؒ نے عہدۂ قضا قبول تو کر لیا لیکن یہ بات چونکہ ان کی طبیعت اور ضمیر کے خلاف

---

[1] ایضاً ص ۴۰ [2] یہ مقام گرمیوں کے زمانہ میں عباسیوں کا دارالخلافہ ہوتا تھا۔
[3] ترجمہ محمد بن حسن امام ذہبی مطبوعہ مصر ص ۵۵، ۵۶

ہوئی تھی اور اس کا ذریعہ امام ابو یوسفؒ ہوئے تھے اس لئے انہوں نے امام ابو یوسفؒ سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور اس میں اس قدر شدت اختیار کی کہ ان کے یہاں آمد ورفت بھی ترک کر دی۔ اور مشہور ہے کہ وفات کے بعد ان کے جنازہ میں بھی شرکت نہیں کی[1]۔ دوسری روایت ہے کہ ہارون رشید نے خود ان کو اس عہدہ کے لئے منتخب کیا تھا، جب امام محمدؒ کو معلوم ہوا تو وہ امام ابو یوسفؒ کے پاس گئے اور اپنے گذشتہ تعلقات کو یاد دلا کر فرمایا کہ مجھے اس آزمائش میں نہ ڈالیے، امام ابو یوسف ان کو لے کر یحییٰ کے پاس گئے، اس نے ان کو ہارون کے پاس بھیج دیا اور اس طرح مجبور ہو کر انہیں یہ عہدۂ قضا قبول کر لینا پڑا۔

بے لاگ فیصلہ اور عہدۂ قضا سے برطرفی :

امام محمد نے یہ عہدہ بادلِ نخواستہ قبول کیا تھا، ان کی خواہش کو اس میں ذرہ بھی دخل نہیں تھا اس لئے وہ جب تک اس عہدہ پر فائز رہے بڑی دیانت داری سے بلا کسی رو رعایت کے اس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہوں نے کبھی اپنے فیصلہ میں خلیفۂ وقت یا ارکان دولت کی پرواہ نہیں کی۔

چنانچہ ان کے قاضی ہونے کے کچھ ہی روز بعد یحییٰ بن عبداللہ کی امان کا قصہ دربار میں پیش ہوا، ہارون نقض عہد کر کے یحییٰ کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن اس ارادہ کی تکمیل کے لئے قضا کے فیصلہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تمام قضاء دربار میں بلائے گئے، امام محمدؒ بھی موجود تھے ہارون سے سب سے پہلے امام محمدؒ سے دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ یحییٰ بن عبداللہ کو جو امان دی جا چکی ہے وہ صحیح ہے اور امان کا نقض اور یحییٰ کا قتل کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ان کے بعد ہارون حسن بن زیاد سے مخاطب ہوا، انہوں نے کچھ صاف جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے ابو البختری وہب بن وہب سے دریافت کیا، انہوں نے ہارون کی مرضی کے مطابق جواب دیا امام محمد پر عتاب شاہی نازل ہوا اور وہ عہدۂ قضا سے برطرف کر دیئے گئے[2] اور انہیں افتا سے بھی روک دیا گیا[3]۔

قید و بند :

غالباً اسی فتویٰ کے سلسلہ میں استاد کی سنت کے مطابق انہیں قید و بند کی مشقت بھی اٹھانی پڑی، مناقب کروری میں محمد بن سلام (امام محمدؒ کے خاص شاگرد) کا بیان ہے کہ

طلب محمد للقضاء فجس و د کل به قرین حتی لا یطلع علیه احد

---

[1] تاریخ بغداد ترجمہ محمد بن حسن امام ذہبی، اس سلسلہ میں بعض غلط روایتیں بھی مشہور ہو گئی ہیں آگے ان پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے گی۔ [2] کروری جلد ۲۔ ص ۱۶۵ [3] ایضاً و بلوغ الامانی ص ۴۰

ولا یدخل علیه احد وضیق فی الجسد الفقه فرشوت السبحان رشوة عظیمه و دخلت علیه بکیس من الدرا (جلد ۲ ص ۱۶۲)

''امام محمد فیصلہ کے لئے بلائے گئے اور پھر قید کر دیئے گئے اور ان کو قید تنہائی دے دی گئی، گویا علم فقہ کے افادہ کو محبوس کر دیا گیا، میں نے دربان کو کچھ دے دلا کر ان کے پاس ایک تھیلی درہم لے کر پہنچا''۔

رہائی اور قاضی القضاۃ کا عہدہ :

اتفاق سے اسی زمانہ میں ام جعفر (ہارون کی بی بی) کو کوئی جائیداد وقف کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے امام محمدؒ سے وقف نامہ لکھنے کی درخواست کی انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ مجھے فتویٰ دینے سے روک دیا گیا ہے، ام جعفر نے امام محمد کے معاملہ (غالباً پابندی اٹھا لینے کے بارے میں) میں ہارون سے گفتگو کی، ہارون نے انہیں فتویٰ کی اجازت دے دی، اور پھر ان کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا[1] اور جس پر غالباً وہ آخر وقت تک فائز رہے۔

وفات :

امام محمد کے قاضی القضاۃ ہونے کے کچھ ہی دن بعد ہارون کو کسی ضرورت سے رے جانا پڑا۔ امام محمد کو بھی وہ اپنے ساتھ لیتا گیا، اسی مقام پر ۱۸۹ھ میں ۵۸ برس کی عمر میں امام فقہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اتفاق سے کسائی مشہور امام نحو بھی اس سفر میں ہارون کے ساتھ تھے، انہوں نے بھی اسی دن یا دو دن بعد انتقال کیا، ہارون کو ان دونوں ائمہ فن کے پے در پے انتقال کا بڑا رنج ہوا اور اس نے غایت افسوس میں کہا کہ ''فقہ و نحو دونوں کو میں نے رے میں دفن کر دیا''[2]۔

تدفین :

جبل طبرک جورے کا مشہور قلعہ ہے، اسی میں امام فقہ کو سپرد خاک کیا گیا[3]۔

یحییٰ یزیدی، ہاورن کے دربار کا مشہور شاعر اور ادیب تھا اس نے بڑا پُر درد اور دل سوز مرثیہ لکھا ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

تصرمت الدنیا فلیس خلود ‏ قد تری من بجة ستبید

لکل امری منا من الموت منهل ‏ فلیس لهٗ الا علیه ورود

الم تر شنیا شاملاً بعد الیلیٰ ‏ وان الشباب لیس یعود

[1] کردری جلد ۲۔ ص ۱۶۵ و بلوغ الامانی ص ۴۰ ‏ [2] مناقب کردری ۲۔ ص ۱۴۹ ‏ [3] ایضاً

امام ذہبی نے ان اشعار کو قاضی ابو خازم عبد الحمید کی طرف منسوب کیا ہے، اور چند اشعار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ صیرانی نے اس مرثیہ کی نسبت یحییٰ یزیدی کی طرف کی ہے[۱]۔

اولاد :

امام محمد کے نکاح اور اولاد کے متعلق تذکروں میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، بعض روایتوں میں آپ کے ایک نواسے کا ذکر آتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شادی ہوئی تھی، اور آپ نے ایک صاحبزادی بھی یادگار چھوڑی تھی۔

حلیہ :

بال گھنے، گداز بدن اور نہایت ہی سکیل وجمیل اور خوش لباس آدمی تھے[۲]۔

ان کے حسن صورت کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ جب ان کے والد تعلیم کی غرض سے ان کو امام صاحب کے پاس لے گئے، تو امام صاحب نے ان کے حسن و جمال کو دیکھ کر فرمایا کہ لڑکے کے سر کا بال اتر ادو، اور معمولی کپڑے پہناؤ۔ ان کے والد نے اس کی تعمیل کی، بال اتر جانے کے بعد ان کے جمال میں اور چار چاند لگ گئے، چنانچہ اسی ہیئت کو دیکھ ابونواس نے یہ اشعار کہے تھے۔

حلقوا رسه ليكسوه قبحا غيره منهم عليه وشحا

كانه في وجهه صباح ليل نزعو ليله وابقوا صبحا

وکیع بیان کرتے ہیں کہ چونکہ محمد بن حسن کم سن اور بہت ہی شکیل وجمیل تھے، اس لئے ہم لوگ حدیث کے درس میں ان کے ساتھ جانا پسند کرتے تھے[۳]۔

اخلاق و عادات :

انسان کے شرف کا اصلی معیار، اخلاق و کردار ہے۔ اگر اس حیثیت سے اس میں کوئی کمزوری ہے تو وہ غیر معمولی ہو کر بھی معمولی آدمی ہے اور اگر اس اعتبار سے اس میں کوئی خوبی ہے، تو وہ ہماری نظروں میں کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو۔ لیکن حقیقی شرف اس کو حاصل ہے۔

امام محمد اپنے فضل و کمال کے ساتھ، اخلاق و کردار میں بھی اپنے ہم عصروں سے ممتاز تھے، امام ابو حفص نے ان کے اخلاق کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے، کہ "اگر ان کو کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ صرف علم ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، (ان میں دوسری کوئی خوبی نہیں ہے) لیکن اسی کے ساتھ

---

[۱] خطیب بغدادی جواہر مضیہ جلد ۲۔ ص ۴۲ [۲] ترجمہ محمد بن الحسن ص ۶۰ [۳] کروی ۱۴۷، ۱۴۸

نہایت صالح، خلیق، مہذب اور عمدہ روش کے آدمی تھے، ان کی زبان سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی، ہر شخص سے مدارات اور محبت ان کا شیوہ تھا[1]۔

علی بن معبدان کے حسن خلق کا ایک اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں امام محمدؒ رقہ کے قاضی تھے، مجھے رقہ جانے کا اتفاق ہوا، ایک دن میں ان سے ملنے گیا۔ دروازہ پر پہنچا تو دربان نے روک دیا، میں واپس چلا آیا، پھر دوبارہ ان سے ملنے نہیں گیا ایک روز گزر رہا تھا دیکھا کہ محمد ابن حسن قضاۃ کے لباس میں شان وشوکت کے ساتھ گھوڑے پر سوار چلے آرہے ہیں، مجھے روکا اور اپنے ساتھ مکان میں لے آئے، مکان پہنچ کر مجھ سے انہوں نے کہا کہ آپ اتنے روز سے رقہ میں ہیں، اور کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے، انہوں نے گذشتہ واقعہ بتایا، امام محمد نے دربان کا نام پوچھا، انہوں نے اس خیال سے کہ دربان سزا پائے گا نام نہیں بتایا۔ امام محمد نے تمام دربانوں کو بلا کر ہدایت کی کہ جب یہ آئیں تو کوئی نہ روکے۔

چنانچہ اس کے بعد وہ جس وقت چاہتے ان کے پاس چلے آتے تھے امام صاحب اور ان کے تلامذہ کو جن میں خود امام محمد بھی تھے، لوگ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر برا بھلا کہتے تھے۔ امام محمدؒ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے یہ شعر پڑھا اور خاموش ہوگئے۔

محسودون و شر الناس منزلۃ　　من عاش فی الناس لوماً غیر محسود[2]

یہ لوگ ہیں (امام صاحب اور ان کے تلامذہ) جن پر لوگ حسد کرتے ہیں مرتبہ کے اعتبار سے سب سے کمتر وہ شخص ہے جس پر کوئی حسد نہ کرے۔

بردباری :

حلم و بردباری کے وہ مجسمہ تھے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں میں نے امام محمدؒ جیسا حلیم آدمی نہیں دیکھا، وہ اپنے مزاج کے خلاف بات سنتے اور برداشت کر جاتے تھے[3]۔

طلبہ ان سے ہر قسم کے سوالات اور بحث ومباحثہ کرتے تھے۔ مگر ان کی پیشانی پر بل نہیں آتا تھا، امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ میں نے امام محمدؒ ہی کو ایک ایسا آدمی پایا کہ وہ بحث ومباحثہ کے وقت چیں بجبیں نہیں ہوتے تھے۔

فیاض :

نہایت کشادہ دست، فیاض اور سیر چشم تھے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ انہیں اپنے والد سے جو

---

[1] کردری ص ۱۴۷　[2] کردری ۲۔ ص ۱۵۴　[3] کردری جلد ۲۔ ص ۱۵۴

دولت ملی تھی وہ سب انہوں نے اپنی تعلیم پر خرچ کر ڈالی، طلبہ کے ساتھ حسن وسلوک کے وقت ان کا یہ وصف اور زیادہ نمایاں ہو جاتا تھا، امام شافعی اور اسد بن فرات کے متعدد بار انہوں نے اسّی دینار بطور امداد دیئے تھے، بسا اوقات اپنے پاس کچھ نہ ہوتا تو دوسروں کے ذریعہ اہلِ احتیاج کی ضرورت رفع کرا دیا کرتے تھے، اسد بن فرات فقہ کی تکمیل کے بعد جب اپنے وطن قیروان واپس جانے لگے، تو ان کے پاس زادِ سفر نہیں تھا۔ امام محمد کو معلوم ہوا تو انہوں نے کسی شاہزادہ کو غالباً (میں یا مامون) لکھا، اس نے دس ہزار کی رقم خزانہ شاہی سے دلوادی اور ان کے سفر خرچ کا انتظام ہو گیا[1]۔

محمد بن سماء کا بیان ہے کہ امام شافعیؒ کو متعدد بار مالی دقتیں پیش آئیں اور ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ امام محمدؒ نے اپنے احباب واصحاب سے بڑی بڑی رقمیں ان کے لئے جمع کرائیں[2]۔

اس وصف میں امام محمد کے بہت کم لوگ شریک نظر آتے ہیں۔

بذلہ سنجی :

اپنے حلم وسنجیدگی کی وجہ سے کوئی ناملائم یا غیر مہذب الفاظ اپنی زبان سے نہیں نکالتے تھے، کبھی کبھی مزاح کے جملے کہہ دیا کرتے تھے، کوئی مسجد گر پڑ کر خراب ہو گئی تھی، لوگوں نے امام ابو یوسفؒ سے اس کے بارے میں فتویٰ پوچھا، انہوں نے کہا وہ مسجد کے حکم میں ہے، ایک روز ادھر سے امام محمد کا گزر ہوا مسجد پر ان کی نظر پڑی...... کہ کوڑے کرکٹ سے اٹی ہوئی ہے، یہ دیکھ کر انہوں نے مزاحاً فرمایا یہ ابو یوسف کی مسجد ہے[3]۔

جرات وحق گوئی :

آپ کے صحیفۂ اخلاق کا ایک نمایاں باب جرات وحق گوئی بھی تھا جب کبھی حق بات کے اظہار کا موقع آجاتا تو آپ اس میں کسی کی رو رعایت اور مداہنت نہیں کرتے تھے، یحییٰ طالبی کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہارون نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش کی کہ اس کی مرضی کے مطابق وہ فتویٰ دے دیں، لیکن انہوں نے اس کے شاہانہ دبدبہ ووقار کی پروا کئے بغیر پوری جرات کے ساتھ حق کا اظہار کیا۔

ایک روز امام محمد دوسرے علماء کے ساتھ ہارون کے محل میں بیٹھے ہوئے تھے[4]۔ اتفاق سے اسی وقت ہارون رشید بھی آگیا، تمام حاضرین اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے لیکن امام محمدؒ نے اپنی

---

[1] معالم الایمان جلد ۱۔ ص ۵ [2] مناقب کردری ۲۔ ص ۱۵۰ [3] مناقب کروزی ۲۔ ص ۱۵۰

[4] یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب امام محمد اس سے پہلے ایک بار ہارون کے موردِ عتاب بن چکے تھے، اور امام جعفری کی کوشش سے ہارون اور ان کے درمیان صفائی ہو چکی تھی۔ بلوغ ص ۴۲

جگہ سے جنبش بھی نہیں کی تھوڑی دیر بعد ہارون نے امام محمد کو تخلیہ میں بلایا، امام محمد اندر گئے، تو ہارون نے ان سے کہا کہ بنو تغلب (نصاریٰ) کو نقض عہد کر کے میں قتل کرانا چاہتا ہوں، امام محمد نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ نے انہیں امان دی ہے، اس لئے نقض عہد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہارون نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے بچوں کا بپتسمہ (عیسائی بنانا) نہ کریں، لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی ہے، امام محمد نے فرمایا کہ انہوں نے بپتسمہ کے باوجود انہیں امان دی تھی۔ اس پر ہارون نے کہا کہ حضرت عمرؓ کو ان سے جنگ کا موقع نہ مل سکا، امام محمد نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو اس کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو ان سے جنگ کرنا چاہئے تھا، حالانکہ ان لوگوں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے بالاشرط صلح کی تھی، اس پر ہارون بہت خفا ہوا، اوران کو محل سے باہر نکلوا دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ وہ جب لاجواب ہو گیا تو اس نے پوچھا کہ میرے آنے پر آپ میری تعظیم کے لئے کیوں کھڑے نہیں ہوئے، امام محمد نے جواب دیا کہ یہ خدام کا کام ہے، علماء کے درجہ سے یہ چیز فروتر ہے، آپ کے ابن عم (حضرت ابن عباسؓ) نے آنحضرت ﷺ سے روایت کی ہے کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لئے اسٹیچو کی طرح کھڑے رہیں تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے[1]۔

جب امام محمد تخلیہ سے باہر آئے، تو حاضرین نے جنہیں یہ خیال تھا کہ آج عدم تعظیم کی بنا پر امام محمد کو کوئی سخت سزا ملے گی، پوچھا کیا ہوا، امام محمد نے پوری گفتگو دہرائی تو لوگ ان کی جرأت پر حیرت زدہ رہ گئے[2]۔

اس روایت سے امام محمد کی جرات وحق گوئی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک حقوق عباد میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے، یہی وجہ تھی کہ ہارون کو خاموش اور اپنے ارادہ سے باز رہنا پڑا۔

ایک مرتبہ ہارون نے کسی شخص کے بارے میں کوئی امان لکھوائی، غالباً اس خیال سے دوسرے سے لکھوائی کہ ضرورت کے وقت اس سے انکار کی گنجائش نکل سکے۔

چنانچہ اس نے امان کے بارے میں امام محمدؒ سے فتویٰ پوچھا کہ میں نے اس اپنے ہاتھوں سے نہیں لکھا ہے، دوسرے سے لکھوایا ہے، تو کوئی شخص اگر قسم کھائے کہ وہ کوئی خط یا تحریر اپنے ہاتھ سے نہ لکھے گا لیکن اگر دوسرے سے لکھوائے، تو اس کی قسم ٹوٹے گی یا نہیں، امام محمد نے اپنی ذکاوت سے مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ لیا، فرمایا کہ وہ قسم کھانے والا شخص عوام میں ہے تو جب تک وہ نیت نہ کرے اس کی

۱۔ کردری ج۲ ص ۱۶۲　　۲۔ بلوغ الامانی ص ۴۲

قسم نہیں ٹوٹے گی، لیکن اگر بادشاہ ہے تو قسم ضرور ٹوٹ جائے گی، اس لئے کہ بادشاہ کے حکم سے جو چیز لکھی جائے گی وہ بادشاہ ہی کی ہوگی، اس پر ہارون بہت برافروختہ ہوا[۱]۔

سازش کا شبہ :

انہی تمام واقعات کی بنا پر ہارون کو یہ شبہ پیدا ہوگیا تھا کہ ہمارے خلاف جو آئے دن طالبیوں کی سازش ہوا کرتی ہے، اس میں امام محمد کا ہاتھ ہے، چنانچہ اس نے حکم دیا کہ ان کی کتابوں کا جائزہ لیا جائے کہ ان میں اس قسم کے باغیانہ خیالات تو نہیں پائے جاتے۔ امام محمد کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے محمد بن سماعہ سے جو ان تمام واقعات میں ان کے ساتھ تھے، کہا کہ فوراً گھر پر جا کر میری کتابوں کو محفوظ کرلو، ورنہ ہوسکتا ہے کہ ایسی کوئی چیز ان میں شامل کردی جائے جو ان میں موجود نہ ہو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد جب ہارون کے سامنے یہ کتابیں پیش ہوئی تو ان میں بجز حضرت علیؓ[۲] کے فضائل کی حدیثوں کے اور کوئی چیز نہیں ملی، اس پر ہارون نے کہا کہ اس سے زیادہ تو ان کے فضائل ہمارے پاس موجود ہیں یہ کوئی گرفت کی بات نہیں ہے[۳]۔

زہد و عبادت :

نہایت صالح، عابد اور شب زندہ دار تھے، رات دن میں ایک ثلث قرآن تلاوت کرڈالتے تھے[۴]۔ انہوں نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کرلیا تھا، ایک حصہ میں درس وتدریس کا مشغلہ رہتا، دوسرے حصہ میں آرام فرماتے اور تیسرے حصہ میں بارگاہِ قدس میں سجدہ ریز ہوتے تھے[۵]۔

شیخ عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، کہ میں نے بارہا کوشش کی کہ جس خضوع وخشوع کے ساتھ امام محمد معمولاً نماز ادا کرتے ہیں، میں ایک ہی بار اس طرح پڑھ لوں، لیکن میں اس سے عاجز رہا[۶]۔ بکر بن محمد العمی فرماتے تھے کہ محمد بن جسماعہ اور عیسیٰ بن ابان (دونوں اپنے وقت کے شیخ اور محدث تھے) نے جس حسن وخوبی سے نماز پڑھنا امام محمدؒ سے سیکھا تھا[۷]۔ محمد بن کامل المروزی فرماتے ہیں کہ میں نے زہد وورع میں امام محمدؒ کو بہت زیادہ بلند پایہ پایا[۸]۔ قتیبہ ابن سعید فرماتے ہیں کہ میں نے انہیں کثیر العبادۃ پایا[۹]۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن حسن جیسا زاہد اور پرہیزگار نہیں دیکھا[۱۰]۔

---

۱ ایضاً وکردری جلد ۲ ص ۱۶۴　۲ تمام خلفائے عباسیہ مختلف اسباب کی بنا پر اس چیز کو بھی ناپسند کرتے تھے
۳ کردری جلد ۲ ص ۱۶۴ و بلوغ الامانی ص ۴۲　۴ کردری ۲ ص ۱۶۲　۵ ایضاً　۶ کردری جلد ۲ ص ۱۶۲
۷ ترجمہ امام محمد امام ذہبی ص ۵۹　۸ کردری ص ۱۶۲　۹ ایضاً ۱۵۳　۱۰ بلوغ الامانی ص ۵۶

آخرت کا خوف :

نہایت رقیق القلب اور آخرت کے خوف سے لرزاں رہتے تھے، وفات سے کچھ دیر پہلے آپ پر بے حد گریہ طاری ہوا، لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ جس وقت میں بارگاہ قدس میں کھڑا کیا جاؤں گا اور مجھ سے سوال ہوگا کہ مقام رے تک کون سی چیز لائی؟ رضائے الٰہی کی جستجو اور تلاش یا جہاد فی سبیل اللہ تو میں اس وقت کیا جواب دوں گا[۱]۔ (یعنی اس میں سے کوئی چیز بھی نہیں) اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اسلاف کسی نیک مقصد کے بغیر گھر سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے تھے۔

علم وفضل :

امام محمدؒ کے صحیفۂ زندگی میں تمام انسانی اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے لیکن علم وفضل کے نقوش ان میں سب سے زیادہ نمایاں اور ظاہر تھے۔

ان کے علم وفضل کا صحیح اندازہ تو ان کی کتابوں کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے، اس کا موقع ہر شخص کو کہاں نصیب ہوسکتا ہے اس لئے دوسروں نے ان کی زندگی پر جو روشنی ڈالی ہے، اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے، اس آئینہ میں ان کی علمی تصویر کا کچھ نہ کچھ عکس نظر ہی آجائے گا۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر امام محمدؒ کی صحبت نصیب نہ ہوئی ہوتی تو مجھ پر علم کا دروازہ نہ کھلتا وہ کسی مسئلہ پر تقریر کرتے تو ان کی فصاحت لسانی کی وجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ قرآن مجید ان ہی کی زبان میں نازل ہوا ہے[۲]۔ فرماتے تھے کہ میں نے ان سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے[۳]۔

امام احمد بن حنبلؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے یہ دقیق مسائل کہاں سے حاصل کئے ہیں فرمایا کہ محمد بن حسن کی کتابوں سے[۴]۔ امام مزنی کے سامنے کسی نے کہا قال محمد، انہوں نے پوچھا کون محمد؟ قائل نے کہا محمد بن حسن، انہوں نے فرمایا،

مرحباً بمن یملأ الآذان سمعًا والقلب فهما [۵]

''مرحبا اس شخص پر جو کان کو سماع اور قلب کو فہم سے بھر دیتا ہے''۔

امام ابوحفصؒ فرماتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف علم کے لئے پیدا کئے گئے ہیں[۶]۔

محمد بن سلام فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ کی کتابوں کے حصول پر دس ہزار درہم صرف کئے، اگر مجھے پہلے ان کتابوں کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا ہوتا تو میں دوسری طرف متوجہ ہی نہ ہوا ہوتا[۷]۔

۱۔ جواہر مضیہ جلد۲ ص۵۴۴ و کردری ۲۔ جواہر مضیہ جلد۲ ص۵۲۹ ۳۔ بلوغ ۱۱۱ مانی ۵۵

۴۔ ترجمہ امام محمد ۵۴ و تاریخ بغداد ۵۔ ترجمہ امام محمد ص۵۴ و تاریخ بغداد ۶۔ بلوغ ۵۵ ۷۔ کردری جلد۲ ص۱۵۲

امام ذہبی لکھتے ہیں کہ امام ابو یوسف ؒ کے بعد فقہ کی ریاست امام محمد ؒ کی طرف منتہی ہوگئی تھی۔ان سے ائمہ کرام نے تفقہ حاصل کیا ہے[1]۔

امام مزنی ؒ امام محمد کے تلامذہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ خدا کی قسم جب وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے تو کان کو بھر دیتے تھے،اور فقہاء پر علم کے دروازے کھول دیتے تھے[2] ان کے اصحاب نے اس تعریف پر تعجب کا اظہار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ جتنی تعریف میں نے کی ہے۔امام شافعی اس سے زیادہ ان کی تحسین کرتے تھے[3]۔

قاضی کامل المروزی فرماتے تھے کہ میں نے امام محمد جیسا عمدہ املا کرانے والا نہیں دیکھا[4]۔

علم کی ذمہ داری کا احساس :

علم دین میں اخلاص اور اس کی ذمہ داری کا احساس علم کی روح ہے،اگر یہ چیز نہ ہو تو علم صاحب علم کے لئے وبال اور باعث عذاب ہے،امام محمد کے صحیفۂ زندگی میں یہ وصف بہت نمایاں ہے کہ انہیں علم دین میں اخلاص اور اس کی ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا،بہت کم سوتے تھے رات کا زیادہ حصہ درس و تدریس اور مطالعہ و تصنیف میں گذرتا،گرمیوں میں کرتا اتار دیتے،اور اپنے سامنے ایک طشت میں پانی رکھ لیا کرتے تھے،جب غنودگی طاری ہونے لگتی تو بدن پر چھینٹے دیتے تھے،لوگوں نے آپ سے اس کم خوابی اور زحمت کشی کی وجہ دریافت کی تو فرمایا! کہ

کیف انام وقد نامت عیون المسلمین توکل علینا ویقلون اذا وقع لنا امر وفعناہ الیہ فیکشفہ لنا فذانمت ففیہ تضیع المدین[5]

''میں کیسے سو سکتا ہوں جب عام مسلمان ہم پر اعتماد اور یہ خیال کر کے سو رہے ہیں کہ جب ہمارے سامنے کوئی معاملہ یا نیا مسئلہ پیش آئے گا تو ان کے (امام محمد) پاس لے جائیں گے وہ اسے واضح کردیں گے اگر میں سو جاؤں تو اس سے دنیا کا نقصان ہوگا''۔

یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے علم کے تمام دروازے ان کے لئے وا کر دیئے تھے۔

قرآن کی تلاوت اس میں تدبر و تفکر اور استخراج مسائل :

قرآن کے حافظ تھے،روزانہ ایک ثلث قرآن کی تلاوت کا معمول تھا[6]۔قرآن میں تدبر و تفکر اور اس سے استخراج مسائل امام ابو حنیفہ ؒ کی درس گاہ کی خاص خصوصیت تھی۔امام محمد میں وہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔

---

۱ بلوغ الامانی ص ۵۷ ۲ ایضاً ۱۴ ۳ ایضاً ۵۵ ۴ کردری جلد ۲۔ص ۱۵۲ ۵ کردری جلد ۲۔ص ۵۰
۶ ترجمہ محمد بن حسن ص ۵۹

چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

استخرجت من كتاب الله نيفا والف مسئلة[۱]

میں نے قرآن سے ایک ہزار سے کچھ زیادہ مسئلے مستنبط کئے ہیں"۔

ابوعبیدہ ؒ فرماتے ہیں میں نے امام محمد سے بڑھ کر کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا[۲]۔ اسی طرح کا ایک مقولہ امام شافعیؒ سے بھی منقول ہے[۳]۔ مارأيت اعلم بكتاب الله من محمد بن حسن۔

(کروری جلد ۲۔ص ۱۵۶)

حدیث :

امام محمد نے اس وقت کے تمام ممتاز شیوخ حدیث سے سماع اور استفادہ کیا تھا، خصوصیت سے امام مالکؒ کی روایتوں کے وہ بہترین حافظ وامین سمجھے جاتے تھے۔ ان کی روایتوں کے درس کے لئے انہوں نے ایک خاص دن مقرر کر لیا تھا۔ اسد بن فرات کا بیان ہے کہ امام مالک کی وفات کے بعد جس دن امام محمدؒ ان کی مرویات کا درس دیتے تھے، اس دن اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ راستہ بند ہو جاتا تھا[۴]، حدیث وآثار میں ان کی دقت نظر اور وسعت معلومات کا صحیح اندازہ اس فن میں اس کی تصنیفات ہی سے کیا جا سکتا ہے، جس کی تفصیل تصنیفات کے باب میں آئے گی۔

غلط فہمی :

امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے متعلق عام طور پر یہی غلط فہمی تھی کہ وہ حدیث کے مخالف اور قیاس کے دلدادہ ہیں۔ چنانچہ امام محمد بھی اس سوء ظنی کا شکار تھے، اسی وجہ سے اکثر منقول پسند طبیعتیں ان سے گریز کرتی تھیں، محمد بن سماعہ کا بیان ہے میں عیسیٰ بن ابان (شیوخ حدیث میں تھے) کو برابر امام محمد کے درس میں شریک ہونے کی ترغیب دیا کرتا تھا لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ جس درس میں حدیث کی مخالفت کی جاتی ہو اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ایک روز کسی طرح محمد بن سماعہ انہیں امام محمد کے درس میں لے آئے اور ان سے کہا کہ عیسیٰ بن ابان جنہیں حدیث میں بڑا درک ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ حدیث کی مخالفت کرتے ہیں۔ امام محمد نے ان سے فرمایا کہ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ ہم حدیث کے مخالف ہیں جب تک آپ ہم سے حدیث کا سماع نہ کر لیں۔ اس وقت تک آپ کو یہ فیصلہ نہ کرنا چاہئے تھا، حدیث کے بارے میں جو کچھ آپ کو پوچھنا ہو پوچھیے، عیسیٰ بن ابان نے احادیث کے

---

۱ کروری ۲۔ص ۱۵۹　۲ تاریخ بغداد ۲۔ص ۱۷۵　۳ ایضاً　۴ شذرات الذہب جلد ۲

کچھ ابواب ومضامین کے متعلق سوالات کئے۔ امام محمد نے تمام کا یکے بعد دیگرے جواب دیا اوران کے دلائل وشواہد، ناسخ ومنسوخ کی پوری توضیح کی۔

محمد بن سماعہ کا بیان ہے کہ عیسیٰ بن ابان جب درس سے اٹھے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میرے اوراس روشنی (امام محمد) کے درمیان ایک پردہ حائل تھا جو آج اٹھ گیا[1]۔

اس کے بعد سے عیسیٰ بن ابان کو امام محمد سے اس قدر تعلق خاطر ہوا کہ وہ حلقۂ اصحاب میں داخل ہوگئے۔ اور امام محمد کی کتاب الحج جو انہوں نے شیوخ مدینہ کے رد میں لکھی تھی اہل مدینہ تک عیسیٰ بن ابان ہی کے ذریعہ پہنچی۔

خود امام شافعیؒ نے اس غلط فہمی کو دور کردیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمد کی کتابوں کو ساٹھ دینار صرف کرکے حاصل کیا، پھر ان میں غور کیا تو ہر مسئلہ کی حدیث سے تائید پائی[2]۔

قیاس کے مقابلہ میں حدیث کو ترجیح :

حدیث کو قیاس کے مقابلہ میں بہر حال ترجیح ہے، امام صاحب اوران کے اصحاب وتلامذہ سب اس کے قائل تھے لیکن انہوں نے حدیث احاد کے قبول کرنے کے کچھ شرائط وحدود مقرر کردیئے تھے، انہی شرائط کی بنا پر لوگوں نے ان کی طرف سے بہت سی بدگمانیاں قائم کرلی تھیں لیکن اگر ان کے منشاومقصد پر غور کیا جائے وبدگمانی کی کوئی بات باقی نہیں رہ جاتی۔

چنانچہ امام صاحب نے متعدد باراس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ عقود الجمان وغیرہ میں امام صاحب کے بہت سے اقوال منقول ہیں۔ امام جعفر صادق سے جوانہوں نے گفتگو کی تھی اسمیں بھی اس خیال کا اظہار کیا تھا۔

امام محمد کی طرف سے بھی یہ بدگمانی تھی اس لئے انہوں نے متعدد جگہ اس غلط فہمی کو دور کیا ہے، اس بحث میں کہ نماز میں قہقہہ ناقض وضو ہے یا نہیں، لکھتے ہیں:

لولا ما جاء من الآثار كان القياس ما قال اهل المدينة ولا كن لا قياس مع اثر ولا ينبغي الا ان نيقاد للآثار[3]

''اگر حدیث وآثار سے ثابت نہ ہوتا تو قیاس کا فیصلہ وہی ہوتا جا اہل مدینہ کہتے ہیں، لیکن حدیث واثر کی موجودگی میں قیاس کوئی چیز نہیں ہے ہم کو صرف آثار ہی کی پیروی کرنی چاہئے''۔

---

[1] کردری جلد ۲۔ ص ۱۵۷ [2] بلوغ الامانی۔ ص ۲۲ [3] بلوغ ص ۴۴

روایت میں احتیاط :

قبول روایت میں امام محمد کی سختی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اہل عدل کے متعلق فرماتے تھے کہ ایسے اہل عدل جن کا عقیدہ ہے کہ جو کاذب ہے وہ صرف فاسق ہے ان کی روایت قبول کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اہلِ ہوی کی روایت قبول کر لی جائے۔ جن کا عقیدہ ہے کہ جو کاذب ہے وہ کافر ہے[1]۔

کذب سے کوئی کافر نہیں ہوتا مگر اس زمانہ میں جھوٹی روایتوں کی بہتات اور ان کے قبول کرنے میں عدم اعتنا کی بنا پر امام محمد کی یہ سختی اور احتیاط بالکل درست ہے۔

اپنی کتابوں کی روایت میں قیود :

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ لوگ روایت کے منشا و مقصد کو نہیں سمجھتے لیکن روایت کرنا شروع کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سی غلط باتیں رواج پا جاتی ہیں۔ امام محمد نے اسی وجہ سے اپنی کتابوں کی روایت کرنے میں یہ قیود لگا دی تھیں۔

لا یحل لا حد ان یروی عن کتبنا الا ما سمع او علم مثل ما علمنا[2]

''ہماری کتابوں کی روایت کا حق صرف اس شخص کو ہے جو براہ راست سنے یا ہماری طرح (منشا و مقصد کا) علم رکھتا ہو''۔

فقہ :

امام محمد کی شہرت اور ان کا اصلی شرف و امتیاز فقہ سے وابستہ ہے، دوسرے علوم میں تو اور اہلِ فن کی طرف بھی رجوع کیا جاتا تھا، لیکن اقلیم فقہ کے وہ اس وقت تنہا تاجدار تھے، امام شافعیؒ نے ان سے تفقہ حاصل کیا تھا۔ اسد بن فرات امام مالکؒ کے شاگرد جنہوں نے فقہ مالک کی بنیاد رکھی تھی، امام محمدؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر چکے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول اوپر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ فرماتے تھے فقہ کے تمام دقیق مسائل میں نے امام محمدؒ سے اخذ کیے ہیں، امام محمد کی ذات کو ائمہ اربعہ کی فقہ کا مخرج قرار دینا بے جا نہ ہوگا اور اس میں تو کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مذہب اربعہ میں جتنی تدوین و تصنیف ہوئی۔ امام مالکؒ امام محمد کے استاد ہیں لیکن فقہ میں علماء امام محمد کو امام مالک سے افقہ سمجھتے تھے۔

یحییٰ بن صالح سے جو شیوخ بخاری میں ہیں، پوچھا گیا کہ آپ نے امام مالک اور امام محمد

---

[1] ایضاً　[2] کردری ج۲۔ ص ۱۵۲

دونوں بزرگوں کی رفاقت کی ہے ان میں کون زیادہ افقہ تھا، انہوں نے فرمایا کہ **محمد بن حسن افقہ امام مالک**، امام محمد امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے[۱]۔

امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی کہ حدیث میں ابن عیینہ اور فقہ میں امام محمد کا تلمذ نصیب ہوا[۲]۔ فرماتے تھے کہ میں نے امام محمدؒ جیسا فقیہ نہیں دیکھا میں فقہ میں ان کا سب سے زیادہ ممنون ہوں[۳]۔ ان کا قول ہے کہ میں نے فقہا میں امام محمدؒ جیسا فقہ میں بصیرت رکھنے والا کسی کو نہیں پایا، جن مسائل کے اسباب وعلل کی تلاش سے اکابر عاجز رہ جاتے تھے وہ ان مسائل کو آسانی سے حل کر دیتے تھے[۴]۔

ایک مرتبہ کسی نے امام شافعیؒ سے مسئلہ دریافت کیا اور انہوں نے جواب دیا، سائل نے ان سے کہا کہ فقہا آپ کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں، امام نے فرمایا کہ تم نے محمد بن حسن کے علاوہ کسی فقیہ کو دیکھا بھی ہے، میں نے ان کے جیسا گداز بدن ذکی آدمی نہیں دیکھا، ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے امام محمد کی صحبت اٹھائی ہے۔ اب ان کے مقابلہ میں کسی فقیہ کی رائے وزنی ہو سکتی ہے کہ میں اس کی پرواہ کروں[۵]۔

تفریع مسائل :

امام ابو حنیفہؒ نے جس فقہ کی تخم ریزی کی تھی اس کی آبیاری اور نشوونما میں تین بزرگوں امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام زفرؒ نے خاص طور پر حصہ لیا تھا، لیکن ان میں سے بھی ہر ایک کی خصوصیت جدا جدا تھی۔ امام مزنی نے ہر ایک کی خصوصیت پر بڑی اچھی رائے دی ہے کسی نے ان سے اہل عراق کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

ابو حنیفة سیدھم و ابو یو سف اتبعھم للحدیث و محمد بن حسن اکثر ھم تفر یعاً و زفر احدھم قیاساً[۶]

''امام ابو حنیفہ اہل عراق کے سردار ہیں، امام ابو یوسف ان سب سے متبع حدیث ہیں اور امام محمد نے ان سب سے زیادہ مسائل کی تفریع کی ہے، امام زفر سب سے زیادہ قیاس تھے''۔

فقہ میں امام محمدؒ کی اصلی خصوصیت یہی تفریع اور تولید مسائل ہے، تفریع کا مطلب یہ ہے کہ مستنبط مسائل کی علتِ مشترکہ تلاش کر کے اس کی روشنی میں دوسرے مسائل پیدا کیے جائیں،

۱۔ بلوغ ص ۱۴ ۲۔ جواہر مضیہ ۲۔ ص ۴۴ و ۵۲۷ ۳۔ ترجمہ امام محمد ذہبی۔ ص ۵۵ و کردری ۲۔ ص ۱۵۰
۴۔ بلوغ۔ ص ۵۵ ۵۔ ایضاً ۶۔ تاریخ بغداد جلد ۲۔ ص ۱۷۶

تفریع مسائل ہر شخص کا کام نہیں ہے، اس کے لئے دینی علوم میں تجر، ادب و لغت سے واقفیت اور غیر معمولی ذہانت کی ضرورت ہے۔ امام محمد میں یہ تمام خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں جن کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

اجتہاد و استنباط :

اجتہاد و استنباط یعنی براہ راست قرآن و حدیث سے مسائل پیدا کرنا، یہ تفریع سے زیادہ مشکل کام ہے۔ استنباط مسائل کے لحاظ سے امام محمد ؒ کو اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ اور استنباط و اجتہاد کے لئے فقہاء نے جو قیود و شرائط لگائے ہیں وہ ان پر پورے اترتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کو صاحب مذہب نہیں بلکہ متبع امام ابوحنیفہ ہی کہتے رہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ایک ہزار سے زائد مسئلے براہ راست قرآن سے مستنبط کئے ہیں۔ ابوعلی فارسی فرماتے ہیں کہ اہل بصرہ کو البیان والتبین، کتاب الحیوان، کتاب سیبویہ اور کتاب العین پر فخر ہے۔ لیکن ہمیں (یعنی اہل کوفہ کو) ان ۲۵ ہزار مسئلوں پر ناز ہے جنہیں امام محمد نے مستنبط کئے ہیں، ان کے اجتہاد و استنباط کا پورا اندازہ ان کی کتابوں کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے۔

معاملات سے واقفیت پیدا کرنے کے سلسلہ میں کدو کاوش :

معاملات کے بیشتر مسائل کا مدار عرف اور تعامل پر ہے لیکن یہ چیزیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، آج جو چیز بھی عرف عام اور فقہا کی اصطلاح میں عموماً بلوی (عام تعامل) میں داخل ہے ضروری نہیں کہ وہ عرف و تعامل کل بھی باقی رہے، کسی زمانہ میں نبیذ سے وضو کے جواز و عدم جواز کا سوال تھا۔ لیکن آج سوڈا واٹر کی قسم کی چیزوں کے متعلق سوال کیا جاتا ہے، اس لئے ایک مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ عرف قدیم اور عرف جدید سے واقف اور اس پر پوری نظر رکھتا ہو، امام محمد ؒ کی یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہ معاملات کے عرف و تعامل کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور ان سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے خود اہل حرفہ اور پیشہ وروں کے پاس جاتے تھے۔

حسن بن شہوب فرماتے ہیں کہ:

رایت محمداً یذهب الی الصباغین ویسئال عن معاملاتهم وما یدیرونها فیما بینهم (کروری جلد ۲. ص ۱۵۲)

''میں نے امام محمد کو دیکھا کہ وہ رنگریزوں کے پاس خود جاتے اور ان سے مل کر ان کے

معاملات اور معاملات میں وہ جو کچھ تبدیلی پیدا کرتے رہتے تھے اس کے متعلق معلومات حاصل کرتے تھے“۔

ایک مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن وحدیث پر اس حیثیت سے نظر رکھے کہ کون سی آیت یا حدیث منسوخ اور کون ناسخ ہے۔ اور اس بات کا بھی پورا علم ہو کہ قرآن وحدیث میں جو چیزیں حرام یا حلال کی گئی ہیں ان کی علت مشترکہ کیا ہے تاکہ دوسری چیزیں جن کی حلت یا حرمت کے متعلق کوئی تصریح نہیں ہے ان پر حلال یا حرام ہونے کا حکم لگایا جاسکے۔ امام محمد اس حیثیت سے بھی قرآن وحدیث پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں میں نے امام محمد جیسا ناسخ ومنسوخ اور حلال وحرام اور ان کی علتوں کا جاننے والا نہیں دیکھا[1]۔

اہلِ اجتہاد کے بارے میں ان کی رائے :

اہلِ اجتہاد کے خطا وصواب کے بارے میں امام محمدؒ نے اپنے تلامذہ کو یہ اصول لکھوا دیا تھا کہ جب کسی مسئلہ کی حلت وحرمت میں مجتہدین کا اختلاف ہوتا ہے اور ایک ہی چیز کو ایک مجتہد حرام اور دوسرا حلال بتاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح اور حق تو ایک ہی ہوگا، یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک وقت میں کوئی چیز حلال وحرام دونوں ہو۔ اب جو مجتہد اپنے اجتہاد میں مصیب ہوگا اسے اپنے خلوص اور فرض کی ادائیگی، کدوکاش اور اصابت رائے کا اجر ملے گا اور جو مصیب نہ ہوگا اس کو بھی اپنے خلوص اور محنت کا اجر ملے گا لیکن ماجور ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا قول اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق بھی ہوگا۔

اس اصول کے اعلان کرنے کے بعد آپ نے تلامذہ سے فرمایا کہ اس بارے میں امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور میری سب کی ایک ہی رائے ہے[2]۔

جو لوگ امام صاحب اور ان کے اصحاب پر مصوبہ[3] ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ اس اصول سے ان کے الزام کی پورے طور پر تردید ہوجاتی ہے۔

دوسرے علوم :

ان دینی علوم کے علاوہ ادب ولغت، یا رضی اور نحو میں بھی انہیں پورا تبحر حاصل تھا، جواہر مضیہ میں ہے کہ وہ عربیت، نحو اور ریاضی میں ماہر امام تھے (جلد۲۔ ص۴۲)۔ امام ابوبکر رازی فرماتے ہیں کہ میں ابوعلی فارسی (مشہور نحوی) سے امام محمد کی جامع کبیر پڑھا کرتا تھا، وہ اکثر فرماتے تھے کہ مجھے

---

[1] کروری ۲۔ ص ۱۵۷ بلوغ الامانی ص ۵۵ [2] ترجمہ امام محمد ذہبی۔ ص ۵۳ بلوغ الامانی ۴۶، ۴۷

[3] یعنی وہ لوگ جو دونوں صورتوں کی تصویب کرتے تھے۔

حیرت ہے کہ محمد بن حسن کو فن نحو میں کس قدر ید طولی حاصل تھا۔ جمہور علماء اور خصوصاً امام ابن تیمیہ نے ان کی عربیت کا بے حد اعتراف کیا ہے۔ فرائض کے مسائل میں انہوں نے جو تدقیق و تفصیل کی ہے اس سے ان کے ریاضی دانی کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فصاحت و بلاغت :

گو وہ عربی النسل نہیں تھے لیکن ان کی فصاحت و بلاغت اور عربیت کا تمام ائمہ فن کو اعتراف تھا۔ امام شافعی جن کی عربی دانی مسلم ہے فرماتے ہیں کہ محمد بن حسن کی فصاحت زبان کی وجہ سے اگر میں یہ کہوں کہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک دوسرے مقولہ ہے کہ میں نے ان کے جیسا فصیح نہیں دیکھا[1]، فرماتے تھے کہ میں پہلی بار جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایک اختلافی مسئلہ پوچھا، انہوں نے مسئلہ کی توضیح شروع کی تو میں اس خیال میں تھا کہ وہ زبان کی کوئی غلطی ضرور کریں گے لیکن وہ تیر کی طرح صفائی سے نکل گئے اور کوئی معمولی سی بھی غلطی نہیں کی[2]۔ جب وہ مسائل پر گفتگو کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قرآن کا نزول ہو رہا ہے[3]۔

مسلک :

امام محمدؒ کے زمانہ سے پہلے ہی عجمیوں کے اثر سے مسلمانوں میں بھی ذات و صفات وغیرہ کے بارے میں بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے، ان میں معتزلہ، خوارج، شیعہ، مرجیہ، قدریہ اور جہمیہ وغیرہ، بہت زیادہ مشہور تھے۔ ہر فرقہ اپنے خیالات اور نظریات کو ثابت کرنے کے لئے قرآن و حدیث کی آڑ لی تھی اور اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا تھا، اس لئے فقہا و محدثین کو بھی اپنے درس میں ضمناً ان مسائل پر بحث اور رد و قدح کرنی پڑی تھی۔ چونکہ ان مسائل میں سے ہر مسئلہ کی بنیاد قرآن کی کوئی آیت یا حدیث نبوی ہی تھی اس لئے اس بارے میں ہر فقیہ اور ہر محدث کی رائے ایک نہیں ہو سکتی تھی اس بناء پر خود علماء مختلف جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ اور ہر جماعت اپنی رائے کو صواب اور دوسرے کی رائے کو ناصواب کہتی تھی بلکہ بسا اوقات اس اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کو فاسق فاجر اور متبدع بھی ٹھہراتی تھی۔

لیکن ان میں بعض مسائل بالکل فروعی اور ان میں بھی اختلاف نزاع لفظی یا غلط فہمی پر مبنی تھا، مثلاً اس مسئلہ میں کہ قرآن حادث ہے یا قدیم علماء کے درمیان بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اختلاف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن قدیم ہے اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ خدا کی صفت کلام جس کا ایک مظہر قرآن ہے کلام الٰہی کی حیثیت سے وہ قدیم

---

[1] بلوغ الامانی ۶۳ [2] کردری ۲۔ ص ۱۵۶ [3] ایضاً ۱۴۸ و تاریخ بغداد

ہے لیکن یہ قرآن جو ہمارے سامنے کاغذ پر لکھا ہوا موجود ہے وہ مخلوق و حادث ہے[۱] اور اس میں کوئی عقلی اور شرعی قباحت نہیں ہے۔

جو لوگ اس کے مخلوق اور حادث ہونے کے قائل ہیں اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا کی صفت خلق اور صفت علم کے مظاہر (انسان وحیوان) مخلوق و حادث ہیں۔ اسی طرح اس کی صفت کلام کا مظہر یہ قرآن ہے اس لئے ایک مظہر کی حیثیت سے وہ بھی حادث و مخلوق ہے ورنہ اس کی اصل صفت کلام تو قدیم ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے دونوں راویوں کا حاصل ایک ہی ہے صرف طریقہ تعبیر میں فرق ہے۔

امام محمد کے سامنے بھی یہ مسائل پیش کیے گئے۔ لیکن امام صاحب کی طرح انہوں نے بھی ہمیشہ ان مسائل میں یا تو اعتدال کی راہ اختیار کی یا سلف صالحین کی طرح تحقیق و تدقیق سے گریز کرتے رہے۔ اسی اعتدال اور گریز کا نتیجہ تھا کہ بعض لوگوں نے امام صاحب کی طرح ان پر بھی جہمی و مرجی وغیرہ ہونے کا الزام لگایا لیکن یہ الزام صرف غلط فہمی کی بناپر تھا۔ اس لئے ہم ایسی روایتیں نقل کرتے ہیں جن سے الزام کی تردید ہو جائیگی۔

امام محمدؒ قرآن کے قدیم ہونے کے قائل تھے[۲]۔ ابو سلیمان جوزجانی فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ

من قال القرآن مخلوق فلا تصلوا خلفه[۳]

''جو شخص قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل ہو اس کے پیچھے نماز نہ پڑھو''۔

لیکن قدیم سے ان کی مراد وہی ہے، جس کی اوپر تشریح کی گئی ہے۔

ذات وصفات کے بارے میں جو احادیث صحیح طریقہ سے مروی ہیں، ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ

ان هذه الاحاديث قد رو تها الثقات فنحن نرويها ونو من بها ولا نفسر ها[۴]

''ذات وصفات کے بارے میں جو احادیث صحیح سند سے مروی ہیں، ہم ان کی روایت کرتے ہیں، ان پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کی تفسیر و توضیح نہیں کرتے''۔

۱؎ بعض لوگوں نے بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے اور اس کے حروف والفاظ کی قدامت کے بھی قائل ہیں لیکن ان کا خیال عقلی وشرعی کسی حیثیت سے صحیح نہیں ہے　۲؎ بلوغ الامانی ص ۵۲　۳؎ ایضاً　۴؎ ایضاً۔ بلوغ المعانی ص ۵۲

اس بارے میں ایک دوسری روایت اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہے، فرماتے ہیں۔

اتفق الفقهاء کلهم من الشرق الی الغرب علی ان الایمان بالقران والا حادیث التی جاء بها الثقات عن رسول ﷺ وفی صفته الرب اللہ عزوجل من غیر تفسیر ولا وصف ولا تشبیه فمن فسر الیوم شینامن ذلک فقد خرج مما علیه النبی ﷺ وفارق الجماعته فانهم لم یصفوا ولم یفسیرولکن افتوا بمافی الکتاب والسنته ثم سکتوافمن قال بقول جهم فقد فارق الجماعت لانه قد وصفه بصفته لا شیئی. (بلوغ الامانی ص ۵۴)

''مشرق سے مغرب تک تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن اور ان احادیث پر جن کو ثقات نے روایت کیا ہے۔ اور اللہ عزوجل کی صفات پر بغیر کسی تفسیر وتشبیہ وتوصیف کے ایمان رکھنا چاہیئے۔ جو شخص ان چیزوں کی تفسیر وتوضیح کرتا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کے اور سلف کے طریقہ سے علیحدہ روش اختیار کرتا ہے اس لئے کہ وہ اس کی توصیف وتفسیر نہیں کرتے تھے جو کچھ کتاب وسنت میں تھا، اس کے مطابق فتویٰ دیتے تھے پھر خاموش ہو جاتے تھے۔ جس شخص نے جہم بن صفوان کی طرح بات کی وہ سلف کی جماعت سے خارج ہو گیا اس لئے کہ جہم اللہ تعالیٰ کو ان اوصاف سے متصف کرتا تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے''۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ اپنے مسلک کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے تھے ، کہ

مذهبی و مذهب الامام (ابی حنیفة) ابی بکر ثم عمر ، ثم عثمان ، ثم علی رضی اللہ عنهم واحد (مناقب کروری ۲۔ ص ۱۶۲)

''میرا اور امام صاحب کا اور خلفائے راشدین سب کا مسلک ایک ہی ہے''۔

بلوغ الامانی میں حافظ زاہد الکوثری نے حسن بن زیاد سے جو روایت نقل کی ہے اس میں امام ابو یوسفؒ کا نام بھی ہے۔

ان روایات سے پورے طور پر واضح ہو گیا ہوگا کہ ان کو اعمال وعقائد میں کتاب وسنت کے اتباع اور سلف صالحین کے اسوہ کا کتنا خیال تھا لیکن اس اتباع اور سلفیت کے باوجود بعض لوگ امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ امام محمد کو جب اس کی اطلاع ہوتی تھی تو ان کے بارے میں یہ شعر پڑھتے اور خاموش رہتے تھے۔

محسدون وشر الناس منزلة
من عاش في الناس يوماً غير محسود [1]

ائمہ اور علماء کی رائے :

کسی شخص کی سوانح حیات کی تکمیل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے متعلق اس کے معاصرین کے خیالات اور رائے معلوم کی جائے تا کہ اس آئینہ خانہ میں اس کی زندگی کے پورے خدوخال دیکھے جا سکیں۔

امام محمدؒ کے فضل وکمال پر ان کے معاصرین ائمہ اور علماء ہم زبان ہیں، اگر ان کے اقوال کو جمع کیا جائے تو ایک چھوٹا سا رسالہ تیار ہو جائے اس لئے ہم صرف چند ممتاز بزرگوں کے اقوال نقل کرتے ہیں :

امام صاحب اور امام مالکؒ نے ان کے متعلق جو رائے دی تھی اسکا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ امام شافعیؒ کے بھی بہت سے اقوال نقل کئے جا چکے ہیں دو چار اور مقولے جو نقل نہیں ہوئے ہیں وہ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

وہ فرماتے تھے کہ اگر فقہا انصاف سے کام لیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے امام محمدؒ جیسا فقیہ نہیں دیکھا (بلوغ۔ ص ۵۵)۔ دوسرا مقولہ ہے کہ میں نے محمد بن حسن جیسا فقیہ نہیں دیکھا۔

ربیع کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے امام محمدؒ کے بارے میں فرمایا!

ما رایت اعقل ولا افقه ولا ازهد ولا اورع ولا احسن نطقا ولا ایرادًا من محمد بن الحسن [2]

''میں نے امام محمد جیسا عاقل، فقیہ، زاہد، متقی، خوش تقریر اور بحث ونقد کرنے والا نہیں دیکھا''۔

امام ابراہیم حربی فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا کہ آپ کو ایسے دقیق مسائل کہاں سے معلوم ہوئے۔ فرمایا، میں نے محمد بن حسن کی کتابوں سے اخذ کیا ہے [3]۔

مولانا عبدالحیؒ نے امام احمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں تین آدمیوں کی رائے متفق ہو جائے۔ تو پھر کسی مخالف کا قول مسموع نہ ہوگا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ وہ تین آدمی کون ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد بن الحسن [4]۔

---

۱ بلوغ الامانی۔ ص ۳۵۔ ترجمہ امام ذہبی۔ ص ۵۲　۲ تہذیب الاسماء امام نووی
۳ ترجمہ امام محمد ذہبی　۴ مقدمہ موطا امام محمد

تعدیل :

ابوعبید کا قول ہے کہ میں نے محمد بن الحسن جیسا عالم نہیں دیکھا [۱]۔ علی بن المدینی جو جرح و تعدیل کے امام ہیں، امام محمدؒ کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی گئی، تو فرمایا کہ صدوق سچے ہیں [۲]۔ (یعنی ان کی روایت قابلِ قبول ہے)۔

محدث ابوسلیمان جوزجانی کو ایک بار امام احمد نے لکھا کہ اگر آپ امام محمد کی کتابوں سے روایت کرنا چھوڑ دیتے تو ہم آپ کے پاس استفادہ حدیث کے لئے حاضر ہوتے [۳]۔

انہوں نے ان کے خط کی پشت پر لکھ دیا کہ آپ کا آنا نہ تو ہمیں بلند کردے گا اور نہ نہ آنا پست کردے گا۔ کاش میرے پاس امام محمد کی کتابوں کا اتنا ذخیرہ ہوتا کہ میں صرف انہی کی روایتیں بیان کرتا [۴]۔

ذہبی نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے حدیث میں امام محمد سے احتجاج کیا ہے [۵]۔

میزان میں لکھتے ہیں :

كان محمد بن حسن من جور العلم والفقه قويافي مالك [۶]۔

''امام محمد علم اور فقہ کے سمندر تھے۔ اور امام مالک کی مرویات میں قوی تھے''۔

محدث دارقطنی جو امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے میں بڑی سخت رائے رکھتے تھے۔ انہیں بھی امام محمد کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ ''غرائب مالک'' میں رفع یدین عند الرکوع کے بارے میں فرماتے ہیں، کہ

حدث به عشرون نفرًا من الثقات الحفاظ منهم محمد ابن الحسن الشيباني يحييٰ بن سعيد القطان وعبد الله بن المبارك وعبد الرحمٰن بن مهدی وابن وهب وغيرهم [۷]۔

''اس حدیث کو بیس ائمہ ثقات نے بیان کیا ہے۔ ان بیس میں امام محمد یحییٰ بن سعید، عبداللہ بن مبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی اور ابن وہب وغیرہ ہیں''۔

---

۱ بلوغ الامانی۔ ص ۵۵ ۲ تاریخ بغداد و تعجیل المنفعہ

۳ غالباً اس وقت امام حنبل امام محمد کے علم و فضل اور ان کی کتابوں سے اتنے واقف نہیں ہوئے تھے۔

۴ مناقب کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۵۲ ۵ بلوغ الامانی۔ ص ۵۶ ۶ امام ذہبی کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کہ وہ صرف امام مالک کی روایتوں میں قابلِ استناد ہیں۔ اس لئے کہ امام مالک جن سے انہوں نے تھوڑی مدت استفادہ کیا، ان کے بارے میں وہ قوی ہوسکتے ہیں، تو امام صاحب کی جن کی روایت اور علوم کی تفصیل میں انہوں نے اپنی عمر ختم کردی۔ ان کے بارے میں کیوں کر وہ قوی بلکہ اقوی نہ ہوں گے۔ ۷ حاشیہ ترجمہ امام محمد۔ ص ۵۸

دوسری روایت ہے کہ

لا یستحق محمد عندی الترک[1]۔

''میرے نزدیک امام محمد (روایت میں) چھوڑنے کے قابل نہیں ہیں۔

عبداللہ بن علی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے امام محمدؒ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا، صدوق سچے ہیں[2]۔ امام ذہبی لکھتے ہیں :

انتھت الیه ریاسة الفقه بالعراق بعد ابی یوسف وتفقه به الائمة

(ترجمه : امام محمد ذهبی ۔ص ۵)

''عراق میں امام ابو یوسف کے بعد فقہ کی ریاست امام محمد پر ختم ہوگئی اور ان سے ائمہ نے تفقہ حاصل کیا''۔

خطیب نے امام محمدؒ کے بارے میں جو جرح نقل کی ہے، اس کے متعلق ہم مولانا حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم کا تبصرہ نقل کردیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس سے جامع توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ فرماتے ہیں :

''خطیب نے امام محمد کی بابت جرح بھی نقل کی ہے۔ جس میں بعض سخت ہیں۔ مگر قریباً ڈیڑھ ہزار برس کے زمانہ میں اکابر اُمت نے جو فیصلہ امام محمد کی عظمت کے بارے میں کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی جرح قائم نہیں رہ سکتی۔ خطیب کا قول ہے کہ جو قول میں آخر میں نقل کروں، وہی میری رائے ہے''۔ (تذکرۃ الحفاظ)

چنانچہ محمودیہ کا خواب جو سب سے آخر میں نقل کیا ہے، اس سے امام محمد کی تعدیل کا فیصلہ خود خطیب کے اصول کے مطابق بھی ہوجاتا ہے۔ (معارف ۱۹۳۳ھ۔ اگست)

جرح کی غیر معتبر روایات :

اس اعتراف فضل وکمال کے باوجود انہی بزرگوں کی سند سے رجال وتذکرہ کی کتابوں میں امام محمد کے بارے میں بعض ایسی روایتیں بھی مروی ہیں جو ان کے صحیفۂ زندگی کا بدنما داغ معلوم ہوتی ہیں۔

لیکن اگر ان روایتوں کو اصولِ روایت ودرایت پر پرکھا جائے تو مشکل ہی سے کوئی روایت درجۂ استناد تک پہنچے گی۔ بفرض محال کوئی روایت اس معیار پر پوری اتر بھی جائے تو اس کو اگر دقتِ نظر

---

[1] حاشیہ ترجمہ امام محمد اصل کتاب۔ ص ۵۸ [2] کردری۔ جلد ۲۔ ص ۵۰

سے دیکھا جائے گا تو اس کی تہ میں کوئی نہ کوئی فقہی وکلامی اختلاف ضرور کارفرما ہوگا اسی فقہی اور کلامی اختلاف کا نتیجہ تھا کہ ائمہ رابعہ تک کو نشانۂ ملامت اور سزاوار تحقیر ٹھہرا گیا، اور ان کے متعلق آج تک کتابوں میں ایسی روایتیں موجود ہیں، جن کی نسبت ایک معمولی انسان کی طرف بھی نہیں کی جاسکتی خصوصیت سے امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ ''وہ اہل الرائے'' ہیں یعنی عقل کو نقل پر ترجیح دیتے ہیں، وہ مُرجی اور جہمی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے امام محمدؒ کے بارے میں بھی انہی روایتوں کا مشہور ہو جانا کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔ لیکن جن ائمہ کی سند سے یہ روایتیں بیان کی گئی ہیں ہم ان کے متعلق یہ خیال نہیں کر سکتے کہ انہوں نے کوئی ایسی بات زبان سے نکالی ہوگی یا ان سے کوئی ایسا عمل سرزد ہوا ہوگا جو ان کے مرتبہ سے فروتر ہو۔ اس وجہ سے ہم کو ان کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

علامہ زاہد الکوثری نے تانیب الخطیب اور بلوغ الامانی میں ان تمام غلط روایتوں پر جو امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے میں مشہور ہیں، بڑی تفصیل سے تنقید کی ہے جو حصہ امام محمدؒ سے متعلق ہے ہم اس کا خلاصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔

امام مالک کی طرف روایت منسوب ہے کہ ایک روز انہوں نے درس میں تلامذہ سے فرمایا کہ اہلِ عراق کی تکذیب نہ کرو نہ تصدیق بلکہ ان کو اہل کتاب کے درجہ میں رکھو۔ امام محمدؒ بھی مجلس میں موجود تھے جب امام مالکؒ کی نظر ان پر پڑی تو وہ بہت شرمندہ ہوئے[1]۔ علامہ زاہد الکوثری نے اس روایت پر کوئی جرح نہیں کی ہے، حالانکہ یہ روایت اس لئے صحیح نہیں ہوسکتی کہ یہ معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہؒ جب دوبارہ دیار نبوی ﷺ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تو امام مالکؒ نے ان سے استفادہ و مذاکرہ کیا۔ اور جب تک وہ وہاں رہے بسا اوقات رات رات بھر مسجدِ نبوی میں یہ سلسلہ جاری رکھا۔ قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ لیث بن سعد نے ایک دن امام مالک کو بنیذ پیتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ آپ بنیذ پی رہے ہیں، امام مالک نے فرمایا کہ میں نے ابوحنیفہؒ کے ساتھ بنیذ پی ہے پھر لیث سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے مصری وہ فقیہ تھے[2]۔

فضائل ابوحنیفہ میں عبدالعزیز الدراوردی سے روایت ہے کہ

ان ما كان ينظر في كتب ابي حنيفة وينفع ينتفع بها . (بلوغ ۱۹)

''امام مالک امام ابوحنیفہ کی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے''۔

---

[1] بلوغ ۱۲ [2] یہ کتاب چار حصوں میں ہے کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

اس میں استفادہ وتعلم اور اعتراف فضل وکمال کے باوجود اہل عراق کے بارے میں جن میں امام صاحب بھی تھے، امام مالک کا کوئی ایسی بات کہنا جس سے امام صاحب یا ان کے تلامذہ کی اہانت ہو مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے بارے میں غلط روایات :

امام محمدؒ سے امام شافعیؒ کے استفادہ وتعلم کا ذکر اوپر آچکا ہے اور امام شافعی نے امام محمد کے فضل وکمال کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور امام محمدؒ نے ان کے ساتھ جو حسن سلوک کئے ہیں ان کا تذکرہ بھی بہ تفصیل ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان بزرگوں کے بارے میں تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں بعض ایسی روایتیں منقول ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں میں استاد وشاگرد اور معلم و متعلم کا تعلق نہیں تھا بلکہ ان میں آپس میں معاصرانہ چشمک تھی۔ اور دونوں ایک دوسرے کے متقابل تھے، اس لئے ضروری ہے کہ ان روایتوں کو معیارِ تنقید پر جانچا جائے۔

اُوپر بیہقی کی سند سے امام رازی نے مناقب الشافعی میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جب امام ابو یوسف اور امام محمد نے دیکھا امام شافعی کا حلقۂ اثر بڑھ رہا ہے اور خلیفہ بھی ان سے متاثر معلوم ہوتا ہے تو ان کو امام شافعی سے حسد پیدا ہوا اور انہوں نے ہارون کو کسی بہانہ سے ان کے قتل پر آمادہ کیا لیکن ہارون نے ایسا نہیں کیا[1]۔

یہ روایت چند وجوہ کی بناء پر صحیح نہیں ہے۔

(۱) تمام اہل تذکرہ متفقہ طور پر لکھتے ہیں کہ امام شافعی پہلی بار ۱۸۴ھ میں عراق آئے اور اس سے دو سال پہلے ۱۸۲ھ میں امام ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس روایت کی کیا حیثیت ہے اب رہا امام محمد کا حسد کرنا اور ہارون کو ان کے قتل پر آمادہ کرنا تو یہ بھی درایت اور روایت کسی حیثیت سے صحیح نہیں ہے، حافظ ابن حجر جو خود شافعی المسلک ہیں، اس روایت کے نقل کرنے بعد لکھتے کہ

والذی نقل من محمد الحسن فی حق الشافعی لیس ثبابت

''جو کچھ سازش وغیرہ امام محمد سے امام شافعی کے متعلق مروی ہے وہ اس کا ثبوت نہیں ملتا''۔

(۲) امام شافعی جس وقت عراق تشریف لائے تھے ان کو فقہ میں کوئی دست درس نہیں تھی،

---

[1] توالی التاسیس ص ۷۰ و بلوغ الامانی ص ۲۹

موطا جسے انہوں نے امام مالک سے براہ راست سماع کیا تھا اس کی بعض روایتیں بھی وہ اپنی کتاب میں امام محمد کے واسطہ سے نقل کرتے ہیں۔اس لئے اس دونوں بزرگوں میں حسد کی کوئی مشترک وجہ نہیں معلوم ہوتی اور نہ بظاہر معاصرانہ چشمک کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔

(۳) اور امام محمدؒ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلفاء و علماء سے زیادہ ملنا پسند نہیں کرتے تھے انہوں نے عہدہ قضا جو ایک خالص دینی کام تھا اس بناء پر کہ اس کی وجہ سے دربار شاہی سے منسلک ہونا پڑے گا، قبول کرنے میں تامل کیا تھا۔ایسے بے نیاز شخص کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ خلفاء کے یہاں درخور حاصل کرنے کے لئے ایک مسلم اور پھر عزیز شاگرد کے قتل کی سازش کرے گا بالکل ہی مستبعد بات ہے۔

امام شافعی سے مناظرہ :

خطیب نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک بار امام شافعیؒ اور امام محمدؒ سے مناظرہ ہوا، امام محمد کے جسم پر باریک کپڑا تھا اور ان کی گردن کی تمام رگیں پھول گئی تھیں اور وہ غصہ میں زور زور سے چیخ رہے تھے یہاں تک کہ ان کے گریبان کے تمام بٹن کھل گئے۔ (جلد ۲۔ص ۱۷۷)

اس روایت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ روایت موضوع ہے۔چیخنے، رگ پھول جانے اور گریبان کے تمام بٹن کھل جانے میں کیا مناسبت ہے اس کے علاوہ یہ روایت سند کے اعتبار سے بھی کمزور ہے۔اس میں دو راوی وعلج اور آباد ضعیف نہیں بلکہ وضاع ہیں، ان ...... کے یہاں وضاعین حدیث[1] کا جمگھٹ لگا رہتا ہے۔اور وضع حدیث ان کا خاص کام تھا۔آباد امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے بارے میں اس قسم کی روایتیں نقل کرنے میں بہت ہی بے باک ہے[2]۔

قطع نظر اس سے خود تاریخ خطیب میں دوسری روایت جو اسی صفحہ میں درج ہے اس سے پہلی روایت کی تردید ہو جاتی ہے، ربیع فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام شافعی نے فرمایا:

ما نا ظرت احدا الاتغیر وجهه ما خلا محمد بن الحسن .
(جلد ۲ ص ۱۷۷)

''بجز امام محمد کے میں نے جس سے بھی مباحثہ کیا اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا''۔

لیکن اس روایت میں بھی دو راوی ابن رازق اور ابو عمرو بن سماک ضعیف ہیں۔

اس سلسلہ کی صحیح روایتوں میں ناظرت کے بجائے سالت! (میں نے پوچھا) یا سئل

---

[1] مثلاً ابوالحسن عطار علی الرضانی وغیرہ　　[2] بلوغ الامانی۔ص ۲۱

(پوچھا گیا) کا لفظ ہے، صمیری ربیع کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے فرمایا! کہ

ماسالت احدا عن مسئلة الا تبین لی تغیر وجهه الا محمد بن الحسن (بلوغ ۲۵)

''میں نے جب بھی کسی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو اس کا چہرہ بدل گیا، بجز محمد بن حسن کے''۔

حافظ ابن عبدالبر کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

سمعت الشافعي يقول ما رأيت احد اسئل عن مسئلة فيها نظر الا رايت الكراهة في وجهه الا محمد بن الحسن (انتقاء ۶۹)

''میں نے امام شافعی سے سنا ہے فرماتے تھے کہ جس سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا میں نے اس کے چہرے پر ایک گھبراہٹ دیکھی، بجز محمد بن حسن کے''۔

مناقب کروری میں یہ روایت تقریباً انہی الفاظ میں ہے۔ (جلد۲، ص۱۵۶)

ان روایتوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ امام محمد اور امام شافعی میں جو علمی مذاکرے ہوتے تھے ان کی حیثیت مناظرہ نہیں بلکہ ایک مستفید اور مفید کے درمیان سوال و جواب کی ہوتی تھی۔

امام صاحبؒ اور امام مالکؒ میں موازنہ:

خطیب نے اپنی تاریخ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے درمیان اس بارے میں بھی گفتگو ہوئی کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ میں علم کے اعتبار سے کون افضل ہے۔ امام شافعیؒ نے امام محمد سے قسم دے کر پوچھا۔

هل تعلم ان صاحبي (مالک) كان اعلم بكتاب الله قال نعم قلت كان عالماً بحديث رسول ﷺ وقال نعم قال افما كان عاقلاً قال نعم قال افما كان صاحبک (ابو حنيفة) جاهلاً كتاب الله وبما جاء رسول الله قال نعم. (جلد ۱۱. ص ۱۷۸)

''اس کا تو آپ کو علم ہے کہ میرے استاد امام مالک کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالم ہیں، امام محمد نے اثبات میں جواب دیا پھر پوچھا کہ وہ حدیث کے ممتاز عالم ہیں، بولے ہاں پھر کہا کیا وہ عقل و فہم میں بڑھے ہوئے نہیں ہیں، بولے ہاں، پھر کہا کہ اور آپ کے استاد ابوحنیفہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ دونوں سے ناواقف نہیں ہیں، بولے ہاں''۔

اس روایت میں دو راوی و علیج اور علی الابار ہیں، جن کے وضاع ہونے کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر اور ابو اسحٰق شیرازی نے بھی اس روایت کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے لیکن ان سے کسی کی روایت میں امام صاحب کے جاہل ہونے کا ذکر نہیں ہے یہ صرف خطیب کی اپج معلوم ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں جتنی روایتیں ہیں ان سب کے الفاظ میں بے حد اختلاف و اضطراب ہے۔ جس سے متن کے ضعف کی طرف بھی قوی اشارہ ہوتا ہے۔ اور سند و متن کے ضعف قطع نظر اگر عقل و درایت کے معیار پر اس روایت کو پرکھا جائے تو اس کے موضوع ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

اگر امام محمد کو یہ علم تھا کہ امام صاحب کتاب وسنت سے جاہل ہیں تو پھر امام صاحب سے تلمذ اور تعلم کی کیا وجہ تھی، کیا کسی جاہل کے سامنے بھی زانو سے تلمذ تہ کیا جاتا ہے۔

امام شافعیؒ کا امام محمدؒ کے مقابلہ میں امام مالک کو صاحبی (میرے استاد) کہنا بھی صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ امام شافعیؒ نے صرف آٹھ مہینے امام مالکؒ سے استفادہ کیا تھا لیکن امام محمد مسلسل تین برس تک ان کی خدمت میں رہے اور سماع حدیث کیا اور پھر امام شافعی کی روایت سے موطا کا کوئی نسخہ مروی نہیں ہے۔ لیکن امام محمد کی روایت سے موطا کا نسخہ آج بھی موجود ہے۔

نیز امام محمدؒ نے امام شافعیؒ سے ایک روایت بھی امام مالک کی سند سے نہیں کی ہے۔ لیکن امام شافعی نے امام محمد کے واسطہ سے ان کی متعدد روایتیں اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں ان وجوہ کی بنا پر امام مالک کو صاحبی کہنے کا حق تو امام شافعی سے زیادہ امام مالک کو تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ راویوں کی خودساختہ روایت ہے اسی لئے روایت کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔

امام محمدؒ دونوں اماموں کے فیض یافتہ تھے اس لئے ان دونوں بزرگوں کے درمیان صاحبی و صاحب کے لفظ سے موازنہ کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے، اس سلسلہ کی سب سے زیادہ صحیح روایت وہ ہے جسے قاضی ابوالعاصم نے اپنی مبسوط میں نقل کیا ہے۔ روایت ہے:

ان الشافعي سأل محمد ايما اعلم مالک و ابو حنيفة فقال محمد بما ذا قال بكتاب الله فقال ابو حنيفة فقال من اعلم بسنة رسول الله فقال ابو حنيفة اعلم بالمعاني و مالک اهدى للالفاظ۔

''امام شافعی نے امام محمد سے پوچھا کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک میں کون بڑا عالم ہے، امام محمد نے پوچھا کس چیز میں، بولے کتاب اللہ کے علم میں۔ امام محمد نے کہا ابوحنیفہ، پھر

انہوں نے پوچھا سنت رسول اللہ کو کون زیادہ جانتا ہے، بولے ابوحنیفہ سنت کے معانی سے زیادہ واقف تھے اور امام مالک الفاظ سے''۔

اس روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ دونوں اماموں کے بارے میں امام محمد ایسی ہی متوازن اور صحیح رائے دے سکتے تھے جس کی تائید واقعات سے بھی ہوتی ہے۔

یہ بات دوست دشمن سب کو معلوم ہے کہ امام صاحب استنباط مسائل میں سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور ان میں اس قدر شدت تھی کہ جب تک تلامذہ حفظ نہیں کر لیتے تھے وہ انہیں اپنی مجلس درس میں شریک نہیں کرتے تھے۔ جہاں تک ائمہ حدیث کی روایت وحفاظت کا تعلق ہے امام مالک ؒ یقیناً اس ذخیرے کے بہت بڑے حافظ وامین تھے۔ اور اس کے جمع کرنے میں انہوں نے بڑی سعی و جہد سے کام لیا تھا لیکن بہر حال یہ بات ماننی پڑے گی کہ امام مالک کی نظر احادیث کے الفاظ پر زیادہ اور معانی پر کم تھی اور امام صاحب کی نظر الفاظ پر کم اور معانی پر زیادہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک کے مستنبط مسائل کی تعداد اتنی نہیں ہے جتنی امام صاحب کے مستخرج مسائل کی ہے کیونکہ استنباط اور استخراج کے لئے ضروری ہے کہ الفاظ سے زیادہ معانی پر نظر رکھی جائے۔ امام محمد نے اسکے بارے میں جو بات کہی ہے اس سے زیادہ کوئی منصفانہ بات نہیں کہی جاسکتی۔

امام ابویوسف ؒ اور امام محمد ؒ کے اختلافات کی حقیقت :

اُوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام محمد ؒ عہدۂ قضا قبول کرنے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن امام ابویوسف ؒ مصلحۃً چاہتے تھے کہ وہ اسے قبول کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے یحییٰ برمکی کے ذریعہ امام محمد ؒ کو اس طرح مجبور کر دیا کہ انہیں لاچار یہ عہدہ قبول کرنا پڑا۔ امام ابویوسف ؒ کے اس اقدام سے امام محمد ؒ بہت کبیدہ خاطر اور ناراض ہوئے۔ اور ان کی یہ کبیدگی اس قدر بڑھی کہ انہوں نے امام ابویوسف ؒ سے تقریباً ترک تعلق کر لیا لیکن ان کی یہ ناراضگی بے تعلقی نفسانیت اور حصول اعزاز کے لئے نہیں تھی بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ اصول اور مصلحت کی جنگ تھی، یعنی امام محمد اسلاف اور خود امام صاحب کے اتباع کے خیال سے دربارِ شاہی سے منسلک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن امام ابویوسف ؒ اپنے مسلک کی اشاعت کے لئے ان کا اس عہد پر فائز ہونا مفید سمجھتے تھے۔

دونوں بزرگوں میں شکر رنجی اور وجہ اختلاف اتنی ہی بات پر تھی لیکن اس سلسلہ میں تذکروں اور فقہ حنفی کی کتابوں کے ذریعہ بے بنیاد اور غلط روایتیں رواج پا گئی ہیں اس لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈال لی جائے تا کہ اصل حقیقت واضح ہوجائے۔

کروری نے مناقب میں اور سرخسی نے شرح اسیر الکبیر میں اس اختلاف کی یہ وجہ بتائی ہے کہ امام محمدؒ کی ذکاوت و ذہانت اور ان کی طرف عام رجحان اور ان کے درس کی شہرت کی بناء پر امام ابو یوسفؒ ان سے حسد کرتے تھے، اور ان کی شہرت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، کہ اگر ہارون رشید کو، ان کے ان اوصاف کی اطلاع ہوگئی اور اس نے امام محمدؒ کو دربارِ شاہی سے منسلک کرلیا تو ان کی عزت کم ہوجائے گی[1]۔

چنانچہ یہی چیز دونوں آدمیوں میں اختلاف اور منافرت کا سبب ہوئی، سرخسی ایک محقق آدمی ہیں، ان کی کتاب میں ایسی غلط روایت کا داخل ہوجانا بہت تعجب خیز معلوم ہوتا ہے، لیکن غالباً یہ روایت ان کو اس وقت پہنچی تھی جب وہ قید خانہ میں تھے، اور قید خانہ کی کھڑکی سے طلبہ کو املا کراتے تھے، اس لیے ان کو تحقیق کا موقع نہ ملا ہو۔ اور روایت کتاب میں داخل ہوگئی ہو، اس روایت کی اگر کوئی بنیاد ہوتی تو کم از کم مخالفین کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا، لیکن سرخسی اور کردری کے علاوہ کسی نے اپنی کتاب میں اس روایت کو جگہ نہیں دی ہے۔ اگر ذرہ تامل سے کام لیا جائے تو خود عقل اس کے قبول کرنے سے ابا کرتی ہے، اس لئے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا تعلق معاصرانہ نہیں بلکہ استاد و شاگرد کا تھا، اور اس تعلق میں رشک و حسد خصوصاً برگزیدہ ہستیوں میں بے معنی سی بات ہے، اور پھر امام ابو یوسف بغداد میں قاضی تھے، اور امام محمد کی مجلس درس کوفہ میں تھی۔ اس بعد مسافت کے باوجود امام محمد کی ذکاوت یا ان کی طرف عام رجحان کا اثر، امام ابو یوسفؒ کی شخصیت پر کیا پڑ سکتا تھا۔ جب کہ دونوں کے فخر و اعزاز کی نوعیت بالکل جدا تھی۔

یہ روایت اس نقطۂ نظر سے بھی قابل غور ہے کہ امام ابو یوسفؒ کو امام محمدؒ سے رشک و حسد کب پیدا ہوا، عہدۂ قضا قبول کرنے سے پہلے یا اس کے بعد، اگر یہ جذبہ بعد میں آیا تو پھر روایت کا یہ ٹکڑا کہ امام ابو یوسفؒ، ہارون سے ان کے اوصاف مخفی رکھنا چاہتے تھے، کیسے صحیح ہوسکتا ہے، اس لئے کہ عہدۂ قضا قبول کرنے کے بعد تو بارہا امام محمد کو براہ راست ہارون سے مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع ملا ہوگا، جیسا کہ واقعات سے پتہ بھی چلتا ہے، اور بعض روایتوں میں ہے کہ خود ہارون ہی نے ان کو اس عہدہ کے لئے منتخب کیا تھا، اگر یہ روایت صحیح تسلیم کرلی جائے، تو رشک و حسد کی روایت بالکل ہی بے معنی ہوجاتی ہے، اس لئے کہ ہارون کو اس سے پہلے ان کے علم و فضل کی اطلاع مل چکی ہوگی۔

پھر اس نے ان کا انتخاب کیا ہوگا، تو پھر اخفا کے کیا معنی ہوئے۔

---

[1] مناقب کردری۔ ص ۱۲۶ بلوغ ۳۸

اور اگر امام ابو یوسف ؒ کو رشک و حسد عہدۂ قضا قبول کرنے سے پہلے پیدا ہوا تو پھر انہوں نے ان کے قاضی مقرر کیے جانے کی کوشش کیوں کی، جب کہ یہ چیز ہارون سے درخور کا ذریعہ ہو سکتی تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ امام سرخسی اور کردری نے امام محمد ؒ کے جن اوصاف کے اخفاء کو امام ابو یوسف سے ان کے اختلاف کا سبب قرار دیا ہے، امام ذہبی نے انہی اوصاف کے اظہار و اعلان کو ان کی رنجش کا سبب بتایا ہے۔ محمد بن سماعہ کا جو امام محمد ؒ کے محبوب شاگرد ہیں، بیان ہے کہ امام محمد ؒ اور امام ابو یوسف ؒ میں رنجش کا سبب یہ ہوا کہ قاضی ابو یوسف ؒ سے رقہ کے قاضی کے انتخاب کے سلسلہ میں مشورہ کیا گیا، انہوں نے فرمایا کہ میری نگاہ میں امام محمد ؒ سے زیادہ بلند مرتبہ اور اس منصب کے لئے کوئی دوسرا موزوں نہیں ہے، ان کے اسی مشورہ پر امام محمد ؒ کو کوفہ سے بغداد بلایا گیا، بغداد آنے کے بعد وہ سیدھے امام ابو یوسف ؒ کے پاس پہنچے، اور ان سے اس انتخاب کی وجہ دریافت کی، امام ابو یوسف نے کہا کہ یہ مشورہ میں نے ہی سوچ کر دیا کہ کوفہ و بصرہ اور تمام مشرق میں ہمارے مسلک حنفی کی کافی اشاعت ہو چکی ہے، اگر آپ قاضی ہو کر شام چلے جائیں گے، تو وہاں بھی آپ کے ذریعہ اس کی اشاعت ہوگی، امام محمد نے اس کو کچھ زیادہ پسند نہیں کیا اور فرمایا اگر انتخاب کی یہی وجہ ہے تو کیا یہ کام اس وقت میں انجام نہیں دے رہا ہوں [1] اور بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے امام ابو یوسف ؒ سے فرمایا کہ آپ کی عنایت اور استادانہ شفقت سے مجھے توقع ہے کہ آپ مجھے اس آزمائش میں نہ ڈالیں گے [2]، اس گفتگو کے بعد امام ابو یوسف ؒ ان کو یحییٰ برمکی کے پاس لے گئے، اور اس سے کہا کہ یہ امام محمد آپ کے سامنے موجود ہیں، ان سے (قضا) کے معاملات طے کر لیجئے، چنانچہ یحییٰ برمکی نے امام محمد سے کچھ ایسا اصرار کیا اور دباؤ ڈالا کہ وہ عہدہ قضا قبول کرنے پر مجبور ہو گئے [3]۔

امام محمد غالباً امام صاحب کے اتباع کی وجہ سے اس عہدہ کو پسند نہیں کرتے تھے، اور چونکہ اس کا وسیلہ امام ابو یوسف ؒ ہوئے تھے، اس لئے امام محمد ان سے کبیدہ خاطر ہو گئے۔

چنانچہ امام ذہبی یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وکان ذلک سبب فساد الحال بین ابی یوسف و محمد بن الحسن [4]۔

''امام ابو یوسف اور امام محمد کے درمیان اختلاف اور شکر رنجی کا سبب یہی واقعہ ہوا''۔

---

[1] ترجمہ امام محمد ذہبی۔ ص ۵۲　[2] کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۶۵　[3] ترجمہ امام محمد۔ ص ۵۶　[4] ایضاً

یہ تھی واقعہ کی اصل صورت جسے راویوں کی دست اندازیوں نے بالکل مسخ کردیا تھا، اور جو دونوں بزرگوں کے صحیفۂ زندگی پر ایک بدنما داغ معلوم ہوتا تھا۔

امام ابو یوسف کے لیے ثقہ کا لفظ کیوں استعمال کیا :

اس قسم کی ایک روایت سرخسی نے شرح السیر الکبیر میں یہ بھی نقل کی ہے، کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت چونکہ ان دونوں بزرگوں میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا، اس لیے انہوں نے اس کتاب میں جہاں ان سے روایت کی ہے، ان کا نام نہیں لیا ہے۔ بلکہ اخبر نی الثقته (ایک سچے اور ثقہ راوی نے مجھ سے بیان کیا) کے الفاظ لکھے ہیں

یہ روایت بھی اسی نقطہ نظر سے قابل غور ہے کہ اگر امام محمد کو ایسی ہی شدید منافرت تھی کہ ان کی اہمیت کم کرنے کے لئے روایت میں ان کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ تو پھر ثقہ کے لفظ کے استعمال کو انہوں نے کیسے پسند کیا، جبکہ اس لفظ سے ان کی اہمیت کم ہونے کے بجائے، اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اس لیے کہ محدثین کا دستور ہے کہ وہ اکثر احتراماً اپنے مشائخ کا نام لینے کے بجائے، ان کے القاب، کنیت یا کسی مخصوص صفت کا تذکرہ کردیا کرتے ہیں، اس لئے امام محمدؒ کے اس لفظ ثقہ کے استعمال کو منافرت یا اہانت پر نہیں بلکہ اعزاز واحترام پر محمول کرنا چاہیے۔

امام ابو یوسف کے جنازہ میں کیوں شریک نہیں ہو سکے :

عام تذکروں میں ہے کہ ان دونوں آدمیوں میں اس قدر شدید اختلاف تھا کہ امام محمد امام یوسفؒ کے جنازہ تک میں شریک نہ ہوئے، چنانچہ امام ابو یوسفؒ کی لونڈیاں رو رو کر یہ شعر پڑھ رہی تھیں۔

اليوم يرحمنا من كان يحسدنا

اليوم نتبع من كانوا لنا تبعا[1]

یہ بات معلوم ہے کہ امام ابو یوسف کا انتقال بغداد میں ہوا، اور اس وقت امام محمد رقہ میں قاضی تھے، ظاہر ہے کہ رقہ (شام) سے بغداد (عراق) کی مسافت کچھ کم نہیں ہے۔ اور وہ زمانہ تار برقی اور ریل اور ہوائی جہاز کا نہ تھا۔ اس لیے یہ ممکن بلکہ یقین ہے، کہ امام محمد رقہ میں موجود رہے ہوں گے، جہاں دو ایک روز میں بھی ان کی وفات کی اطلاع نہیں پہنچ سکتی تھی، اس لیے جنازہ میں شرکت کا کیا سوال ہو سکتا تھا۔

---

[1] مناقب کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۶۶

یہ تمام روایات اس تصور کا نتیجہ ہیں کہ ان دونوں بزرگوں میں کوئی نفسانیت یا جاہ واقتدار کی جنگ تھی لیکن اگر ان کے درمیان اس قسم کی باتیں ہوتیں تو ارباب رجال ان کی تعدیل وتوثیق کے بجائے ان ہی باتوں کو سبب قرار دے کر ان پر جرح وتنقید کرتے، مگر کسی ایک شخص نے بھی اس حیثیت سے ان پر کوئی جرح نہیں کی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصنیفات

تدوین وتالیف کے لحاظ سے امام محمد اپنے تمام ہم عصروں میں ممتاز تھے، ان کے اقران و معاصرین میں سے کسی ایک شخص نے اتنی کثیر اور مفید تصانیف نہیں چھوڑی ہیں، ان تصانیف کی افادیت واہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ائمہ اربعہ کے مسلک کے سلسلہ میں تدوین فقہ کا جو کچھ بھی کام ہوا ہو امام محمد کی کتابوں یا ان کے تفریع کردہ مسائل کی روشنی میں ہوا۔ اور جب تک فقہی تحزب وتعصب نہیں پیدا ہوا تھا اس وقت تک ہر مسلک کے فقہا اور علماء ان کی کتابوں سے یکساں فائدہ حاصل کرتے رہے۔

اُوپر آچکا ہے کہ اسد بن فرات نے امام محمد ؒ سے کس جانکاہی اور دلسوزی کے ساتھ فقہ کی تحصیل کی تھی، چنانچہ فقہ کا یہ ذخیرہ لے کر عراق واپس جانے لگے تو راستہ میں مدینہ منورہ میں اتر پڑے، وہاں امام مالک کے اصحاب وتلامذہ کے سامنے امام محمد ؒ کے تفریع کردہ مسائل کو پیش کیا، اور امام مالک کے قول سے ان مسائل کی تائید وتطبیق چاہی، اہل مدینہ نے انہیں مصر جانے کا مشورہ دیا، باختلاف روایت وہ ابن وہب اور ابن قاسم کے پاس مصر پہنچے، ابن وہب نے ان مسائل کے جواب دینے سے معذوری ظاہر کی، لیکن ابن قاسم جو امام مالک ؒ کے تلامذہ میں سب سے زیادہ ان سے مستفید ہوئے تھے، انہوں نے اپنی بصیرت کے مطابق جواب دیا۔

چنانچہ اسد نے امام محمد کی فقہی تبویب کے مطابق ساٹھ جلدوں میں ان تمام مسائل کو جمع کیا اور ان کتابوں کا نام اسدیہ رکھا، اسد کے یہی جمع کردہ مسائل مالکی فقہ کی مشہور کتاب مدونہ کی تدوین و تالیف کے لیے مشعل راہ ہوئے۔

امام شافعی جس وقت عراق گئے گو وہ امام مالک ؒ کے درس حدیث میں شریک ہو چکے تھے، لیکن فقہ میں اب تک نہیں کوئی دسترس نہیں تھی، چنانچہ انہوں نے ساٹھ دینار صرف کر کے امام محمد کی کتابیں نقل کرائیں، اور کچھ عاریۃً لے کر استفادہ کیا، اس کے علاوہ ایک مدت تک ان کے درس میں شریک ہوتے رہے، اس کے بعد ان کو فقہ میں درک حاصل ہوا، جیسا کہ ان کا خود بیان ہے، کہ فقہ میں امام محمد ؒ کا سب سے زیادہ ممنون احسان ہوں، گو امام شافعی خود مجتہد ہیں اور ان کی فقہ کا ایک خاص نہج

ہے، لیکن بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے فقہی اجتہاد اور تدوین میں امام محمد کی ذات کو بڑا دخل ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے متعلق تمام اہل تذکرہ نے لکھا ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا، کہ آپ نے یہ دقیق مسائل کس سے حاصل کئے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ امام محمدؒ کی کتابوں سے۔

غرض فقہ میں فروع کی جتنی تالیف و تدوین ہوئی ان سب کا سلسلہ کسی نہ کسی حیثیت سے امام محمد کی ذات تک ضرور منتہی ہوتا ہے۔

کثرت تصانیف :

امام محمد کی تصانیف کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے، مولانا عبدالحئی صاحب نے النافع الکبیر میں ایک روایت نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کی تعداد ۹۹۹ ہے، لیکن یہ تعداد مبالغہ سے خالی نہیں معلوم ہوتی۔ طاش کبری زادہ نے مفتاح السعادۃ میں لکھا ہے کہ امام محمدؒ جو کتابیں لکھنا چاہتے تھے، ان سے ان کی فہرست مانگی گئی، تو انہوں نے جو فہرست دی، اس میں ایک ہزار کتابوں کے نام درج تھے، اگر وہ زندہ رہتے تو یہ تعداد پوری کر دیتے۔

چنانچہ اسی لئے کہا گیا کہ ان کی زندگی بھی رحمت تھی اور موت بھی، اس لئے کہ اگر وہ زندہ رہتے اور تمام کتابیں مکمل کر دیتے تو اس سے استفادہ کرنے والے تھک جاتے، اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک ہزار کتابیں لکھیں نہیں بلکہ لکھنا چاہتے تھے۔

عام ارباب تذکرہ اور خصوصاً ابن ندیم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے، ان کی تعداد ۲۳ سے متجاوز نہیں ہے، اب ہم تفصیل سے ہر کتاب کی اہمیت اور اس کی خصوصیات پر بحث کرتے ہیں۔

موطا سے امام مالک :

دوسری صدی میں حدیث کے جتنے مجموعے مرتب ہوئے ان میں ترتیب و تدوین کے لحاظ سے موطا امام مالک سب سے زیادہ جامع اور اہم ہے، یہی وجہ تھی کہ اس وقت تمام اسلام سے تشنہ کامان حدیث موطا کے سماع کے لئے امام مالک کی خدمت میں جوق در جوق آتے تھے، اور اکثر اہل علم امام مالک سے جو کچھ سنتے تھے، اسے تحریر میں لاتے جاتے تھے، ظاہر ہے کہ ہر شخص کے سماع اور تحریر میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا تھا، اسی وجہ سے تھوڑی کمی و بیشی کے ساتھ موطا کے متعدد نسخے تیار ہو گئے، اور ہر صاحب نسخہ نے اپنے ہی نسخہ کو رواج دیا، سیوطی نے تنویر الحوالک میں ان کی تعداد چودہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں سولہ بتائی ہے، اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ۳ نسخوں کا ذکر کیا ہے،

(موسیٰ ص ۱۲) ان ہی نسخوں میں ایک نسخہ امام محمد کی روایت سے بھی مروی ہے، لیکن ان تمام نسخوں میں کچھ نہ کچھ فرق موجود ہے، اور خصوصیت سے امام محمد کے مدونہ نسخہ میں اور زیادہ فرق ہے[۱]۔

موطا ئے امام محمد :

موطا کے جتنے نسخے موجود ہیں، ان میں یحییٰ مصمودی کا مروی نسخہ سب سے زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے، ہندوستان میں یہی نسخہ زیادہ مروج ہے، اور زرقانی وغیرہ نے شرح بھی اس کی لکھی ہے، لیکن بعض وجوہ سے امام محمد کا روایت کردہ نسخہ اس سے بھی زیادہ معتبر اور افادیت کا حامل ہے، اب ہم ان وجوہ کی تفصیل کرتے ہیں۔

(۱) یحییٰ بن یحییٰ امام مالک کی خدمت میں صرف چند ماہ رہے، انہوں نے ابھی موطا کا سماع ختم بھی نہیں کیا تھا کہ امام مالک دنیا سے رخصت ہوگئے، اور امام مالک کے بعد ان کے تلامذہ سے سماع کی تکمیل کی، امام محمد امام کے مخصوص تلامذہ میں نہیں ہیں، لیکن وہ تین برس تک امام کی خدمت میں رہے، اور ان سے ۷۰۰ سے زیادہ حدیثیں سماع کیں، اس لئے اس اصول کے ماتحت کہ قلیل الملازمت کی روایت سے طویل الصحبت کی روایت قوی ہوتی ہے، امام محمد کے نسخہ کو یقیناً ترجیح ہونی چاہئے۔

(۲) یحییٰ کے روایت کردہ موطا میں کثرت سے مسائل فقہیہ اور امام مالک کے اجتہادات مذکور ہیں، بہت سے تراجم ابواب ایسے ہیں جن کے تحت کوئی حدیث نہیں ہے، لیکن موطائے امام محمد کی یہ خصوصیت ہے کہ کوئی ترجمہ ایسا نہیں ہے جس کے تحت مرفوع یا موقوف روایت نہ ہو، اور ظاہر بات ہے کہ حدیث کی جس کتاب میں رائے واجتہاد کا شمول ہوگا، اس کے مقابلہ میں حدیث کی وہ کتاب جو نفس حدیث پر مشتمل ہوگی اس کو ضرور افضلیت ہوگی۔

(۳) یحییٰ کے نسخہ میں صرف امام مالک کی روایتیں مروی ہیں۔ لیکن امام محمد کے نسخہ میں دوسرے شیوخ کی روایتیں بھی شامل ہیں، اور ظاہر بات ہے کہ اس زیادتی میں افادیت کا پہلو زیادہ ہے۔

موطائے امام محمد کی فنی خصوصیت اور ان کا طریقۂ روایت:

امام محمد نے موطا میں جو طریقہ روایت اختیار کیا ہے، اور جن فنی خصوصیت کا لحاظ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) وہ پہلے ترجمۃ الباب یعنی مضمون کی سرخی قائم کرتے ہیں، پھر اسی کے ذیل میں امام مالک

---

۱ مفتاح السعادۃ۔ ص ۱۰۸

سے کوئی مرفوع یا موقوف روایت درج کرتے ہیں اور وہ لفظ حدیث کے بجائے عموماً لفظ اثر استعمال کرتے ہیں، اور اس سے مرفوع اور موقوف دونوں طرح کی روایتیں مراد ہوتی ہیں۔

(۲) ہر عنوان کی ابتدا باب یا کتاب سے اور کبھی کبھی لفظ ابواب سے کرتے ہیں، جس جگہ نسخوں کا اختلاف دکھلانا مقصود ہوتا ہے وہاں لفظ فصل لکھ دیتے ہیں۔

(۳) ایک مضمون کی ایک یا چند حدیثیں نقل کرنے کے بعد به ناخذ یا بھذانا خذ کہہ کر اپنے مسلک کی طرف اشارہ کردیا کرتے ہیں، اور جو حدیثیں ان کے مسلک کے موافق نہیں ہوتیں ان کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے ہیں۔

(۴) عام طور پر وہ لفظ اخبرنا اور حدیثنا میں کوئی فرق نہیں کرتے، جیسا کہ متاخرین کا طریقہ ہے، وہ اپنے شیوخ سے جتنی روایتیں کرتے ہیں ان میں زیادہ تر لفظ اخبرنا استعمال کرتے ہیں، اگرچہ اوپر کے لوگ آخری لفظ حدثنا استعمال کرتے ہیں۔

(۵) اپنی رائے ظاہر کرنے کے بعد کبھی کبھی امام صاحب کی رائے کا ذکر بھی "وھو قول ابی حنیفه" کہہ کر دیا کرتے تھے۔ امام صاحب کی رائے کے ساتھ ان کے استاد ابراہیم نخعی اور کبھی کبھی والعامته من فقھائنا کہہ کر کوفہ و عراق کے عام فقہا کی رائے کا ذکر بھی کردیا کرتے ہیں۔

(۶) وہ بہت سے مسائل کے سلسلہ میں ھذا حسن یا جمیل و مستحسن وغیرہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد موکدہ یا سنت غیر موکدہ ہوتی ہے۔ اور جہاں وہ ینبغی کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس سے مراد سنتِ موکدہ یا واجب ہوتی ہے اور بسا اوقات لاباس کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد اس حکم کا جواز ہوتا ہے۔

(۷) غیر مستند احادیث کے لئے وہ لفظ بلغنا استعمال کرتے ہیں۔ ایسی حدیث کو اصطلاح میں بلاغیات کہا جاتا ہے۔ ہر محدث کی بلاغیات کو محدثین قابلِ استناد نہیں سمجھتے مگر امام محمد کی بلاغیات کے بارے میں صاحب ردالمختار لکھتے ہیں۔

ان بلاغاته مستندة ''ان کی بلاغیات مستند ہوتی ہیں''۔

(۸) موطا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں کوئی موضوع روایت نہیں ہے۔ البتہ کچھ ضعیف روایتیں ضرور ہیں۔ مگر ان کا ضعف متابعت کی وجہ سے دور ہو جاتا ہے، یعنی وہ روایتیں چونکہ متعدد طریقوں سے مروی ہیں، اس لئے اگر کوئی طریقہ اسناد کمزور ہوا تو دوسرا قوی طریقہ اسناد اس کے ضعف کو دور کردیتا ہے یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ وہی روایت دوسری کتب حدیث

میں کسی دوسرے صحیح طریقے سے مروی ہوتی ہے، جس سے اس کا ضعف باقی نہیں رہتا[1]۔

کتاب الآثار :

حدیث و آثار میں امام محمدؒ کی دوسری تصنیف کتاب آثار ہے اس میں احادیث نبوی ﷺ کم اور آثار صحابہ و تابعین کثرت سے ہیں، غالباً اسی لئے اس کا نام کتاب الآثار پڑا ہے۔ اس کتاب میں کل ۶۶ مرفوع، ۲۷ موقوف و مرسل حدیثیں، ۱۲ بلاغیات اور ۷ سو اٹھارہ صحابہ و تابعین ہیں، ان کے علاوہ امام ابوحنیفہؒ اور خود امام محمدؒ کے اقوال ہیں اس کتاب کی چند خصوصیتیں یہ ہیں۔

(۱)　اس میں کثرت سے اپنے شیخ الشیوخ ابراہیم نخعیؒ سے امام ابوحنیفہؒ کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے علاوہ صرف پندرہ شیوخ سے روایتیں کی ہیں۔

اس کتاب کی نقل و روایت کا محدثین نے اور خاص طور سے فقہا نے ہمیشہ اہتمام رکھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کتاب کے رواۃ کی جرح و تعدیل پر مستقلاً دو رسالے لکھے تھے۔ ایک کا نام الایثار لمعرفۃ الآثار ہے اور دوسرے کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

کتاب الحج :

فن حدیث و آثار میں یہ ان کی تیسری تصنیف ہے، اس کا پورا نام کتاب الاحتجاج علی اہل المدینہ ہے۔

امام محمدؒ کو امام مالک کے شاگرد تھے اور ان سے موطا کا سماع کیا تھا مگر اس کے باوجود ان کو امام مالکؒ اور علمائے مدینہ کے بعض خیالات اور راویوں سے اختلاف تھا۔ اس کتاب میں انہوں نے انہی باتوں کا جواب دیا ہے اور ان کے خلاف حجت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے مدینہ منورہ وغیرہ کے کتب خانوں میں ہیں، ہندوستان میں اس کا کچھ طبع ہو چکا ہے۔

گو اس وقت بہت ہی کم یاب ہے۔ ۱۹۴۵ء میں حضرۃ الاستاد جناب سید سلیمان صاحب ندویؒ کے ساتھ سورت جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں اس کا مطبوعہ حصہ مفتی مہدی حسن[2] صاحب کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ راقم کو وہیں اس نسخے کو دیکھنے کا موقع ملا جس سے ان کے شیوخ کی فہرست بھی تیار کی تھی، وہ فہرست تو گم ہوگئی مگر حافظہ میں اتنی بات محفوظ ہے کہ اس میں انہوں نے تقریباً ۱۰۸

---

[1] یہ پوری تفصیل مولانا عبدالحئی فرنگی محلؒ کے مقدمہ موطا سے لی گئی ہے۔
[2] موصوف اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مفتی ہیں۔

شیوخ سے روایتیں کی ہیں، اتنے شیوخ سے انہوں نے کسی اور کتاب میں روایت نہیں کی ہے۔ یہ کتاب دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ امام ابوحنیفہ ؒ کے مستند روایتوں کا ایک مجموعہ بھی امام محمد ؒ نے مرتب کیا تھا جو مسند ابوحنیفہ اور نسخہ محمد کے نام سے مشہور ہے۔

حدیث و آثار کی مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ فقہ میں ان کی متعدد مبسوط وغیرہ مبسوط کتابیں ہیں، انہوں نے فقہ میں جو کتابیں لکھیں یا املا کرائیں وہ دو طرح کی ہیں، ایک کو فقہا ظاہر الروایۃ کہتے ہیں، دوسری کو غیر ظاہر روایۃ کہتے ہیں۔ یعنی پہلی قسم کی کتابوں کی روایتیں عام طور پر مشہور و معروف ہیں اور دوسری قسم کی کتابوں کی روایتیں غیر معروف وغیر مشہور ہیں۔ ظاہر الروایۃ میں ان کی چھ کتابوں کا شمار ہوتا ہے۔ مبسوط، جامع صغیر، جامع کبیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر، زیادات۔

مبسوط :

یہ کتاب اسم با مسمیٰ ہے یعنی فقہ میں امام محمد کی سب سے ضخیم اور مبسوط کتاب ہے جو ابھی تک طبع نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے متعدد قلمی نسخے استنبول اور مصر کے کتب خانوں میں موجود ہیں، پوری کتاب چھ جلدوں میں ہے جس کی مجموعی ضخامت تین ہزار صفحات سے زیادہ ہے اس میں دس ہزار سے زیادہ مسائل مذکور ہیں۔ مسائل کے بیان میں عموماً آثار و احادیث سے ان کے دلائل کا ذکر بھی کرتے جاتے ہیں۔ ان میں جو آثار و احادیث ہیں اگر ان کو علیحدہ کر لیا جائے تو ایک مختصر مجموعہ حدیث آثار تیار ہو جائے۔ اس کتاب کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد حکیم نام کے ایک عیسائی یا یہودی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس نے اس کہا کہ جب تمہارے محمد اصغر کی کتاب ایسی ہے تو تمہارے محمد اکبر ﷺ کی کتاب کیسی ہوگی۔

(۲) الجامع الکبیر :

فقہ میں امام محمد ؒ کی یہ دوسری اہم تصنیف ہے اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے استنبول کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس کتاب کے متعدد وراوی ہیں جن میں ایک علی بن معبد بن شداد ہیں، اس میں بہت ہی اہم اور نادر مسائل پر گفتگو کی گئی ہے یہ کتاب روایت و درایت دونوں کا بہترین مجموعہ ہے اس کی اہمیت کا اندازہ علماء فقہ کے ان اقوال سے کیجئے۔

ابن شجاع کہتے ہیں۔

اسلام میں فن فقہ پر ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ امام ابوبکر الرازی اس کی شرح میں لکھتے ہیں،

فن نحو کے بعض ماہرین جیسے ابوعلی فارسی وغیرہ سے میں جامع کبیر پڑھتا تھا تو وہ کتاب کے مصنف کی نحوی مہارت پر حیرت کرتے تھے۔

. عربی ادب ولغت کے امام اخفش اور علامہ شریف النقیب وغیرہ نے بھی اس کتاب کی عربیت کی تعریف کی ہے۔اسی طرح امام ابن تیمیہ نے بھی اس کی عربیت کا اعتراف کیا ہے۔غرض جمہور علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ کتاب جس طرح فقہ میں حجت ہے۔اسی طرح عربیت میں بھی حجت ہے اس کتاب کی اہمیت ہی کے پیش نظر اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں جو...... ممتاز فقہائے مجتہدین نے لکھی ہیں۔

(۳) الجامع الصغیر :

فقہ میں امام محمد کی یہ تیسری تصنیف ہے۔اس کتاب میں ۱۵۳۲ مسائل ہیں جن میں صرف دو قیاسی مسئلے ہیں بقیہ تمام کا ماخذ حدیث نبوی وآثار سلف ہیں، یہ کتاب مولانا عبدالحیٔ صاحب ؒ کے حاشیہ کے ساتھ چھپ گئی ہے،اس کتاب کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔مولانا عبدالحیٔ صاحب ؒ نے کتاب پر حاشیہ کے ساتھ ایک مقدمہ بھی،" النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر " کے نام سے لکھا ہے جس میں اس کی تمام خصوصیات اور شرّاح کے نام تفصیل سے لکھ دیتے ہیں۔اس کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ جب امام محمد مبسوط کی تالیف سے فارغ ہو گئے تو امام ابو یوسف ؒ نے ان سے یہ فرمائش کی وہ ایک ایسی کتاب لکھیں جس میں ان روایتوں کو جمع کر دیں جو میں نے .... امام صاحب کے واسطہ سے ان کو سماع کرائی ہیں۔

چنانچہ انہوں نے یہ کتاب مرتب کر کے امام ابو یوسف کے سامنے پیش کر دی امام ابو یوسف ؒ نے دیکھا تو فرمایا کہ "میری روایات کو بڑے عمدہ طریقہ سے انہوں نے محفوظ رکھا ہے،صرف تین مسئلوں میں غلطی کی ہے۔امام محمد نے جب سنا تو فرمایا کہ میں نے غلطی نہیں کی بلکہ وہ خود اپنی روایات بھول گئے ہیں،بعض اہل تذکرہ کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف ؒ اپنی جلالت علم کے باوجود اس کتاب کو حضر و سفر میں برابر ساتھ رکھتے تھے۔

(۴) السیر الصغیر :

فقہ میں ان کی یہ چوتھی کتاب ہے۔امام ابوحنیفہ ؒ نے سیر ومغازی پر اپنے تلامذہ کو جو کچھ املا کرایا تھا اس کو ان کے متعدد تلامذہ نے کتابی شکل میں جمع کر دیا تھا۔ان ہی میں امام محمد کی یہ کتاب بھی

ہے اسی کتاب کا رد امام اوزاعی نے لکھا تھا۔ اس کتاب کا جواب امام ابو یوسف ؒ نے بھی دیا تھا اور امام محمد نے بھی۔ امام ابو یوسف ؒ کا جواب کتابی شکل میں الرد علی سیر الاوزاعی کے نام سے چھپ گیا ہے اور امام محمد کا یہ جواب السیر الکبیر کے نام سے اہل علم میں متداول ہے۔

(۵) السیر الکبیر :

یہ کتاب امام اوزاعی کے جواب میں لکھی گئی تھی مگر اب یہ سیر و مغازی کا بہترین ذخیرہ شمار کی جاتی ہے، اس میں آپ کو جہاد و قتال اور صلح و جنگ کے طریقے اس کے مواقع دوسری قوموں سے مسلمانوں کے تعلقات اور تجارت اسلام میں اس کے حقوق اور دوسرے معاملات پر بحث کی گئی ہے۔ اسلام کے بین الاقوامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

یہ کتاب امام محمد کی آخری تصنیفات میں شمار ہوتی ہے۔ قوت استدلال اور دقت نظر کے اعتبار سے ان کی یہ کتاب سب میں ممتاز ہے۔ ہارون رشید کو اس کتاب سے حد درجہ دلچسپ تھی اس نے اپنے دونوں لڑکوں امین اور مامون کو اس کا سماع کرایا تھا۔ اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ مقبول عام امام سرخی متوفی ۴۹۰ھ کی شرح ہے۔ یہ شرح مع متن حیدر آباد میں چھپ گئی ہے اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے استنبول کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس کا سب سے قدیم قلمی نسخہ مکتبہ الفاتح میں ہے، اس کتاب کا ترکی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

(۶) زیادات :

فقہ میں ان کی چھٹی کتاب زیادات ہے اور زیادۃ الزیادات ہیں۔ ان دونوں کتابوں کو الجامع الکبیر کا ضمیمہ سمجھنا چاہئے کیونکہ اس میں جن مسائل کا تذکرہ رہ گیا تھا وہ ان میں پورا کر دیا گیا ہے۔ یہ کتابیں اپنی گہرائی اور دقت نظری کے اعتبار سے ان کا بڑا کارنامہ شمار ہوتی ہیں۔ علمائے فقہ نے ان کی بھی شرحیں لکھی ہیں، غالبًا یہ کتاب اب تک چھپی نہیں ہے ان کے متعدد قلمی نسخے استنبول کے کتب خانہ میں ہیں۔

بعض لوگ ان دونوں کتابوں کو ظاہر الروایۃ میں شمار نہیں کرتے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ان میں بیشتر کتابیں چھپ گئی ہیں اور جو علیحدہ سے نہیں چھپی ہیں ان کو بھی مطبوعہ ہی سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ امام سرخسی نے ان تمام کتابوں کا خلاصہ اپنی مشہور کتاب مبسوط میں لے لیا ہے۔

غیر ظاہر الروایۃ :

ان مشہور اور معروف الروایۃ کتابوں کے علاوہ ان کے متعدد و غیر معروف الروایۃ کتابیں بھی ہیں۔ ان میں سے (۱) ایک قیات کے نام سے مشہور ہے، ان میں ان مسائل کو جمع کیا گیا ہے جو انہوں نے

رقہ کے قضا کے زمانہ میں مستنبط کے تھے، اس کے راوی اور جامع ان کے مشہور شاگرد محمد بن سماعہ ہیں۔

(۲)　دوسری کتاب کیسانیات ہے اس کے راوی شعیب بن سلیمان الکیسانی ہیں۔ ان ہی کے نام پر اس کتاب کا نام پڑ گیا ہے۔ اس کو الامانی بھی کہا جاتا ہے اس کتاب کا ایک ٹکڑا حیدر آباد کے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ دائرۃ المعارف کی طرف سے اس کے چھپنے کا انتظام ہو رہا تھا۔

مگر سقوطِ حیدر آباد کے بعد ان قیمتی ذخائر کے چھپنے کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔

آن قدح بشکست وآں ساقی نماند

(۳)　تیسری کتاب جرجانیات ہے۔ اس کے راوی ان کے شاگرد علی بن صالح الجرجانی ہیں اور انہی کے نام کی نسبت سے اس کا نام جرجانیات پڑا ہے۔

(۴)　چوتھی کتاب ہارونیات ہے۔ اس کے بارے میں نام کے علاوہ کچھ نہیں معلوم۔

(۵)　پانچویں کتاب کتاب النوادر ہے۔ جس کے روای ابراہیم بن رستم ہیں۔

(۶)　ان کی ایک کتاب کتاب الکسب کے نام سے مشہور ہے جس کو وہ نا تمام چھوڑ کر انتقال کر گئے کچھ لوگوں نے ان سے خواہش کی کہ زہد وورع پر ایک کتاب تصنیف کر دیں، اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں نے کتاب البیوع تصنیف کر دی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اصل زہد وورع تو حصولِ رزق میں حلال وحرام کا لحاظ ہے اور یہ سب باتیں بیع وشراء میں بیان کر دی گئی ہیں مگر جب ان لوگوں کا اصرار بڑھا تو انہوں نے یہی کتاب لکھنی شروع کی مگر تکمیل سے پہلے ہی رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ امام سرخسی نے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔

(۷)　ایک کتاب چند سال پہلے کتاب المخارج والحیل کے نام سے مصر سے شائع ہوئی ہے جس کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ امام محمد کی تصنیف ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مصر ہی کے ایک کتب خانہ میں ایک کتاب اسی نام سے موجود ہے جس کو امام ابو یوسف کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ اصل میں کسی نے بعد میں ان ائمہ کو بدنام کرنے کے لئے ان کے نام سے یہ کتاب لکھ کر منسوب کر دی ہے۔ اور دروغ گو را حافظہ نہ باشد اس لئے اس کو کسی نے امام ابو یوسف کی طرف اور کسی نے امام محمد کی طرف منسوب کر دیا۔

یہ کتاب خود ان ائمہ کے زمانہ ہی میں ان کی طرف منسوب کی جانے لگی تھی۔ چنانچہ امام محمد کے مشہور شاگرد محمد بن سماعہ کا بیان اوپر گزر چکا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد سے خود سنا ہے کہ کتاب المخارج والحیل کے نام سے جو کتاب لوگوں میں متداول ہے۔

هذا الكتاب ليس من كتبنا وانما القى فيها.

''اس کا شمار ہماری کتابوں میں نہیں ہے اس کو کسی نے گھڑ لیا ہے''۔

ان کے علاوہ بھی بعض کتابوں کے نام ابن ندیم نے لکھے ہیں، کتاب اجتہاد الرائے، کتاب الاستحسان، کتاب الخصال، کتاب الرد علی اہل المدینہ، کتاب اصول الفقہ وغیرہ۔ مذکورہ بالا تفصیل سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ طبقہ تبع تابعین میں سب سے زیادہ تحریری یادگاریں انہی نے چھوڑی ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت امام زُفرؒ

امام ابوحنیفہؒ کے تیسرے ممتاز شاگرد اور معروف مجتہد امام زفر بن ہذیل ہیں۔ یہ اپنے علم وفضل اور ملکۂ اجتہاد میں امام ابویوسف اور امام محمد سے نہ تھے بلکہ قیاس میں تو یہ صاحبین سے کچھ آگے ہی تھے۔ عام تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ **احلھم قیاسا** امام صاحب کے تلامذہ میں قیاس کرنے میں سب سے زیادہ تیز تھے۔ لیکن اس استعداد وصلاحیت کے باوجود اتنے مشہور نہں ہوائے جتنے کہ صاحبین ہوئے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ صاحبین میں ملکۂ اجتہاد کے ساتھ قوتِ تحریر اور تصنیف وتالیف کی صلاحیت بھی تھی اور انہوں نے اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی تھیں اس لئے دنیا نے ان کے علم وفضل کو زیادہ جانا اور امام زُفرؒ اس نعمت سے یا تو محروم تھے یا انہوں نے اسے اختیار نہیں کیا اس لئے وہ کوئی ایسی تحریری یادگار نہیں چھوڑ گئے کہ دنیا ان کے فضل وکمال کا پورا اندازہ کرتی۔

امام زُفرؒ اس حیثیت سے بھی امام صاحب کے تلامذہ میں ممتاز ہیں کہ ان کو امام صاحب نے اپنی زندگی ہی میں درس وتدریس کی اجازت دے دی تھی جب کہ امام ابویوسف اور امام محمد کو ان کی زندگی میں اس کی اجازت نہیں مل سکی تھی۔

علم وفضل کے ساتھ زہد واتقا اور استغنا وبے نیازی میں بھی امام صاحب کا پرتو ان پر پڑا تھا، چنانچہ حکومت کے شدید اصرار بلکہ سختی کے باوجود انہوں نے عہدۂ قضا قبول نہیں کیا اس جرم میں ان کا گھر گرا دیا گیا ان کو روپوشی کی مصیبت اٹھانی پڑی مگر اس سب کے باوجود انہوں نے اپنے کو اس آزمائش میں ڈالنا پسند نہیں کیا۔

نام ونسب :

زفر نام ہے۔ ابوالہذیل کنیت تھی، بصرہ[1] آبائی وطن تھا۔ ان کے والد ہذیل اموی دور میں اصبہان کے والی تھے، یہیں ۱۱۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی[2]۔

---

[1] بعض لوگوں نے ان کو اصبہانی لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ [2] کروری جلد ۲۔ ص ۱۸۷ الحات النظر۔ ص ۴

خاندان :

ان کا سلسلۂ نسب عدنان سے مل جاتا ہے ان کا خانوادہ بصرہ کے ممتاز عرب خانوادوں میں تھے، کردری نے لکھا ہے: مِنْ بَيْتٍ شريف غالباً اسی امتیاز کی وجہ سے یزید بن عبدالملک نے ان کے والد کو اصبہان[1] جیسے اہم مقام کا والی (گورنر) مقرر کر دیا تھا، ان کے ایک بھائی صباح بن ہذیل بنوتمیم کے صدقات کی وصول کے عامل مقرر کیئے گئے تھے۔

امام زفرؒ کی اہلیہ بصرہ کے ممتاز محدث خالد بن احارث کی بہن تھیں، ان کی والدہ البتہ عجمی النسل تھیں، چنانچہ انہوں نے صورت ان کی اور سیرت باپ کی پائی تھی۔ حجاج بن ارطاۃ کہا کرتے تھے، اللسان عربی لا الوجه، ان کا چہرہ تو عربوں جیسا نہیں ہے مگر زبان عربوں جیسی ہے۔

تعلیم و تربیت :

امام زفر کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں تذکرے خاموش ہیں، البتہ ان سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعلیم کا آغاز محدثین کی آغوش میں ہوا مگر ان کی ذہانت اور طباعی محض تحدیث روایت پر اکتفانہ کر سکی اور ان کو امام ابوحنیفہؒ کے درس فقہ تک کھینچ لائی۔

امام طحاوی کے واسطہ سے یہ روایت تذکروں میں درج ہے کہ امام زفر ابتدا محدثین کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے جایا کرتے تھے۔ ایک دن ایک مسئلہ ایسا پیش آیا کہ جسے ان کے شیوخ حل نہ کر سکے وہ ناچار امام صاحب کی خدمت میں آئے اور مسئلہ دریافت کیا، امام صاحب نے اس کا جوب دیا۔ مگر امام زفرؒ اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور کتاب وسنت سے اس کی دلیل پوچھی، امام صاحب نے اپنے دستور کے مطابق فرمایا کہ یہ مسئلہ فلاں حدیث سے ماخوذ ہے اور اس کے عقلی دلائل یہ ہیں، پھر امام صاحب نے فرمایا کہ اگر مسئلہ کی صورت یہ ہو تو پھر جواب کیا ہوگا؟ امام زفرؒ نے کہا کہ اس صورت کا سمجھنا تو میرے لئے پہلی صورت سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ امام صاحب نے اس کا بھی جواب عنایت فرمایا اس کے بعد امام صاحب نے کچھ اور مسائل پر روشنی ڈالی، امام زفرؒ کا بیان ہے کہ میں امام صاحب کی مجلس سے بہت خوش خوش واپس ہوا اور اپنے اصحاب حدیث کے سامنے ان مسائل کو رکھا کہ وہ انکا جواب دیں مگر وہ کسی مسئلہ کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔ میں نے پھر تمام مسائل کے جوابات اور

---

[1] علامہ زاہد الکوثری نے تاریخ اصبہان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ اصبہان کے والی مقرر تھے وہیں امام زفر کی ولادت ہوئی مگر کردری نے لکھا ہے کہ بصرہ کے والی تھے۔ تاریخ اصبہان ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں لیکن شذرات الذہب وغیرہ سے پہلے بیان کی تائید ہوتی ہے اس لئے اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

ان کے دلائل ان کے سامنے بیان کئے تو وہ حیرت زدہ ہو گئے اور پوچھا کہ یہ باتیں تمہیں کہاں سے معلوم ہوئیں، میں نے بتایا کہ امام ابوحنیفہ کی مجلس درس میں۔ اس کے بعد سے میں اپنے ساتھیوں میں راس الحلقہ سمجھا جائے گا[1]۔ اس واقعہ کے بعد سے وہ بالا التزام امام ابوحنیفہ کی مجلس درس میں شامل ہونے لگے اور تقریباً بیس برس تک ان کی خدمت اور رفاقت میں رہے۔

امام ابوحنیفہ ؒ کی مجلس درس میں عجیب کشش اور اس کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ جو ایک بار اس میں شریک ہو گیا پھر کیا مجال کہ وہ اس کو چھوڑ کر دوسری جگہ جائے، امام ابویوسف، امام محمد اور امام زفر یہ تمام حضرات پہلے کسی اور حلقہ درس میں شریک تھے مگر جب امام صاحب کی خدمت میں آئے تو پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے امام ابویوسف کے شیوخ کی فہرست سو سے زیادہ ہے اور اس سے کچھ زیادہ امام محمد کے شیوخ ہیں خود امام زفر کے شیوخ کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ مگر جو محبت شگفتگی اور عقیدت ان لوگوں کو امام صاحب سے تھی وہ کسی سے نہیں تھی اس میں امام صاحب کے علم و تفقہ اور ان کے مجتہدانہ درس کے ساتھ ان کے عام اخلاق و کردار اور زہد و تقویٰ کا بڑا دخل تھا۔ خصوصیت سے طلبہ کے ساتھ وہ جس شفقت، حسن سلوک اور مساوات کے ساتھ پیش آتے تھے اور ان کے لئے جو دلسوزی کرتے تھے اس کی مثال دوسری جگہ کم ملتی ہے۔

امام زفر ؒ امام صاحب کی زندگی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

جالست ابا حنیفة اکثر من انصح و اشفق النا س منه و انه یبذل نفسه اللہ تعالیٰ اماھامة النھا ر فانه کان مشغو لاً بالمسا ئل وحلّها و تعلیمها فاذاقام من ا لمجلس عاد مریضاً اوشیع جنازة او داسی فقیرا وواصل اخاً اوسعی فی حاجةٍ فاذا کان اللیلُ خلا للتلاوة العبادةِ و الصّلوٰة فکان ھذا سبیلہ حتی تو فی[2]

"میں بیس برس سے زیادہ امام صاحب کی خدمت میں رہا، میں نے ان سے زیادہ کسی کو عام انسانوں کا خیر خواہ مخلص اور مشفق نہیں دیکھا وہ صرف خدا ہی کے لئے اپنی جان کھپایا کرتے تھے، کوئی دوسرا جذبہ نہیں ہوتا تھا۔ قریب قریب پورے دن وہ مسائل کے حل اور ان کی تعلیم و تدریس میں لگے رہتے تھے...... جب مجلسِ درس سے اٹھتے تھے تو کسی مریض کی عیادت کے لئے جاتے یا کسی جنازہ میں شرکت کرتے یا کسی سے ملاقات کے لئے

---

[1] لمحات النظر۔ ص ۶　　[2] مناقب کردری ص ۱۰۴ جلد ۲

جاتے یا پھر کسی کی کوئی اور ضرورت پوری کرنے میں لگ جاتے تھے جب رات ہو جاتی تو پھر ذکر تلاوت اور نماز کے لئے اپنے کو یکسو کر لیتے تھے پوری زندگی انہوں نے اسی طریقہ پر گزاری"۔

امام زفر کے دوسرے شیوخ :

اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام زفرؒ ابتداً کوفہ کے دوسرے شیوخ حدیث سے استفادہ کرتے تھے اس کے بعد ان کو امام صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہوا امام صاحب کے علاوہ جن شیوخ سے انہوں نے استفادہ کیا ان کی تعداد کافی ہے، چند مشاہیر کے نام یہ ہیں۔

سلمان بن مہران معروف بہ اعمش، یحییٰ بن سعید، محمد بن اسحٰق صاحب المغازی یحییٰ بن ایوب التیمی، اسمٰعیل بن ابی خالد، ایوب علیہ سختیانی، زکریا بن ابی زائدہ، سعید بن ابی عروبہ۔

نہایت ذہین اور ذکی تھے اس لئے اپنے تمام اساتذہ کی نظروں میں بہت محبوب رہے۔ امام ابوحنیفہؒ بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

امام صاحبؒ کا طریق تعلیم اور امام زفرؒ :

امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ درس وتدریس عام شیوخ سے مختلف تھا، دوسرے شیوخ عموماً اپنی معلومات طلبہ کو املا کرا دیتے تھے یا پھر زبانی تحدیث روایت کر دیتے تھے۔ مگر امام ابوحنیفہؒ کا درس مجتہدانہ اور تمرینی ہوتا تھا۔ وہ طلبہ کے سامنے مسائل پیش کر کے انہیں سے جواب لیتے تھے اور پھر ان ہی سے دلائل پوچھتے تھے، جب تلامذہ اپنی معلومات پیش کر لیتے تھے تو امام صاحب اپنی معلومات اس کے سامنے رکھتے اس بحث وتمحیص کے بعد جو اصول وفروغ طے ہو جاتے تھے، ان کو قلمبند کر لیا جاتا تھا[۱] اس طریقہ درس کا نتیجہ تھا کہ امام صاحب کے تلامذہ میں جتنے ممتاز مجتہدین اور فقہا پیدا ہوئے کسی امام کے تلامذہ میں نہیں ہوئے۔

شیوخ کی رائے :

امام صاحب امام ابو یوسفؒ اور امام زفرؒ دونوں کو تمام تلامذہ میں ممتاز حیثیت دیتے تھے ایک بار فرمایا کہ میرے چھتیس اصحاب ایسے ہیں جن میں ۲۸ قاضی ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور چھ مفتی بن سکتے ہیں اور دو آدمی یعنی ابو یوسف اور زفرؒ قاضیوں اور مفتیوں کی تعلیم وتربیت کا کام کر سکتے ہیں[۲]۔

---

[۱] مناقب کردری۔ جلد ۱۔ ص ۵۰ [۲] مناقب کروری۔ جلد ۲۔ ص ۱۲۵

استاد کا احترام :

امام زفر ” امام صاحب ” کا غایت درجہ احترام کرتے تھے، فرماتے تھے کہ امام صاحب کی زندگی میں ان سے اختلاف کرتا تھا مگر اب ہمت نہیں پڑتی جب ان کی شادی ہوئی تو امام صاحب کو انہوں نے مدعو کیا اور خطبہ کی خواہش ظاہر کی اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ”یہ اپنے علم و فضل اور شرف کے لحاظ سے امام المسلمین ہیں“۔ بعض لوگوں کو یہ اعزاز برا معلوم ہوا اور ان سے کہا کہ تمہارے خاندان اور قوم کے ممتاز لوگ موجود ہیں ان سے خطبہ کی خواہش نہیں کی۔ امام زفر نے فرمایا کہ اگر میرے والد بھی موجود ہوتے تو میں ان پر بھی امام صاحب کو ترجیح دیتا[۱]۔

درس و تدریس :

امام صاحب نے اپنی زندگی ہی میں ان کو درس و تدریس کی اجازت دے دی تھی مگر انہوں نے استاد کی موجودگی میں غالباً درس و تدریس کا مشغلہ جاری نہیں کیا بلکہ ان کی وفات کے بعد یہ سلسلہ جاری کیا یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انہوں نے کوفہ میں کتنے دنوں تک درس و تدریس کے سلسلہ قائم رکھا مگر بہر حال انہوں نے کچھ دن یہاں درس دیا پھر بصرہ منتقل ہو گئے۔

بصرہ میں مجلس درس :

بصرہ کی فضا اس وقت امام صاحب کے تلامذہ کے لئے نہایت موزوں تھی گو وہاں امام صاحب کے متعدد ممتاز تلامذہ موجود تھے۔ مگر کسی نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کرنے کی ہمت نہیں کی۔

یوسف بن خالد بصری، امام صاحب کے شاگرد تھے جب وہ امام صاحب کی خدمت سے وطن واپس ہونے لگے تو امام صاحب نے ان سے کہا تھا کہ بصرہ میں بہت سے صاحب علم و فضل ہیں وہاں جا کر کسی کھمبے[۲] سے لگ کر نہ بیٹھنا یعنی درس و تدریس کا سلسلہ نہ جاری کر دینا اور یہ کہنے لگنا کہ ابو حنیفہ نے یہ اور یہ کہا ہے ورنہ جلد ہی مسند درس اٹھا دینی پڑے گی۔ مگر انہوں نے امام صاحب کی ہدایت پر عمل نہیں کی اور بصرہ پہنچتے ہی مسند درس قائم کر دی نتیجہ وہی ہوا جس کی امام صاحب نے پیش گوئی کی تھی یعنی ان کو جلد ہی مسند درس اٹھا دینی پڑی اس وقت بصرہ میں عثمان بن مسلم امام بصرہ تھے، یہ ان کی خدمت میں جانے لگے مگر ان سے وہاں بھی خاموش نہیں رہا اور انہوں نے امام صاحب کے اقوال ان کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیئے جس کے نتیجہ میں شیخ عثمان کے تلامذہ نے ان کو زدوکوب تک کیا[۳]۔

---

۱ مناقب کردری جلد ۲۔ ص ۱۸۴　　۲ اس وقت دینی علوم کی درس گاہیں مسجدیں ہوتی تھیں یہ اسی طرف اشارہ ہے کہ مسجد کے کسی کھمبے سے لگ کر مسند درس نہ بچھا دینا۔　　۳ لمحات النظر۔ ص ۱۶

ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بصرہ میں امام صاحب اور ان کے تلامذہ سے لوگوں میں کتنی نفرت پھیلی ہوئی تھی انہی حالات میں امام زفرؒ بصرہ جاتے ہیں۔

امام صاحب لوگوں کی نفسیات اور ان کی سیاست اور رجحان سے خوب واقف تھے اسی لئے انہوں نے یوسف بن خالد کو اہلِ بصرہ کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ مگر وہ اس کو نہ سمجھ سکے جس کے نتائج ان کے حق میں اچھے نہیں ہوئے۔ امام زفر خود بھی ذہین اور موقع شناس تھے اور پھر امام صاحب کی اس ہدایت سے بھی واقف تھے اس لئے جب وہ بصرہ گئے تو انہوں نے پہلے حلقۂ درس نہیں قائم کیا بلکہ شیخ عثمان بن مسلم کی مجلس درس میں شرکت کرنے لگے کچھ روز وہ چپ چاپ درس میں شریک ہو کر سنتے رہے اس کے بعد انہوں نے ان کے اصول وفروغ پر نظر ڈالی تو بہت سے مسائل کے سلسلہ میں اصل وفرع اور ماخوذ میں تضاد نظر آیا۔ امام زفر ان مسائل کا تذکرہ ان کے تلامذہ سے کرتے اور پھر بدلائل ان کی غلطی واضح کرتے وہ تلامذہ اس کا ذکر شیخ سے کرتے اور ان سے اپنی رائے سے رجوع کرنے کے لئے اصرار کرتے تھوڑے دن کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ امام زفرؒ سے استفادہ کرنے والوں کا ہجوم ہوا اور ان کو ایک الگ حلقۂ درس قائم کرنا پڑا، ابواسد کہتے ہیں کہ ان کے درس میں اتنا ہجوم ہوا کہ وہاں کے اکثر حلقائے درس ٹوٹ گئے[1]۔

امام زفرؒ بہت دقیق النظر اور باریک بین تھے اس لئے بعض تلامذہ ان کا درس سمجھ نہیں پاتے تھے اور اس سے اکتا جاتے تھے مشہور محدث وکیع بن الجراح امام صاحب کے پاس جاتے تھے تو بہت تیار ہو کر جاتے تھے، مشہور محدث وکیع بن الجراح امام صاحب کے تربیت یافتہ ہیں امام صاحب کی وفات کے بعد بغرض استفادہ صبح کو امام زفر کے پاس اور شام کو امام یوسف کے پاس جایا کرتے تھے۔

لیکن امام ابو یوسف چونکہ عہدۂ قضا اور دوسری ذمہ داریوں کی وجہ سے مشغول رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کو استفادہ کا موقع کم ملتا تھا اس لئے انہوں نے اب صرف امام زفرؒ ہی کے پاس آمدورفت محدود کرلی، ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ

الحمد لله الذی جعلک خلفاً لنا عن الامام ولکن لا یذهب عنی حسرة الامام (کروری جلد ۲، ص ۱۸۴)

"خدا کا شکر ہے آپ کو اس نے امام کا جانشین بنایا اگر امام صاحب کی غیر موجودگی کی حسرت کسی طرح دل سے نہیں جاتی"۔

---

[1] اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اسی اختلاف کی وجہ سے ان کو بے دین اور مبتدع وغیرہ ٹھہرایا گیا۔

تلامذہ :

ان کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی پھر بھی جتنے دنوں انہوں نے درس دیا ان سے ایک خلق کثیر فیضیاب ہوئی چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

عبداللہ بن مبارک، محمد بن حسن، وکیع بن جراح، سفیان بن عینیہ، ہلال بن یحیٰی، حسن بن زیاد، محمد بن عبداللہ انصاری، فضل بن وکین، ابراہیم بن سلیمان، بشر ابن قاسم، محمد بن وہب، حافظ خالد بن حارث وغیرہ۔

عہدۂ قضا :

حافظ ابن عبدالبر اور عبدالقادر قریشی نے لکھا ہے کہ امام زفرؒ بصرہ کے قاضی بھی بنائے گئے تھے اور اہلِ بصرہ کو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے مسلک سے جو کچھ اختلاف تھا اور جو غلط فہمی تھی وہ ان کے قاضی ہی ہونے کے بعد ختم ہوئی مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ بصرہ یا کسی اور جگہ کے قاضی مقرر کئے گئے۔ عدم صحت کے وجوہ یہ ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سوار بن عبداللہ ۱۳۸ھ سے لے کر ۱۵۶ھ تک بصرہ کے قاضی رہے۔ اور امام زفرؒ کی وفات ۱۵۸ھ میں ہوئی ہے اس لئے ان کے عہدۂ قضا کے تقرر کا زمانہ زیادہ سے زیادہ دو برس کا ہو سکتا ہے۔ مگر اس مدت میں وہ منصب درس پر متمکن نظر آتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کی عمر کا اور کوئی حصہ نہیں بچتا جس میں یہ عہدہ قبول کر سکتے ہوں۔

(۲) بعض روایتوں میں ہے کہ قاضی سوار کے بعد ان کے لڑکے عبداللہ اس عہدہ پر مامور ہوئے اگر یہ روایت صحیح ہے۔ تو پھر امام زفرؒ کے بارے میں عہدہ قضا قبول کرنے کی روایت بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ بصرہ کے قیام کے زمانہ میں ان سے وہاں کے اہل علم سے جو علمی مباحثے ومناظرے ہوئے اور ان کے لئے بصرہ کی فضا ہموار ہوئی اس کی وجہ سے حافظ ابن عبدالبر کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ عہدۂ قضا ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کے سلسلہ میں جو صریح روایتیں موجود ہیں اس کی موجودگی میں مذکورہ روایت بالکل ہی موضوع معلوم ہوتی ہے۔ کروری لکھتے ہیں:

اکرہ زفر علی ان یلی القضاء فابیٰ

''امام زفر کو مجبور کیا گیا کہ وہ عہدہ قضا قبول کر لیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا''۔

ظاہر ہے کہ حکومت کی کسی پیشکش کو ٹھکرا دینا کچھ آسان نہیں تھا۔

چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ **ھدم منزلہ واختفی مدۃ ثم خرج واصلح منزلہ ثم ھدمہ ثانیاً واختفی کذالک حتیٰ عفی عنہ**

''ان کا گھر گرا گیا گیا اور وہ مدتوں روپوش رہے پھر آ کر انہوں نے اپنا مکان درست کرایا پھر دوبارہ گرادیا گیا وہ مدتوں روپوش رہے پھر جا کے ان کو معاف کیا گیا''۔

ظاہر ہے اس واضح بیان کے بعد ان کے عہدۂ قضا قبول کر لینے کی روایت کے عدم صحت میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔

پھر امام صاحب اور ان کے تلامذہ کے عہدۂ قضاء نہ قبول کرنے کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک غیر معمولی عزم وارادہ، ہمت وجرات اور عدیم المثال کردار کا ثبوت ہے۔ ان کی اس قربانی اور ایثار نفسی نے دین کے وقار کو بلند کیا، حکومت کے غلط رخ کو بڑی حد تک موڑا اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ امام صاحبؒ اور امام زفرؒ جیسے اولوالعزم بزرگوں ہی کی قربانی نے امام ابو یوسفؒ اور دوسرے بزرگوں کے لئے حکومت کی فضا سازگار بنائی کہ وہ حکومت میں رہ کر دینی مقاصد بروئے کار لا سکے۔

پھر یہ بات بھی قابل قدر ہے کہ کوئی معمولی لیاقت کا آدمی اس عہدہ سے انکار کرتا تو زیادہ تعجب انگیز نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس وقت کے سلاطین وزراء تک بھی اچھے خاصے دین کے عالم ہوتے تھے، ان کے سامنے ان کی لیاقت اور علمی صلاحیت کا ہر وقت امتحان ہوا کرتا تھا اور پھر وہ حکومت تقریباً شخصی حکومت تھی، جس کے لئے حبس وقتل ایک معمولی بات تھی، اس لئے ہر شخص اس کے قبول کرنے کی جرات کر بھی نہیں سکتا تھا، مگر امام صاحب اور ان کے تلامذہ نے اپنی غیر معمولی صلاحیت کے باوجود ایک دینی مقصد کی خاطر اس سے انکار کیا تھا، خود امام زفر کے متعلق امام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ قاضی بننا تو معمولی بات ہے یہ تو قاضیوں کی تربیت وتادیب کر سکتے ہیں۔

شادی :

غالبًا ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں ایک ممتاز محدث خالد بن حارث کی بہن سے دوسری ان کے بڑے بھائی کی بیوہ سے غالبًا یہ نکاح صرف انہوں نے بیوہ کی پرورش کی خاطر کرلیا تھا۔

وفات :

بہت کم عمری یعنی کل ۴۸ سال کی عمر میں وفات پائی، وفات کے وقت امام ابو یوسف موجود تھے، انہوں نے آخری وصیت کی خواہش ظاہر کی، انہوں نے کہا کہ یہ سامان میری بیوی کے لئے ہے،

اور یہ تین ہزار درہم میرے بھتیجے کے لئے ہیں پھر فرمایا کہ نہ تو مجھ پر کسی کا کوئی حق ہے اور نہ میرا کسی پر کوئی حق ہے[۱]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔

اخلاق وعادات :

اپنے زہد واتقاء اخلاق وکردار کے لحاظ سے بھی اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، ان کی فات کے بعد لوگوں میں یہ عام چرچا تھا کہ محض آخرت کی بازپرس کے خوف سے ان کا انتقال ہوا[۲]۔ حالانکہ ان کی زندگی بالکل بے داغ تھی، خود فرماتے تھے کہ میں نے اپنے بعد کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کی بازپرس کا مجھے خوف ہو[۳]۔

ابراہیم بن سلیمان کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ امام زفرؒ کی خدمت میں بیٹھتے تو کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ دنیاوی باتوں کا تذکرہ کرسکتا۔ اور اگر کوئی شخص دنیا کا تذکرہ چھیڑ ہی دیتا تو وہ مجلس سے اٹھ جاتے تھے[۴]۔

امام صاحب کے شاگردوں میں داؤد طائی مشہور صاحب زہد وتقویٰ بزرگ گذرے ہیں، ان سے اور امام زفرؒ سے بہت زیادہ بھائی چارہ تھا حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ داؤد صرف عبادت میں مشغول ہوگئے۔ مگر امام زفرؒ علم وعبادت دونوں کے جامع تھے[۵]۔

یحییٰ بن اکثم فرماتے ہیں کہ میرے والد امام صاحب کے بعد امام زفرؒ کی مجالس اس لئے زیادہ جانا پسند کرتے تھے کہ وہ علم کے ساتھ صاحب ورع وتقویٰ بھی تھے[۶]۔ خود فرماتے تھے میں نے دنیا میں رہنے کی کبھی بھی خواہش نہیں کی، اور نہ میرا دل کبھی دنیا کے مزخرفات کی طرف مائل ہوا[۱]۔

علم وفضل :

علم وفضل میں ان کو جو امتیاز حاصل تھا اس کا کچھ تذکرہ اوپر آچکا ہے، اس سلسلہ میں ائمہ فقہ و حدیث کے چند اقوال اور نقل کئے جاتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ نے ایک بار ایک مجمع میں فرمایا کہ۔

ھو امام من ائمة المسلمین و علم من اعلام الدین.

"وہ ائمہ مسلمین کے ایک امام اور دین کی سربلندی کے ایک نشان ہیں"۔

دوسرے ائمہ نے بھی ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے، عثمان بن ابی شیبہ کہتے تھے کہ

---

۱ مناقب کردری۔ جلد۲۔ ص۱۸۶ ۲ مناقب کردری۔ جلد۲۔ ص۱۸۶ ۳ ایضاً۔ ص۱۸۳ ۴ مفتاح السعادہ
۵ مناقب۔ ص۱۸۳ ۶ کردری۔ جلد۲۔ ص۱۸۳

میں نے اپنے والد سے ان کے علم و فضل کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ اس زمانہ کے سب سے بڑے فقیہ ہیں۔ ان کے اندر فقہ و حدیث کا بڑا اچھا امتزاج تھا، لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ تمہارے پاس جو احادیث ہو ہو میرے سامنے پیش کرو میں رطب و یابس الگ کردوں گا[1]۔

امام صاحب کے تلامذہ کے بارے میں عام طور سے یہ غلط فہمی تھی کہ وہ قیاس کو حدیث و آثار پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن یہ ایک صریح بہتان تھا، امام زفر فرماتے تھے کہ احادیث و آثار کی موجودگی میں ہم لوگ قیاس کو ترک کردیتے ہیں[2]۔

علم حدیث میں انہوں نے اپنی جو تحریری یادگاریں چھوڑی ہیں، ان کا تذکرہ آگے آئے گا۔

مجتہد کی حیثیت سے :

امام صاحب کے دوسرے مخصوص تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد کی طرح امام زفر کو بھی لوگوں نے مجتہد مطلق قرار دیا ہے، امام ابو یوسف کے حالات میں ہم اس کی پوری توضیح کرآئے ہیں اس لئے ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہے، امام زفرؒ کے متعلق جن لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ امام زفرؒ نے ایک بار فرمایا تھا کہ میں امام صاحب کی زندگی میں اختلاف کیا کرتا تھا لیکن اب اختلاف سے ڈرتا ہوں، اس لئے کہ ان کی زندگی میں اختلافی مسائل ان کے سامنے پیش ہوئے تھے، تو ردوکد کے بعد اکثر ان کی رائے کو ترجیح دینی پڑی تھی، مگر اب اس کی کوئی شکل باقی نہیں ہے۔

یہ بات اپنے موقع محل کے لحاظ سے صحیح ہے مگر ان کو مقلد محض قرار دے کر ان کے تمام مجتہدات کو نظر انداز کردینا صریح ظلم ہے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام صاحب خود اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے کہ میرے کسی قول پر اس وقت تک فتویٰ نہ دو جب تک اس کا ماخذ معلوم نہ ہوجائے، جب امام صاحب خود اپنے تلامذہ کو تقلید محض سے منع کرتے تھے، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس بات سے انہوں نے اپنے تلامذہ کو سختی سے منع کیا ان کے تلامذہ اسی کو اپنا شعار بنالیتے، پھر امام صاحب نے اپنے درس و تدریس کا طریقہ ہی ایسا رکھا تھا کہ ان میں اجتہاد و استنباط کی صلاحیت لامحالہ پیدا ہوجاتی تھی، ان تمام باتوں کے باوجود ان کے تلامذہ میں سے تو کوئی مجتہد مطلق پیدا نہ ہوا اور ان سے کن درجہ کے لوگ اس مرتبہ پر فائز کردیتے جائیں، یہ انتہائی زیادتی کی بات ہے، خاص طور پر امام زفر جن کے مجتہد مطلق ہونے کے بعض اور دلائل بھی ہیں۔

---

[1] مناقب کردری۔ ص ۱۸۳ [2] ایضاً

امام زفر کے تقریباً سترہ اجتہاد کردہ مسئلے ایسے ہیں جن میں وہ بالکل منفرد ہیں، اور فقہ حنفی میں ان کے مطابق فتوے دیئے جاتے ہیں، ان مسائل کو الاشباہ والنظائر کے شارح اور مشہور فقیہ احمد حموی نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے، اس رسالہ کی متعدد شرحیں اور تلخیصیں کی گئی ہیں۔

اسی طرح ابوزید دبوسی نے اپنی کتاب تاسیس النظر میں ایک باب میں خاص طور سے ان مسائل سے بحث کی ہے، جن میں امام زفر نے امام صاحب سے اصولی یا فروعی اختلاف کیا ہے، اس کی تمام تفصیلات علامہ زاہد الکوثری نے امام زفر کے سوانح حیات میں کی ہیں، آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ۔

ان کے مخصوص مجتہدات کی طرف، اتقانی زرکشی اور علامہ بزدوی وغیرہ نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر لکھتے ہیں۔

فان کان شان المجتهد المطلق الانفراد بمسائل فی الاصول والفروع فهاهو زفر له انفرادات فی الناحیتین علی ان الموافقة لامام فی الرای فی بعض مسائل الاصول والفروع عن علم بادلتها لاتخل بالاجتهاد المطلق اصلاً۔

" اگر مجتہد مطلق کی شان یہی ہے کہ وہ بعض اصولی اور فروعی مسائل میں منفرد ہو تو دونوں حیثیتوں سے امام زفر منفرد ہیں، اور بعض اصولی یا فروعی مسائل میں ان کے دلائل و مآخذ کی واقفیت کے ساتھ امام صاحب کی ہمنوائی کرنا بھی اجتہاد مطلق کے بغیر ممکن نہیں ہے "۔

امام صاحب ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "اقیس اصحابی" میرے اصحاب میں سب سے زیادہ قیاس کرنے والے "

امام غزالی سے کسی نے اصحاب ابوحنیفہ ؒ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے امام ابو یوسف ؒ اور امام محمد ؒ کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد فرمایا زفر سب سے زیادہ دقیقہ سنج تھے۔

تصنیف :

امام زفر ؒ اپنے علم وفضل کے لحاظ سے امام صاحب کے خاص تلامذہ امام ابو یوسف ؒ اور امام محمد ؒ سے کم تر نہیں تھے، مگر ان میں تصنیف و تالیف کا وہ مادہ یا تو فطرۃً کم تھا یا انہوں نے اس مشغلہ کو اختیار ہی نہیں کیا اس لئے نہ تو ان کے خیالات اتنے زیادہ پھیل سکے جتنے ان دونوں بزرگوں کے پھیلے، اور نہ ان کو وہ شہرت ہوئی جو صاحبین کو ہوئی۔

مناقب کردری میں ہے۔

کان زفر قلیل الکتابۃ یحفظ بالسمع حسن القیاس

''امام زفر لکھتے بہت کم تھے، وہ جو کچھ سنتے تھے اسے حافظہ میں محفوظ کر لیتے تھے، اور بہترین قیاس کرتے تھے''۔

حاکم نے حدیث میں ان کی دو کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں۔

ان لزفر نسختین فی الحدیث احد اھمار وایۃ ابی وھب والاخری روایتہ شداد بن حکم [1]۔

''حدیث میں امام زفر کے دو مجموعے ہیں ایک کے راوی ابو وہب اور دوسرے کے راوی شداد بن حکم ہیں''۔

بے فائدہ کلامی مسائل سے گریز:

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ اس زمانہ میں فلسفہ کے اثر سے علماء میں بہت سے ایسے مباحث اور لفظی اختلافات پیدا ہوگئے تھے، جن کی حیثیت دین میں تو کچھ نہیں تھی، مگر سوا اتفاق سے ـ ـ ـ ـ ـ وہ اُس وقت توحید و آخرت کے مسائل کی طرح اہم ہوگئے تھے، اور جو لوگ ان کلامی مسائل اور فلسفیانہ موشگافیوں سے اپنے دامن کو بچائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے، ان کے دامن پر بھی لوگ دو چار چھینٹیں ڈال ہی دیتے تھے۔

امام صاحب اور ان کے تقریباً تمام اصحاب و تلامذہ ایسے غیر ضروری مسائل و مباحث سے گریز کرتے تھے۔ مگر پھر بھی لوگوں نے ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیں، جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس وقت قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا مسئلہ عام طور سے موضوع بحث بنا ہوا تھا، اور اس کے بارے میں عموماً لوگ آئمہ سے سوالات کرتے تھے۔ امام زفر گو ان لا یعنی باتوں سے بہت گریز کرتے تھے مگر پھر بھی کبھی کبھی زبان کھولنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ایک روز کسی نے قرآن کے بارے میں پوچھا، انہوں نے جواب دیا،

القرآن کلام اللہ ''قرآن کلام الٰہی ہے''۔

یہ نہایت عاقلانہ جواب تھا، مگر سائل کا مقصد کچھ اور تھا، اس لئے اس نے فوراً ہی پھر پوچھا کہ کیا وہ مخلوق ہے؟ امام زفرؒ نے ذرا تند مگر ہمدردانہ لہجے میں فرمایا کہ

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث۔ ص ۱۶۴

''اگر تم ان دینی مسائل کے سوچنے اور غور کرنے میں مشغول ہوتے جن میں مشغول، ہوں تو وہ میرے لئے بھی مفید ہوتا اور تمہارے لئے بھی اور جن مسائل کی فکر میں تم پڑے ہوئے ہو ہو تمہارے لئے مضر ہیں، اللہ تعالیٰ کے لئے وہ چیزیں ثابت کرو جن سے وہ خوش ہو، اور جن چیزوں کا تم کو خدا نے مکلف نہیں بنایا ہے، اس میں اپنی جان ناحق نہ کھپاؤ۔

ایک بار حسن بن زیاد سے کسی نے کہا کہ ''امام زفرؒ بہت قیاس تھے'' انہوں نے کہا کہ یہ جاہلوں کی بات ہے۔ وہ عالم تھے، پھر اس شخص نے کہا کہ امام زفرؒ نے علم کلام میں غور وخوض کیا تھا؟ حسن نے کہا، سبحان اللہ کیا سطحی بات تم نے کی، ہمارے اصحاب کے بارے میں سوال کرتے جو کہ انہوں نے علم کلام میں میں غور وخوض کیا تھا، یا نہیں، وہ اس سے بڑی چیز کے حامل تھے، وہ علم و فضل کی کان تھے، جس کو عقل نہیں ہوتی اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے علم کلام میں غور کیا اور ہمارے اصحاب تو،

کانوا اعلم محدود اللہ[1]۔

'' وہ حدود اللہ سے خوب واقف تھے ''۔

مقصد یہ تھا کہ ان کا مشغلہ یہ نہیں تھا کہ وہ اُن مسائل میں جو نہ تو دنیا کی زندگی میں مفید ہوں اور نہ آخرت میں اپنا وقت ضائع کریں بلکہ وہ حدود اللہ کی پاسبانی اور ـــــــــ نگہبانی میں اپنی زندگی کھپاتے تھے جو صرف ان ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری مخلوق خدا کے لئے دونوں جہاں میں مفید ہیں۔

جرح وتعدیل :

عام محدثین نے امام زفر کی روایات کو قابل قبول قرار دیا ہے، اور ان کی توثیق وتعدیل کی ہے، امام ذہبی لکھتے ہیں، وہ فقیہ، زاہد اور صدوق تھے، ان کی توثیق بہت سے لوگوں نے کی ہے، ابن معین بھی ان کی توثیق کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر نے لسان میں فضل بن وکین کا قول نقل کیا ہے، ثقۃ ماموناً اسی طرح کے الفاظ حافظ ابن معین سے بھی نقل کیے گئے ہیں، ابن سبان نے بھی ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔

---

[1] لمحات۔ ص ۱۷

اس توثیق وتعدیل کے ساتھ بعض محدثین اورارباب رجال نے ان پر نقد وجرح بھی کیا ہے، مثلاً ابن مہدی قاضی سوار وغیرہ۔

لیکن جیسا کہ ہم امام محمد کے حالات میں لکھ آئے ہیں کہ جولوگ ایک ہزار برس سے زیادہ سے متبوع ومطاع چلے آتے ہوں اور جن کے علم وفضل پر امت کا ایک بہت بڑا طبقہ اعتماد کرتا چلا آتا ہو ان کے بارے میں اگر دو چار آدمیوں کی رائیں اچھی نہ بھی ہوتو اس سے ان کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اگر ان منفرد رایوں پر کوئی حکم لگایا جائے تو پھر مشکل سے کوئی ممتاز محدث یا فقیہ ثقہ رہ جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت امام اوزاعیؒ

امام اوزاعیؒ اُن ائمہ تبع تابعین میں ہیں، جن کا شمار دوسری صدی کے ممتاز مجتہدین مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ وغیرہ کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں فقہ وحدیث کے جو مکاتب فکر پیدا ہوئے، ان میں ایک کے بانی یہ امام اوزاعیؒ بھی ہیں۔

انہوں نے تقریباً پوری زندگی شام میں بسر کی۔ اس لئے زیادہ تر یہیں ان کے مسلک و فتاوے کی ترویج واشاعت ہوئی اور یہیں سے یہ مسلک اندلس میں پہنچا۔

شام بنواُمیہ کا سب سے بڑا سیاسی مرکز تھا۔ اسی لئے اُموی حکومت پر بھی ان کے علم وفضل اور فقہ وفتاویٰ کا اثر پڑا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے حکومت نے ان کے سامنے عہدۂ قضا پیش کیا۔ مگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔

۱۳۲ھ میں جب مشرق سے بنی اُمیہ کا سیاسی اقتدار ختم ہوا تو اس خاندان کے بعض حوصلہ مند افراد مغرب اقصیٰ پہنچے اور اندلس کی حکومت میں ایک نئی جان ڈالی۔ ان ہی کے ذریعہ امام اوزاعی کا مسلک اندلس آیا اور ایک مدت تک اس پر اہلِ اندلس کا عمل رہا۔

شام میں تقریباً دو صدی تک اور اندلس میں تقریباً ایک صدی یعنی حاکم بن ہشام متوفی ۲۵۶ھ کے عہد تک یہ مسلک زندہ رہا۔ اس کے بعد مشرق میں حنفی وشافعی اور مغرب میں مالکی و حنبلی مسلکوں نے اس کی جگہ لے لی اور بالآخر آہستہ آہستہ اس مسلک پر تعامل ختم ہوگیا۔

فقہ وحدیث کی کتابوں میں اب بھی ان کے مجتہدات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے سوانح حیات کی پوری تفصیل ملاحظہ ہو:

ابتدائی حالات :

امام اوزاعی کا نسبی تعلق یمن کے قبیلہ بنو ہمدان یا بنو حمیر سے تھا۔ مگر ان کا خاندان وہاں سے ترکِ وطن کر کے شام چلا آیا اور یہاں دمشق کے قریب ایک بستی اوزاعی [۱] میں بود و باش اختیار کر لی۔ اسی نسبت سے ان کو اوزاعی کہا جاتا ہے۔

بچپن کا نام عبدالعزیز تھا۔ بعد میں اسے تبدیل کر کے عبدالرحمٰن رکھا اور اسی نام سے وہ مشہور ہیں۔ ان کی کنیت ابو عمرو اور والد کا نام عمرو تھا [۲]۔

شام کے مشہور شہر بعلبک میں ۸۵ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ ابھی بچے ہی تھے کہ سر سے والد کا سایہ اُٹھ گیا اور یہ یتیم ہو گئے۔ ماں نے نہ جانے کن کن مصیبتوں اور تکلیفوں کے ساتھ ان کی پرورش کی۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان کا نشو ونما کسی ایک جگہ نہیں ہوئی بلکہ ان کی والدہ (غالباً معاشی پریشانیوں کی وجہ سے ان کو شہر بہ شہر لئے پھرتی تھیں۔ بہت دنوں تک ادھر اُدھر کی خاک چھاننے کے بعد خدا نے نہ جانے کیا صورت پیدا کر دی کہ بیروت میں قیام پذیر ہو گئیں۔

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کی ولادت بعلبک میں ہوئی اور پرورش کرک میں ہوئی [۳]۔ اس کے بعد ان کی والدہ ان کو کرک سے لے کر بیروت چلی آئیں اور یہیں اقامت گزیں ہو گئیں۔ بہر حال بیروت پہنچنے کے بعد غالباً ان کو کچھ اطمینان نصیب ہوا تو تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔

ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور بچپن کے دوسرے حالات و کوائف کا ذکر تذکروں میں بہت ہی کم بلکہ قریب قریب نہیں ملتا ہے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔

جو بچے خوشحال اور فارغ البال گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں یا کم از کم ان کو اپنے والدین کا سایۂ عاطفت ہی نصیب ہوتا ہے، ان کا بچپن ایک خاص نہج سے گزرتا ہے۔ ان کی تعلیم ایک خاص

---

۱ بعض اربابِ تذکرہ نے لکھا ہے کہ اوزاع یمن کے قبیلہ ذوالکلاع کی ایک شاخ ہے۔ یمن سے ترکِ وطن کر کے جب یہ لوگ شام آئے تو جہاں یہ آباد ہوئے اسی مقام کا نام اوزاعی پڑ گیا۔ مگر میں نے سمعانی کے بیان کو ترجیح دی ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ اصلہ من سبی السند ان کا خاندانی تعلق سندھ سے تھا۔ اس اعتبار سے ان کو ہندوستانی کہنا چاہئے مگر راقم کو اس بیان پر شک ہے۔ اس لئے اس کی تائید کسی دوسرے بیان سے نہیں ہوتی۔ راقم نے اس کی تردید میں ایک مفصل مضمون لکھا ہے، جو معارف اپریل ۵۶ء میں چھپ گیا ہے۔ جو لوگ اس کی تفصیل چاہتے ہوں، وہ مضمون دیکھ لیں۔ ۲ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۹۲ اسمعانی لفظ اوزاعی

۳ دمشق کے پاس ایک گاؤں تھا، اس نام کے دوسرے مقامات بھی ہیں

۴ ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۹۲ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ انہوں نے آخر عمر میں بیروت میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مگر دوسرے تذکرہ نگاروں نے وہی لکھا ہے جس کو میں نے اختیار کیا ہے۔

نظم وتربیت اور تربیت ایک خاص معیار کے مطابق ہوتی ہے۔ایسے بچے آگے چل کر جب کسی ممتاز حیثیت کے مالک ہوتے ہیں تو ان کے بچپن اور ان کی تعلیم کے واقعات سینکڑوں آدمیوں کو یاد ہوتے ہیں۔اس لئے سوانح نگاروں کو ان کے ابتدائی حالات معلوم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔مگر امام اوزاعیؒ اس طرح کی تمام نعمتوں سے محروم تھے۔

نہ تو وہ کسی خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے، نہ ان کے والد کا سایہ ان کے سر پر تھا۔حتیٰ کہ ان کو سن شعور تک کسی ایک جگہ رہنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ان کی ولادت کہیں ہوئی، بچپن کسی اور جگہ گذرا اور جوانی کے ایام کہیں اور بسر ہوئے۔ایسی صورت میں ان کے بچپن کے حالات اور تعلیم وتربیت کے ابتدائی واقعات پردۂ اخفا میں ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تعلیم اور اساتذہ :

مگر اس کے باوجود ان کی انشا پردازی، فصاحت وبلاغت اور تحریر وتقریر کی بے پناہ قوت وصلاحیت سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت ایسے ماحول اور ایسے اساتذہ کی صحبت میں ہوئی جو ان حیثیتوں سے ممتاز تھے۔

اہل تذکرہ نے ان کے زمانۂ طالب علمی کے جو دو ایک واقعے بیان کئے ہیں اور ان کے جن اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے، ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں :

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ یہ اپنی والدہ کے ساتھ بیروت میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، یہ بیروت ہی میں تھے کہ ایک بار ان کو یمامہ جانے کا اتفاق ہوا۔یمامہ میں اس وقت ممتاز محدث یحییٰ بن کثیر کی مجلس درس برپا تھی۔اس میں شریک ہونے لگے۔ان کو یحییٰ کی مجلس ایسی پسند آئی کہ اسی کے ہو رہے۔ کچھ دنوں کے بعد (غالباً ان کی صلاحیت کے اندازے کے بعد) اُستاذ نے ہدایت کی کہ وہ بصرہ جاکر محمد بن سیرین اور شیخ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما سے سماع حدیث کریں۔

اُستاذ کے حکم کے بموجب وہ بصرہ روانہ ہوگئے۔مگر یمامہ سے بصرہ پہنچنا کچھ آسان نہ تھا۔یمامہ اور بصرہ کے درمیان کئی سو میل کا مسافت تھی۔

پھر امام اوزاعی کو نہ تو سواری میسر تھی اور نہ بھرپور زادراہ۔نہ جانے وہ کس کس طرح اور کتنے دنوں میں افتاں وخیزاں بصرہ پہنچے۔وہاں پہنچتے ہی یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ جن بزرگوں سے سماع حدیث کے لئے وہ اتنی دور سے پاپیادہ آئے ہیں، ان میں سے ایک یعنی امام بصری واصل بحق ہوچکے ہیں اور

دوسرے امام محمد بن سیرین صاحب فراش ہیں۔ اس خبر سے ان کو جو رنج ہوا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، مگر سوائے صبر کے چارۂ کار کیا تھا۔

وہ ابن سیرین کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ بستر مرگ پر پڑے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ سماع حدیث سے تو بہرہ مند نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے سعادت اسی میں سمجھی کہ وہ مہلت بھی میسر ہے، اس میں حضرت ابن سیرین کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں۔ چنانچہ جب تک وہاں رہے برابر ان کی عیادت کے لئے جاتے رہے۔ ممکن ہے اس اثنا میں انہوں نے ان سے زبانی کوئی حدیث سنی ہو، جیسا کہ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ مگر عام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کو محمد بن سیرین سے سماع حدیث حاصل نہیں ہے [1]۔

انہوں نے تابعین کی ایک کثیر تعداد سے حدیث نبوی کی سماعت کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے:

ادرک خلقا من التابعین۔ (البدایہ۔ جلد اول۔ ص ۱۱۶)

''تابعین کی ایک کثیر تعداد کی انہوں نے صحبت اُٹھائی ہے''۔

اہل تذکرہ نے ان کے جن اساتذہ کا ذکر کیا ہے ان میں چند ممتاز تابعین اور تبع تابعین کے نام یہ ہیں:

عطا بن ابی رباح، قتادہ، نافع مولی ابن عمر، امام زہری، محمد بن ابراہیم، شداد بن ابی عمارہ، قاسم بن مخیمرہ، ربیعہ بن یزید وغیرہ۔

امام زہری اور یحیٰ بن کثیر کے بارے میں امام اوزاعی کا خود کا بیان ہے کہ ان دونوں اماموں نے (غالباً زبانی سماع حدیث کے بعد) مجھے اپنے اپنے صحیفے (جن میں ان کی مرویات لکھی ہوئی تھیں) دیئے اور فرمایا کہ

اردھا عنی ''میرے واسطے سے تم اس کی روایت کرو''۔

یعقوب بن شیبہ نے یحیٰ بن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ امام زہری سے امام اوزاعی کی روایت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ مگر ابن شیبہ یہ قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''زہری سے امام اوزاعی کی روایت خاص چیز ہے'' [2]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن شیبہ نے ابن معین کی اس رائے کو قبول نہیں کیا ہے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۲۴۱

درس وافتا :

بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ تیرہ برس کی عمر میں مسند درس وافتا پر بیٹھ گئے تھے مگر اس روایت میں یا تو مبالغہ ہے یا غلط فہمی کی بنا پر عمر غلط درج ہوگئی ہے جو حافظ ابن کثیر نے لکھی ہے کہ ۱۱۳ھ سے جب کہ ان کی عمر پچیس برس کی تھی، انہوں نے فتویٰ دینا شروع کر دیا تھا۔

یہ تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے باقاعدہ اپنی کوئی مجلس درس قائم کی تھی مگر تمام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ دینی مسائل میں اہل شام ان ہی طرف رجوع کرتے تھے۔ ہقل بن زیاد جو ان کے خاص شاگرد ہیں، ان کا بیان ہے :

افتی الاوزاعی فی سبعین الف مسئله بحد ثنا واخبرنا[1]۔

''انہوں نے ستر ہزار مسئلوں کا جواب حدیث کی روشنی میں دیا''۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی خاص مجلس درس تو قائم نہیں تھی مگر دوسرے طریقوں سے اہل علم ان سے استفادہ وروایت کرتے تھے۔ محاسن المساعی میں ہے کہ وہ نماز فجر کے بعد خاص ضرورت کے علاوہ کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے، بلکہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ تلامذہ انتظار میں رہتے تھے۔ جب سورج نکل آتا تھا تو اُستاذ وتلامذہ فقہ وحدیث کے مذاکرہ میں لگ جاتے تھے۔ ثم یقومون فیتذکرون فی الفقه والحدیث ۔ (ص ۴۷)

ان سے روایت کرنے والوں میں متعدد اکابر ائمہ ہیں، چند کے نام یہ ہیں :

امام مالکؒ، امام شعبہؒ، سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، ابن ابی الزمادؒ، ہقل بن زیاد، ابواسحاق الفرادی وغیرہ۔

امام اوزاعی کو یہ فخر حاصل ہے کہ امام زہریؒ اور اقتادہ نے بھی جو ان کے اُستاذ اور ائمہ تابعین کے سرخیل ہیں، ان سے روایت کی ہے[2]۔

فضل وکمال :

ان کے فضل وکمال کا اعتراف تمام اکابر ائمہ فقہ وحدیث نے کیا ہے۔ یحییٰ بن معین فرماتے تھے، ائمہ تو چار ہیں، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ[3]۔ عبدالرحمٰن

---

[1] البدایہ۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۶ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۳۹

[3] البدایہ۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۶ ابھی تک امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مسلکوں کی شہرت نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اسلامی مملکت کی بیشتر آبادی ان ہی ائمہ کے فقہ وفتاوے پر عامل تھی۔

بن مہدی کا قول ہے کہ اس وقت حدیث میں چار امام ہیں، امام اوزاعیؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ اور حماد بن زیدؒ[۱]۔ ان ہی کا قول ہے کہ شام میں امام اوزاعیؒ سے زیادہ سنت نبوی کا جاننے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔

امام شافعی کا بیان ہے کہ میں نے حدیث میں ان سے زیادہ سمجھدار اور فقیہ آدمی نہیں دیکھا[۲]۔ سفیان بن عیینہؒ ان کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اپنے زمانہ کے امام ہیں۔ ابو اسحاق فراری کا قول ہے کہ میں نے امام اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ جیسا صاحبِ علم و فضل نہیں دیکھا[۳]۔

ابوزرعہ رازی فرماتے تھے، امام اوزاعی اپنے علم و فضل اور کثرتِ روایت کی بنا پر اہلِ شام کے مرجع بن گئے تھے اور اہلِ شام ان ہی سے فتاوے لیتے تھے۔

اوپر ذکر آچکا ہے انہوں نے تقریباً ستر (۷۰) ہزار مسائل کا جواب حدیث و آثار کی روشنی میں دیا تھا۔ اُمیہ بن زید سے کسی نے پوچھا کہ مکحول[۴] کے مقابلہ میں اوزاعی کا کیا درجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اوزاعی کا رتبہ ہمارے نزدیک مکحول سے زیادہ ہے۔ پوچھا کہ مکحول نے تو صحابہ کرامؓ کو دیکھا تھا۔ فرمایا کہ ہاں روایت صحابہ کا فضل انہیں ضرور حاصل تھا۔ مگر یہ فضل اضافی ہے۔ امام اوزاعی میں جو فضل و کمال ہے وہ ان کا ذاتی ہے[۵]۔ دوسری روایت میں ہے کہ ان میں علم و عبادت اور اظہارِ حق ہر چیز جمع تھی۔

امام مالک فرماتے تھے کہ امام اوزاعی ان ائمہ میں ہیں، جن کی اقتدا کی جاسکتی ہے۔

(البدایہ۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۶)

امام نووی ان کے فضل و کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

وقد اجمع العلماء علیٰ امامة الاوزاعی وجلالته وعلو مرتبة وکمال فضله۔

''امام اوزاعی کی امامت، جلالت شان علو مرتبت اور فضل و کمال پر سب کا اتفاق ہے''۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ سلف کے اقوال مشہور و معروف ہیں[۶]۔

حافظ ابن کثیر نے ان کے علم و فضل کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :

خلفاء، وزراء اور تجار وغیرہ کسی طبقہ میں بھی ان سے زیادہ صاحب علم و فضل اور فصیح و بلیغ، متقی

۱۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۲۳۹ ان کے حالات کتاب میں درج ہیں　۲۔ ایضاً۔ ص ۲۴۲　۳۔ ایضاً
۴۔ مشہور تابعی ہیں　۵۔ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۲۹۹۔ ۳۰۰　۶۔ ایضاً

وپرہیزگار آدمی نہیں دیکھا۔ فقہ وحدیث، سیرت ومغازی اور دوسرے اسلامی علوم میں نہ صرف اپنے اہلِ وطن پر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ پر ان کی سیادت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ زبان وادب کا ذوق بھی ان میں فطری تھا۔

ان کی تحریر وتقریر دونوں نہایت فصیح وبلیغ ہوتی تھیں۔ ان کی زبان سے جوبات بھی نکلتی لوگ حسن بیان اور فصاحت کی وجہ سے اس کو لکھ لیتے تھے اور وہ تحریر بطور نمونہ اپنے پاس رکھتے تھے۔

دربارِ خلافت میں بھی ان کی تحریریں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ خصوصیت سے عباسی خلیفہ منصور کو ان کی تحریر بہت پسند تھی۔ ایک بار اس نے اپنے خاص کاتب سے کہا کہ حکومت کی طرف خطوط وفرامین ملک کے دوسرے حصوں میں بھیجے جاتے تھے۔ ان میں تمہیں امام اوزاعی کی تحریر سے مدد لینی چاہئے تاکہ ان خطوط کی زبان فصیح وبلیغ سمجھی جائے۔ کاتب نے کہا کہ امیر المؤمنین پوری مملکت میں اس وقت ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی تحریر کا چربہ اُتار سکے یا اس کی تقلید کرسکے[۱]۔

ان کے علم وفضل کا تذکرہ ان کی تصنیفات کے ضمن میں بھی آئے گا۔

عقائد میں ان کا مسلک :

اس زمانہ میں جبر وقدر کے مسائل عام طور پر رائج ہوگئے تھے۔ خاص طور پر ایمان کے بسیط ومرکب ہونے کی بحثیں عام طور پر اہلِ علم کا موضوع بحث تھیں۔ امام اوزاعی اس بارے میں عام محدثین اور سلف کا مسلک رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے اسلاف ایمان وعمل میں تفریق نہیں کرتے تھے۔ عمل ایمان سے ہے اور ایمان عمل سے۔ ایمان ایک جامع لفظ ہے تو جو اپنی زبان سے ایمان کا اقرار کرے، قلب میں اس کی معرفت رکھے اور عمل سے اس کا ثبوت دے، اس نے ایک کڑا تھام لیا جو ٹوٹ نہیں سکتا، **فقد استمسک بالعروۃ الوثقی ، لا انفصام لھا۔** اور جو شخص زبان سے تو ایمان کا اظہار کرے، مگر نہ تو اس کا قلب اس کی معرفت کا لذت شناس ہو اور نہ عمل سے اس کا ثبوت دے تو ایسے شخص کا ایمان خدا کے یہاں مقبول نہیں۔ آخرت میں وہ ناکامیاب ہوگا۔

مناظرہ :

امام اوزاعی بحث ومباحثہ اور مناظرہ ومجادلہ سے دور رہتے تھے، مگر جب اس کی ضرورت آجاتی تھی تو اثبات حق کے لئے مناظرہ بھی کرلیا کرتے تھے۔ پہلی صدی کے آخر میں یونانی فلسفہ کے اثر سے

---

[۱] البدایہ۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۷۷

بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ان میں ایک فرقہ قدریہ بھی تھا۔دوسری صدی کی ابتداء میں اس کا بڑا زور تھا۔ان کا خیال تھا کہ تقدیر کوئی چیز نہیں۔خدا پیدا کر دینے کے بعد پھر اس میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔انسان بالکل مختار مطلق ہے۔وہ جو چاہے کرے،اس کے لئے محض اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کافی ہے۔

ہشام بن عبدالملک متوفی ۱۲۵ھ سے لوگوں نے ایک قدری کی شکایت کی۔اس نے اس کو بلوایا اور کہا کیا بات ہے کہ تمہارے بارے میں لوگ چہ می گوئیاں کر رہے ہیں۔بولا کہ اگر لوگ میری شکایت کرتے ہیں تو اس کا فیصلہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب مجھے کوئی قائل کر دے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ غلط ہے۔اگر کوئی مجھے قائل کر دیتا ہے تو آپ کو میری طرف سے پوری اجازت ہے کہ میرا سر قلم کر دیں۔ہشام نے کہا بات معقول ہے۔ہشام نے امام اوزاعیؒ کو بلوا کر عرض کیا کہ آپ ہماری طرف سے اس سے گفتگو کیجئے۔

امام اوزاعیؒ نے قدری سے فرمایا کہ تین یا چار باتیں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں تم ان میں انتخاب کرلو۔اس نے کہا آپ تین سوال کر سکتے ہیں۔ فرمایا،

هل قضى الله على مانهى ؟ کیا خدا نے جس چیز سے روکا ہے،اس کے خلاف بھی فیصلہ کرتا ہے۔بولا کہ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔پھر پوچھا کہ خدا نے جو حکم دیا ہے، اس کے درمیان خود حائل بھی ہو جاتا ہے۔بولا، یہ تو پہلے سوال سے بھی زیادہ سخت ہے۔اس کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں۔پھر سوال کیا کہ جن چیزوں کو اس نے حرام کیا ہے،اس کے استعمال کی بھی اجازت دیتا ہے۔کہا یہ اور بھی مشکل ہے۔امام اوزاعیؒ نے فرمایا،

امیر المؤمنین! میں نے تین باتیں پوچھیں،تینوں کے جواب سے عاجز رہا،خود فیصلہ کرلیں۔ہشام نے اس کو وہی سزا دی جس کا وہ مستحق تھا۔

پھر الگ سے ہشام نے اوزاعی سے پوچھا کہ اگر وہ ایک ہی سوال کی اجازت دیتا تو آپ اس سے کیا پوچھتے؟ فرمایا، میں اس سے پوچھتا کہ تمہاری اور خدا کی مشیت برابر درجہ کی چیز ہے یا کم درجہ کی۔ اس کا وہ جو جواب دیتا،اس کے عقیدہ کے خلاف ہوتا۔پھر انہوں نے اپنے سوال کی تفصیل بتائی۔

خلافت کی اہلیت :

غیر معمولی علم وفضل کے ساتھ حکمرانی وانتظام ملکی صلاحیت بہت کم جمع ہوتی ہے مگر یہ دونوں خوبیاں بیک وقت ان میں موجود تھیں ایک بار امام اوزاعیؒ اور سفیان ثوریؒ امام مالکؒ

کے پاس گئے وہاں سے واپس ہوئے تو امام مالک نے ان کے متعلق فرمایا کہ سفیان علم میں بڑھے ہوئے ہیں اوراوزاعی علم کے ساتھ انتظام ملکی کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔امام ذہبی نے لکھا ہے:

وکان یصلح للخلافۃ

''وہ خلیفہ بنائے جانے کے لائق تھے''۔

امام مالک فرماتے تھے انہ یصلح للامامۃ یہ امامت کے لائق تھے ابواسحٰق فزاری فرماتے تھے کہ اس زمانہ میں اگر خلفاء کے انتخاب کا اختیارامت کو دے دیا جائے تو میں امام اوزاعی کو منتخب کروں گا۔ (محاسن المساعی ص ۱۱)

امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ

امام اوزاعیؒ عالم تھے مگر وہ عام علماء کی طرح نہیں تھے بلکہ ان کے علم وعمل میں مطابقت تھی۔ انہوں نے حفظ وروایت اور فکرونظر ہی تک اپنی توجہ مبذول نہیں رکھی بلکہ امت کے ہر کام سے دلچسپی لی، انہوں نے عبادت وریاضت کر کے محض اپنی ذات ہی کی نجات کی راہ نہیں ڈھونڈی بلکہ عدل وانصاف کے پھیلانے اور مخلوق خدا کی بھلائی اور راحت رسانی کی فکر بھی کی۔امام کثرتِ عبادت اور ورع وزہد کے ساتھ اس حدیث پر بھی عامل تھے۔

عدلِ ساعۃ خیر من عبادۃ الف شہر[1]

''ایک گھڑی کا عدل وانصاف ہزار مہینہ کی عبادت سے بہتر ہے''۔

سیرت وکردار :

سیرت وکردار میں صحابہ وتابعین کا نمونہ تھے۔زہدوقناعت سخاوت وفیاضی،حق گوئی و بے باک، وعظ وپند اور امت کی خیر خواہی یہ سب ان کے نمایاں اوصاف تھے۔

بچپن سے انہوں نے فقر وفاقہ کی زندگی بسر کی تھی۔مگر زہدوقناعت کا حال یہ تھا کہ خود کبھی دربارِ خلافت کا رُخ نہیں کیا۔

خلفائے بنوامیہ کے یہاں بھی معزز محترم تھے اور خلفائے عباسیہ میں بھی ان کا وقار اور اعزاز تھا۔مگر کبھی کسی سے کوئی مدد نہیں لی۔خلفائے بنوامیہ نے ان کو متعدد بار جاگیریں دیں تھیں، نیز دربارِ خلافت کی طرف سے مختلف اوقات میں تقریباً ستر ہزار دینار کے عطیے ان کی خدمت میں پیش

---

[1] محاسن المساعی۔ص ۹

کیے گئے مگر انہوں نے نہ تو کبھی ان جاگیروں کے کسی چپہ سے فائدہ اٹھایا اور نہ نقد رقم کا ایک حبہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کیا بلکہ یہ ساری جائداد اور پوری رقم فقرا اور مساکین اور جہاد فی سبیل اللہ میں لگادی اور خود ہمیشہ فقر وفاقہ کی زندگی بسر کی جب انتقال ہوا تو سارا اثاث بیت سات دینار سے زیادہ کا نہ تھا۔

جرات وحق گوئی :

جرأت وحق گوئی ان کی سیرت کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ اس سلسلہ میں امیر شکیب ارسلان نے جو کچھ لکھا ہے اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں :

''امام اوزاعی نے خلفاء وامراء کے سامنے جس جرات وحق گوئی کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال تاریخ اسلام میں بہت کم ملے گی۔ لبنان کے عیسائیوں کے بارے میں وہاں کے امیر صالح بن علی کو انہوں نے جو خط لکھا اس کو غور سے پڑھیے، بنوامیہ کے بارے میں عبداللہ بن علی سے انہوں نے جو گفتگو کی اس کو سامنے رکھیے، منصور کو انہوں نے جو ناصحانہ خطوط لکھے ان پر ایک نظر ڈال لیجئے ان سب میں آپ کو ان کا یہ وصف نمایاں نظر آئے گا''۔

ولعمری لو کان العلماء الذین من نحط الا و زاعی عدد کبیرا فی الا سلام لما قد کان اسر ع الفساد الی المجمع الا سلا می و لا کانت انحطت ودل الا سلا م بعد ذلک العلو فی الا رض وانما کانت آفة هٰذه الامة فساد ا امرائها وحین علما ئها . (ص ۱۵)

''خدا کی قسم اگر علمائے امت میں امام اوزاعی کی روش اختیار کرنے والوں کی ایک معتد بہ تعداد موجود رہا کرتی تو اسلامی معاشرہ میں نہ تو اتنی جلدی فساد پیدا ہو جاتا اور نہ اسلامی حکومت غیر معمولی عروج کے بعد اتنی جلد زوال پذیر ہوتی۔ اس امت کی ساری مصیبت امرا کا بگاڑ اور علماء کی بزدلی ہے''۔

امام اوزاعیؒ نے جن جن مواقع پر امرا اور خلفاء کے سامنے جرات وحق گوئی کا ثبوت دیا ہے اسکی تفصیل ملاحظہ ہو۔

بنواُمیہ کی حکومت سے امام اوزاعی کا کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ مگر جس ظلم وتشدد کے ساتھ وہ شام سے جلا وطن کیے گئے تھے غالباً وہ امام کو پسند نہیں تھا، ممکن ہے کہ انہوں نے اس بارے میں کچھ اظہارِ خیال بھی کیا ہو۔ عبداللہ بن علی۔ جس نے شام سے بنوامیہ کا خاتمہ کیا تھا جب اس کو بنواُمیہ کی

طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے ان تمام لوگوں کا صفایا کرنا شروع کیا جن کو اُموی خلافت سے کسی درجہ میں بھی ہمدردی تھی، اس سلسلہ میں امام اوزاعی کی بھی تلاش ہوئی یہ کئی دن چھپے رہے مگر پھر جرأت کر کے خود دربار میں حاضر ہو گئے۔ فرماتے ہیں کہ جس وقت میں دربار میں داخل ہوا تو دیکھا کہ عبداللہ ایک تخت پر متمکن ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ ہے اس کے اردگرد بہت سے جلاد نما سپاہی ننگی تلوا ریں لئے کھڑے ہیں۔ میں نے پہنچ کر سلام کیا اس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے اپنے نزہ کو زمین پر ٹیکتے ہوئے کہا :

اوزاعی! ہم نے ان ظالموں (بنواُمیہ) سے ملک اور اس کے باشندوں کا نجات دلانے میں جو جنگ کی ہے یہ جہاد ہے کہ نہیں؟ امام اوزاعیؒ کے لئے یہ بڑا سخت وقت تھا۔ مگر انہوں نے نہایت ہی حکیمانہ جواب دیا، فرمایا کہ میں نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے یہ حدیثِ نبوی سنی ہے کہ

"تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، ہر شخص اپنے اعمال میں جیسی نیک و بدنیت کرے گا ویسا ہی اسے اجر ملے گا"۔

مقصد یہ تھا کہ اگر تمہاری نیت صرف ملک گیری کی تھی تو تم کو اس کا اجر ملے گا اور اگر اعلائے کلمۃ اللہ مقصود تھا تو پھر جہاد کا ثواب ملے گا۔

یہ غیر متوقع جواب سن کر ابن علی غصہ سے بیتاب ہو گیا اور اسی غصہ میں اپنے نیزہ کو زمین پر ایک بار پھر تیزی سے ٹیکا اور معاً دوسرا سوال یہ کیا کہ

یااوزاعی ما تقول فی دماء بنی امیہ

"اے اوزاعی! بنی اُمیہ کے خون کے بارے میں کیا خیال ہے"؟ (یعنی ان کا قتل کرنا جائز ہے یا حرام)

آپ نے اپنی طرف سے کوئی جواب دینے کے بجائے نہایت ہی متانت کے ساتھ ایک حدیث پھر سنائی، وہ حدیث یہ ہے :

"آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا! ہے کہ مسلمان کا خون کرنا تین حالتوں میں جائز ہو سکتا ہے، قصاص میں یا شادی کے بعد زنا میں یا پھر ارتداد کے بعد"۔

یہ جواب بھی اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا۔ اسی لئے اس نے اس دفعہ اور زیادہ غصہ کا اظہار کیا پھر پوچھا کہ اچھا،

"بنواُمیہ کے مال کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

آپ نے فرمایا! ان کے پاس جو دولت تھی اگر وہ حرام ذریعہ سے ان کے ہاتھ میں آئی تھی تو بہرحال وہ تمہارے ہاتھ میں پہنچ کر حلال تو نہیں ہو سکتی۔ اور اگر حلال تھی تو تم اس کو اسی طریقہ سے لے سکتے ہو جس طرح شریعت نے اجازت دی ہے''۔

یہ جواب سن کر وہ بالکل آگ بگولہ ہو گیا، امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ میں اس جواب کے بعد متوقع تھا کہ ابھی وہ میرے قتل کا حکم دے دیگا۔ مگر اب اس نے ترہیب کے بجائے ترغیب سے کام لینا شروع کیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیوں اگر آپ کو عہدۂ قضا سونپ دیا جائے تو کیا ہرج ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے اسلاف نے اس ذمہ داری سے مجھے سبکدوش رکھا تو میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اسی روش پر قائم رہیں۔

اس سوال و جواب کے بعد اس نے ان کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ امام اوزاعی دربار سے رخصت ہو کر ابھی کچھ دور ہی گئے تھے کہ عبداللہ کا ایک قاصد لپکا ہوا ان کے پاس پہنچا، امام اوزاعی نے دیکھا تو سمجھے کہ وہ غالباً میرے قتل کا پروانہ لا رہا ہے چاہا کہ فوراً سواری سے اتر کر دو رکعت نماز ادا کر لیں[1]۔

چنانچہ انہوں نے نماز کی نیت باندھ لی۔ قاصد انتظار کرتا رہا جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے دو سو دینار کی ایک تھیلی پیش کی اور کہا کہ یہ امیر نے آپ کے لئے بھیجا ہے امام اوزاعی کا بیان ہے کہ میں نے خوف کی بناء پر یہ رقم لے لیکن مگر گھر پہنچنے سے پہلے پوری رقم صدقہ کر دی[2]۔

منصور کا ناصحانہ خطوط :

خلفائے عباسیہ میں منصور حد درجہ خودرائے، جابر اور متشدد واقع ہوا تھا۔ اسی نے عہدۂ قضا نہ قبول کرنے پر امام ابوحنیفہ ؒ کو کوڑے لگوائے اور قید کر دیا تھا۔ اسی نے طلاق مکرہ میں اس کی مرضی کے خلاف فتویٰ دینے پر امام مالک ؒ کو سر بازار رسوا کیا اور ان کا ایک ہاتھ بازو سمیت اکھڑوا دیا تھا۔ اسی نے سفیان ثوریؒ جیسے برگزیدہ بزرگ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ یہ سب واقعات امام اوزاعی کے سامنے تھے، مگر اس کے باوجود وہ حق گوئی و بیباکی سے باز نہیں رہتے تھے۔

منصور اپنی خودرائی اور جبر و استداد کے باوجود غالباً اپنی سیہ کاری کو چھپانے کے لئے اس بات کا خواہش مند رہتا تھا کہ امام اوزاعی اس کے دربار میں آ کر نیک مشورے دیں۔

---

[1] قتل سے پہلے دو رکعت نماز ایک صحابی حضرت خباب بن ارت ؓ کی سنت ہے۔

[2] البدایہ والنہایہ۔ ص ۱۱۸ تذکرہ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۶۲۔ ۱۶۳

مگر امام اوزاعی بغیر طلب کے نہ کبھی دربار میں آئے اور نہ بغیر کسی شدید ملّی ضرورت کے کوئی تحریر لکھی۔

پہلی بار منصور جب شام آیا اور امام اوزاعی سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے اس کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ جب واپس ہونے لگے تو انہوں نے منصور سے کہا کہ مجھے سیاہ لباس[1] پہننے سے معاف رکھا جائے۔ اس نے اجازت دے دی۔ جب وہ دربار سے رخصت ہوگئے تو اپنے ندیم خاص ربیع کو ان کے پاس بھیجا اور کہا کہ میرا نام ظاہر نہ کرنا بلکہ اپنی طرف سے دریافت کرنا کہ سیاہ لباس وہ کیوں ناپسند کرتے ہیں۔ ربیع کے دریافت کرنے پر فرمایا سیاہ لباس نہ تو احرام میں استعمال کیا جاتا ہے، نہ تجہیز و تکفین میں اور نہ شادی کے موقع پر، تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے [2]۔

ایک بار منصور نے ان کو ایک خط لکھا اور یہ آرزو کی کہ کوئی خیر خواہانہ مشورہ دیجئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے نہایت مختصر اور بلیغ خط لکھا۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

اما بعد! فعلیک یا امیر المؤمنین بتقوی اللہ عزوجل وتواضع یرفعک اللہ تعالیٰ یوم یضع المتکبرین فی الارض بغیر الحق واعلم ان قرابتک من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولن تزید حق اللہ الا وجوبا [3]۔

''امیر المؤمنین آپ اپنے اُوپر خدا کا تقویٰ لازم کرلیجئے اور تواضع اختیار کیجئے۔ خدا تعالیٰ آپ کو اس دن بلند کرے گا جس دن ان متکبرین کو جو ناحق زمین پر بڑے بنتے ہیں۔ ذلیل کرائے گا اور اچھی طرح غور کرلیجئے کہ آنحضرت ﷺ سے آپ کی قرابت خدا کے یہاں حق سے زیادہ آپ کو کچھ نہ دلائے گی''۔

اس خط میں امام اوزاعی نے منصور کی تین کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے، جنہوں نے اس کو حد درجہ مستبد بنا دیا تھا، یعنی خوفِ خدا کی کمی، حکومت کا غرور اور نسلی شرف۔

اگر کوئی اہم دینی یا ملّی ضرورت پیش آجاتی تو بغیر طلب بھی اس کو خط لکھ کر اس کی طرف متوجہ کرتے تھے۔

ابراہیم بن علی اور محمد بن حسن نے منصور کے خلاف جب علم بغاوت اُٹھایا تو منصور نے سرحدی مسلمانوں سے بھی مدد مانگی۔ انہوں نے مدد نہیں دی۔ چونکہ وہ رومی حکومت کے بالکل زد میں

---

[1] سیاہ لباس عباسی حکومت کا سرکاری لباس تھا۔ اس وقت دربار میں اس لباس میں نہ پہنچنے کے معنی بغاوت کے تھے۔
[2] حسن المساعی مرتبہ امیر شکیب ارسلان۔ ص ۱۱۹ [3] ایضاً ص ۱۲۰

تھے، (غالباً حکومت نے منصور کی خفگی سے فائدہ اٹھا کر) انہوں نے بہت سے سرحدی مسلمانوں کو قید کرلیا۔ اور منصور کے پاس لکھا کہ اگر آپ چاہیں تو فدیہ دے کر مسلمان قیدیوں کو چھڑا سکتے ہیں۔ منصور چونکہ ان سے ناخوش تھا، اس لئے اس نے انکار کردیا۔

امام اوزاعی کو جب اس کی اطلاع ہوئی کہ ہزاروں مسلمان رومیوں کے ہاتھ قید و بند کی مصیبت جھیل رہے ہیں اور منصور رہا کرانے کی کوئی فکر نہیں ہے تو انہوں نے ایک لمبا سخت خط لکھا، جس میں منصور کی ذمہ داریوں کا ذکر کر کے مسلمان قیدیوں کی رہائی کی طرف توجہ دلائی۔ اس خط کو مع ترجمہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں :

اما بعد ! فان الله تعالیٰ استرعاک الله هذه الامة لتکون فیها بالقسط قائما وبنبیه صلی الله علیه وسلم وفی خفض الجناح والرافة متشابها واسال الله تعالیٰ ان یکن علی امیر المؤمنین وهمنا هذه الامة ویرزقه رحمتها فإن سائخة المشرکین التی غلبت عام اول وموطهنم حریم المسلمین واستنزا لهم العوائق والذراری من المعاقل والحصون کان ذٰلک بذنوب العباد وما عقا الله اکثر فبذنوب العباد استنزلت العوائق والذراری من الماقل والمحصون ، لا یلقون لهم ناصرا ولا عنهم مدافعًا کاشفات رؤسهن وا قدا مهن فکان ذٰلک بمرایٔ ومسمع وحدیث ینظر الله الیٰ خلقه اعراضه واعراضهم فلیتق الله یا امیر المؤمنین ولیتبع بالقاداة بهم من الله سبیلا ولیخرج من حجة الله فان الله تعالیٰ قال لنبیة وما لکم لا تقاتلون فی سبیل الله والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان وقد بلغنی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وانه قال انی اسمع بکأ الصبی فی الصلاة فاتجوز فیها مخافة ان تفتنّ فکیف تبخلتیهم یا امیر المؤمنین ! فی ایدی العدد یمتهونهم ویتکشفون منهم ما لا بستحله الا بنکاح وانت راعی الله والله تعالیٰ فوتک وسوف منک " یوم نضع الموازین القسط لیوم القیامة فلا تظلم نفس شینا وان کان مثقال حبّة من حزدلٍ اتینا بها وکفیٰ بنا حاسبین " ۔

امابعد! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس اُمت کا ذمہ دار اور نگہبان اس لئے بنایا ہے کہ آپ اس میں انصاف قائم کریں اور مسلمانوں کے ساتھ محبت اور شفقت میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت سے مشابہت پیدا کریں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمانوں پر اس وقت جو مصیبت آئی ہے، اس میں وہ آپ کو اطمینان نصیب کرے اور ان پر رحم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس سال کی ابتداء میں (رومی) مشرکین کو جو غلبہ ہوا ہے، اس میں انہوں نے مسلمانوں کے گھروں کو روند ڈالا ہے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو ان کے گھروں اور قلعوں سے نکال کر ذلیل کیا ہے۔ یہ سب بندوں کے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ خدا نے ان کے گناہوں کو بہت کچھ معاف کر دیا ہے، ورنہ اور بڑی مصیبت آتی تو بندوں کے گناہوں کا ہی نتیجہ ہے کہ عورتیں اور بچے اپنے گھروں اور پناہ گاہوں سے اس طرح نکالے گئے) کہ نہ ان کا کوئی مددگار ہے اور نہ ان کی طرف سے کوئی مدافعت کرنے والا ہے۔ عورتوں کی بے بسی کا حال یہ ہے کہ ان کے سر اور پیر ننگے ہیں اور یہ سب ہمارے دیکھتے اور سنتے ہو رہا ہے اور جس وقت خدا تعالیٰ اپنی اور ان کی عزت کی تخلیق پر نگاہ ڈالے گا، تو امیر المؤمنین اس بارے میں آپ کو خدا سے ڈرنا چاہئے اور ان کا فدیہ دے کر خدا کے غضب سے بچنے کا کوئی راستہ ڈھونڈنا چاہئے اور اس کی حجت سے کوئی مفر تلاش کرنا چاہئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں لڑتے نہیں اور کمزور مرد، عورتیں بچے اس بستی سے نکلنے کی دعا کرتے ہیں۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی پہنچا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "اگر نماز میں بچے کی رونے کی آواز سنتا ہوں اس کو مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان نہ ہو"۔ ان احکام کی موجودگی میں امیر المؤمنین مسلمانوں کو ان کے دشمنوں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ ان کو تکلیف دیں اور ان کی بے حرمتی کریں۔ آپ خدا کے راعی ہیں، وہ آپ سے اس دن اس ذمہ داری کا پورا پورا حق چاہے گا۔ اُس نے کہا کہ جس دن ہم انصاف کی ترازو لگائیں گے اس دن کسی پر ظلم نہ ہوگا، اگر کوئی رائی کے برابر بھی بُرائی کرے گا تو ہم اس کو سامنے لائیں گے اور ہمارا حساب کافی ہے"۔

اہلِ تذکرہ بیان کرتے ہیں کہ اس خط کا یہ اثر ہوا کہ اس نے فوراً فدیہ دے کر مسلمانوں کو رہا کر لینے کا حکم دیا۔

فلما وصل کتابه امر بالفداء.

''جس وقت یہ خط پہنچا، اسی وقت اس نے فدیہ دے کر مسلمانوں کو چھڑا لینے کا حکم دیا''۔

اس خط کی اہمیت کا پورا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب منصور کی مستبدانہ روش کو بھی نگاہ میں رکھا جائے۔

غیر مسلم رعایا کی ساتھ عدل کی تاکید :

ان کا یہ طرز عمل صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ نہیں تھا بلکہ غیر مسلموں پر بھی وہ اسی طرح شفیق ورحیم رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں امیر شکیب ارسلان کا بیان ملاحظہ ہو :

امام اوزاعی '' ضروری سمجھتے تھے کہ اسلام نے انسان کو جو بنیادی حقوق دیئے ہیں وہ ان کو دین مذہب کی تفریق کے بغیر دیئے جائیں۔

چنانچہ امیر صالح بن علی نے جب جبل لبنان کے نصاری پر ظلم کیا تو انہوں نے سخت نکیر کی اور اس کو خط لکھا۔ وہ اس آیت قرآنی پر عامل تھے، لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اسی طرح جب اہل قبرص کا معاملہ پیش ہوا تو اس میں بھی مداخلت کی۔ غرض یہ کہ ان کی روش سے صاف طور پر معلوم ہوتا تھا کہ اسلام عدل وانصاف اور انسانی حقوق کی حفاظت کرنے والا دین ہے اور ظلم وتعدی سے اس کو نفرت ہے۔ (ص ۱۴)

ایک بار منصور نے ان کو بلا بھیجا۔ دور سے آنا تھا، اس لئے دیر ہو گئی۔ دربار میں پہنچے تو منصور نے کہا، میں دیر سے منتظر تھا۔ آپ نے اس کا تو جواب نہیں دیا، لیکن یہ پوچھا کہ آپ نے کس لئے یاد کیا ہے۔ بولا کچھ اخذ و استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ ارشاد ہوا، میں تیار ہوں، مگر اس شرط کے ساتھ کہ میں جو کچھ کہوں اسے آپ بھول نہ جائیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کے ارشادات کو بھلا دوں۔ جب کہ میں نے خود ہی اس کے لئے آپ کو تکلیف دی ہے۔ فرمایا، ہاں، اس کو آپ سن تو لیں گے مگر اس پر عمل نہ کریں گے۔ ان کا یہ انداز گفتگو منصور کے حاجب ربیع کو برا معلوم ہوا اور ان کو تنبیہ کرنی چاہی، مگر منصور نے اس گستاخی سے یہ کہہ کر اسے روک دیا کہ تم کو معلوم نہیں ہے کہ درس وافادہ کی مجلس ہے، شاہی دربار نہیں۔

جب امام اوزاعی '' کو پورا اندازہ ہو گیا کہ منصور میں اس وقت جذبہ نصیحت پذیری موجود ہے اور ان کی باتوں کو بڑی توجہ سے سن رہا ہے، تو اس کے سامنے چند احادیث نبوی بیان کیں۔

پہلی حدیث مکحول کے واسطہ سے یہ بیان کی کہ '' آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب کسی

بندے کو خدا کے دین کی کوئی بات معلوم ہوتی اور وہ اس کو قبول کر کے اس کی قدر کرتا ہے تو اس لئے وہ خدا کی ایک نعمت ہوتی ہے جو خاص طور پر اس کے لئے بھیجی گئی ہے۔ اور اگر وہ اُٹھ کر اس کی ناقدری کرتا ہے، تو اس کے اُوپر وہ ایک حجت ہوتی ہے اور اس ناقدری کی وجہ سے وہ اپنے گناہوں میں بھی اضافہ کر لیتا ہے اور خدا کا غضب بھی بڑھ جاتا ہے''۔

اس حدیث کے سُنانے کا مقصد یہ تھا کہ جو باتیں میں کہوں اس کی قدردانی تمہارے لئے مفید ہوگی اور ناقدری کرو گے تو دنیا و آخرت دونو جگہ تم نقصان اُٹھاؤ گے۔

پھر دوسری حدیث یہ سُنائی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو حاکم رعیت پر ظلم و زیادتی کر کے چین کی نیند سوتا ہے، خدا اس کے اُوپر جنت حرام کر دے گا''۔

یہ حدیث سُنانے کر بعد ایک لمبی تقریر کی۔ جس کا ایک ایک جملہ حرز جاں بنانے کے قابل ہے۔ عام فائدہ کے لئے ہم یہاں چند جملے نقل کرتے ہیں :

''امیر المؤمنین! جس نے حق بات کو ناپسند کیا، اس نے خدا کو ناپسند کیا۔ اس لئے کہ اللہ سراسر حق ہی ہے، ھو الحق المبین۔ امیر المؤمنین جس چیز نے لوگوں کے دلوں کو آپ کی طرف مائل کیا اور انہوں نے آپ کو اپنا حاکم بنایا وہ رسول ﷺ کی قرابت نسبتی تھی اور رسول اللہ ﷺ اُمت کے لئے نہایت ہی مہربان، رحیم، ہمدرد اور غم خوار تھے۔ آپ کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ لوگوں پر حق (خدا کا حق ہو یا بندوں کا) نافذ کریں۔ ان کے درمیان انصاف کریں۔ ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کریں، (اس بات پر اس ماحول کو سامنے رکھ کر غور کرنا چاہئے، جس میں ادنیٰ سے غلطی پر گردن زدنی کا حکم ہو جایا کرتا تھا)۔ ان کے اُوپر اپنا دروازہ کھلا رکھیں۔ یہ نہ ہو کہ آپ کے دروازہ پر پہرہ دار بیٹھے رہیں اور لوگ آپ تک نہ پہنچ سکیں۔ آپ کو عوام کی خوشحالی سے مسرت ہو، اور ان کی بدحالی سے رنج۔ آپ کے زیر حکومت عرب وعجم، مسلم و کافر بھی ہیں۔ ان میں ہر ایک کا یہ حق ہے کہ آپ ان کے ساتھ انصاف کریں۔ پھر سوچئے کہ یہاں گروہ در گروہ ایسے لوگ ہیں، جنہیں آپ سے کوئی نہ کوئی شکایت ہے اور ان پر کوئی نہ کوئی ظلم آپ کی طرف سے ہوا ہے۔

امیر المؤمنین! مکحول سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ہاتھ ایک چھڑی رہا کرتی تھی، جس پر آپ ٹیک لگا کر چلا کرتے تھے اور ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے منافقین پر ایک رعب بھی طاری رہتا تھا۔

چنانچہ ایک دن حضرت جبرئیلؑ آئے اور کہا کہ ''اے محمد! کیا یہی چھڑی ہے جس سے

آپ اپنی اُمت کا سر کچلتے اور خوف زدہ کرتے ہیں؟ آپ سوچئے کہ اس شخص کا خدا کے یہاں کیا حال ہوگا، جس نے لوگوں کے چہرے خون آلود کئے، ان کا خون بہایا، ان کی بستیاں اُجاڑیں، ان کو جلاوطن کیا اور ان پر رعب جمایا۔

امیر المومنین! اپنے نفس کو اپنے فائدہ ہی کے لئے راضی کر لیجئے اور اس کے لئے اپنے رب سے امان حاصل کیجئے۔

امیر المومنین! اگر حکومت و سلطنت آپ سے پہلے گزرنے والوں کے ساتھ رہنے والی ہوتی تو وہ آپ تک نہ پہنچتی اور یہ آپ کے پاس بھی باقی نہیں رہے گی۔ جس طرح دوسروں کے پاس باقی نہ رہی۔ آپ نے اس آیت لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً ۔ کی تفسیر اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ صغیرہ سے مراد تبسم اور کبیرہ سے مراد ضحک یعنی کھل کر ہنسنا ہے تو پھر کیا وہ مظالم خدا کے یہاں لکھے ہوئے نہ ہوں گے اور ان کا بدلہ نہ ملے گا، جو آپ کے ہاتھوں اور زبان کے ذریعہ ہوئے ہیں''۔

امیر المومنین! حضرت عمر فاروقؓ کو کتنا احساسِ ذمہ داری تھا۔ اس بارے میں یہ روایت مجھے ملی ہے۔ فرمایا:

لو ماتت سخلة على شاطئ الفرات لخشيت ان اسئال عنها .

''اگر ایک بکری کا بچہ بغیر میری دیکھ بھال کے فرات کے کنارے مرجائے، تو مجھے ڈر ہے کہ مجھ سے اس کی بازپرس ہوگی''۔

تو پھر اس کے بارے میں آپ سے کتنی زبردست بازپرس ہوگی جو آپ کے سامنے آپ کے عدل سے محروم رہا۔

امیر المومنین! اس آیت يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ کی تفسیر آپ کے دادا (آنحضرت ﷺ) نے کیا فرمائی۔ یہ فرمائی کہ خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ اے داؤد! تمہارے سامنے دو آدمی فیصلہ کرانے کے لئے آئیں اور ایک کی طرف تمہارا میلان ہو اور اس سے تمہیں محبت ہو تو تمہارے دل میں یہ خیال نہ ہو کہ کاش اسی کے موافق فیصلہ ہو اور وہ اپنے فریق کے مقابلہ میں کامیاب ہو۔ اگر ایسا کروگے تو میں نبوت کی ذمہ داری تم سے واپس لے لوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد نہ تمہاری خلیفۃ الارض کی حیثیت باقی رہے گی اور نہ کوئی دوسرا شرف (کیونکہ یہ سب نبوت کے طفیل میں ہے)۔

اے داؤد! میں نے جن لوگوں کو بندوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے، ان کا اسی طرح گلہ بان ہونا چاہئے، جس طرح اُونٹ کا گلہ بان ان کی گلہ بانی کرتے ہیں۔ ان کے علم کا تعلق، دیکھ بھال اور نگرانی سے ہے اور ان کی نرمی کا تعلق حکمرانی سے ہے۔ تا کہ شکستہ دلوں کے زخم پر پھایا رکھیں اور مجبوروں اور ناتوانوں کی ضروریات پوری کریں۔

امیر المؤمنین! آپ پر ایک ایسی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اگر وہ آسمان وزمین اور پہاڑوں پر ڈالی جاتی تو وہ اس کے اُٹھانے سے انکار کردیتے۔ مجھ سے یزید بن فقیہ شام نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک شخص کو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر کیا۔ کچھ دنوں بعد دیکھا کہ وہ گھر پر موجود ہے۔ آپ نے پوچھا کہ کیا چیز مانع ہوئی کہ تم وصولی پر گئے نہیں۔ تم کو معلوم نہیں کہ تم کو اس کام کا اجر جہاد کے برابر ملے گا۔ اس نے کہا، ایسا نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا، کیوں۔ اس نے کہا کہ مجھے حدیث نبوی ﷺ پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ہر والی اور حاکم کو بلایا جائے گا اور اس کو آگ کے پل پر کھڑا کردیا جائے گا۔ جس کی وجہ سے اس کے جسم کے اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے۔ اس کے بعد پھر وہ واپس لایا جائے گا اور اس سے حساب کتاب ہوگا۔ اگر اس نے اپنی ذمہ داری بخوبی انجام دی ہے تو بچ جائے گا۔ ورنہ پھر وہ پل اس کو جہنم میں پہنچادے گا۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اس سے پوچھا کہ یہ روایت کس نے بیان کی ہے، اس نے کہا، ابوذر اور سلیمان نے۔ آپ نے ان دونوں صاحبوں سے اس روایت کے بارے میں دریافت کرایا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے یہ روایت آنحضرت ﷺ سے سُنی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ روایت سن کر ایک سرد آہ کھینچی اور فرمایا! کہ افسوس عمر کو بھی اس سے گزرنا ہوگا۔

اما اوزاعیؒ کی اس تقریر کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ منہ پر رومال ڈال کر زور زور سے رونے لگا۔

امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار نے مجھے بھی رُلایا۔ جب اس کے آنسو تھمے تو امام اوزاعی نے پھر اپنی تقریر شروع کی۔ فرمایا، کہ

امیر المؤمنین! آپ کے دادا حضرت عباسؓ نے آنحضرت سے مکہ اور طائف کی امارت کی خواہش کی تو آپ نے فرمایا، کہ ''اے میرے چچا! امارت جس کا حق ادا نہ کیا جائے اس سے الگ تھلگ رہنا زیادہ بہتر ہے''۔ آنحضرت ﷺ کو ان سے جو محبت اور تعلق تھا اسی کی بنا پر انہوں نے ان کو امارت سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ اس لئے کہ خدا کے یہاں اس کے وبال سے ان کو بچا نہیں سکتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی وَ اَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْاَقْرَبِينَ۔ تو آپ

نے اپنے چچا حضرت عباسؓ، اپنی پھوپھی، اپنی صاحبزادی حضرت صفیہؓ اور حضرت فاطمہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا،

انی لست اغنی عنکم من اللہ شیئا الالی عملی ولکم عملکم[1]۔

''میں خدا کے یہاں تم کو بچانہ سکوں گا۔ہوشیار! کہ میرے لئے میرا عمل اور تمہارے لئے تمہارا عمل''۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے معاملات کی ذمہ داری وہی شخص اٹھا سکتا ہے، جو اچھی رائے اور پختہ عقل رکھتا ہو۔لوگوں کی دیکھ بھال کرتا ہو۔اس سے برائی نہ پیدا ہوتی ہو،وہ بے دینی پر لپکتا نہ ہو،اور خدا کے معاملہ میں لومة لائم سے ڈرتا نہ ہو۔پھر آپ نے فرمایا،حاکم کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ایک تو وہ مضبوط قوی ارادہ حاکم جو اپنے کو بھی قابو میں رکھے اور اپنے کارندوں کو تو یہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔جس پر خدا کی رحمت سایہ فگن رہتی ہے،دوسرے وہ کمزور حاکم جو اپنے کو تو قابو رکھتا ہو مگر اس کے عمال اور کارندے اس کی کمزوری کی وجہ سے نفس پروری میں منہمک ہو جائیں،تو یہ ہلاکت وتباہی کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔بس اللہ ہی اس کو بچا سکتا ہے ،

تیسرے وہ حاکم جو عمال پر تو کڑی نگاہ رکھتا ہے،مگر خود نفس کا بندہ ہے،تو یہ اس ظالم چرواہے کی طرح ہے،جس کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے، شرّ الرّعاء الحطمه بدترین چرواہا وہ ہے جو جانوروں پر ظلم کرتا ہو۔

مجھے حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی معلوم ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ اگر دو فریق میرے پاس آئیں اور میں ان میں سے اس شخص کی طرف مائل ہو جاؤں جو حق سے دور ہو،خواہ میرا رشتہ دار ہو یا اجنبی تو مجھے ایک لمحہ کی بھی مہلت نہ دے''۔

امیر المومنین! سب سے سخت چیز قیام حق اور خدا کے یہاں سب سے معزز چیز تقویٰ ہے، جو شخص اللہ کی اطاعت کے ذریعہ عزت چاہتا ہے۔اللہ اس کو بلندی وعزت دیتا ہے اور جو شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور عزت کا خواہاں ہوتا ہے،خدا اسے پست اور ذلیل کر دیتا ہے۔

(والسلام علیک)

امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ یہ تقریر کرنے کے بعد میں مجلس سے اٹھ گیا۔منصور نے پوچھا کہ یہاں سے کہاں جانے کا قصد ہے۔بولے وطن! اگر آپ اجازت دیں۔منصور نے کہا،آپ کو اجازت ہے۔میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے ایسی قیمتی نصیحتیں کیں۔میں ان کو انتہائی خوشی سے قبول کرتا ہوں۔خدا مجھے ان پر عمل کرنے کی توفیق دے اور میری مدد کرے، وھو حسبی ونعم الوکیل ۔میں

---

[1] بخاری شریف میں یہ روایت ذرہ اور تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔

امید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح اپنی زیارت سے سرفراز کرتے رہیں گے۔ امام اوزاعیؒ یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ انشاء اللہ ایسا ہی کروں گا۔ منصور نے حکم دیا کہ آپ کو سفر خرچ دے دیا جائے۔ چنانچہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا، مگر آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور فرمایا،

ما کنت لابیع نصیحتی بعرض عن الدنیا ولا بکلها .

''میں اپنی نصیحت کو دنیا کی ایک حقیر متاع کیا، پوری دنیا کے بدلے بھی نہیں بیچ سکتا''۔

راوی کا بیان ہے کہ منصور کو چونکہ ان کے طرز عمل سے واقفیت تھی اس لئے ان کے رد کر دینے سے کبیدہ خاطر نہیں ہوا۔

اس نصیحت نامہ کے ایک ایک لفظ سے امام کے خلوص، للہیت اور حق لوگوں کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کی للّٰہیت اور خلوص کا نتیجہ تھا کہ منصور جس کے استبداد و جبر کا ایک زمانہ شکار ہو چکا تھا، وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس میں منصور کی کوئی ایسی کمزوری نہیں ہے جس کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ مگر جو کسی شخص کی معمولی بات سننا گوارا نہ کرتا ہو، وہ اپنی کمزوریاں اس شخص کی زبان سے سنتا اور ان کے دُور کرنے کا وعدہ کرتا ہے، جس کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ عباسیوں کی حکومت کو پسند نہیں کرتا۔

انہوں نے حکومت کے بعض ایسے معاملات میں دخل اندازی کی ہے، جس کی توقع اس زمانہ میں نہیں کی جا سکتی تھی۔ اُوپر مسلمانوں کے فدیہ دے کر رہا کرانے اور لبنان کے عیسائیوں پر ظلم سے باز رکھنے کا ذکر آچکا ہے۔ وہ غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ واپس لانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ہوش و حواس کی حالت میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو دیکھا ہے [1]۔

عبادت وتقویٰ :

عبادت وتقویٰ میں بھی وہ ممتاز تھے۔ نماز نہایت ہی خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے۔ خصوصیت سے رات کا بیشتر حصہ ذکر و نوافل میں گزرتا تھا۔ فرماتے تھے کہ جو لوگ رات کی نمازوں میں جتنا طویل قیام کریں گے، اللہ تعالیٰ اسی نسبت سے قیامت کے قیام کو ہلکا کر دے گا۔ اپنے اس قول کے ثبوت میں وہ قرآن کی اس آیت کو پیش کرتے تھے :

وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَ سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا . (دھر : ۲)

---

[1] تاریخ الصغیر بخاری۔ ص

''اور کسی وقت رات کو سجدہ کر اسکو اور پاکی بول اس کی بڑے رات تک یہ لوگ چاہتے ہیں جلدی ملنے والے کو اور چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو''۔

حج کے لئے سفر کیا تو زیارت حرمین کا ذوق وشوق اتنا غالب رہا کہ پورے سفر حج میں بے خبر ہو کر ایک دن نہیں سوئے۔ سونے کا زیادہ غلبہ ہوا تو کجاوے سے ٹیک لگائی یا لیٹ پوٹ لیا۔

ابن عساکر کا قول ہے کہ امام اوزاعی ؒ کثرت عبادت اور نماز کی خوبی میں ممتاز تھے۔

ولید بن مسلم کا قول ہے کہ عبادت میں امام اوزاعی سے زیادہ کوشش واہتمام کرنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا[1]۔

رات کے وقت نماز میں اس قدر روتے تھے کہ مصلیٰ تر ہو جاتا تھا۔ ایک بار ایک عورت ان کی اہلیہ سے ملنے آئی۔ اس نے دیکھا کہ مصلیٰ کا حصہ تر رہے۔ پوچھا کہ کیا مصلیٰ پر کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہے۔ نیک بخت بولیں:

هذا من اثر دموع الشيخ من بكائه في سجوده هكذا يصبح كل يوم ۔ (ص ۱۱۷)

''یہ شیخ کے آنسوؤں سے تر ہو گیا ہے۔ یہ روزانہ سجدوں میں اسی طرح رویا کرتے ہیں''۔

ابو مسہر کا قول ہے ، کہ

كان اوزاعي يحيي الليل قرآنا وبكاءً[2] ۔

''اوزاعی روتے اور نماز میں قرآن کی تلاوت میں رات ختم کر دیا کرتے تھے''۔

مگر ان کی یہ رقیق القلبی رات کی تنہائیوں تک محدود تھی۔ مجمع عام میں وہ بڑے ضبط سے کام لیتے تھے۔

ہدایہ میں یہ ہے کہ ''ان کو مجلس میں روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ مگر جب کبھی وہ تنہائی میں روتے تھے تو اس قدر روتے تھے کہ ان کے حال پر رحم آتا تھا''۔

نہایت خاموش اور سنجیدہ آدمی تھے۔ کبھی قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے اور نہ مذاق وہنسی کرتے تھے۔

خشوع :

خضوع وخشوع کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اوپر خدا کی عظمت وبرتری اور احساس و ذمہ داری اور قیامت کی بازپرس کی ایک مستقل کیفیت طاری ہو جائے۔ نماز سے اس کیفیت کا تعلق ضمنی یا بطور مشق کے ہے۔ امام اوزاعی پر یہ کیفیت ہمہ وقت طاری رہتی تھی۔ بشر بن منذر کہتے تھے کہ

---

[1] البدایہ۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۷ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۶۱

وکان من شدة الخشوع كانه اعمی[۱]۔

''شدت خشوع کی وجہ سے یہ اندھے معلوم ہوتے تھے''۔

اُوپر ان کی رقت قلبی کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ بھی اسی خشوع قلب کا نتیجہ تھی۔ایک بار کسی نے ان سے خشوع کی تعریف پوچھی تو فرمایا، کہ آنکھوں اور بازوں کو جھکاؤ اور رقت قلب کا نام خشوع ہے[۲]۔

امر بالمعروف :

اُمت مسلمہ کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو بُرائی سے روکا جائے اور بھلائی کی ترغیب دی جائے۔اللہ تعالیٰ نے دست وبازو، زبان وقلم، قوت واقتدار اور مال ودولت یا اس کے علاوہ جو بھی صلاحیت عطا کی ہے، ان کو اسی راہ میں لگا دینا ایمان کی سب سے بڑی علامت ہے۔امام اوزاعیؒ اس وصف میں صحابہ وتابعین کا نمونہ تھے۔

ان کو اللہ تعالیٰ نے زبان وقلم کی جو صلاحیت عطا کی تھی، اس کو انہوں نے اسی مقصد میں پورے طور سے لگا دیا تھا۔ان کے تمام معاصرین کا بیان ہے کہ

وکان انصح للامة[۳]۔

''اُمت کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے''۔

انہوں نے امراء وخلفاء سے جو مکالمے کئے اور ان کو جو خطوط لکھے ہیں وہ اسی جذبۂ امر بالمعروف و نهی عن المنكر کا نتیجہ تھے۔اس کی تفصیل اُوپر آچکی ہے۔

ہر طبقہ میں ان کی عزت تھی :

اپنے ان ہی اوصاف ومحاسن اور سیرت وکردار کی وجہ سے ہر طبقہ میں معزز ومحترم تھے۔حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے :

كان الاوزاعي في الشام معظمًا مكرمًا امره اعز عند هم من امر السلطان۔ (ص ۱۲۰)

''امام اوزاعی شام میں اس قدر معزز ومکرم تھے کہ ان کا حکم اہلِ شام کی نظر میں بادشاہِ وقت کے حکم سے زیادہ قابلِ قدر اور محترم تھا''۔

شام کے بعض امراء نے ان کے بارے میں کوئی سخت قدم اُٹھانا چاہا تو ان کے ہم نشینوں نے مشورہ دیا کہ ان کو نہ چھیڑو ورنہ،

---

[۱] ایضاً　[۲] تذکرۃ الحفاظ۔جلد اول۔ص ۱۶۱　[۳] تہذیب التہذیب۔جلد ۶۔ص ۲۵۶

والله لو أمر اهل اشام ان یقتلوک . (ص ۱۲۰)

"خدا کی قسم اگر اہلِ شام کو وہ تمہارے قتل کا حکم دے دیں تو وہ تم کو قتل کر دیں گے"۔

امام اوزاعی کی وفات کے بعد شام کے امیر نے آپ کی تدفین کر بعد کہا خدا آپ کے حال پر رحم فرمائے۔ مجھے جس نے امارت سپرد کی ہے (یعنی منصور) میں اس سے بھی زیادہ آپ سے ڈرتا تھا[1]۔

بقیہ بن ولید کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو امام اوزاعی کے ذریعہ آزماتے تے، اگر کوئی شخص ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتا تھا تو ہم اس کے بارے میں سمجھتے تھے کہ انه هو صاحب سنة یہ متبع سنت ہے۔

امام اوزاعی حج کے لئے تشریف لے گئے تو سفیان ثوری نے جو پہلے سے وہاں موجود تھے، بستی سے باہر نکل کر استقبال کیا اور ان کے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے آگے آگے چل رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے

طرقوا للشارع [2]۔ "شیخ کے لئے راستہ دے دو"۔

بیش قیمت اقوال :

فرمایا کہ جب تم کو کوئی حدیث نبوی صحیح طریقہ سے مل جائے تو پھر اس میں چوں وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ کہتے تھے وہ اللہ کے مبلغ کی حیثیت سے کہتے تھے (یعنی اس کو اللہ ہی کا پیغام سمجھنا چاہئے)۔

سلف صالحین یعنی صحابہ کے اقوال و اعمال کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ اگر چہ لوگ اس میں تمہارا ساتھ نہ دیں، اس کے مقابلہ میں اور کسی شخص کی رائے کو خواہ وہ کتنے ہی اچھے اور دلفریب پیرائے میں کیوں نہ پیش کی گئی ہو۔ کوئی اہمیت نہ دو اور اس کے قبول کرنے سے پرہیز کرو۔ اس سے دین بھی واضح اور روشن رہے گا اور تم بھی راست پر قائم رہو گے۔

فرماتے تھے :

العلم ماجاء عن اصحاب محمد وما لم یجئ عنهم فلیس یعلم .

"حقیقی علم وہ ہے جو صحابہ کرام سے ثابت اور منقول ہے اور جو ثابت نہ ہو وہ علم نہیں ہے"۔

ولید کا بیان ہے کہ میں امام اوزاعی سے خود سنا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ "دنیا میں انسان عمر کی جتنی گھڑیاں گزار رہا ہے، وہ سب اس کے سامنے ترتیب سے پیش کی جائیں گی، تو زندگی میں جو ساعت اللہ کی یاد سے غفلت میں گزری ہے اس پر نفس کو افسوس ہوگا۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰ ص ۱۲۰ [2] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۲۴۱

ان کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی بات پوچھتا تو اس کا جواب ضرور دیتے تھے۔

ایک عیسائی نے ایک مٹکا شہد ہدیہ دیا اور کہا کہ آپ ایک خط شہر بعلبک کے والی کو (مالی مدد کے لئے) لکھ دیجئے۔ آپ نے اس سے کہا کہ اگر خط لکھوانا چاہتے ہو تو اس کی شرط یہ ہے کہ یہ شہد واپس لے لو ورنہ میں شہد تو قبول کرلوں گا مگر خط نہیں لکھ سکتا۔ وہ راضی ہوگیا۔ آپ نے شہد واپس کر دیا اور اس کی امداد کے لئے خط لکھ دیا اور اس کی مدد ہوگئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی مقصد کے حصول یا سفارش کے لئے جو ہدیہ پیش کیے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔

فرمایا کرتے کہ سلامتی اور عافیت کے دس اجزاء ہیں، جن میں ۹ کے برابر تو خاموشی ہے اور اسی کا ایک جز لوگوں سے بے نیازی ہے۔

ایک بار اپنے ایک شاگرد سے فرمایا کہ جو شخص موت کو زیادہ یاد کرتا ہے، اس کو ہر معاملہ میں آسانی میسر آتی ہے اور جو شخص یہ جان لے کہ گفتگو بھی ایک عمل ہے (جس کی باز پرس ہوگی) تو وہ بات چیت کرے گا۔

ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ امام اوزاعی ؒ کہا کرتے تھے کہ ”ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں سب سے زیادہ کمی مونس وغم خوار بھائی کی، حلال پیسے اور اتباع سنت کی ہوگی[1]۔

فرماتے تھے کہ سلف صالحین کا حال یہ تھا کہ صبح صادق کے وقت یا اس سے کچھ پہلے ہی سے وہ ذکر وعبادت میں مشغول ہوجاتے تھے۔ جب طلوع آفتاب کا وقت ہوتا تھا تو سب لوگ جمع ہوکر پہلے قیامت اور اس کی ہولناکی کے بارے بات چیت کرتے تھے، پھر تعلیم کا چرچا ہوتا تھا۔

فرماتے تھے کہ پانچ باتیں تمام اصحابہ ؓ اور تابعین میں مشترک تھیں۔

(۱) اجتماعیت (۲) اتباع سنت (۳) تعمیر مساجد۔
(۴) تلاوت قرآن پاک (۵) جہاد فی سبیل اللہ[2]۔

فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تو اس میں بحث ومباحثہ اور اجدال ومناظر کا دروازہ کھول دیتا ہے اور علم وعمل کے دروازے ان کے لئے بند کر دیتا ہے۔

حضرت علی ؓ اور حضرت عثمان ؓ دونوں کی محبت ایک مومن ہی کے قلب میں جمع ہوسکتی ہے۔

---

۱ یہ ایک حدیث نبوی کی تفسیر ہے ۲ حسن المساعی ص ۱۳۸

جو شخص علماء کے شاذ و نادر اقوال پر عمل کرے گا، وہ ایک دن اسلام کے دائرہ سے نکل جائے گا۔ فرمایا کہ بُرا ہو غیر عابد فقہا اور حرام چیزوں کو شبہہ کی بنا پر حلال کر دینے والوں کا۔ جس شخص نے دین میں کوئی بدعت ایجاد کی، اس کا ورع وتقویٰ سلب ہوا۔

فرماتے تھے جو واعظ خدا کی رضا کے لئے وعظ نہیں کہتا، اس کی باتیں دل سے اس طرح نکل جاتی ہیں جس طرح پتھر کے اُوپر سے پانی۔ فرمایا مومن بات کم کرتا ہے۔ اور عمل زیادہ اور منافق عمل کم کرتا ہے اور بات زیادہ۔

فرماتے تھے کہ سنت نبوی پر جم جاؤ اور اہل سنت کا جو موقف ہے وہی تم اختیار کرو۔ جس چیز سے وہ رُکے تم بھی رُکو۔ سلف صالح کے راستہ پر چلو، ایمان بغیر زبان کی شہادت کے استوار اور درست نہیں ہوتا اور ایمان وقول بغیر عمل کے درست نہیں ہوتے اور یہ تینوں چیزیں حسب سنت نبوی ﷺ نیت کے بغیر درست نہیں ہوتیں۔ کسی نے پوچھا کہ اس حدیث اکثر اُمتی دخولانی فی الجنته اهل البله میں اهل البله سے کون لوگ مراد ہیں۔ فرمایا!

الذین یعرفون الخیر ولا یعرفون الشر :

''جو صرف بھلائی ہی جانتے ہیں بُرائی اور شر سے وہ واقف ہی نہیں''۔

ان کا فقہی مسلک :

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ وہ ایک علیحدہ مکتب فقہ کے بانی تھے۔ ان کے فقہی مسلک کی پوری تفصیل اور اس کے امتیازات کی فہرست تو نہیں تیار کی جاسکتی، اس لئے کہ نہ تو ان کی مرویات ہی جمع ہوسکیں، اور نہ ہی ان کے فقہی مجتہدات ہی مرتب کئے جاسکے۔ کتاب الرو علی السیر الاوزاعی میں امام ابو یوسف نے ان کی بہت سی فقہی رایوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر ان کا تعلق ایک خاص موضوع سیر وغزوات سے ہے۔ صاحب حسن المساعی نے چند عام مسائل کا تذکرہ کیا ہے، جن میں وہ دوسرے ائمہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱)　نبیذ سے وضو کے جواز کے قائل تھے۔ امام ابو حنیفہ کا یہی مسلک ہے۔ دوسرے ائمہ کو اس سے اختلاف ہے، مگر اس اختلاف کا دارومدار نبیذ کی تعریف پر ہے۔ اہلِ عراق اس کی جو تعریف کرتے ہیں، اس سے یہ اختلافات ختم ہوجاتے ہیں۔

(۲)　پانی کم ہو یا زیادہ اس میں اگر اتنی نجاست پڑ جائے جس سے کوئی تغیر واقع نہ ہو تو ان کے نزدیک وہ پاک ہے۔ اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ کی رائے اس سے مختلف ہے۔

(۳) کتے اور سور کے جھوٹے کو وہ پاک سمجھتے تھے، یعنی وہ پیا بھی جاسکتا ہے اور اس سے وضو بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ دونوں کھانے میں منہ ڈال دیں تو اس کا کھانا حرام نہیں سمجھتے تھے۔ امام زہریؒ اور امام مالکؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے ائمہ کی رائے اس سے مختلف ہے۔

(۴) سجدۂ سہو میں ان کا مسلک یہ تھا کہ اگر نماز میں کوئی کمی ہوئی ہے تو سجدۂ سلام سے پہلے کرنا چاہئے اور اگر زیادتی ہوئی ہے تو سلام کے بعد۔ امام مالکؒ اور ایک روایت میں امام احمدؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

(۵) نماز میں کوئی شخص بھول کر کھاپی لے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے، خواہ نماز فرض ہو یا نفل، کیونکہ ایسا بے کار فعل جو نماز کی جنس سے نہیں ہے، اس میں عمد اور نسیان دونوں برابر ہے۔

(۶) اگر جوتے اور چمڑے کے موزے کے نچلے حصہ میں نجاست لگ جائے اور اس کو اس طرح زمین پر رگڑ دیا جائے کہ اس کی نجاست دُور ہو جائے تو اس سے نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ ان کے سامنے یہ حدیث ہے،

اذا وطی احد کم بنعله الاذی فان التراب له طهور ۔

(۷) نمازِ عیدین میں استفتاح یعنی ثنا وغیرہ کا پڑھنا تکبیراتِ زوائد کے بعد ہونا چاہئے اس رائے میں یہ تمام ائمہ اربعہ سے منفرد ہیں۔ دوسرے ائمہ استفتاح کے بعد تکبیر زوائد کہتے ہیں۔

(۸) غسلِ جمعہ فجر سے پہلے بھی کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے ائمہ کے یہاں اس کا استحباب طلوع سورج کے بعد شروع ہوتا ہے۔

(۹) رمضان میں قصداً مباشرت کرنے والا اگر کفارہ ادا کردے تو اس پر قضا نہیں ہے۔ اگر بھول کر جماع کرلے تو اس پر قضا ہے کفارہ نہیں۔

(۱۰) قربانی کے چمڑے کو فروخت کر کے اس کی چلنی اور دوسری استعمال کی چیزیں خریدی جاسکتی ہیں اور ان کا استعمال ہوسکتا ہے۔ دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ فروخت کرنے کے بعد قیمت صدقہ کردینا ضروری ہے۔

کتاب المغنی لابن قدامه میں دوسرے ائمہ کے ساتھ ان کے مسلک کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اگر اس سے ان کی فقہی رایوں کو علیحدہ کرلیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔

ان کا فقہی مسلک کتنی مدت تک زندہ رہا اور اس کے زوال کے اسباب کیا ہوئے :

اُوپر یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ امام اوزاعیؒ کا یہ مسلک شام میں دو صدی تک اور اندلس میں

تقریباً ایک صدی زندہ رہا۔ مگر اس کے بعد کچھ داخلی اور خارجی اسباب ایسے پیدا ہوئے جس کی بنا پر یہ فنا ہو گیا۔ جن اسباب کی بنا پر یہ مسلک زندہ نہ رہ سکا، اس کی کچھ تفصیل یہاں کی جاتی ہے۔

امام اوزاعیؒ کا ذہن کچھ قدرۃً بھی محدثانہ طرز فکر سے زیادہ ہم آہنگ تھا اور ان کی تعلیم و تربیت بھی حدثنا و اخبرنا ہی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان سے پیش آمدہ مسائل میں استفسار کیا جاتا، تو وہ حدیث نبوی اور آثار صحابہؓ کی روشنی میں سادہ طور سے ان کا جواب دیتے تھے۔ زیادہ تدقیق و تفتیش اور فرضی قیاس آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے ستر ہزار مسائل کا جواب حدیث و آثار کی روشنی میں دیا تھا۔ جب تک مسلمانوں میں سادہ اسلامی زندگی کا رواج رہا۔ اس وقت تک ان کے مسلک پر تعامل باقی رہا۔ مگر جب فقہا کی ژرف نگاہی اور باریک بینی کا دور شروع ہوا اور انہوں نے مسائل کی تخریج و تفریع کی بھرمار کر دی تو امام اوزاعیؒ کا سادہ اور ٹھیٹھ مسلک ان کی دقت پسندی کے آگے نہ ٹھہر سکا، اور ان کا خالص محدثانہ مکتب فکر فقہی مکتب فکر کے سامنے شکست کھا گیا[1]۔

اسی کے ساتھ کچھ سیاسی اسباب بھی ایسے پیدا ہوئے، جنہوں نے ان کے مسلک کو ختم کرنے میں مدد دی تھی۔

امام اوزاعیؒ کے مسلک کی ترویج اور اس کے زوال کے اسباب پر عام مورخین اور تذکرہ نگاروں نے جو روشنی ڈالی ہے، وہ یہاں پیش کی جاتی ہے۔ قدما میں لسان الدین بن الخطیب نے اور متاخرین میں علامہ کرد علی اور خضری نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔

امام ذہبیؒ لکھتے ہیں:

كان اهل الشام ثم اهل الاندلس على مذهب الاوزاعي مدة من الدهر ثم فني العارفون به[2]۔

''اہل شام پھر اہل اندلس امام اوزاعیؒ کے مسلک پر ایک مدت تک عامل رہے۔ پھر اس کے جاننے والے ختم ہو گئے''۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ذہبیؒ کے نزدیک اس مسلک کے اختتام کا سبب یہ ہے کہ اس کے جاننے والے باقی نہ رہے تھے۔ مگر اس کے جاننے والے کیوں باقی نہ رہے؟ اس کا جواب اس بیان میں نہیں ہے۔

---

[1] اس دور میں دوسرے محدثانہ مکاتب فکر مثلاً سفیان ثوریؒ، داؤد ظاہریؒ، اسحاق بن راہویہؒ اور طبریؒ وغیرہ کا بھی یہی حشر ہوا۔ ان مسلکوں کی شکست سے اُمت کو سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کا تعلق اصل ماخذ یعنی کتاب و سنت سے کم ہو گیا اور براہ راست کتاب و سنت سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔

[2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۶۴

حافظ ابن حجرؒ تہذیب میں لکھتے ہیں :

والیه فتوی الفقه لاهل الشام .

''اہل شام فقہی مسائل میں ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے''۔

دوسری جگہ اسی کتاب میں ہے :

کانت الفقهاء تدوربا لاندلس علی رای الاوزاعی الی زمن الحکم بن هشام المتوفی سنة ۲۵۶ (جلد ۶ ، ص ۲۴۶)[۱]۔

''اندلس میں امام اوزاعیؒ کے مسلک کے مطابق ــــــ حکم بن ہشام متوفی ۲۵۶ھ کے زمانہ تک فقہا فتویٰ دیتے اور عمل کرتے رہے''۔

اس بیان سے بھی اس مسلک کے زوال پر تو روشنی نہیں پڑتی مگر اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دوسری صدی کے نصف آخر تک اندلس میں فیصلے اس مسلک کے مطابق ہوتے تھے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں بڑی تفصیل سے امام اوزاعی کے حالات لکھے ہیں۔ مگر اس بارے میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ البتہ اپنی ایک دوسری کتاب میں اتنا لکھا ہے، کہ

وقد کان اهل الشام علی مذهب الاوزاعی نحوا من مائتی سنة[۲]۔

''اہلِ شام دو برس تک امام اوزاعی کے مسلک پر عامل رہے''۔

اس بیان سے ایک دوسرا گوشہ واضح ہو گیا۔ وہ یہ کہ شام میں دو برس تک ان کا مسلک چلا شیخ کردعلیؒ نے کچھ اور زیادہ وضاحت کی ہے۔ یہ علم نہیں ہو سکا کہ ان کا ماخذ کیا ہے۔

بعمل بمذهبه فی الشام نحو مائتی سنة و آخر من عمل بمذهبه احمد بن سلیمان قاضی الشام وعمل اهل الاندلس بمذهبه اربعین سنة ثم تناقض بمذهبه الامام مالک[۳]۔

''شام میں تقریباً دو صدی تک ان کے مسلک پر عمل باقی رہا۔ شام کے آخری قاضی جنہوں نے ان کے مسلک پر عمل کیا وہ احمد ابن سلیمانؒ تھے، اہلِ اندلس محض چالیس ہی برس ان کے مسلک پر عمل کر سکے تھے کہ امام مالکؒ کے مسلک سے یہ شکست کھا گیا''۔

کردعلیؒ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اندلس میں محض چالیس برس ان کا مسلک زندہ رہا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے یہ مدت زیادہ بیان کی ہے۔ اُوپر حافظ ابن حجرؒ کا بیان گزر چکا ہے۔ آگے خضریؒ کا بیان آتا ہے۔

۱۔ کتاب میں ۲۵۰ھ اس کی وفات درج ہے مگر صحیح ۲۰۶ھ ہے۔ ابن اثیر نفح الطیب وغیرہ۔

۲۔ اختصار علوم الحدیث۔ ص ۹۹ ۳۔ خطط الشام۔ جلد ۴۔ ص ۲۵

قاضی احمد سلیمان جن کو شیخ کردعلیؒ نے شام میں مسلک اوزاعیؒ کا آخری مفتی وقاضی قرار دیا ہے۔ ان کے بارے میں امام ذہبی کا بیان ملاحظہ ہو۔ وہ ۳۴۷ھ کے حوادث کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ

انہ مات مفتی دمشق علی مذھب الاوزاعی القاضی ابو الحسن احمد ابن سلیمان [1] جزلم وکانت لہ حلقہ کبیرۃ بالجامع۔

''اسی سنہ میں امام اوزاعیؒ کے مسلک کے مفتی قاضی ابوالحسن احمد بن سلیمان جزلم نے انتقال کیا۔ جامع دمشق میں ان کا بہت بڑا حلقۂ درس تھا''۔

اس بیان سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اس مسلک کے مطابق چوتھی صدی کے نصف تک فتوے دیئے جاتے رہے اور اسی مسلک کے علماء کا عہدۂ قضا پر تقرر ہوتا رہا۔ اس کے بعد سرکاری طور پر ان کا مسلک ختم ہوگیا مگر اس بیان کے آخری ٹکڑے ''حلقہ کبیرۃ'' سے پتہ چلاتا ہے کہ شام میں اس کے بعد بھی اس مسلک کا چرچا رہا ہوگا، کیونکہ انکے انتقال کے بعد یکایک تو یہ مسلک ختم نہیں ہوگیا ہوگا۔

شیخ خضریؒ نے التشریع الاسلامی میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وکان اھل شام یعملون مذھبہ ثم انتقل مذھب الاوزاعی الیٰ الاندلس مع الداخلین ابھا من اعقاب بن امیۃ ثم اضمحل امام مذھب الشافعی فی الشام وامام مذھب مالک فی الاندلس وذالک فی منتصف القرن الثالث (۲۷۰)

''اہلِ شام بہت دنوں تک ان کے مسلک پر عمل کرتے رہے پھر ان کا مسلک بنوامیہ کے ان لوگوں کے ذریعہ اندلس پہنچا جنہوں نے اندلس میں جا کر اپنی حکومت قائم کی پھر شام میں امام شافعیؒ کے مسلک کے آگے اور اندلس میں امام مالکؒ کے سامنے یہ کمزور پڑ گیا اور تیسری صدی کے نصف میں یہ ہوا''۔

شام کے بارے میں تو عام اربابِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ وہاں دو سو برس تک امام اوزاعیؒ کا مسلک زندہ رہا مگر اندلس کے بارے میں انہوں نے کسی مدت کی تعیین نہیں کی ہے اس کے لئے ہم اندلس کے سب سے قابلِ وثوق مورخ لسان الدین ابن الخطیب کا بیان نقل کرتے ہیں:

''اہلِ اندلس اور اہلِ شام ابتدا میں امام اوزاعیؒ کے مسلک کے پیرو تھے مگر اندلس کے

---

[1] حیدرآباد کی مطبوعہ تاریخ ذہبی میں جزلم کے بجائے حزام ہے۔ مگر امیر شکیب ارسلان نے پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ لفظ حزام نہیں بلکہ جذلم ہے۔ (حسن المساعی۔ ص۵)

تیسرے اموی حکمران حکم بن ہشام کے زمانہ میں فقہ وفتاویٰ کی مسند مالکی فقہا نے سنبھال لی پھر آہستہ آہستہ مالک مسلک کا وہاں عام چرچا ہوا، اور اندلس اور قرطبہ دونوں جگہ یہی مسلک رواج پذیر ہو گیا اور اس مسلک کے فروغ کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ حکم نے خود اس مسلک کو اختیار کر لیا تھا"۔

اس تبدیلی مسلک کا سبب کیا ہے؟ مصنف ؒ نے لکھا ہے کہ اس بارے میں دو مختلف رائے ہیں، عام اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ

ان سببه رحلة علماء الاندلس الى المدينة فلمارجعوا الى الاندلس وصفوا افضل مالک وسعة علمه وجلالة قدره فاعظموه (ص ۱۵۰ جلد ۲)

"اس تبدیلی کا سبب یہ ہوا کہ بہت سے علمائے اندلس (تحصیل علم اور سماع حدیث کے لئے مدینہ منورہ گئے وہاں امام مالک ؒ کی مجلس درس برپا تھی اس میں شریک ہو کر جب اندلس واپس ہوئے تو امام مالک ؒ کے فضل وکمال اور جلالت علم کا چرچا ہوا، چنانچہ اہلِ اندلس ان کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ (اور ان کا مسلک اختیار کر لیا)

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ جب علمائے اندلس امام مالک ؒ کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے یہاں کے اموی حاکم کے عدل وانصاف اور سیرت وکردار کی تعریف کی امام مالک ؒ چونکہ عباسی حکومت کو اس کے ظلم وتشدد کی وجہ سے پسند نہیں کرتے تھے اس لئے ان کو اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی اور فرمایا کہ

نسأل الله تعالیٰ ان یزین حرمنا بملککم........ فنمت المسئلة الی ملک الاندلس مع ما علم من جلالة مالک ودینه فحمل الناس علی مذهبه. (ص ۱۵۹)

"ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے حرم (مکہ) کو تمہارے حکمران کے (عدل وانصاف) سے مزین کر دے۔۔۔۔۔ یہ بات جب اندلس کے حکمران تک پہنچی اور ساتھ ہی وہ امام مالک ؒ کی جلالت علم اور ان کے دین وتقویٰ سے واقف ہوا تو اس نے امام اوزاعی ؒ کے مسلک کو ترک کر دیا اور امام مالک ؒ کے مسلک کے اختیار کر لینے پر اہلِ اندلس کو آمادہ کیا"۔

پہلی رائے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی مسلک کا سبب صرف علمی اور دینی تھا مگر دوسری رائے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلک کی تبدیلی صرف علمی نہیں تھی بلکہ اس میں کچھ سیاسی مصلحت بھی پوشیدہ تھی۔ صاحب نفح الطیب نے پہلی رائے کو ترجیح دی ہے اور دوسری رائے کو ضعیف بتایا ہے مگر میرے نزدیک دوسری رائے قابلِ ترجیح ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر فقہ وفتاویٰ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو

آپ کو معلوم ہوگا کہ کوئی فقہی مسلک کسی ملک میں اسی وقت رواج پذیر ہوا ہے جب اس کو حکومت نے اپنایا ہے۔ محض عوام کے حسنِ ظن یا ان کی خواہش کی بنا پر بہت کم کوئی تبدیلی ہوئی ہے، یہ بات ضرور ہے کہ اس میں کچھ علمی اور دینی اسباب بھی معاون ہوتے ہیں جن میں ایک سبب کا ذکر راقم نے اُوپر کیا ہے یعنی فقہ میں ان کا خاص محدثانہ طرزِ فکر۔

اُوپر کے تمام بیانات سے حسبِ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) شام میں امام اوزاعیؒ کا مسلک دو سو برس تک زندہ رہا۔

(۲) شیخ خضریؒ کے بیان کے مطابق اندلس میں ان کا مسلک بنو اُمیہ کے ذریعہ پہنچا۔

(۳) شیخ کرد علیؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس میں مسلک اوزاعی صرف چالیس برس زندہ رہا۔ مگر نفح الطیب کے بیان اور بنو اُمیہ کی حکومت کے قیام کی تاریخ ۱۳۸ھ اور حکم بن ہشام متوفی ۲۰۶ھ کے دورِ حکومت میں قضاۃ کے تقرر کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ مدت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے، یعنی کم سے کم پون صدی۔

(۴) شام میں امام اوزاعیؒ کے مسلک کی جگہ حنفی وشافعی مسلک نے لی اور اندلس میں مالکی مسلک نے۔

مسلک اوزاعی کے مشہور علماء :

اُوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ شام میں تقریباً دو صدی تک امام اوزاعیؒ کا مسلک زندہ رہا، ظاہر ہے کہ اس مدت میں سینکڑوں آدمی ان کے اجتہاد استنباطات سے واقف ہوئے ہوں گے۔ یہ تفصیل تو نہیں ملتی کہ عہدۂ قضا کی تقرریوں میں ان کے مسلک کا کتنا خیال کیا جاتا تھا، مگر بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شام میں قضاء وافتاء پر ان کے مسلک کا کافی اثر تھا اور اس کے مطابق قاضیوں کا تقرر بھی ہوتا تھا۔ جیسا کہ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ مذہب اوزاعی کے مشہور مفتی اور قاضی احمد بن سلیمان تھے۔ جن کا انتقال ۳۴۷ھ میں ہوا۔ شیخ کرد علیؒ نے لکھا ہے کہ یہ آخری قاضی تھے، جنہوں نے مسلکِ اوزاعی پر شام میں عمل کیا۔ (ص ۵)

امیر شکیب ارسلانؒ نے لکھا ہے کہ فقہ اوزاعی کے ایک عالم ان کے اجداد میں امیر نعمان ابو الحسام ابن الامیر متوفی ۳۲۵ھ میں جن کے بارے میں اہلِ تذکرہ لکھتے ہیں :

کان اعلم اهل زمانه بفقه الاوزاعی

انہوں نے فقہ اوزاعی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام ہے الاقوال الصحیحه فی اصول حدیث الاوزاعی ۔ (ص ۴۲)

ان کے علاوہ دو علماء کا نام تذکروں میں آتا ہے۔ ایک فقہ وفتاویٰ کے سب سے معتبر ناقل ولید بن یزید، دوسرے عباس بن ولید (حسن المساعی۔ص ۳۲ نیز اعلام الموقعین)۔

تصنیف:

تعجب ہے کہ اربابِ تذکرہ میں سے کسی نے بھی ان کی تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔ مگر ابن ندیمؒ نے ان کی دو کتابوں کا نام لیا ہے۔ (۱) **کتاب السنن فی الفقه** (۲) **کتاب المسائل فی الفقه**۔ ان کے علاوہ انہوں نے ایک کتاب جس کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا۔ امام ابوحنیفہؒ کے "مسائل سیر ومغازی" کے رد میں لکھی تھی۔ جس کے جواب میں امام ابو یوسفؒ نے ایک کتاب **الرد علی السیر الاوزاعی** لکھی، اور امام محمدؒ نے **السیر الکبیر** میں جابجا اس کے جوابات دیئے ہیں۔

یہ علم نہیں ہوسکا کہ امام اوزاعیؒ کی کتاب دنیا کے کسی کتب خانہ میں موجود ہے یا نہیں، مگر امام شافعیؒ نے یہ پوری کتاب اپنی کتاب **الام** جلد ۶ میں نقل کردی ہے، اور امام یوسف کی کتاب جو لجنۃ المعارف النعمانیہ کی طرف سے چھپ کر منصہ شہود پر آگئی ہے۔ اس سے بھی امام اوزاعیؒ کی کتاب کی حیثیت اور سیر ومغازی میں ان کے علم ونظر کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

سیر ومغازی کے جو مسائل امام ابوحنیفہ اپنے درس میں املا کراتے تھے، تلامذہ ان مسائل کو مرتب کرلیا کرتے تھے۔ خصوصیت سے امام محمد نے ان مسائل کا جو مجموعہ السیر الصغیر کے نام سے مرتب کیا تھا، وہ بہت مقبول ہوا۔ یہ مجموعہ جب امام اوزاعیؒ کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے پوچھا: یہ کتاب کس کی تصنیف ہے؟ بتایا گیا کہ امام محمد عراقی کی۔ بولے عراق نے سیر ومغازی کے موضوع پر تصنیف کیوں شروع کردی؟ اس لئے کہ ان کو سیر ومغازی کا کوئی علم نہیں ہے (یہ علم صحابہ کے ذریعہ پہنچا ہے)۔ اور صحابہ تو شام کے ایک حصہ اور حجاز میں پہنچے تھے۔ عراق تو بہت بعد میں فتح ہوا ہے [۱]۔

چنانچہ امام اوزاعیؒ نے ان مسائل کی تردید میں ایک کتاب لکھ ڈالی۔ جب یہ کتاب امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ تک پہنچی تو انہوں نے اس کا جواب دیا [۲]۔

امام اوزاعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے سینکڑوں مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے اپنی کتاب میں ان تمام مسائل میں امام صاحبؒ کی پوری وکالت کی ہے اور ان کے اقوال کی ترجیح کے لئے عقلی ونقلی دلائل کا انبار لگا دیا ہے۔ مگر پھر بھی بعض مسائل میں انہوں نے اپنے امام اور استاذ کے مقابلہ میں امام اوزاعیؒ کے قول کو ترجیح دی ہے یا اس کی طرف رجوع کرلیا ہے۔ ان مسائل کا تذکرہ

۱۔ السیر الکبیر۔ص ۴ ۲۔ مقدمہ الرد علی السیر الاوزاعی۔ص ۲۔

طوالت کا سبب ہوگا اہل علم کے لئے اس کتاب کے ص۔۲۱، ۴۲، ۴۳، ۹۷ وغیرہ کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

وفات :

امام اوزاعیؒ کی وفات بڑے دردناک طریقہ سے ہوئی۔ آپ بیروت میں تھے، ایک دن حمام میں غسل کے لئے گئے۔ صاحب حمام لاعلمی میں باہر سے دروازہ بند کر کے کہیں چلا گیا۔ اندر آگ جل رہی تھی اور باہر سے ہوا جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا، اس لئے اسی حالت میں جان بحق ہو گئے اور جب صاحب حمام واپس آیا اور اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ آپ کا داہنا ہاتھ سر کے نیچے ہے اور قبلہ رو فرش زمین پر مُردہ پڑے ہیں[1]۔ یہ حادثہ عظمیٰ صفر یا ربیع الاول ۱۵۷ھ میں پیش آیا۔

آپ کی وفات تو بیروت شہر میں ہوئی مگر تدفین بیروت کے باہر ایک موضع خنتوس میں ہوئی۔ اس بستی[3] کے بارے میں ابن خلکان نے اپنے زمانہ کا حال لکھا ہے کہ اس بستی کے تمام باشندے مسلمان ہیں، بستی کے خواص تو امام اوزاعیؒ سے واقف ہیں، مگر عوام صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہاں ایک بزرگ کی قبر ہے۔ ان کی موت پر بعض شعراء نے مرثیے بھی کہے۔

مرثیہ کا ایک شعر یہ ہے:

عرضت له الدنيا فاعرض مقلعا

عنها بزهده ايما اقلاع

دنیا ان کے سامنے پیش کی گئی مگر انہوں نے زہد و قناعت کی وجہ سے اس سے ہمیشہ گریز کیا۔ ان کے نزدیک زہد و قناعت کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ جب انتقال ہوا تو پورا اثاثِ بیت چند درہم سے زیادہ کا نہیں تھا۔

حلیہ :

ابن خلکان نے ان کا حلیہ یہ بتایا ہے۔ میانہ قد، گندمی رنگ، ہلکی ڈاڑھی، جس میں مہندی کا خضاب لگا ہوا تھا[2]۔

---

[1] بعض تذکروں میں ہے کہ آپ کی اہلیہ نے لاعلمی میں دروازہ بند کر دیا تھا۔ [2] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۴۹۳

[3] اس بستی کے آثار میں بجز ایک کنویں کے اور کچھ باقی نہیں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت ابن جُریج رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے آنکھ کھولی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک معتدبہ تعداد موجود تھی۔ اگر وہ ان کی صحبت اختیار کرتے تو ان کا شمار زمرۂ تابعین میں ہوتا، مگر ابتداء میں ان کو شعر وادب سے دلچسپی تھی، اس لئے وہ ان سے کسب فیض نہ کرسکے۔ اسی لئے ان کو تبع تابعین میں شمار کیا گیا ہے۔

ان کا شمار تبع تابعین کے اس زمرہ میں ہوتا ہے، جنہوں نے تفسیر وحدیث کی تدوین وترتیب میں حصہ لیا۔ خاص طور پر علم تفسیر میں یہ اپنے معاصرین میں ممتاز تھے۔ تفسیر طبری میں سینکڑوں روایات ان کے واسطے سے ملیں گی۔ یہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد تھے۔

نام ونسب :

عبدالملک نام ہے۔ ابوالولید اور ابو خالد کنیت تھی۔ ان کا آبائی وطن روم تھا[1]۔ اسی وجہ سے بعض لوگ انہیں رومی عیسائی کہتے تھے[2]۔ بعثت نبوی ﷺ کے بہت پہلے سے مکہ میں متعدد رومی غلام خاندان موجود تھے۔ غالباً ان ہی میں حضرت ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان بھی تھا۔ یہیں ۸۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔

تعلیم وتربیت :

مکہ میں اس وقت شعر وادب اور حدیث وفقہ کا عام چرچا تھا۔ ابتدا میں ان کو شعر وادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور جوانی کا پورا زمانہ اسی وادی میں گزار دیا۔ عمر ڈھلنے کا زمانہ آیا تو کسی نے علوم دینیہ کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے بعد پوری زندگی اس کی نذر کردی۔

مکہ میں اس وقت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ممتاز شاگرد عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کا چشمۂ فیض جاری تھا۔ حدیث نبوی ﷺ کے سماع کے لئے سب سے پہلے حضرت ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ انہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

---

1. تاریخ بغداد۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۰۱ ؛ فجر الاسلام کے مصنف نے بھی انہیں اہل کتاب تبع تابعین شمار کیا ہے۔
2. شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۲۲۶

خود بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کی خدمت میں یہ جذبہ لے کر حاضر ہوا کہ میں بھی ان کا مرتبہ حاصل کر دوں۔ اتفاق سے اس وقت ان کی خدمت میں عبداللہ بن عبیدؒ [۱] بھی موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ قرآن حفظ کرلیا ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ بولے جاؤ پہلے قرآن پڑھ لو، پھر علم (حدیث) کا قصد کرو۔ میں واپس قرآن کی تعلیم میں لگ گیا۔ کچھ دنوں بعد پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتفاق اس دن بھی عبداللہؒ موجود تھے۔ پوچھا کہ پورا قرآن مستحضر ہوگیا؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے دوسرا سوال یہ کیا کہ فرائض بھی سیکھے ہیں؟ بولا نہیں! انہوں نے کہا جاؤ، پہلے فرائض کی تحصیل کرو، پھر واپس آؤ۔ چنانچہ میں واپس چلا گیا اور کچھ دنوں بعد واپس آیا، تو مجھے حضرت عطاءؒ کی صحبت میں کسب علم کی اجازت ملی اور پھر سترہ (۱۷) برس تک ان کی خدمت میں رہا [۲]۔

اس واقعہ سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عطاءؒ ہر کس و ناکس کو اپنے درس میں شریک نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے لئے انہوں نے کم از کم قرآن کے حفظ اور درس کے عام مفہوم و معنی کے استحضار کو ضروری قرار دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے درس کی سب سے بڑی خصوصیت جیسا کہ ابن سعد نے لکھا ہے، قرآن کی تفسیر اور اس کے دقائق و معانی کی تعلیم تھی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن سے بالکل نابلد ہو وہ ان کے درس سے کیا فائدہ اُٹھا سکتا تھا؟

دوسرے اس واقعہ سے حضرت ابن جریجؒ کے شوق وانہماک کا پتہ چلتا ہے کہ ان کو دو بار مجلس درس سے واپس کیا گیا، مگر ہر بار ان کا جذبۂ شوق کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی رہا اور پھر اسی شوق نے انہیں سترہ (۱۷) برس تک اپنے اُستاد سے جدا نہ ہونے دیا۔ اتنی مدت ان کی خدمت میں رہنے کے بعد بھی ان کے جذبۂ طلب کو تسکین نہیں ہوئی اور سات برس تک مکہ کے دوسرے ممتاز شیخ عمرو بن دینارؒ کی خدمت میں رہے اور پھر مکہ سے نکل کر انہوں نے مدینہ، بصرہ، بغداد، یمن، شام اور مصر کی خاک چھانی اور وہاں کے تمام ممتاز شیوخ سے استفادہ کیا۔ ان کے مخصوص شیوخ تفسیر وحدیث کے نام یہ ہیں :

اساتذہ :

حضرت عطاء بن ابی رباح، امام زہری، صالح بن کیسان، عمرو بن دینار، نافع مولی بن عمر، ہشام بن عروہ، موسیٰ بن عقبہ، امام جعفر صادق، یحییٰ بن سعید الانصاری، امام اوزاعی، لیث بن سعد رحمہم اللہ تعالیٰ۔

---

[۱] یہ حضرت عبید بن عمر کے لڑکے اور عطاءؒ کے شاگرد تھے۔ [۲] شذرات الذہب۔ جلد اول۔ ص ۲۲۸ تاریخ بغداد۔ جلد ۱۰۔ ص ۴۰۲

علم وفضل :

ان کے علم وفضل کے بارے میں آئمہ نے جو رائیں دی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اس لحاظ سے معروف تھے۔ ان کے شیخ عطاء بن ابی رباحؒ ان کو اہل حجاز کا سردار کہتے تھے [1]۔ امام احمدؒ ان کو "علم کا ظرف" کہتے تھے [2]۔ امام ذہبیؒ نے انہیں امام، حافظ حدیث اور احد الاعلام (بڑوں میں ایک تھے) لکھا ہے۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ ان کے فضائل ومناقب بے شمار ہیں۔

علمِ تفسیر :

علم تفسیر میں جو صحابہ ممتاز تھے، ان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا نام سرِ فہرست ہے۔ تابعین میں ان کے جو تلامذہ علمِ تفسیر میں مشہور ہوئے ان میں حضرت عطاء بن ابی رباحؒ بھی ہیں۔ اُوپر ذکر آچکا ہے کہ حضرت ابن جریجؒ ان کے بہت ہی چہیتے شاگرد تھے اور سترہ برس تک ان کی خدمت میں رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ علمِ تفسیر کا جو سرمایہ حضرت عطاء بن ابی رباحؒ کو حضرت ابن عباسؓ سے ملا تھا، اس سے حضرت ابن جریجؒ کو بھی وافر حصہ ملا ہوگا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ ارباب تذکرہ ان کی اس خصوصیت کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ البتہ علومِ تفسیر کی کتابوں میں انہی کی قرآن فہمی کے بارے میں اشارات ملتے ہیں۔

امام ذہبیؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نسلاً رومی تھے۔ ارباب تذکرہ جب کسی کے بارے میں رومی یا قبطی لکھتے ہیں تو اس سے عموماً عیسائی ہی مراد لئے جاتے ہیں، یعنی ان کی وطنی نسبت کو ان کی دینی نسبت کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر صاحب فجر الاسلام نے لکھا ہے کہ یہ نصرانی تھے۔ کیونکہ طبری نے نصاریٰ کے بارے میں جو روایتیں اپنی کتاب میں درج کی ہیں، ان میں بیشتر حضرت ابن جریجؒ ہی کے ذریعہ مروی ہیں [3]۔

علمِ تفسیر میں گویا ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ کے مدرسۂ فیض سے مستفیض ہوئے تھے، مگر ان کی تفسیر پر مفسرین نے زیادہ اعتماد کا اظہار نہیں کیا ہے۔ امام سیوطیؒ نے لکھا ہے :

ان ابن جریج لم یقتصد الصحة وانماروی ماذکر فی کل آیة من الصحیح والسقیم [4]۔

"ابن جریج نے تفسیر میں زیادہ صحت کا اہتمام نہیں کیا۔ وہ ہر آیت کی تفسیر میں غلط صحیح ہر طرح کی روایتیں نقل کر دیتے ہیں"۔

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۳۔ص ۴۰۴ [2] ایضاً [3] فجر الاسلام۔ص ۲۴۶ [4] اتقان جلد ۲۔ص ۱۸۵

عموماً علمائے اُمت اہل کتاب مفسرین کے بارے میں اس طرح کی رائے دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کا ماخذ عموماً اسرائیلیات ہوتا تھا۔ جس کا سارا تار پود قصہ و افسانہ ہوتا تھا۔ جن میں نہ صحت سند کا کوئی لحاظ کیا جاتا تھا اور نہ روایت ہی سے کوئی واسطہ ہوتا تھا۔ ایسے لوگ جب مسلمان ہوئے تو اسلامی روایات میں بھی ان کی ذہنیت کسی نہ کسی حد تک باقی رہی۔ جس کی وجہ سے غلط روایات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اسلامی علوم میں شامل ہوگیا۔ خصوصیت سے علم تفسیر کے سلسلہ میں جو قصے و افسانے احادیث نبوی ﷺ کے نام سے اور جو غلط روایات رواج پذیر ہوئیں، اس میں اہل کتاب تابعین و تبع تابعین کا زیادہ تر ہاتھ تھا۔

بہرحال سقم و غلطی کے باوجود علم تفسیر میں حضرت ابن جریجؒ کا درجہ و رتبہ ہے۔ تمام مفسرین ان کی رائے نقل کرتے ہیں۔ خاص طور سے علامہ طبریؒ نے تو بے شمار جگہ ان کے اقوال نقل کئے ہیں اور ان کی مرویات سے استدلال کیا ہے۔ افسوس ہے کہ فن تفسیر میں ان کی تحریری یادگار موجود نہیں ہے، جس سے اس فن میں ان کے مرتبہ کا آسانی سے اندازہ لگایا جائے

فن قرآت میں بھی ان کو مہارت تھی۔ علامہ ابن حبانؒ نے ان کا شمار قراء اہل حجاز میں کیا ہے۔

علم حدیث :

علم حدیث میں حضرت ابن جریجؒ نے ممالک اسلامیہ کے تقریباً تمام مشہور آئمہ سے استفادہ کیا تھا۔ خاص طور سے حضرت عطاء ابن ابی رباحؒ اور عمرو بن دینارؒ کی خدمت میں وہ برسوں رہے تھے۔ اسی لئے اس فن میں بھی ان کا ایک مرتبہ ہے۔ ان کی روایات کو آئمہ حدیث نے قبول کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ "ابن جریج نے عطاءؒ سے جو روایتیں کی تھیں، ان میں انہوں نے غلطی نہیں کی ہے۔ خود ان کے اُستاد عطاءؒ کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔ کسی نے پوچھا کہ آپ کے بعد مسائل میں ہم کس کی طرف رجوع کیا کریں۔ بولے کہ ابن جریج کی طرف، پھر کہا کہ یہ اہل حجاز کے بہترین نوجوان ہیں [1]۔

ابن مدینیؒ کہتے تھے کہ حدیث نبوی ﷺ کی روایات کا دار و مدار چھ آدمیوں پر ہے۔ پھر ان چھ آدمیوں کا علم ان لوگوں کے درمیان سمٹ گیا، جنہوں نے علم حدیث کی تدوین کی اور ان تدوین کرنے والوں میں ایک حضرت ابن جریجؒ بھی ہیں [2]۔

بعض معاصر آئمہ نے ان پر جرح بھی کی ہے اور ان کی مرویات کو ضعیف قرار دیا ہے۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ جلد اول　　[2] ایضاً

حضرت یحییٰ بن سعید قطانؒ سے کسی نے پوچھا کہ ان کی روایات کیسی ہیں؟ فرمایا کہ ضعیف۔ پھر پوچھا کہ وہ اخبرنی کے لفظ سے روایت کریں تو فرمایا کہ یہ کوئی چیز نہیں ہے، ان کی مرویات بہرحال ضعیف ہیں[1]۔

حضرت ابوزرعہؒ نے بھی ان کی تضعیف کی ہے۔ امام مالکؒ ان کو حاطب اللیل (ہر غلط وصحیح روایات کا جامع) کہتے تھے۔ مگر ان کے بارے میں جرح کے جو الفاظ منقول ہیں، ان میں کسی حد تک مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ فن حدیث میں ان کے مرتبہ کی تعیین کے لئے حضرت یحییٰ بن معینؒ امام جرح وتعدیل اور امام ذہلیؒ کی رائیں زیادہ محتاط اور صحیح معلوم ہوتی ہیں۔

حضرت ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن جریجؒ نے جو روایتیں تحریر کی مدد سے بیان کی ہیں وہ قابلِ اعتماد ہیں[2]۔ مقصد یہ ہے کہ ان کی زبانی مرویات زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ان کا حافظہ معمولی درجہ کا تھا۔ اس لئے ان کو زبانی روایتیں اچھی طرح یاد نہیں رہتی تھیں۔ حضرت یحییٰ بن سعیدؒ جن کی جرح اُوپر گزر چکی ہے تحریری روایت کے بارے میں یہ بھی ابن معینؒ کے ہم خیال تھے[3]۔

امام ذہلیؒ کہتے تھے کہ ان کی زبانی روایتیں وہی قابلِ وثوق ہیں جن میں یہ حدثنی یا سمعتُ کے الفاظ استعمال کریں[4]۔

ان تمام راویوں کو پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ آئمہ نے حدیث نبوی کی جمع وترتیب میں کس قدر احتیاط برتی ہے اور ضعیف وکمزور روایتوں کو اس پاکیزہ ذخیرہ سے علیحدہ کرنے میں کتنا اہتمام کیا ہے۔ اگر کسی مسلّم امامِ حدیث سے بھی اس بارے میں کوئی لغزش ہوجاتی تھی تو اس کی لغزش کو واضح کرنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے۔

فقہ :

ابن حبان نے ان کو فقہائے اہلِ حجاز میں شمار کیا ہے۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ شافعی طرز فقہ کی داغ بیل جن آئمہ نے امام شافعیؒ سے پہلے ڈالی، ان میں ابن جریجؒ کا بھی شمار ہے۔ امام نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ امام شافعیؒ نے فقہ میں جن لوگوں سے استفادہ کیا تھا ان میں مسلم خانجی بھی شامل تھے۔ جو ابن جریجؒ کے تربیت یافتہ تھے[5]۔

۱؎ جن الفاظ سے آئمہ روایت کرتے ہیں ان میں ایک خبرنی بھی ہے۔ ۲؎ تہذیب۔ جلد۶۔ ص ۴۰۶

۳؎ ایضاً۔ جلد۶۔ ص ۴۰۴ ۴؎ ایضاً ۵؎ تہذیب الاسماء۔ جلد۲۔ ص ۲۹۸

تصنیف :

ان کا شمار ان آئمہ میں ہوتا ہے جنہوں نے علوم دینیہ کی تدوین وترتیب میں حصہ لیا۔ اربابِ تذکرہ نے ان کی کسی کتاب کا نام نہیں لیا ہے۔ البتہ ابن ندیمؒ نے لکھا ہے کہ ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''کتاب السنن'' ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اس طرز پر لکھی گئی ہے جس پر عام کتب سنن لکھی گئی ہیں، یعنی ہر ہر باب جدا جدا ہے۔ مثلاً: باب طہارت، باب الصلوٰۃ وغیرہ[1]۔ ان کی ایک تفسیر کی کتاب کا ذکر کشف الظنون میں بھی ہے۔

ان کی تصنیف کے بارے میں عام اہلِ تذکرہ امام احمدؒ کی یہ رائے نقل کرتے ہیں، کہ

اول من صنف الكتب ابن جريج وابن ابي عروبه .

(تهذيب الاسماء جلد ٢ . ص ١٩٨)

''سب سے پہلے جن لوگوں نے الگ الگ عنوانات پر کتابیں تصنیف کیں ان میں ابن جریج اور ابن ابی عروبہ سب سے مقدم ہیں''۔

مگر ہمارے سامنے اسلامی علوم کی جمع وتدوین کی جو تاریخ ہے اس کی روشنی میں یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ان بزرگوں سے بہت پہلے سے تمام اسلامی علوم، تفسیر وحدیث وغیرہ پر تصنیف کا کام شروع ہو گیا تھا۔ اس بارے میں یا تو ابن عمادؒ کی یہ رائے صحیح ہے کہ

اول من صنف الكتاب بالحجاز . (ش جلد ٢ ص ٢٢٢)

''حجاز میں سب سے پہلے ابن جریج نے جمع وتدوین کا کام شروع کیا''۔

یا پھر یہ کہا جائے کہ ابتداءً جن لوگوں نے حدیث اور فقہ پر کتابیں لکھیں ان میں موضوع وعنوان کی تقسیم نہیں تھی، بلکہ جس کو تفسیر اور فقہ کا جو ذخیرہ جس طرح مل گیا، اس نے اسی طرح مرتب کر دیا۔ حضرت ابن جریجؒ کا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اس میں فنی ترتیب قائم کر کے موضوع کے اعتبار سے حدیث نبوی ﷺ کو جمع کیا۔ چنانچہ خود بھی کہا کرتے تھے کہ میری طرح کسی نے علم کی تدوین نہیں کی[2]۔

ان کی تصانیف کے بارے میں آئمہ نے جو رائیں دی ہیں، وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ حضرت یحییٰ بن سعیدؒ کہتے ہیں ''ابن جریج کی کتابیں کتبِ امانت ہیں''۔

ان کی کتابیں ان کی زندگی ہی میں مشہور ہو چکی تھیں اور لوگ ان سے استفادہ کرنے کے لئے دور دور سے سفر کرتے تھے۔

---

[1] ابن ندیم

شیخ خالد بن نزارؒ کہتے ہیں کہ میں ۱۵۰ھ میں وطن سے اس ارادہ سے نکلا کہ ابن جریج کی کتابیں حاصل کروں۔ مگر جب منزل مقصود پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ چند دن پہلے ان کا انتقال ہو چکا[1]۔

عادات واخلاق :

ان کے اُوپر خشیت ربانی کی کیفیت ہر وقت طاری رہتی تھی۔ مشہور محدث عبدالرزاقؒ کا بیان ہے کہ جب میں ان کو دیکھتا تھا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ خدا سے ڈرتے ہیں۔ میں نے ان کے جیسا بہتر نمازی نہیں دیکھا[2]۔ ظاہر ہے کہ نماز کی رُوح خشوع وخضوع اور خشیت الٰہی ہے۔ جس کے اُوپر یہ کیفیت ہمہ وقت طاری رہتی ہو وہ نماز میں سراپا خشیت کیوں نہ بن جاتا ہوگا؟ ان کی اسی خشیت الٰہی کا اثر تھا کہ وہ شب زندہ دار ہوگئے تھے۔ امام مالکؒ ان کی شب بیداری کی وجہ سے ان کو صاحب اللیل (رات میں عبادات کرنے والا) کہتے تھے[3]۔

روزہ سے بے انتہا شغف تھا۔ پورے سال روزے رہتے تھے۔ ہر ماہ میں صرف تین دن روزے وہ چھوڑ دیا کرتے تھے[4]۔

طبیعت بہت رقیق اور اثر پذیر پائی تھی۔ یمن کے زمانۂ قیام میں حج کی سعادت سے محروم رہے تھے۔ ایک دن عمر بن ابی ربیعہؒ کے چند اشعار یاد آگئے، جن میں طول ہجر کی شکایت تھی۔

ان اشعار کا یاد آنا تھا کہ فوراً زیارت حرمین کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ اسی وقت اپنے اُستاد حضرت معین بن زائدہؒ کے پاس آئے اور ان سے اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔ اُستاد نے کہا تم نے پہلے کیوں نہ اطلاع دی۔ انہوں نے جلدی قصد کر لینے کا سبب بتایا تو اُستاد نے جلدی جلدی ان کے لئے سامانِ سفر کا انتظام کیا اور وہ دیار محبوب کی زیارت کے لئے روانہ ہوگئے[5]۔

علم کے حصول کا مقصد :

ایک بار متعدد آئمہ کا مجمع تھا۔ امام اوزاعیؒ بھی موجود تھے۔ ولید بن مسلم نے پوچھا کہ آپ حضرات نے علم کس کے لئے حاصل کیا ہے؟ سب نے کہا کہ اپنی ذات کے لئے۔ مگر حضرت ابن جریجؒ بولے کہ میں نے علم لوگوں کے فائدہ کے لئے حاصل کیا ہے[6]۔

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۱۰۔ ص ۴۰۳ [2] صفوۃ الصفوۃ جلد ۲۔ ص ۲۳ [3] ایضاً [4] تذکرۃ الحفاظ
[5] شذرات الذہب جلد اول۔ ص ۲۲۶ [6] تہذیب التہذیب جلد ۱۰۔ ص ۴۰۴

نفاستِ طبع :

خوشبو کے استعمال کے عادی تھے۔اس کے ساتھ خضاب کا بھی استعمال کرتے تھے۔

وفات :

زندگی بھر بیشتر ایام انہوں نے جوارحرم میں گزارے، مگر آخر عمر میں بصرہ چلے گئے اور وہاں پہنچ کر سلسلۂ درس شروع کردیا۔مگر عمر نے وفا نہ کی اور شروع ذی الحجہ ۱۵۰ھ میں انتقال ہو گیا[1]۔

اولاد :

دو صاحبزادے یارگار چھوڑے۔دونوں صاحب علم و فضل تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول۔ص ۱۵۳۔۵۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام اسحاق بن راہویہ رح

تابعین کے فیضِ تربیت سے جو لوگ بہرہ ور ہوئے اور ان کے بعد علوم دینیہ کی اشاعت و ترویج کی انہی میں امام المسلمین اسحاق بن راہویہ ؒ بھی ہیں۔ ان کا شمار ان اساطین اُمت میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے دینی علوم خصوصاً تفسیر و حدیث کی بے بہا خدمات انجام دی ہیں اور اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں۔

نام ونسب :

نام اسحٰق اور ابو یعقوب کنیت تھی۔ والد کا نام ابراہیم تھا مگر راہویہ کے نام سے مشہور تھا۔ عام طور پر اربابِ رجال ان کا پورا سلسلۂ نسب بیان نہیں کرتے دولابی نے ان کا پورا سلسلۂ نسب بیان کیا ہے، جس کو صاحب تہذیب نے نقل کیا ہے [1]۔ (جلد ا۔ ص ۲۱۸)

ان کا اصلی وطن مرو (ایران) تھا۔ کسی وجہ سے قیام نیشاپور میں تھا [2]۔

تعلیم وتربیت :

۱۶۱ھ یا ۱۶۳ھ میں ولادت ہوئی [3]۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حدیث کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے امام وقت عبداللہ بن مبارک ؒ کی خدمت میں گئے مگر اس کی کم سنی استفادہ میں مانع بنی، پھر دوسرے شیوخ حدیث کی مجالس درس میں شریک ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ اس وقت ممالکِ اسلامیہ میں دینی علوم کے جتنے مراکز تھے وہ سب ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور تھے مگر ابن

---

[1] عبداللہ بن طاہر امیر خراساں نے ایک بار ان سے دریافت کیا کہ آپ ابن راہویہ کے نام سے کیوں مشہور ہیں؟ اس نام سے آپ کو مخاطب کیا جائے تو آپ برا نہیں مانیں گے؟ بولے کہ میرے والد کی ولادت راستہ میں ہوئی تھی جس کی وجہ سے اہل مروان کو راہوی کہنے لگے، یہی راہوی عربی میں آکر راہویہ ہو گیا۔ میرے والد اس لفظ کو اپنے لئے پسند نہیں کرتے تھے لیکن مجھے پسند ہے۔ تاریخ بغداد جلد ۲۔ ص ۲۷۵

[2] تہذیب جلد ۲۔ ص ۲۱۶

[3] سنہ وفات میں اختلاف ہے اس اختلاف کی وجہ سے ان کی تاریخ ولادت میں بھی اختلاف ہو گیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ ۱۶۱ھ میں ولادت ہوئی اور ۲۳۸ھ میں وفات پائی۔

راہویہؒ نے ان تمام مقامات کا سفر کیا اور وہاں کے تمام ممتاز محدثین وعلمائے سے استفادہ کیا۔ خطیب بغدادی نے اس سلسلہ میں عراق، حجاز، یمن، مکہ اور شام وغیرہ کا نام لیا ہے مگر ان مقامات کی حیثیت محض ایک شہر کی نہیں تھی بلکہ یہ مملکتِ اسلام کے بڑے بڑے صوبے یا علاقے تھے جن میں سینکڑوں علمی مراکز تھے اور بے شمار جگہوں پر فقہ وحدیث کی مجلسیں برپا تھیں اس لئے ان مرکزی مقامات کی نہ جانے کتنی بستیوں کی خاک چھانی ہوگی ان کے اساتذہ کے چند نام یہ ہیں :

حضرت سفیان بن عیینہ مکہ، جریر بن عبدالحمید راموی، اسمٰعیل بن علیہ بصرہ، وکیع بن جراح یحییٰ بن آدم، ابومعاویہ، ابواسامہ کوفہ، عبدالرزاق بن ہمام، عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن مبارک خراسان۔ یہ ان کے چند مشاہیر اساتذہ کے نام دیئے گئے ہیں ورنہ یہ تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔

تفسیر :

ان کو ابتدا ہی سے علم حدیث سے شغف تھا اور اسی کے حصول میں انہوں نے سب سے زیادہ محنت وکوشش کی مگر تفسیر وفقہ وغیرہ میں بھی ان کو دسترس تھی۔ خطیب نے لکھا ہے کہ وہ حدیث وفقہ کے جامع تھے۔ جب وہ قرآن کی تفسیر بیان کرتے تھے تو اس میں بھی سند کا تذکرہ کرتے تھے۔ ابوحاتمؒ اس بارے میں کہتے ہیں کہ حدیث کے سلسلۂ روایت اور الفاظ کا یاد کرنا تفسیر کے مقابلہ میں آسان ہے۔ امام ابن راہویہؒ میں یہ کمال ہے کہ وہ تفسیر کے سلسلۂ سند کو بھی یاد کر لیتے ہیں[۱]۔

قوتِ حافظہ اور حدیث سے شغف واعتماد :

اس کدوکاش کے ساتھ خدا نے قوتِ حافظہ بھی غیر معمولی دیا تھا۔ بے شمار احادیث زبانی یاد تھیں۔ کئی کئی ہزار احادیث تلامذہ کو وہ اپنی یادداشت سے لکھا دیا کرتے تھے اور کبھی کتاب دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ خود کہتے ہیں جو کچھ سنتا ہوں اسے یاد کر لیتا ہوں اور جو کچھ یاد کر لیتا ہوں پھر نہیں بھولتا۔ فرماتے تھے، ستر ہزار حدیثیں ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتی ہیں۔ حضرت ابوزرعہؒ مشہور محدث کہتے تھے کہ ان کے جیسا قوت حفظ والا نہیں دیکھا گیا[۲]۔

ان سے ایک بار کہا گیا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کو ایک لاکھ حدیثیں زبانی یاد ہیں۔ فرمایا کہ میں ایک دو لاکھ کچھ نہیں جانتا، مگر میں نے آج تک جتنی حدیثیں سنی ہیں وہ سب یاد ہیں۔ ابوداؤد خفاف جو ان کے تلامذہ میں ہیں کہتے تھے کہ ایک بار گیارہ ہزار حدیثیں انہوں نے املا کرائیں اور پھر ان کو دوبارہ دہرایا تو ایک حرف کا فرق نہیں تھا[۳]۔

۱؎ تہذیب التہذیب حصہ اول۔ ص ۲۱۸　　۲؎ تاریخ بغداد　　۳؎ ایضاً

حدیث سے شغف کا نتیجہ :

خدادادا استعداد و صلاحیت اور قوتِ حافظہ کے ساتھ حدیث سے ان کے شغف و انہماک نے جلد ہی ان کو تبع تابعین کے زمرہ میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک بنادیا۔ بڑے بڑے آئمہ حدیث ان کے فضل و کمال کے معترف اوران کے جلالت کے قائل ہوگئے۔

امام ابن خزیمہ ؒ کہتے تھے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو اپنے علم و فضل کی بنا پر اس زمرہ میں بھی ایک ممتاز حیثیت حاصل کرتے۔

امام احمد بن حنبل ؒ کے سامنے جب کوئی شخص ابن راہویہ [۱] کہتا تھا تو ان کو بُرا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ خراسان کے علاقہ میں ان کے زمانہ میں ان کے جیسا صاحب علم آدمی نہیں پیدا ہوا۔ گو ہمارے اوران کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلاف تھا۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اختلاف تو ہر زمانہ کے اہلِ علم میں ہوا ہے۔

مقصد یہ تھا کہ اختلاف کی بناء پر کسی کے فضل کا اعتراف نہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ حضرت یحییٰ بن یحییٰ ؒ ایک ممتاز محدث تھے۔ ان کے پاس جب امام ابن راہویہ ؒ آتے تھے تو وہ ان کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ ان کے قریب کے لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ وہ تو آپ سے عمر میں بھی چھوٹے ہیں۔ ان کی اتنی عزت افزائی کیوں کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ

اسحاق اکثر منی و انا اسن منه [۲]۔

''اسحاق علم میں مجھ سے بڑے ہیں اور میں عمر میں ان سے بڑا ہوں''۔

انہی کا قول ہے کہ اسحاق کے پاس علم کا خزانہ ہے [۳]۔ حضرت محمد بن یحییٰ الذہلی ؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار ۱۹۹ھ میں امام اسحاق بن راہویہ ؒ کے ساتھ رصافہ گیا۔ یہاں پر تمام معاصر آئمہ حدیث مثلاً: احمد بن حنبل ؒ، یحییٰ ابن معین ؒ وغیرہ جمع تھے مگر اس مجلس کے صدر نشین امام اسحاق بن راہویہ ؒ بنائے گئے [۴]۔

درس و تدریس :

اس بارے میں اہلِ تذکرہ کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتے۔ مگر جستہ جستہ واقعات سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ تحصیل علم اور سماع حدیث کے بعد ان کا قیام زیادہ تر نیشاپور میں رہتا تھا۔ گویا جگہ اسلامی مملکت کے مرکزی مقامات سے بہت دور تھی۔ پھر اس زمانہ میں سفر کی دقتیں بھی

---

[۱] کہ اس میں ایک اہانت کا پہلو تھا۔ [۲] تاریخ ابن عساکر جلد ۲۔ ص ۴۴۰ [۳] تاریخ بغداد [۴] ایضاً

وہاں تک پہنچنے میں مانع تھیں۔ مگر اس کے باوجود صدہا تشنگان علم اس چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ خصوصیت سے خراسان کے علاقہ میں ان کا علم کافی پھیلا۔ خطیب کا بیان ہے کہ ان کا علم خراسانیوں میں خوب پھیلا۔ ہب ابن جریر کا بیان ہے کہ مشرق میں جن لوگوں نے سنت کو زندہ کیا ان میں اسحاق بن راہویہ بھی ہیں [۱]۔

ان سے جن لوگوں نے اکتساب فیض کیا ان میں امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائی، امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین رحمہم اللہ وغیرہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ان تمام آئمہ نے اپنی اپنی کتابوں میں اسحاق ابن راہویہ کی مرویات نقل کی ہیں۔

امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ان کبار آئمہ کے علاوہ خلق کثیر نے اس سے روایت کی ہیں۔

حضرت یحییٰ بن آدمؒ ان کے شیوخ میں ہیں، مگر انہوں نے اس سے تقریباً دو ہزار روایتیں نقل کی تھیں۔

طریقۂ درس :

عام طور پر آئمہ حدیث کا طریقہ درس یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ انہیں املا کرانا ہوتا تھا، اُسے وہ پہلے سے لکھ کر لے جاتے تھے۔ مگر بہت سے آئمہ حدیث کو اپنے حفظ پر اتنا اعتماد ہوتا تھا کہ وہ زبانی املا کراتے تھے۔ ان ہی میں امام اسحاق بن راہویہؒ بھی تھے۔ اُوپر ذکر آچکا ہے کہ بسا اوقات وہ کئی کئی ہزار روایتیں ایک مجلس میں زبانی املا کر دیتے تھے۔

تنقید حدیث :

کہتے تھے کہ جو ذخیرۂ حدیث میرے پاس ہے ان میں ایک لاکھ حدیثوں کے موقع ومحل سے اس طرح واقف ہوں کہ وہ گویا میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان میں ستر ہزار تو مجھے مع معانی حفظ ہیں اور چار ہزار مزوّرہ حدیثیں اور مجھے یاد ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ مزوّرہ حدیثوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ جھوٹی اور موضوع روایتیں جنہیں میں نے اس لئے یاد کر لیا ہے کہ جب وہ روایتیں صحیح احادیث کے ساتھ مخلط ہو کر میرے سامنے آئیں تو ان میں جتنا حصہ کذب اور وضع کا ہے اسے الگ کر دوں اور صحیح حدیث کا جتنا حصہ ہے اس کو علیحدہ کر دوں۔

---

[۱] تاریخ بغداد۔ ص ۳۷۶

ان کی اس خدمت کی اہمیت کا اندازہ پورے طور پر اسی وقت ہوسکتا ہے جب دوسری صدی کے اس فتنہ کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے، جس کے ذریعہ ہزاروں بے سروپا روایتیں احادیث نبوی ﷺ کے نام سے لوگوں میں رواج پاگئی تھیں اور نہ جانے کتنی موضوع روایتیں زبان زد خاص وعام ہوگئی تھیں۔ اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے آئمہ حدیث نے جو کدو کاوش اور جدوجہد کی اور اس کے لئے دکھ سہے اس کا صحیح اندازہ تو یحییٰ بن معینؒ، عبدالرحمٰن مہدی، ابن المدینی، احمد بن حنبل وغیرہ کے حالات سے ہوگا، مگر اس صدی کے دوسرے آئمہ کے سوانح حیات میں بھی اس قسم کی کوششوں کی کوئی نہ کوئی جھلک ملتی ہے۔ اس طرح کی کوشش حضرت اسحٰق بن راہویہؒ نے بھی کی تھی۔

اہلِ علم سے مذاکرات :

اجتہادی مسائل میں اربابِ علم کے درمیان ہمیشہ مذاکرہ ومباحثہ ہوتا رہا ہے۔ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، یہ دونوں بزرگ امام اسحاق بن راہویہؒ کے معاصر تھے۔ اس لئے ان میں بھی بعض دینی مسائل میں مذاکرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اہلِ تذکرہ نے خصوصیت سے دو مسئلوں کا ذکر کیا ہے۔

ایک مسئلہ یہ تھا کہ مکہ کے اندر مکانات ہیں، ان پر ان کے رہنے والوں کا حق ملکیت بھی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ ان کو کرایہ وغیرہ پر اُٹھا سکتے ہیں یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو پھر ان کو بیع کرنے یا کرایہ پر دینے کا اختیار ہے یا نہیں؟ امام شافعیؒ ملکیت کے قائل تھے اور امام اسحاق بن راہویہؒ مکہ کی سرزمین پر کسی کی ملکیت تسلیم نہیں کرتے تھے۔

اتفاق سے ایک بار مکہ میں ان دونوں بزرگوں کا اجتماع ہوگیا۔ امام احمدؒ بھی موجود تھے۔ امام اسحاق بن راہویہؒ چونکہ اس مسئلہ میں بہت سخت تھے، اس لئے انہوں نے امام شافعیؒ کے سامنے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ امام شافعیؒ نے اس سے اختلاف کیا اور اپنے اس اجتہاد پر قرآن کی اس آیت کا استدلال کیا۔

للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم .

''ان فقیر مہاجرین کے لئے جن کو ان کے گھروں سے نکالا گیا''۔

ان کا استدلال یہ تھا کہ اس آیت میں دیار کی نسبت ان کے مالکوں کی طرف کی گئی ہے۔ پھر حدیث سے انہوں نے حجت قائم کی۔ وہ یہ کہ فتح مکہ کے دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنے گھر کا

دروازہ بند کرلے وہ مامون ہے۔ پھر فرمایا کہ ابوسفیان کے مکان میں داخل ہو جائے اس کو امن ہے پھر فرمایا کہ عقیل نے تو ہمارے لئے کوئی مکان نہیں چھوڑا [۱] (جس میں ہم ٹھہر سکیں)۔

حضرت عمرؓ کے اسوہ سے استدلال کرتے ہوئے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ انہوں نے جیل خانہ کے لئے کچھ لوگوں سے ان کے مکانات خرید لئے تھے۔

امام اسحاق بن راہویہؒ نے دلائل سن کر فرمایا کہ مگر بعض تابعین میرے خیال کی تائید کرتے ہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں تو رسول اللہ ﷺ کا قول پیش کرتا ہوں اور آپ تابعین کی رائے سے استدلال کرتے ہیں۔ امام اسحاق بن راہویہؒ نے پھر قرآن کی اس آیت کو استدلال میں پیش کیا:

سواء العاکف فیہ والباد.

''اس میں مقیم و مسافر دونوں برابر ہیں''۔

اس کے جواب میں امام شافعیؒ نے فرمایا یہ تو مسجد حرام کے بارے میں ہے۔ مکہ کی عام زمین اس سے مراد نہیں ہے۔

اسی طرح ایک اور مسئلہ میں بھی مذاکرہ ہوا۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ مردہ جانور کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے یا نہیں؟ امام شافعیؒ پاکی کے قائل تھے اور امام اسحاق بن راہویہؒ عدم جواز کے [۲]۔

عادات واخلاق:

عادات واخلاق اور زہد و تقویٰ سے بھی وہ ممتاز تھے۔ تمام اہل تذکرہ لکھتے ہیں، وہ صدق وصفا، ورع و تقویٰ میں ممتاز تھے۔ ان کے تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کے بارے میں یہ آیت مثال کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء.

''خدا کے بندوں میں اس سے اس کو جاننے والے ہی ڈرتے ہیں''۔

ایک بار امیر خراسان علی بن طاہر کے پاس گئے۔ ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں۔ وہ کھاتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے ان کی بے نیازی اور سادگی کو دیکھ کر کہا، اگر تم نے یہ کسی ریا کی وجہ سے نہیں کیا تو دنیا میں تم زیادہ بے ریا میں نے نہیں دیکھا [۳]۔

۱؎ حضرت عقیلؓ حضرت علیؓ کے چھوٹے بھائی تھے۔ جب آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ وغیرہ مکہ سے ہجرت کر گئے تو حضرت عقیلؓ نے اپنا اور آنحضرت ﷺ کا مکان فروخت کر ڈالا۔ یہ اسی طرف اشارہ ہے۔

۲؎ طبقات الشافعیہ جلد اول ص ۲۳۶　　۳؎ ابن عساکر جلد ۲ ص ۴۱۴

اس سادگی کے باوجود زندگی زیادہ تر عشرت ہی میں بسر ہوئی تھے۔ وہ ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ ایک بار تیس ہزار درہم ان پر قرض ہو گئے۔ یحیٰؒ نے جوان کے علم وفضل کے قائل تھے۔ علی طاہر امیر خراسان کا ایک رُقعہ لکھا کہ ان کا قرض ادا کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کا قرض ادا کر دیا [1]۔

شیخ وہب بن جریرؒ فرماتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ اسحاق بن راہویہ صدقہ اور عمر کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے مشرق میں سنت کو زندہ کیا [2]۔

علامہ ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ امام اسحاق بن راہویہؒ نے سنت نبوی ﷺ کی ترویج کی۔ جھوٹی روایتوں کو احادیث نبوی سے الگ کیا اور جن لوگوں نے سنت کی مخالفت کی ان کا پورا مقابلہ کیا [3]۔

تصنیف :

انہوں نے اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں۔ مگر اس وقت ان کے موجود ہونے کا کوئی علم نہیں ہے۔ علامہ ابن حبانؒ نے تو صرف اتنا لکھا ہے :

وصنف الکتب

"انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں"۔

مگر اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔

ابن ندیمؒ نے البتہ ان کی دو تصانیف کا تذکرہ کیا ہے۔

(۱) کتاب السنن فی الفقہ　　　(۲) کتاب التفسیر

امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ تابعین کے بعد جن لوگوں نے فنِ تفسیر کو زندہ کیا ان میں اسحاق بھی ہیں [4]۔

وفات :

ان کی قبر آج بھی زیارت گاہ خلائق ہے۔ علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ان کی قبر مشہور ہے اور لوگ اس کی زیارت کو جاتے ہیں۔

یہ صاحبِ مذہب تھے :

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ یہ فقہ میں ایک مسلک کے بانی تھے۔ جسے اسحاقیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد اول۔ ص ۲۳۴　[2] ابن عساکر جلد ۲۔ ص ۴۱۴　[3] تہذیب جلد اول۔ ص ۲۱۹
[4] انتصار علوم الحدیث ص ۸۹

اسحٰق بن راھویہ قد کان اماما متبعا له طائفة يقلد ونه ويجتهد واعلى مسلكه[1]۔

''اسحاق بن راہویہ امام وقت تھے۔ایک گروہ ان کی تقلید کرتا تھا اوران کے مسلک کے مطابق مسائل کا استنباط اوراجتہاد کرتا تھا''۔

اس بات کا علم نہیں ہوسکا کہ یہ مسلک کہاں پروان چڑھا۔ کتنے دنوں تک زندہ رہا اور کب فنا ہوگیا۔

---

[1] اختصار علوم الحدیث۔ص ۸۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت سفیان بن عیینہ رحؒ

حضرت سفیان بن عیینہ کے علم و فضل اور دیانت و تقویٰ کا ہر کہ دمہ معترف و مداح ہے۔ زمرہ تبع تابعین میں حدیث نبوی ﷺ کی تدوین کا کام جن بزرگوں نے انجام دیا، ان میں حضرت سفیان بن عیینہؒ کا نام سرِ فہرست ہے۔ ان کا ایک زرین کارنامہ یہ بھی ہے کہ کلام الٰہی کے وہ لفظی و معنوی رموز و نکات جواب تک سینوں میں محفوظ چلے آرہے تھے، ان کو وہ صفحہ قرطاس پر لائے۔ گو اس خدمت میں ان کے دوسرے معاصر بزرگ مثلاً اسحاق راہویہ، سفیان ثوری وغیرہ بھی شریک ہیں اور ان میں سے بعض بزرگوں کی تفسیریں تو آج تک موجود ہیں۔

حضرت سفیان بن عیینہ کی تفسیر کے اس وقت موجود ہونے کا کوئی علم ہمیں نہیں ہے، مگر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی تک وہ اہلِ علم میں متداول رہی اور اس کا فیض ہندوستان تک پہنچا تھا۔ حضرت محمد بن ابراہیم دیبلی (سندھ) جو تیسری صدی کے ہندوستانی عالم ہیں۔ ان کے ذکر میں یہ فقرہ ملتا ہے:

یروی کتاب التفسیر لا بن عینیہ [1]۔

''یہ ابن عیینہ کی تفسیر کی روایت کرتے ہیں''۔

خاندان :

حضرت سفیان بن عیینہؒ غلام خاندان کے ایک فرد تھے۔ ان کے والد کا نام عیینہ اور دادا کا نام ابو عمران میمون تھا [2]۔ ان کے والد والی کوفہ خالد بن عبداللہ القسری کے عمال میں تھے [3]۔ مگر ۱۲۰ھ میں ہشام نے خالد کو معزول کر دیا اور ان کے بجائے یوسف بن عمر ثقفی کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔

---

[1] نزہۃ الخواطر۔ جلد اول ص ۰۷ [2] بعض اہلِ تذکرہ نے ابو عمران ان کے دادا کا نام لیا ہے۔ (ابن خلکان) اور بعض نے ابو عمران عیینہ کی کنیت بتائی ہے (تہذیب)۔

[3] اس بارے میں اہلِ تذکرہ کے درمیان اختلاف ہے کہ ان کے عمال حکومت میں تھے یا والد۔ ابن سعد نے ان کے والد ہی کو لکھا ہے اور زیادہ قرین قیاس یہی ہے۔ اس لئے ہم نے اس بیان کو ترجیح دی ہے۔

یوسف کو خالد سے پرانی پرخاش تھی، اس لئے اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی خالد کے عمال سے بدلہ لینا شروع کردیا۔ حضرت سفیان کے والد عیینہ بھی عتاب میں آئے، مگر وہ کسی طرح چھپ کر کوفہ سے مع اہل وعیال مکہ آگئے اور جوار خدا میں پناہ لی اور بعد میں یہیں سکونت اختیار کرلی۔ اس وقت امام ابن عیینہ کی عمر ۱۳ سال تھی۔ ان کا خاندان اپنے علم وفضل کی وجہ سے ممتاز تھا۔ ان کے نو بھائی تھے، جن میں پانچ صاحبِ علم وفضل تھے۔

ولادت اور تعلیم وتربیت :

حضرت سفیان بن عیینہ ؒ کی ولادت ہشام کے عہدِ خلافت میں ۱۰۷ھ میں کوفہ میں ہوئی۔ کوفہ اس وقت فقہائے محدثین کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں کی ہر مسجد مدرسہ تھی اور ہر گھر سے قال اللہ اور قال الرسول کی آواز سنائی دیتی تھی۔ حتیٰ کہ ایوان حکومت کے تاجدار بھی اپنی تمام بے راہ ریوں کے باوجود اس آواز سے مانوس تھے۔ غرض اسی روح پرور ماحول میں امام کا نشو ونما ہوا۔ اور یہیں ان کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا۔

آئمہ میں بیشتر ایسے گزرے ہیں جن کے والدین غریب تھے یا ان کے سنِ شعور سے پہلے انتقال کرچکے تھے۔ اس لئے ان میں بہت کم ایسے بزرگ ہیں، جن کی تعلیم وتربیت کسی خاص نظم وتربیت سے ہوتی ہو۔ مگر امام سفیان بن عیینہ ان خوش قسمت لوگوں میں تھے، جن کے والدین زمانہ تعلیم وتربیت میں زندہ تھے اور مالی اعتبار سے مطمئن بھی تھے، اس لئے ان کی تعلیم باقاعدہ ہوئی۔

ابھی چار برس کی عمر تھی کہ حفظ قرآن کے لئے بٹھادیا گیا۔ ۷ برس کی عمر میں اس سے فارغ ہوگئے۔ حفظ قرآن کے بعد حدیث کی کتاب شروع کرادی گئی۔ غالباً یہ اس لئے کیا گیا کہ کلام الٰہی کے ساتھ بچپن ہی میں ارشاداتِ نبوی ﷺ کا کچھ ذخیرہ بھی ان کے سینے میں محفوظ ہوجائے۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۵ برس کی عمر تک جاری رہا۔ اس عمر کو پہنچ جانے اور والدین کی پوری توجہ کے باوجود اب تک طبیعت میں حصول علم کا پورا شوق نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس کے لئے ان کے والد ہمیشہ ان کو نصیحت کرتے اور احساس ذمہ داری دلاتے رہتے تھے۔ ان کی ایک نصیحت کے الفاظ تذکروں میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے ایک دن کہا :

”پیارے بیٹے! بچپن کا زمانہ ختم ہوا اور تم اب سنِ شعور کو پہنچے۔ اب پورے طور سے خیر کی طلب یعنی حصول علم دین میں لگ جاؤ، مگر اس راہ میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے

کہ اہل علم کی اطاعت وخدمت کی جائے۔اگر تم ان کی اطاعت وخدمت کرو گے تو علم و فضل کی دولت سے بہرہ مند ہو گئے [۱]۔

یہ نصیحت ان کے دل میں گھر کر گئی۔خود کہتے ہیں کہ میں نے والد کی اس نصیحت کو زندگی بھر حرز جان بنائے رکھا اور کبھی اس سے سر مو تجاوز نہ کیا۔

اس کی تصریح تو نہیں ملتی کہ یہ نصیحت کہاں کی، مکہ میں یا کوفہ میں۔مگر قرین قیاس یہ ہے کہ نصیحت مکہ ہی میں کی گئی۔اس لئے کہ ان کا خانوادہ مکہ سے کوفہ ۱۲۰ھ میں گیا۔جب کہ ان کی عمر ۱۴ یا ۱۵ سال کی تھی اور خود ان کا بیان ہے کہ یہ ۱۲۲ھ سے بالتزام مکہ کے آئمہ حدیث کی خدمت میں جانے لگے تھے۔ظاہر ہے کہ یہ التزام واحساس ذمہ داری ان میں پہلے نہیں تھا، جب ہی تو ان کے والد نے یہ نصیحت کی تھی۔اس لئے یہ نصیحت یقیناً مکہ میں کی گئی ہو گی۔

مکہ اس وقت آئمہ تابعین کا گہوارہ تھا۔امام زہری، عمرو بن دینارؒ، ابن جریجؒ اور بہت سے سر آمد وروزگار آئمہ قرآن وسنت کی مجالس درس میں شریک ہونے لگے اور جب تک مکہ میں رہے، ان سے جدا نہیں ہوئے [۲]۔۱۲۶ھ میں حضرت عمرو بن دینارؒ کا انتقال ہو گیا۔جس سے یہ چشمۂ فیض تو بند ہو گیا مگر ابھی دوسرا چشمۂ علم جاری تھا کہ نہ جانے کیا اسباب ہوئے کہ یہ مکہ سے پھر کوفہ چلے گئے [۳]۔

ذہانت اور شوق جستجو :

بچپن ہی سے نہایت ذکی اور ذہین تھے۔ان آئمہ کی خدمت میں ان کی ذہانت وذکاوت کو مزید جلا ہوئی اور ان میں ایسی وقت نظری اور قوت پیدا ہو گئی کہ بڑے بڑے آئمہ ان کا اعتراف کرنے لگے۔علامہ ابن جریجؒ جو ممتاز تبع تابعین میں ہیں۔مکہ میں ان کی مجلسِ درس برپا تھی۔ایک دن سفیانؒ ان کی خدمت میں گئے۔ابن جریجؒ کوئی روایت بیان کر رہے تھے، جس میں انہوں نے صحابی کے نیچے کے راوی کا نام نہیں لیا، بلکہ یہ کہا کہ مجھ سے ایک شخص نے بیان کیا ہے کہ ابن عباسؓ یہ فرماتے ہیں۔ابن عیینہ کو راوی کے نام نہ لینے کی وجہ سے خلش ہوئی اور انہوں نے اس کی تلاش کی۔معلوم ہوا کہ وہ راوی ابھی زندہ ہے۔تحقیق کے بعد وہ دوبارہ ابن جریجؒ کے پاس پہنچے۔اتفاق سے اس دن بھی وہ اسی روایت کو دہرا رہے تھے۔جب انہوں نے یہ کہا کہ ایک شخص نے مجھ سے یہ بیان کیا ہے،

---

[۱] تہذیب الاسماء۔جلد اول۔ص ۲۴۵ [۲] تاریخ بغداد۔جلد ۹۔ص ۱۷۷ [۳] ایضاً۔ص ۱۸۳

تو یہ بولے۔ ابوالولید اس کے راوی تو عبید اللہ بن ابی یزید ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ آپ تحقیق کر لیتے تو سلسلہ سند کا ابہام دور ہو جاتا۔ ابن جریجؒ یہ سن کر بولے:

قد غصت علیه یا غواص [۱]

''اے بحر تحقیق کے غواص تم نے ڈوب کر حقیقت دریافت ہی کر لی''۔

قوتِ حافظہ:

خدا نے قوت حافظہ بھی غیر معمولی عطا فرمایا تھا۔ اپنی قوت حافظہ کے بارے میں خود ہی فرماتے تھے کہ

ما کتبت شیئاً قط الا شیاحفظته [۲]۔

''میں جس چیز کو ضبط تحریر میں لایا وہ مجھے یاد ہوگئی''۔

حضرت سفیان بن عیینہؒ کے اساتذہ کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ صرف تابعین میں اسی ۸۰ سے زائد بزرگوں سے انہوں نے کسب فیض کیا تھا [۳]۔ چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:

امام زہری، امام شعبہ، مسعر بن کدام، عمر بن دینار، ابواسحاق السبیعی، محمد بن عقبہ، حمید الطویل، زیاد بن علاقہ، صالح بن کیسان رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

درس وتدریس:

مکہ میں ۵-۶ برس رہنے کے بعد ۱۲۶ھ میں جب کہ ان کی عمر ابھی ۱۹-۲۰ برس تھی، مکہ سے اپنے آبائی وطن کوفہ چلے آئے۔ یہاں بھی آئمہ تابعین وتبع تابعین کی متعدد مجلسیں قائم تھیں اور ان سب سے انہوں نے استفادہ کیا تھا۔ مگر خاص طور سے وہ مسعر بن کدامؒ کی صحبت میں زیادہ رہے۔ گو یہ خود اس وقت مرجع خلائق تھے۔ مگر انہوں نے ابن عیینہ سے خواہش کی کہ وہ تحدیث روایت کا سلسلہ شروع کریں۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ کے سینہ میں گو امام زہری اور عمرو بن دینار کی مرویات کے خزینے محفوظ تھے۔ مگر انہوں نے کم سنی کی معذرت کی۔ حضرت مسعرؒ کدامؒ نے کہا کہ آپ کے پاس امام زہری اور عمرو بن دینار کا سرمایۂ روایات موجود ہے تو پھر آپ کو کم سنی کی پرواہ نہ کرنی چاہئے۔ مقصد یہ تھا کہ اس راہ میں عمر کی نہیں بلکہ علم وفہم کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے آپ بہرہ ور ہیں۔ غالباً انہی کے مشورے کے بعد انہوں نے اپنا سلسلۂ درس شروع کیا۔

کوفہ جس وقت پہنچے، اس وقت وہاں سب سے وسیع حلقۂ درس امام ابوحنیفہؒ کا تھا۔ ان کو یہ فخر حاصل ہے کہ جب امامؒ کو ان کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے تلامذہ اور عام اہل کوفہ سے کہا کہ

۱۔ تاریخ بغداد۔ جلد ۹۔ ص ۱۸۲　　۲۔ ایضاً۔ ص ۱۷۹　　۳۔ ایضاً

تمہارے پاس عمرو بن دینار کی مرویات کا حافظ آ گیا ہے۔ چنانچہ لوگ ان کی مرویات سے اخذ و استفادہ کرنے کے لئے ان کے پاس آنے لگے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ مجھ کو جس نے سب سے پہلے محدث بنایا وہ امام ابوحنیفہ ؒ ہیں [1]۔

کوفہ میں اس وقت امام اعمش ؒ اور امام شعبہ ؒ کے درس کا بھی ہر طرف چرچا تھا مگر جب ابن عیینہ ؒ نے درس دینا شروع کیا تو ان آئمہ کے تلامذہ بھی ان کی مجلس درس میں شریک ہونے لگے۔ عبداللہ بن داؤد ؒ کہتے ہیں کہ ہم لوگ امام اعمش کے درس میں شریک تھے کہ کسی نے آ کر یہ اطلاع دی کہ سفیان بن عیینہ ؒ نے بھی تحدیث شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ہم لوگ اعمش کی مجلس سے اُٹھے تو ان کے درس میں شریک ہوئے۔ اہلِ تذکرہ ان کی جلالتِ علم کے ذکر میں اسی بات کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے امام اعمش ؒ کی زندگی ہی میں اپنی مجلس درس قائم کر دی تھی [2]۔

امام شعبہ ؒ اپنے تلامذہ سے کہا کرتے تھے کہ جس کو عمرو بن دینار ؒ کی مرویات مطلوب ہوں اس کو ابن عیینہ ؒ کے پاس جانا چاہئے [3]۔

امام اعمش ؒ اور امام شعبہ ؒ ان کے شیوخ حدیث میں سے ہیں۔ مگر ان دونوں بزرگوں نے بھی ان سے سماع حدیث کیا تھا۔ بغدادی نے لکھا ہے کہ ایک بار ابن عیینہ امام اعمش کی مجلس درس میں گئے اور پچاس حدیثیں بیان کیں۔ اسی طرح امام شعبہ ؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے ان سے سو روایتیں سنی ہیں [4]۔

حضرت سفیان بن عیینہ ؒ ہر سال زیارت حرمین کے لئے جاتے تھے۔ ان کے درس میں یوں بھی طلباء کا ہجوم رہتا تھا مگر حج کے زمانہ میں جب کہ سارے ممالک اسلامیہ کی آبادی مکہ میں سمٹ آتی تھی۔ سماع حدیث کے لئے ان کے پاس ایک اژدہام ہوتا تھا۔ بلکہ بہت سے تشنگانِ چشمۂ نبوت تو اسی غرض کے لئے سفر حج کی مشکلیں برداشت کرتے تھے۔ امام ذہبی ؒ لکھتے ہیں :

فقد کان خلق یحجون و الباعث لقاء ابن عیینہ فیزد حمون علیه فی ایام الحج [5]۔

''ایک مخلوق حج کے لئے اسی لئے جاتی تھی کہ سماع حدیث کے لئے ابن عیینہ کی ملاقات نصیب ہو، چنانچہ حج کے زمانہ میں ان کے گرد ایک اژدہام ہوتا تھا''۔

---

[1] ابن خلکان۔ جلد اول۔ ص ۳۷۶ [2] بغدادی۔ جلد ۹۔ ص ۱۷۵ [3] ایضاً۔ ص ۱۸۰
[4] ایضاً۔ جلد ۹۔ ص ۱۷۵ [5] تاریخ بغداد۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۵

معاصرین میں ان کا علمی مقام :

امام زہری اور عمرو بن دینارؒ کے تلامذہ سارے ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے تھے، مگر ان آئمہ کے جو تلامذہ سب سے زیادہ قابل وثوق اور معتمد سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سفیان بن عیینہؒ بھی تھے، بلکہ بعض حیثیتوں سے یہ سب میں ممتاز تھے [۱]۔ ابن المدینیؒ کا بیان ہے کہ

مافی اصحاب الزھری اتقن من ابن عیینه [۲]۔

''زہری کے تلامذہ اور اصحاب میں سب سے قابل وثوق ابن عیینہ کی ذات تھی''۔

ایک شخص نے ابن المدینی سے پوچھا کہ زہریؒ کے تلامذہ میں مقدم کون ہے؟ بولے! تقدم تو مجھے حاصل ہے مگر ان کے اصحاب میں جن کے سماع میں شک نہیں کیا جاسکتا نہ ان پر کسی نے کلام کیا ہے اور نہ زبان کھولی ہے، وہ سفیان بن عیینہؒ اور زیاد بن سعدؒ ہیں [۳]۔

ان ہی کا بیان ہے کہ میں نے سعید القطانؒ سے پوچھا کہ امام زہریؒ کے فیض یافتوں میں آپ معمر اور سفیان بن عیینہؒ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟ بولے سفیان کو [۴]۔

اسی طرح عمرو بن دینارؒ کی مرویات کے بھی یہ سب سے بڑے امین سمجھے جاتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سفیان عمرو بن دینار کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ یحییٰ بن معینؒ نے ایک دن کہا کہ سفیان عمرو بن دینارؒ کی مرویات کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ کسی نے پوچھا کہ حماد بن زید سے بھی زیادہ؟ بولے ہاں۔ پھر پوچھا کہ اگر عمرو بن دینارؒ کی کسی روایت میں سفیان ثوریؒ اور سفیان بن عیینہؒ کے درمیان اختلاف ہو جائے تو آپ کس کو ترجیح دیں گے؟ بولے ابن عیینہؒ کو۔

اوپر امام شعبہؒ کا قول گزر چکا ہے کہ جس کو عمرو بن دینار کی روایت مطلوب ہوں وہ ابن عیینہ کے پاس جائے [۵]۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ تمام حفاظ حدیث کا اس امر پر اتفاق ہے کہ عمرو بن دینار کی مرویات کے سب سے زیادہ قابل وثوق راوی یہی ہیں [۶]۔

فنِ حدیث میں ان کا اصلی مقام :

اوپر جو اقوال نقل کئے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ مکہ میں حدیث نبوی کا جو ذخیرہ تھا، اپنے زمانہ میں اس کے یہ سب سے بڑے محافظ سمجھے جاتے تھے، مگر یہ ان کے علم و فضل کا ایک گوشہ تھا۔ حدیث میں ان کے اصلی مقام کو سمجھنے کے لئے ہمعصر علماء کے چند اور اقوال پر نظر ڈال لینی ضروری ہے۔

۱۔ تذکرہ۔ جلد اول۔ ص ۲۳۹ ۲۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۱۹ ۳۔ تاریخ بغداد۔ جلد ۹۔ ص ۱۸۷
۴۔ ایضاً ۵۔ ایضاً ۶۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۱۶

جہاں تک روایتوں کی کثرت اور ان کے حفظ اور ضبط تحریر میں لانے کا تعلق ہے، اس میں ان کو کوئی انفرادی امتیاز حاصل نہیں تھا۔ ان کی مرویات کی کل تعداد ۷ ہزار بتائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنا کوئی مجموعہ بھی نہیں چھوڑا۔ اس کے برخلاف اتباع تابعین میں بہت سے بزرگوں کے سینوں میں ان سے کہیں زیادہ روایتیں محفوظ تھیں اور ان میں سے بہتوں نے اپنے مجموعہ ہائے حدیث بھی یادگار چھوڑے تھے۔ اتباع تابعین کے زمرہ میں جو چیز ان کو ممتاز کرتی ہے، وہ حدیث نبوی ﷺ کا فہم، تفسیر، حدیث کا ملکہ اور وثوق واعتماد ہے۔ ان اوصاف میں کم لوگ ان کے ہمعصر تھے۔ احمد بن عبداللہؒ کا بیان ہے کہ ''ان کا شمار حکمائے حدیث میں ہوتا تھا، گوکہ ان کی روایتیں صرف ۷ سات ہزار تھیں اور انہوں نے کوئی حدیث کا مجموعہ بھی نہیں چھوڑا[1]۔

امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ میں نے ان کے جیسا حدیث کی بہتر تفسیر وتشریح کرنے والا نہیں دیکھا[2]۔ ان ہی کا قول ہے کہ علم میں جتنی پختگی اور وثوق واعتماد ان کو تھا، میں نے کسی دوسرے میں نہیں دیکھا[3]۔

حضرت عبدالعزیز بن ابی داؤدؒ کہتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ کی مجلس میں جب اصحاب حدیث نہیں ہوتے تھے تو وہ مرسل روایتوں کے بجائے مسند روایتیں بیان کرتے تھے۔ میں جب ان مسند روایتوں کو سن کر ان کی مجلس سے اُٹھتا تو ابن عیینہؒ کے پاس جاتا اور ان روایتوں کو ان کے سامنے پیش کرتا، وہ کہتے کہ اس میں یہ غلطی اور اس میں یہ خامی ہے۔ پھر میں امام ثوریؒ کے پاس آتا اور ان سے ابن عیینہؒ کی تنقید کا ذکر کرتا تو فرماتے کہ بھائی ابن عیینہ نے جو کہا ہے، وہ صحیح ہے[4]۔

مشہور امام جرح وتعدیل عبدالرحمن بن مہدیؒ سے کسی نے پوچھا کہ حدیث میں ابن عیینہؒ کا کیا مقام ہے؟ بولے، ان کو حدیث کی تفسیر اور حدیث کے متفرق الفاظ کے جمع کرنے میں مہارت حاصل تھی[5]۔ وہ حدیث کی تشریح میں بے جا تاویل کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خصوصیت سے زجر وتوبیخ کے سلسلہ میں ارشادات نبوی ﷺ کی ایسی تاویل وتفسیر جو بے خوفی پیدا کردے، غلط سمجھتے تھے۔ ایک بار فرمایا کہ اس حدیث:

من غشّنا فليس منا و حمل علينا فليس منا .

''جس نے فریب کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔ جس نے مسلمانوں پر حملہ کیا وہ مسلمان نہیں ہے''۔

۱؎ تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۲۴۴	۲؎ ایضاً	۳؎ تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۲
۴؎ تاریخ بغداد۔ جلد ۹۔ ص ۱۸۱	۵؎ ایضاً۔ ص ۱۸۲

کی تفسیر جولوگ یہ کرتے ہیں کہ ایسا شخص ہمارے طریقہ اورحسن سیرت پر نہیں ہے، وہ غلطی پر ہیں۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ایسی احادیث جن میں معاصی پر سخت تنقید کی گئی ہو، ان کی تفسیر کر کے ان تنبیہات کو ہلکا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تاکہ لوگوں کے اندر گناہوں سے بچنے کا زیادہ سے زیادہ جذبہ پیدا ہو، وہ گناہ کر کے بے خوف نہ ہو جائیں[1]۔

متقدمین میں تو اس طرح کی تاویل کا جذبہ کم تھا۔ مگر متاخرین میں بہت سے لوگوں نے زجر و توبیخ کے سلسلہ میں بہت سے فرمودات نبوی ﷺ کو اپنی تاویل وموشگافی سے اتنا بے اثر بنادیا ہے کہ ان کا وہ مقصد ہی فوت ہو گیا، جس کے لئے وہ فرمائے گئے تھے۔

ان کی روایتوں کا درجہ :

تمام آئمہ حدیث نے ان کی مرویات کو قابل وثوق اور لائق اعتنا سمجھا ہے۔ ابن المدینیؒ کہتے ہیں کہ یہ اہلِ حجاز کی روایتوں کے سب سے بڑے عالم ہیں[2]۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے ان کا علم حجت ہے۔ ابن قطانؒ کا قول ہے کہ یہ چالیس برس سے حدیث کے امام ہیں، عجلیؒ کا بیان ہے کہ ان کی ذات قابل وثوق اور قابل اعتماد ہے[3]۔ ابن المدینی کا بیان اُوپر آچکا ہے کہ ان کی روایتوں میں شک نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ان پر کسی نے کلام کیا ہے[4]۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ حدیث میں کون شخص سب سے بہتر ہے؟ بولے، مجھے تو ابن عیینہ سے بہتر کوئی آدمی نہیں ملا[5]۔

جرح :

اکثر اہلِ علم نے لکھا ہے کہ حدیث میں ان کی وثاقت اور اتقان وتثبت اتنا مسلم ہے کہ توثیق وتعدیل سے ان کی ذات مستغنیٰ ہے[6]۔ مگر بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ آخری عمر میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا۔ اس لئے ان کی عمر کے آخری دو سالوں میں ان سے جن لوگوں نے سماع حدیث کیا تھا، ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

یحییٰ بن سعید القطانؒ بیان کرتے ہیں کہ آخری عمر میں میں نے ان سے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ وہی روایتیں جن کو ایک بار بیان کر چکے ہیں۔ اب بیان کرتے ہیں تو ان میں کچھ نہ کچھ زیادتی یا کمی ہو جاتی ہے؟ بولے، پہلا ہی سماع ٹھیک ہے اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اسی بنا پر

---

[1] تہذیب الاسماء۔ جلد ۱۔ ص ۲۲۵ [2] تہذیب جلد ۴۔ ص ۱۲۱ [3] تہذیب الاسماء جلد ۴۔ ص ۱۲۲، ۱۱۹

[4] تاریخ بغداد۔ جلد ۹۔ ص ۱۷۸ [5] ایضاً ص ۱۸۲ [6] تہذیب التہذیب۔ جلد ۴۔ ص ۱۲۴

یحییٰ بن سعید نے جو ان کے ارشد تلامذہ میں تھے اعلان کر دیا تھا کہ ۱۹۷ھ کے بعد جن لوگوں نے ابن عیینہؒ سے سماع حدیث کیا ہے ان کی روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے اس لئے کہ آخری دو سالوں میں ضعف حافظہ کی وجہ سے ابن عیینہؒ کو روایتوں میں اشتباہ پیدا ہو جاتا تھا[1]۔

اندازہ لگائیے کہ محدثین نے حدیث کی روایت اور اسکی حفاظت میں کتنی چھان بین اور تحقیق وتدقیق سے کام لیا ہے۔ ابن عیینہؒ جیسے بے شمار ائمہ حدیث ہیں جن کی مرویات کو ایک خاص عمر کے بعد محدثین نے قبول نہیں کیا ہے۔

پھر بھی کچھ اہلِ ہوس یہ کہتے ہیں کہ ذخیرۂ حدیث قابلِ اعتماد نہیں ہے حالانکہ اگر اس زمین پر سرمایۂ حدیث نا قابلِ اعتماد ہے تو دنیا کی کوئی تحریری دستاویز قابلِ اعتبار نہیں ہوسکتی۔

تفسیر میں ان کا مقام :

تابعین کے عہد تک علم تفسیر کوئی الگ فن نہیں بنا تھا نہ اب تک مخصوص طور سے اسی موضوع پر کسی نے کوئی تصنیف کی تھی لیکن اتباع تابعین کے عہد میں جب بہت سے دینی علوم کی داغ بیل پڑی اور ان کی تدوین وترتیب شروع ہوئی تو علمِ تفسیر بھی حدیث سے ایک الگ فن قرار پایا اور اس پر بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔

زمرۂ اتباع تابعین میں جن بزرگوں کو اس فن میں کوئی خصوصیت حاصل تھی اور انہوں نے اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں ان میں سفیان بن عیینہؒ بھی ہیں۔ ان کی قرآن فہمی کا صحیح اندازہ تو اس وقت لگایا جا سکتا تھا جب کہ ان کی کتاب سامنے ہوتی مگر اس وقت اس کے موجود ہونے کا کوئی علم نہیں ہے ہمعصر علماء نے ان کی قرآن فہمی کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ یہ ہے :

امام احمد فرماتے ہیں کہ اہلِ علم میں ان سے زیادہ قرآن کا جاننے والا میں نے نہیں دیکھا[2]۔

ابن وہب کہتے ہیں کہ **مارایت اعلم بکتاب اللہ من ابن عیینہ** ۔ ابن عیینہؒ سے بڑا کتاب اللہ کا عالم میں نے نہیں دیکھا[3]۔ عبدالرحمٰن بن مہدی سے کسی نے ان کے علم وفضل کے بارے میں سوال کیا انہوں نے بہت سے اوصاف کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بھی کہا کہ

معرفتہ بالقرآن "ان کو قرآن کی معرفت بھی حاصل تھی"[4]۔

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۴۔ ص ۱۲۰ [2] تہذیب التہذیب جلد ۴۔ ص ۱۲۰ [3] تہذیب الاسماء جلد ۱۔ ص ۲۲۴
[4] تاریخ بغداد جلد ۹۔ ص ۱۸۲

ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ قرآن کی معرفت میں وہ سفیان ثوریؒ سے بڑھے ہوئے تھے[1]۔ ابتدا میں ذکر آچکا ہے کہ ان کی تفسیر تیسری صدی تک اہلِ علم میں متداول تھی اور اس کا فیض ہندوستان تک پہنچا تھا۔

تفقہ :

یہ اجتہاد و تفقہ کی دولت سے بھی بہرہ ور تھے۔ آپ کے اجتہاد و تفقہ کے اندازہ کے لئے یہ بات کافی ہے فقہ میں یہ امام شافعی کے استاد ہیں۔ امام احمد نے ان کو فقہا میں شمار کیا ہے، امام نووی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ

وهو احد اجداد الشافعية في طريق الفقه[2]۔

''جن لوگوں نے شافعی طریقہ تفقہ کی بنیاد رکھی سفیان بن عیینہؒ ان کے اجداد میں ہیں''۔

مقصد یہ ہے کہ شافعی فقہ میں اجتہاد و استنباط مسائل کے ساتھ حدیث نبوی ﷺ کا جو حسین امتزاج ملتا ہے اس کے پیدا کرنے میں جن بزرگوں نے حصہ لیا ان میں سفیان بن عیینہؒ بھی تھے ورنہ زمانہ کے لحاظ سے یہ امام شافعیؒ سے مقدم تھے۔ بایں ہمہ علم وفضل فتویٰ دینے سے گریز کرتے تھے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ افتا کا جتنا مادہ ان میں موجود تھا میں نے کم لوگوں میں دیکھا مگر وہ اس سے اتنا ہی گریز بھی کرتے تھے[3]۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ فقہ کا کوئی مسئلہ جب ان کے سامنے آتا تھا تو عموماً میری طرف اشارہ کرکے کہا کرتے تھے، ان سے پوچھو[4]۔

اخلاق وکردار :

علم وفضل کے ساتھ سیرت وکردار میں بھی اسلامی زندگی کی صحیح تصویر تھے ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، خصوصاً کھانے پینے میں ان کے ایک شاگرد ان کے یہاں آئے، انہوں نے دیکھا کہ ان کے آگے جو کی دو موٹی روٹیاں رکھی ہوئی ہیں، یہ دیکھ کر شاید ان کو تعجب ہوا ہوگا اسی لئے فرمایا کہ چالیس سال سے یہی میری غذا ہے[5]۔ اس جو کی روٹی کی اہمیت اس وقت زیادہ معلوم ہوگی جب عباسی دور کے تمدن کو سامنے رکھا جائے جس میں لوگ ستو بھی کھجور اور میووں کا استعمال کرتے تھے مگر وہ اپنی سادگی کو بے حد چھپاتے تھے اسی وجہ سے شاید ان کے بارے میں لوگوں کو کچھ غلط فہمی تھی۔ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ ایک دن وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے اور ایک گوشہ میں بٹھا دیا اس کے بعد جو کی ایک

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ا۔ ص ۲۳۹ ۲؎ تہذیب الاسماء جلد ا۔ ص ۲۲۵ ۳؎ صفوۃ الصفوۃ۔ جلد ا۔ ص ۲۷۲
۴؎ تہذیب الاسماء جلد ا۔ ص ۵۹ ۵؎ ایضاً۔ ص ۲۲۴

موٹی روٹی نکالی، پھر فرمایا کہ لوگ کیا کہتے ہیں اسے چھوڑو برسوں سے میری یہی غذا ہے[1]۔ شاید اسی اخفا کی وجہ سے ان کی سیرت و کردار کے واقعات بہت کم تذکروں میں ملتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں کہ اگر آدمی کے ظاہر و باطن میں توافق ہو تو عدل ہے اور اگر باطن ظاہر سے اچھا ہو تو اس کی افضلیت کا کہنا لیکن اگر ظاہر اچھا اور باطن برا ہو تو پھر یہ ظلم ہے یعنی جو شخص ایسا کرتا ہے وہ اپنے اُوپر ظلم کرتا ہے۔

کبھی ایوانِ حکومت کا رخ نہیں کیا۔ ایک بار یمن میں وہاں کے گورنر معین بن زائد؁ سے ملاقات ہوگئی اس نے انکو کچھ ہدیہ پیش کیا اسے قبول تو کر لیا مگر پھر کبھی اس کی نوبت نہ آنے دی۔ امام ذہبی؁ لکھتے ہیں کہ

ولم تلطخ سفیان بعد بجوائزھم .

''اس کے بعد سفیان کبھی امراء کے تحائف سے ملوث نہیں ہوئے''۔

صوم و صلوٰۃ سے ان کو جو شغف تھا وہ تو تھا ہی مگر حج کعبۃ اللہ کا تو انہیں عشق تھا جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے وفات تک شاید ہی کسی سال اس سعادت سے محروم رہے ہوں۔

اہلِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے ستر حج کئے تھے۔

ان کا معمول تھا کہ جب زیارتِ حرمین کے لئے جاتے تو خدا کی بارگاہ میں یہ دعا کرتے کہ خدایا دوبارہ پھر تو اس سے بہرہ مند کرنا مگر ۱۹۸ھ میں جب آخری بار زیارت کے لئے گئے تو ان کا بیان ہے کہ خدا سے میں اتنی بار دعا مانگ چکا تھا کہ اس سال دعا مانگتے ہوئے مجھے شرم آئی۔ چنانچہ اسی سال ان کا انتقال ہو گیا[2]۔

حکیمانہ اقوال :

ان کی سیرت اور کردار کے واقعات اہلِ تذکرہ نے بہت کم لکھے ہیں مگر دوسروں کی سیرت و کردار کو نشو و نما دینے کے لئے ان کے بہت سے حکیمانہ اقوال کتابوں میں ملتے ہیں۔

ہم چند اقوال یہاں نقل کرتے ہیں۔ اس آئینہ میں ان کی سیرت کے خدوخال بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ فرمایا، زہد و تقویٰ، صبر اور موت کے انتظار کا نام ہے۔ علم جب تم کو نفع نہ پہنچائے گا جس کو عقل زیادہ ملتی ہے عموماً اس کو روزی کم ملتی ہے[3]۔ فرمایا کہ جو شخص صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے کوئی کام کرتا ہے تو خدا ایسے شخص پر غضب آلود ہوتا ہے۔

---

[1] صفوۃ الصفوۃ [2] تاریخ بغداد۔ جلد ۹ ص ۱۸۳ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ا۔ ص ۲۷۰

فرمایا کہ ضروریات زندگی کی طلب دنیا کی محبت نہیں ہے۔ فرمایا کہ اگر میرا دن کم عقلوں کی طرح اور میری رات جاہلوں کی طرح غفلت میں گزرے تو پھر میں نے جو علم حاصل کیا ہے وہ بے فائدہ ہے۔

جو لوگ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق جوڑنے کا واسطہ ہیں وہ خدا کے یہاں سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہیں یعنی انبیاء اور ان کے بعد علماء۔

فرمایا کہ جو شخص یہ سمجھے کہ میں فلاں سے بہتر ہوں تو اس نے غرور کیا اور ابلیس کو اس غرور ہی نے حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے سے روکا تھا۔ جو شخص اپنی نفسانی خواہش بناء پر کوئی گناہ کرتا ہے تو اس سے توبہ کی امید رکھو اور جو شخص جذبۂ تکبر کے ساتھ کوئی معصیت کرتا ہے تو اس پر لعنت ہے اس لئے ابلیس نے جذبۂ تکبر ہی سے نافرمانی کی تھی اس لئے ملعون و مردود ہوا۔ یعنی محض نافرمانی ہوتی تو اتنی سخت سزا نہ ملتی۔

فرمایا کہ جب کوئی عالم **لا ادری** (میں نہیں جانتا) کہنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔

فرمایا کہ نماز کی توقیر یہ ہے کہ مسجد میں اقامت سے پہلے آؤ۔ اسحٰق بن اسرائیل کہتے ہیں کہ میں نے سفیانؒ کی زبان سے یہ بات سنی ہے وہ کہتے تھے کہ راہِ حق پر چلو اور غلط روی نہ اختیار کرو، خواہ راہِ حق کے چلنے والے کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں۔

فرمایا کہ ایام تین ہیں۔ کل گذشتہ یہ ہمارا صاحب حکمت اور معلم ہے جو اپنی حکمت آموزی چھوڑ جاتا ہے آج، یہ ایک بچھڑ جانے والا دوست جس کی جدائی بڑی طویل ہے۔ یہ تمہارے پاس آتا رہتا ہے مگر تم اس کے پاس نہیں جا سکتے۔ کل آئندہ، اس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ تم اس کو پا سکو گے یا نہیں؟

فرمایا کہ قیامت کے دن تین آدمیوں کو بڑی شدید حسرت و ندامت ہوگی۔ ایک وہ آقا جس کے غلام کا حسنِ عمل قیامت کے دن اس سے زیادہ ہوگا، دوسرے وہ مالدار جس نے مال جمع کیا مگر اس میں سے ایک پھوٹی کوڑی کسی کو نہ دی، اسکے مال کو جب اس کے ورثہ نے پایا تو راہِ خدا میں صدقہ کر دیا، تیسرے وہ عالم جس نے اپنے علم سے نہ خود کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ دوسروں کو کوئی فائدہ پہنچایا مگر اس سے دوسروں نے علم حاصل کیا اور اس نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا۔

ایک مجلس میں کوئی رقت آمیز بات ہوئی اس پر یہ رو پڑے کسی نے پوچھا کہ دوسرے لوگ تو اس بات سے بے قرار نہیں ہوئے آپ کیوں اس قدر بے خود ہو گئے، بولے جب آنسو گر جاتا ہے تو قلب کو سکون مل جاتا ہے

کسی نے رضائے خداوندی کے بارے میں سوال کیا، فرمایا کہ اللہ سے راضی وہ شخص ہے جو جس حال میں ہے اس کے علاوہ دوسری حالت کی خواہش نہ رکھے۔

احنف بن قیس فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ قبل اس کے کہ تمہیں کوئی ذمہ داری سونپی جائے دین کا فہم حاصل کرو۔ سفیان اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب آدمی کو دین کا فہم حاصل ہوگا تو وہ عہدہ اور سرداری کی طلب نہیں کرے گا[1]۔

وفات :

۱۶۳ھ میں یہ کوفہ سے مستقل طور پر مکہ مکرمہ آ گئے اور عمر کے بقیہ ۳۵ سال اس دیارِ پاک میں بسر کئے۔ ۱۹۸ھ میں ان کا انتقال ہوا اور حرم پاک کے مشہور قبرستان حجون میں سپردِ خاک کئے گئے[2]۔

ابراہیم بن منذر نے ان کی وفات پر بڑا پُر اثر و پُر درد مرثیہ کہا۔

[1] یہ تمام اقوال صفوۃ الصفوۃ جلد ۲۔ ص ۱۳۱ تا ص ۱۳۵ سے لئے گئے ہیں۔ [2] ابن خلکان تاریخ بغداد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ

حضرت عبداللہ بن مبارک زمرۂ تبع تابعین کے گلِ سرسبد تھے۔ان کی زندگی اسلام کا مکمل نمونہ اور اس کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ان کا جذبۂ دینی اور شوقِ جہاد، ان کی فیاضی اور نرم خوئی، دنیا سے بے رغبتی اور احساسِ ذمہ داری اور اس کے سوانح حیات کے جلی عنوانات ہیں۔ان کے ہاتھ میں کوئی مادی طاقت نہیں تھی مگر انہی اخلاقی صفات کی وجہ سے اسلامی مملکت کے ہر فرد کے دل پر ان کی حکمرانی تھی۔ ایک بار وہ رقہ آئے، پورا شہر ان کی زیارت کے لئے ٹوٹ پڑا۔

اتفاق سے ہارون رشید اپنے خدم وحشم کے ساتھ وہاں موجود تھا۔محل سے اس کی بیوی یا اس کی لونڈی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔اس نے پوچھا کہ یہ ہجوم کیسا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ خراسان کے عالم عبداللہ بن مبارکؒ آئے ہوئے ہیں، یہ انہی کے مشتاقانِ دید کا ہجوم ہے۔اس نے بے ساختہ کہا کہ ''حقیقت میں خلیفۂ وقت یہ ہیں۔نہ ہارون کہ اس کے گرد پولیس اور فوج کی مدد کے بغیر کوئی مجمع نہیں ہوتا''۔

نسب :

حضرت عبداللہ بن مبارک کے والد مبارکؒ ایک شخص کے غلام تھے۔ان کی شادی اسی کی لڑکی سے ہوئی تھی۔اس وقت تک اسلامی معاشرہ میں عہدِ سعادت کے آثار باقی تھے، اس لئے نسبتِ نکاح کا معیار حسب ونسب نہیں بلکہ لڑکے کی صلاحیت اور اس کا دین وتقویٰ ہوتا تھا۔مبارک چونکہ اس حیثیت سے ممتاز تھے، اس لئے آقا نے اپنی لڑکی ان سے بیاہ دی۔گو اس کی نسبتیں دوسری بڑی بڑی جگہوں سے بھی آرہی تھیں۔مبارک کی جن خصوصیات کی بنا پر یہ شادی ہوئی مختصراً ہم اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

مبارک نہایت دیانت دار ومحتاط شخص تھے۔آقا ان کے سپرد جو کام کرتا تھا اس کو وہ نہایت دیانت داری اور اطاعت شعاری کے ساتھ انجام دیتے تھے۔آقا نے باغ کی نگرانی ان کے سپرد کردی تھی۔

ایک بار اس نے ان سے کہا کہ ایک ترش انار باغ سے توڑ لاؤ، وہ گئے اور شیریں انار توڑ لائے۔ آقا نے غصہ میں کہا تمہیں ترش و شیریں انار کی بھی تمیز نہیں؟ انہوں نے کہا کہ ''نہیں''۔ اس نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ آپ نے مجھے ترش انار کھانے کی اجازت تو دی نہیں ہے۔ اس لئے میں اس کو کیسے پہچان سکتا ہوں، اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بات صحیح ہے۔

مبارکؒ کی اس غیر معمولی دیانت داری اور حق شناسی کا اس بہت اثر پڑا اور وہ ان کی بہت قدر و منزلت کرنے لگا۔

مبارکؒ کے آقا کی ایک ناکتخدا نہ لڑکی تھی جس کی شادی کے پیغامات ہر طرف سے آرہے تھے، لیکن غالبًا وہ ان نسبتوں میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے اس بارے میں مبارکؒ سے بھی مشورہ کیا کہ مبارک ! میں اس لڑکی کی شادی کہاں اور کس سے کروں؟ انہوں نے کہا کہ

> ''عہد جاہلیت میں لوگ نسبت میں حسب یعنی عزت و شہرت اور نسب کو تلاش کرتے تھے۔ یہودیوں کو مالدار کی جستجو ہوتی تھی اور عیسائی حسن و جمال کو ترجیح دیتے تھے، لیکن اُمتِ محمدیہ کے نزدیک تو معیار دین و تقویٰ ہے، آپ جس چیز کو چاہیں ترجیح دیں''۔

آقا کو ان کا یہ ایمان افروز اور دانشمندانہ جواب بہت پسند آیا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ ''میری لڑکی کا شوہر بننے کے لئے مبارک سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں ہے''۔ بیوی بھی نیک بخت تھیں، انہوں نے بھی اس رائے کو پسند کیا اور آقا کی لڑکی سے انکی شادی ہوگئی [۱]۔

ولادت اور تعلیم :

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اسی باسعادت لڑکی کے بطن سے ۱۱۸ھ میں مرو میں پیدا ہوئے۔ ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے۔ ان کا اصلی وطن مرو تھا۔ اس لئے وہ مروزی کہلاتے ہیں۔ یہ مرو جہاں ان کی ولادت ہوئی، مسلمانوں کا قدیم شہر ہے۔ افسوس ہے کہ یہ اس وقت روس کے قبضہ میں ہے۔ اس سرزمین سے جہاں اخلاق و روحانیت کے سینکڑوں چشمے اُبلے اور اسلامی علم و تمدن کے صدہا سوتے پھوٹے اب وہاں مادیت ہی کا نہیں بلکہ دہریت کا سیلاب رواں ہے۔

۱۔ ابن خلکان۔ شذرات الذہب۔ جلد اول ص ۲۹۶　　۲۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۲۵۰

ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں، لیکن امام ذہبیؒ کے بیان سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتدائے عمر ہی سے طلب علم کے لئے سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے لگے تھے[1]۔

اس وقت اسلامی مملکت کے کسی قصبہ اور کسی قریہ میں بھی علماء کی کمی نہ تھی۔ مرو جو خراسان کا ایک مشہور شہر تھا، اس کو اچھی خاصی مرکزیت حاصل تھی، اس لئے وہاں اہلِ علم کی کیا کمی ہوسکتی تھی۔ غالباً ابتدائی تعلیم وتربیت وہیں ہوئی۔ اس کے بعد اس زمانے کے عام مذاق کے مطابق علم حدیث کی طرف توجہ کی۔ اس کے لئے انہوں نے شام وحجاز، یمن ومصر اور کوفہ وبصرہ کے مختلف شہروں اور قصبوں کا سفر کیا اور جہاں سے جو جواہر علم ملے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لئے[2]۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں :

طلب علم کے لئے عبداللہ بن مبارکؒ سے زیادہ سفر کرنے والا ان کے زمانے میں کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ انہوں نے دور دراز شہروں کا سفر کیا تھا۔ مثلاً یمن، مصر، شام، کوفہ، بصرہ وغیرہ۔

ابو اسامہؒ فرماتے ہیں، کہ

مارايت ارجلا اطلب للعم في الآفاق من ابن المبارك .

(ج اول . ص ۲۵۱ تذکرہ الحفاظ)

''میں نے عبداللہ بن مبارک سے زیادہ کسی کو ملک در ملک گھوم کر طلب علم کرنے والا نہیں دیکھا''۔

یہ سفر آج کل کا نہیں تھا کہ چند لمحوں میں انسان نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ بلکہ اس زمانے کے سفر کا ذکر ہے، جب لوگ پیدل یا اونٹ یا گدھوں کے ذریعہ مہینوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے تھے، پھر راستوں کی دشواریاں تو الامان، الحفیظ۔ اور یہ کچھ عبداللہ بن مبارکؒ ہی کی خصوصیت نہ تھی۔ بلکہ سب ہی اکابر آئمہ نے حصول علم میں دُور دُور کی خاک چھانی تھی۔

شیوخ کی تعداد :

موجودہ زمانہ کی طرح اس وقت علم وفن نہ اس طرح مدون تھا اور نہ ایک جگہ محفوظ۔ خصوصیت سے علوم دینیہ میں علم حدیث کا ذخیرہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں بکھرا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حدیث کے سب سے پہلے حامل صحابہ کرام کی زندگی گوشہ گیری کی نہیں بلکہ مجاہدانہ تھی۔ اس لئے وہ شوق جہاد اور دوسری دینی ضرورتوں کی بنا پر تمام امصار وقصبات میں پھیل گئے تھے۔ وہ جہاں پہنچتے تھے،

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۲۵۰ [2] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ص ۲۸۶

وہاں کے باشندے ان سے اکتساب فیض کرتے تھے اور وہ آنحضرت ﷺ کے قول و عمل اور آپ کی سیرت کو ان سے معلوم کر کے اپنے سینوں اور سفینوں میں محفوظ کرتے جاتے تھے۔ اب جن لوگوں کو صرف عملی زندگی کے لئے حدیث نبوی ﷺ کے ذخیرہ کے معلوم کرنے کی خواہش ہوتی تھی ان کو بہت زیادہ کدو کاوش کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے لئے ان کے دربار کے صحابۂ کرام اور ان کے بعد وہاں کے علماء و فضلاء کی زندگی کا دیکھ لینا بھی کافی تھا۔ مگر جو لوگ اس تمام بکھرے ہوئے جواہر ریزوں اور شہ پاروں کو یکجا مدون اور مرتب کر دینا چاہتے تھے کہ ان زندہ ہستیوں کے اُٹھ جانے کے بعد کہیں یہ ذخیرہ ضائع نہ ہو جائے، ان کے لئے خاک چھانی اور شہروں اور قصبوں کے لئے زحمتِ سفر اُٹھانی ناگزیر تھی۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ ان ہی بزرگوں میں تھے۔ خود فرماتے ہیں :

حملت عن اربع الاف شیخ فرویت عن الف منهم .

''میں نے چار ہزار شیوخ و اساتذہ سے فائدہ اُٹھایا، اور ان میں سے ایک ہزار سے روایت کی ہے''۔

دوسری روایت میں ہے کہ

کتبت عن الف

''میں نے ایک ہزار شیوخ کی روایتوں کو لکھ لیا ہے''۔

یعنی جن لوگوں سے تحصیل علم کیا، ان کی تعداد تو چار ہزار ہے۔ مگر ہر شیخ اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کے علم روایت کو معیاری قرار دیا جائے۔ اس لئے غایت احتیاط میں صرف ایک ہزار شیوخ کی روایت کو لکھنا پسند کیا اور اسی سے انہوں نے دوسروں تک منتقل کیا۔

عباس کہتے ہیں کہ ان کے آٹھ سو شیوخ سے تو مجھے ملاقات کا موقع ملا ہے[۱]۔ ان کے بعض ممتاز اساتذہ کے نام لکھے جاتے ہیں :

(۱)　**امام ابوحنیفہ** : یہ امام صاحب کے خاص شاگردوں میں ہیں۔ ان کو امام صاحبؒ سے بڑی محبت اور نسبت تھی۔ فرماتے ہیں کہ مجھ کو جو کچھ حاصل ہوا وہ امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کی وجہ سے حاصل ہوا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :

لو لا ان الله تعالىٰ اعانني بابي حنيفه وسفيان كنت كسائر الناس[۲]۔

''اگر اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کے ذریعہ میری دستگیری نہ کرتا تو عام آدمیوں کی طرح ہوتا''۔

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۲۵۲　　۲؎ تہذیب التہذیب۔ ترجمہ امام ابوحنیفہ

مناقب کردری میں ابن مطیع کی روایت ہے کہ میں نے ان کو امام صاحبؒ کے پاس کتاب الرائے کی قرأت کرتے ہوئے دیکھا۔ ان سے اچھی قرأت کرنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا[1]۔

امام ابوحنیفہؒ کی شان میں ان کے بہت سے اشعار منقول ہیں۔ خطیب نے ان میں سے چند اشعار نقل کئے ہیں[2]۔

(۲) **امام مالکؒ**: ان کے دوسرے ممتاز شیخ امام مالکؒ ہیں۔ امام مالکؒ سے انہوں نے موطا کا سماع کیا تھا۔ موطا کے متعدد نسخے ہیں، جن میں ایک کے راوی ابن مبارک بھی ہیں۔ امام مالکؒ کے مشہور شاگرد یحییٰ بن یحییٰ اندلسی امام مالک کی مجلس درس میں ابن مبارک کی ایک آمد کا ذکر ان لفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ابن مبارک ایک بار امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام مالکؒ مجلس سے اُٹھ گئے اور ان کو اپنے قریب بٹھایا۔ اس سے پہلے امام مالک کسی کے لئے مجلس درس میں نہیں اُٹھتے تھے۔ جب ان کو بٹھالیا، تب درس کا سلسلہ جاری کیا۔ قاری پڑھتا جاتا تھا، جب امام مالک کسی اہم مقام پر پہنچتے تو ابن مبارک سے دریافت فرماتے کہ اس بارے میں آپ لوگوں یعنی اہلِ خراسان کے پاس کوئی حدیث یا اثر ہو تو پیش کیجئے۔ عبداللہ بن مبارک غایت احترام میں بہت آہستہ آہستہ جواب دیتے۔ اس کے بعد وہاں سے اُٹھے اور مجلس سے باہر چلے گئے، (غالباً یہ بات بھی اُستاد کے احترام کے خلاف معلوم ہوئی کہ وہ ان کی موجودگی میں کوئی جواب دیں)۔ امام مالکؒ ان کے اس پاسِ ادب ولحاظ سے بہت متاثر ہوئے اور تلامذہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ ''ابن مبارک خراسان کے فقیہ ہیں[3]۔

یہ واقعہ غالباً ان کی طالب علمی کے زمانہ کا نہیں ہے، بلکہ اس وقت کا ہے جب ان کی شخصیت مشہور و معروف ہو چکی تھی اور وہ ایک فقیہ اور محدث کی حیثیت سے جانے جا چکے تھے۔ اس لئے امام مالکؒ ان کا اعزاز اسی حیثیت سے کر رہے تھے اور وہ ایک شاگرد رشید کی طرح ان سے پیش آ رہے تھے۔ ان آئمہ کے علاوہ ان کے چند معروف و ممتاز شیوخ کے نام یہ ہیں، جن میں متعدد کبارِ تابعین ہیں:

تابعین:

حضرت ہشام بن عروہ، سلیمان التیمی، یحییٰ الانصاری، حمید الطویل، اسمٰعیل بن ابی خالد، عبد الرحمٰن بن یزید، امام اعمش، موسیٰ بن عقبہ صاحب المغازی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ان تابعین کے علاوہ بے شمار اتباع تابعین سے استفادہ کیا تھا۔ چند ممتاز آئمہ کے نام حسبِ ذیل ہیں:

---

[1] کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۷۹ [2] تاریخ بغداد۔ جلد ۱۱ [3] تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۳۸۷

حضرت سفیان بن ثوری، سفیان بن عیینہ، حماد بن سلمہ، مسعر بن کدام، شعبہ بن مجاج، امام اوزاعی، ابن جریج، لیث بن سعد، ابن ابی ذیب، سعید بن عروہ، صالح بن صالح، عمرو بن میمون، معمر بن راشد رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

مسند درس :

خود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نہایت ذہین وذکی اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کے مالک تھے۔ پھر ان کے شیوخ میں ہر فن کے استاد بلکہ امام موجود تھے۔ اس لئے وہ ان کے فیض صحبت اور اپنی صلاحیت سے جلد ہی ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے اور علم وفن کے صدر نشیں بنا دیئے گئے اور خلقِ خدا ان سے مستفید ہونے لگی۔

ان کی زندگی بالکل مجاہدانہ تھی، اس لئے کہیں مستقل طور سے جم کر وہ مجلس درس قائم نہیں کر سکے، لیکن ان کا علم سفینہ کا مرہونِ منت نہیں تھا، بلکہ جو کچھ تھا وہ سینہ میں محفوظ تھا۔ اس لئے وہ جہاں کہیں اور جس حالت میں بھی رہتے، ان کا علم ان کے ساتھ رہتا تھا۔ گویا ان کی ذات ایک رواں دواں چشمۂ فیض تھی، جس سے تشنگان علم ہر آن اور ہر وقت استفادہ کر سکتے تھے۔ کبھی وہ کوفہ میں ہیں تو کبھی بصرہ میں، کبھی بغداد میں ہیں، تو کبھی مصر اور رقہ میں، غرض وہ جہاں بھی رہے علم وفن سایہ کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ بڑے بڑے شیوخ اور ان کے بعض اساتذہ تک ان سے سماع حدیث کے مشتاق رہتے تھے۔

حضرت حماد بن زیدؒ مشہور محدث ہیں۔ ابن مبارکؒ ایک بار ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا، کہاں سے آ رہے ہو؟ بولے، خراسان سے۔ پوچھا خراسان کے کس شہر سے؟ بولے، مرو سے۔ مرو کا نام سن کر انہوں نے پوچھا، عبداللہ بن مبارک سے واقف ہو؟ جواب دیا کہ وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ حماد نے انہیں اپنے سینے سے لگایا[1]۔

حضرت سفیان ثوریؒ ان کے استاد ہیں۔ ان سے کسی خراسانی نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ تمہارے پاس مشرق ومغرب کے سب سے بڑے عالم عبداللہ بن مبارک موجود ہیں، ان سے کیوں نہیں دریافت کرتے[2]۔

---

۱. خطیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۵۷ ۲. مناقب کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۷۳

تلامذہ :

گو کسی خاص جگہ آپ کی مسند درس قائم نہیں تھی۔ مگر ایک خلق کثیر نے آپ سے استفادہ کیا تھا اور جہاں وہ جاتے تھے، ان کے ساتھ اکتساب فیض کے لئے لوگوں کا ہجوم ہو جاتا تھا۔ ان کے تلامذہ کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ

حدث منه خلق لا يحصون من اهل الا قاليم [۱]

''ممالک اسلامیہ کے اتنے لوگوں نے ان سے فائدہ اُٹھایا ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا''۔

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ بعض ممتاز تلامذہ کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ان سے ایک خلق کثیر نے استفادہ کیا تھا [۲]۔

بعض ممتاز اور سرمایۂ ناز تلامذہ کے نام یہ ہیں :

حضرت سفیان ثوریؒ، یہ ان کے استاد بھی تھے اور ان سے روایت بھی کرتے ہیں [۳]۔

معمر بن راشد، ابواسحاق الفزاری، عبدالرحمن بن مہدی۔ یہ لوگ بھی ان کے اُستاد تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ، اسحاق بن راہویہ، سعید القطان، فضیل بن عیاض، ابوداؤد الطیالسی، سلیمان المروزی وغیرہ۔

علم حدیث سے شغف :

ان کو تمام دینی علوم میں دستگاہ تھی۔ مگر علم حدیث کے حفظ اور روایت سے انہیں خاص شغف تھا، جو وقت جہاد اور عبادت سے بچتا تھا، وہ اس مبارک کام میں صرف کرتے تھے۔ بسا اوقات حدیث کا ذکر خیر چھڑ جاتا تو پوری رات آنکھوں میں کٹ جاتی۔ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد علی بن حسن سے کسی حدیث کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ ساری رات مسجد کے دروازے پر کھڑے کھڑے گزر گئی اور ان کو احساس بھی نہ ہوا [۴]۔

شغف بالحدیث کا یہ عالم تھا کہ گھر سے باہر بہت کم نکلتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ ہمہ وقت مکان کے اندر بیٹھے رہتے ہیں، وحشت نہیں ہوتی؟ فرمایا کہ وحشت کی کیا بات ہے؟ جب کہ مجھے اس تنہائی میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام سے شرف صحبت کی دولت نصیب ہے۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۲۵۰ ۲۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۳۸۵

۳۔ اس زمانہ میں عام دستور تھا کہ اصاغر اکابر سے اور اکابر اصاغر سے روایت کرتے تھے کہ ایک روایت کسی معمولی شاگرد کے پاس ایسی ہے، جس کا علم استاد کو نہیں ہے۔ اس سے استفادہ کرنے میں شیوخ کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

۴۔ تہذیب اور مناقب کردری

مقصد یہ تھا کہ میں جب ہر وقت حدیث نبوی اور آثار صحابہ کے مطالعہ اور غور و خوض میں لگا رہتا ہوں تو گویا میں ان کی صحبت میں بیٹھ کر ان سے بات چیت کرتا ہوں اور ان کی نشت و برخاست، رفتار و گفتار کا نقشہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے، پھر اس سے زیادہ ایک مسلمان کے لئے انس اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔

علم حدیث میں ان کا مرتبہ :

علم حدیث میں ان کا مرتبہ ایک امام حدیث کا تھا۔ حدیث کی جتنی متداول کتابیں ہیں ان کی روایات کثرت سے موجود ہیں۔ ان سے جو روایات مروی ہیں، ان کی تعداد بیس اکیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ ابن معینؒ جو مشہور حافظ حدیث اور امام جرح و تعدیل ہیں، فرماتے ہیں کہ انہوں نے جو روایتیں کی ہیں، ان کی تعداد بیس اکیس ہزار ہے [1]۔

لیکن کثرت روایت سے ان کی حدیث دانی کا پورا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ان کے معاصر آئمہ حدیث اور بعد کے محدثین اور فقہا اور آئمہ رجال کے خیالات معلوم کئے جائیں اور اسی آئینہ میں ان کی حدیث دانی کے خط و خال دیکھے جائیں۔

حضرت ابو اسامہؒ کا قول ہے کہ وہ فن حدیث میں امیر المومنین تھے۔ عبد الرحمن بن مہدیؒ جو آئمہ اسماء رجال میں ہیں، وہ فرماتے تھے کہ عبداللہ بن مبارکؒ سفیان ثوریؒ سے افضل تھے لوگوں نے ان سے کہا کہ لوگ آپ کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ فرمایا کہ عام لوگوں کو ان کے علم کا اندازہ نہیں ہے۔ میں نے ابن مبارک جیسا کسی کو نہیں پایا۔ پھر کہا، میرے نزدیک آئمہ حدیث چار ہیں۔ سفیان ثوری، امام مالک، حماد بن زید اور عبداللہ بن مبارک رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابو اسحاق فرازیؒ کا قول ہے کہ وہ امام المسلمین تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یہ حافظ حدیث اور اس کے عالم تھے۔ سفیان ثوریؒ گو ابن مبارک کے استاد ہیں، مگر ان کے علم و فضل کے معترف تھے۔ ایک بار ان کے سامنے کسی نے ابن مبارک کو یا عالم المشرق (اے مشرق کے عالم) کے لفظ سے مخاطب کیا۔ سفیان ثوری موجود تھے، انہوں نے اس شخص کو ڈانٹا اور فرمایا کہ ان کو **عالم المشرق و المغرب** کہو۔

محدثین میں اگر کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تو عبداللہ بن مبارکؒ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ حضرت فضالہؒ فرماتے ہیں، کوفہ کے محدثین کی خدمت میں میری آمد و رفت تھی۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۲۵۱

جب کسی حدیث کے بارے میں ان میں اختلاف ہوتا تو وہ لوگ کہتے تھے اچھا اس اختلاف کو طبیب حدیث کے پاس لے چلو وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔ اس طبیب سے مراد عبداللہ بن مبارکؒ تھے [۱]۔

حدیث کا احترام :

حدیث نبوی ﷺ کا ان کے دل میں بے حد احترام تھا۔ اگر کسی سے اس کے خلاف حرکت سرزد ہو جاتی تو خفگی کا اظہار کرتے تھے۔ ایک بار کوئی شخص دور سے سفر کر کے سماع حدیث کے لئے ان کے پاس آیا اور اسی وقت سماع کی درخواست کی۔ انہوں نے انکار کیا۔ وہ فوراً اُٹھ کر جانے لگا تو دوڑ کر اس کی سواری کی رکاب تھام لی۔ اس نے کہا کہ آپ نے حدیث کے سماع سے تو محروم رکھا، مگر میری سواری کی رکاب تھام رہے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں ! میں اپنی ذات کو تو ذلیل کر سکتا ہوں مگر حدیث نبوی ﷺ کی توہین مجھے گوارا نہیں [۲]۔

غالباً اس نے بے موقع سوال کیا تھا یا سماع حدیث کا وہ اہل نہیں تھا۔ اس لئے سماع نہیں کرایا۔ مگر عام انسانی اخلاق صرف کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اسی طرح ایک شخص نے راستہ میں ان سے کسی حدیث کے بارے میں سوال کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور فرمایا :

لیس هذا موضع حدیث [۳]۔

''یعنی یہ موقع حدیث نبوی ﷺ کی روایت وسماع کا نہیں ہے''۔

امام کے بعض اصول حدیث :

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا عہد حدیث کی تدوین واشاعت کا خاص عہد تھا۔ اس لئے اس وقت ہر شخص اس خدمت کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتا تھا۔ اخبرنا و حدثنا کی آواز گھر گھر گونج رہی تھی۔ ہر شہر بلکہ ہر قصبہ اور ہر بڑی بستی میں درس حدیث کی کئی کئی مجلسیں برپا تھیں، لیکن جس قدر یہ سلسلہ عام اور وسیع تھا، اسی قدر حدیث کی نقل وروایت میں افراط وتفریط شروع ہو گئی تھی۔ خصوصیت سے پیشہ ور واعظوں اور قصہ گویوں نے نہ جانے کتنی حدیثیں وضع کر ڈالی تھیں۔

خلافت راشدہ کے زمانہ تک حدیث کی روایت پر بڑی پابندی عائد تھی۔ خصوصیت سے حضرت عمر فاروقؓ اس بارے میں بہت سخت تھے اور بڑے بڑے صحابہ کو اس پر تنبیہ کرتے رہتے تھے اور جب تک کوئی اپنی روایت کا دوسرا شاہد پیش نہیں کرتا تھا، وہ اسے قبول نہیں کرتے تھے اور نہ اس

۱؎ یہ تمام اقوال تہذیب الاسماء اور تہذیب التہذیب سے لئے گئے ہیں　۲؎ مناقب کردری۔ جلد ۲۔ ص ۲۱۷　۳؎ ایضاً

روایت کو بیان کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ مگر اس عہد راشد کے بعد جب دینی معاملات میں قانونی گرفت ڈھیلی ہوئی تو ہر کس وناکس نے روایت وتحدیث شروع کردی۔

بنوامیہ کے زمانہ میں اس فتنہ نے کافی بال وپر نکالے۔ اس لئے اس وقت جو آئمہ حدیث اور اس فن کے نبض شناس تھے، ان کو اس فتنہ کے انسداد کی فکر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ان کے ہاتھ میں قانون کی طاقت تو تھی نہیں، اس لئے انہوں نے قرآن وحدیث اور صحابہ کے عمل کی روشنی میں اصول مرتب کئے جس سے اس فتنہ کا انسداد ہوسکے۔

چنانچہ ان ہی اصولوں کے تحت بڑے بڑے راوی حدیث کی مرویات جانچی وپرکھی جانے لگیں۔ جس سے بھی قال النبی ﷺ کا لفظ زبان سے نکلا، اس کی روایت کی صحت حتیٰ کہ اس کے ذاتی حالات کی تفتیش شروع ہو جاتی تھی۔ جب تک اس کے ضبط، احتیاط، قوت حافظہ اور اس کی اخلاقی حالت کے متعلق پورا اطمینان نہیں ہو جاتا تھا، آئمہ حدیث نہ تو اس کی روایت قبول کرتے تھے اور نہ اس کو قابلِ اعتماد اور ثقہ سمجھتے تھے۔

اس وقت اصول حدیث کا فن ہمارے سامنے مدوّن اور مرتب طور پر موجود ہے۔ ابتداء اس کی یہ شکل نہیں تھی، بلکہ ہر امام اور محدث نے اپنے علم وبصیرت کے مطابق کچھ اصول بنالئے تھے، جنہیں بعد میں مرتب ومدون کردیا گیا۔ عبداللہ بن مبارکؒ بھی ان بزرگوں میں تھے جنہوں نے حدیث کی روایت کے کچھ اصول مرتب کرلئے تھے۔ ان کے چند اصول درج ذیل ہیں:

(۱) حدیث کے صحیح اور قابل حجت ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام رواۃ ثقہ اور فقیہ ہوں۔ فقیہ کے یہ معنی ہیں کہ وہ الفاظ کی تاثیر، زبان کے قواعد ومحاورات اور مطالب کے طرز ادا سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ احادیث جن کے رواۃ ثقہ ہوں مگر فقیہ نہ ہوں قابل حجت تو ہیں لیکن قسم اول کی حدیثوں سے کم رتبہ ہیں۔

(۲) قرب اسناد (یعنی راوی کا کم نہ ہونا)۔ حدیث کی صحت وجودت کی دلیل نہیں ہے۔ رواۃ کی تعداد خواہ کسی قدر ہو مگر یہ ضروری ہے کہ ان میں ہر ایک راوی ثقہ اور معتبر ہو۔

(۳) حدیث کے لائق احتجاج ہونے کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ راوی نے خود اس کو سنا ہو اور روایت کرتے وقت تک اس نے اس کو اچھی طرح محفوظ رکھا ہو۔

(۴) روایت بالمعنی کے قائل تھے۔ انما المیّت یعذب ببکاء الحی[1] کو حدیث بالمعنی تسلیم کرتے تھے۔

(۵) اصول روایت کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن بالعموم نہیں بلکہ خاص حالتوں میں۔

(۶) تدلیس یعنی راوی کا اپنے شیخ کا صراحۃً ذکر نہ کرنے کے سخت مخالف تھے۔

فقہ :

فقہ کی مشق و ممارست انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں بہم پہنچائی تھی۔ اس لئے ان میں قدرے فقہ بھی تھا۔ امام مالکؒ ان کو خراسان کا فقیہ کہتے تھے۔ اسی طرح بعض دوسرے علماء بھی ان کے تفقہ کے معترف ہیں۔ مگر یہ مسلم ہے کہ حدیث میں ان کا جو مرتبہ تھا، تفقہ و اجتہاد میں ان کو وہ درجہ حاصل نہیں تھا جو امام صاحب کے دوسرے تلامذہ کو حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہرت فقیہ کی حیثیت سے کم اور محدث کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ یحییٰ بن آدم جو ان کے معاصر اور خاص شاگرد ہیں، فرماتے ہیں کہ

کنت اذا طلبت الدقیق من المسائل فلم اجدہ عندہ ایست منہ[2]۔

''جب بھی میں نے ان سے دقیق مسائل دریافت کئے تو اس کا جواب ان سے نہیں پایا، جس سے میں مایوس ہوا''۔

دوسرے علوم :

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ حدیث و فقہ کے ساتھ تفسیر، سیرت، نحو و بلاغت، ادب و لغت، شعر و شاعری غرض ان تمام اصنافِ علم سے واقف تھے، جن کی ضرورت علوم دینیہ میں ہوتی ہے۔ ایک بار ان کے تلامذہ مثلاً فضیل بن عیاضؒ، مخلد بن حسینؒ وغیرہ جمع ہوئے اور آپس میں طے کیا کہ

---

[1] یعنی میت پر اس کے خاندان والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔ اس روایت کو حضرت عائشہ صدیقہؓ لفظاً و معنیً کسی طرح بھی تسلیم ہی نہیں کرتی تھیں۔ ان کا استدلال قرآن کی اس آیت سے تھا۔ ولا تزروا زرۃ وزر اخری وہ فرماتی تھیں کہ اس میں راویوں سے غلطی ہوگئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ لوگ میت پر رو رہے تھے، آنحضرت صلعم نے دیکھا، تو فرمایا کہ میت پر عذاب ہو رہا ہے اور یہ رو رہے ہیں۔ رونا عذاب کا سبب نہیں تھا مگر راویوں نے اسے سبب قرار دیدیا۔

[2] مناقب کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۷۳ و تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۲۵۱ یحییٰ بن آدم نے اپنی کتاب الخراج میں تقریباً ۶۰ روایتیں ابن مبارکؒ سے کی ہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں ان کا بیان قابلِ قدر ہے۔

عبداللہ ابن مبارک کی علمی و عملی لیاقتوں اور صلاحیتوں کو شمار کریں۔ پھر ان سے ہر ایک نے ان کی کچھ نہ کچھ خصوصیات کا ذکر کیا۔ پھر سب نے متفقہ طور پر ان کے بارے میں کہا کہ

جامع العلم الفقه و الادب و النحو و اللغة و الشعر و العربية و الفصاحة [1]۔

''وہ علم و فقہ، ادب و نحو، لغت و شاعری، عربی ادب اور فصاحت کے جامع تھے''۔

اس وقت شعر و شاعری عام طور پر سرتا سر رندی و ہوسنا کی کا مظہر بن گئی تھی۔ شعراء تو داد تحسین حاصل کرنے کے لئے غزل کہتے تھے یا مادی فائدے سمیٹنے کے لئے امراء و سلاطین کی مدح سرائی و قصیدہ گوئی کرتے تھے، مگر اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے موجود تھے جو اخلاقی شاعری کے دیدبان تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے اور کبھی کبھی کچھ کہہ بھی لیا کرتے تھے۔ ان کے جو اشعار خطیب بغدادی اور کردری وغیرہ نے نقل کئے ہیں وہ اخلاقی تعلیم سے پُر ہیں۔ چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

اذا رافقت في الاسفار قومًا　　فكن لهم كذى الرحيم الشفيق

جب تم کسی کے رفیق سفر ہو تو ۔ اس کے ساتھ اس طرح پیش آ ؤ جیسے اپنے بھائی کے ساتھ آتے ہو

متى تاخذ تعنفهم تولوا　　وتبقى في الزمان بلا صديق

اگر تم اپنے احباب کے ساتھ سخت رویہ رکھو گے تو ۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا کوئی دوست نہیں رہ جائے گا

قد يفتح المرء حانوتًا لمتجره　　وقد فتحت لک الحانوت بالدين

لوگ اسباب تجارت کے لئے دوکان کھولتے ہیں ۔ اور تو نے دین فروشی کی دوکان کھول رکھی ہے

بين الاساطين حانوت بلاغلق　　فباغ اموال المساكين

یہ دوکان (مسجد) ستونوں کے درمیان ہے جس میں تالا لگانے کی ضرورت نہیں ۔ جس کے ذریعہ غربا کی دولت سمیٹی جا رہی ہے

صيّرت وبينک شاهينًا تصديه　　وليس يفلح اصحاب الشواهين

تم نے شکار کرنے کے لئے دین کو شاہین بنا رکھا ہے ۔ مگر یاد رکھو کہ ایسے شاہین باز فلاح نہیں پاسکتے

ان اشعار میں ان دنیادار اور علماء اور فقہاء کی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے، جنہوں نے مسند درس کو دولت و وجاہت کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔

---

[1] تہذیب الاسماء۔

عبادت وتقویٰ اور عادات واخلاق :

عبداللہ بن مبارک عبادت وریاضت، زہد وتقویٰ اور اپنے عادات واخلاق میں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نمونہ تھے۔ صحابہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ

فی اللیل رھبان وفی النھار فرسان ۔

''رات میں راہبوں کی طرح عبادت کرتے تھے اور دن میں شہسوار بن کر میدانِ کارزار میں نظر آتے تھے''۔

علامہ ابن مبارکؒ اس خصوصیت کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ اسی بناء پر حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے تھے کہ

نظرت فی امر الصحابة فما رایت لھم فضلا علیٰ بن المبارک الا لصحبتھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔

میں نے صحابہ کے حالات پر غور کیا تو صحبتِ نبوی صلعم کے علاوہ اور کسی چیز میں ابن مبارک کو ان سے کم تر نہیں پایا''۔

ظاہر ہے کہ صحبتِ نبوی صلعم صحابہ کا اتنا بڑا فضل ہے کہ اس میں نہ تو ان کا کوئی شریک وسہیم ہے اور نہ اس میں کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ مگر اپنے اخلاق وکردار کے لحاظ سے اُمت میں ان کے بعد بہت سے ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جو ان کی صحیح تصویر تھے۔ انہی میں ابن مبارکؒ بھی تھے۔ ہم مختلف عنوانوں کے تحت مختصر طور سے ان کی زندگی کے ان اخلاقی اوصاف کی یہاں وضاحت کرتے ہیں۔

عبادت وتقویٰ :

عبادت اور تقویٰ میں ضرب المثل تھے۔ ابونعیمؒ نے حلیۃ الاولیاء میں امام شعرانیؒ نے طبقات الکبریٰ میں ان کا شمار زہاد تبع تابعین میں کیا ہے ۔ سفیان ثوریؒ جن کی جلالت پر ایک زمانہ متفق ہے وہ فرماتے تھے کہ میں نے کوشش کی کہ عبداللہ بن مبارکؒ جیسی محتاط زندگی گزاروں تو میں چند دن بھی نہ گزار پایا[۱]۔

تمام اہلِ تذکرہ فرماتے ہیں کہ وہ زہد وورع، عبادت اور قیام لیل میں اپنی مثال آپ تھے[۲]۔

اسمٰعیل بن عیاش فرماتے ہیں کہ کوئی نیک خصلت ایسی نہیں ہے جو ان میں موجود نہ رہی ہو[۳]۔

۱۔ صفوۃ الصفوۃ۔ جلد ۴۔ ص ۱۱۱ ۲۔ تہذیب التہذیب۔ جلد ۵۔ ص ۳۸۵ ۳۔ ایضاً

احساسِ ذمہ داری :

ایک بار شام میں کسی شخص سے قلم مستعار لیا۔ اتفاق سے قلم اس شخص کو واپس کرنا بھول گئے جب مرو پہنچے تو قلم پر نظر پڑی، مرو سے شام پھر واپس گئے اور قلم صاحبِ قلم کو واپس کیا[1]۔

تنہا یہ واقعہ ان کی اخلاقی زندگی کا بہترین مظہر ہے اور دنیا کی اخلاقی تاریخ کا غیر معمولی واقعہ ہے۔ مرو شام سے سینکڑوں میل دور ہے اور پھر یہ واقعہ اس زمانہ کا بھی ہے جب رسل و رسائل کے ذریع صرف گھوڑے، اونٹ اور خچر ہوتے تھے۔

خشیتِ الٰہی :

اس زہد و ورع کے ساتھ آخرت کی باز پرس سے ہر وقت ارزاں رہتے تھے، انہوں نے زہد و ورع پر ایک کتاب لکھی تھی جب اس کو طلبہ کے سامنے پڑھتے تھے تو ان پر اس قدر رقت طاری ہو جاتی تھی کہ بول نہیں سکتے تھے۔

قاسم بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن مبارک کے ساتھ اکثر سفر میں رہتا تھا میرے دل میں خیال ہوا کہ آخر کس بنا پر ان کو اتنا فضل و شرف اور قبول عام حاصل ہے۔ جس طرح وہ نماز پڑھتے ہیں ہم بھی نماز پڑھتے ہیں، جتنے روزے وہ رکھتے ہیں ہم بھی ان سے کم روزہ نہیں رکھتے، وہ حج کرتے ہیں ہم بھی حج کرتے ہیں، وہ جہاد میں شرکت کرتے ہیں اس شرف میں ہم بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ شام جا رہے تھے۔ راستہ میں رات کو کہیں ٹھہرے سب لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ یک بہ یک چراغ گل ہو گیا ایک آدمی چراغ جلانے کے لئے اٹھا، چراغ جلا کر وہ واپس ہوا تو ہم نے دیکھا کہ عبداللہ ابن مبارک کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اسی (خشیت الٰہی کی) وجہ سے ان کو یہ فضل و شرف حاصل ہے۔ پھر فرماتے ہیں، غالباً چراغ گل ہونے پر اندھیرا ہو گیا اور اس سے یک گونہ ہم لوگوں پر جو گھبراہٹ طاری ہوئی اس چیز نے ان کو قبر قیامت کی یاد دلا دی اور ان پر رقت کی یہ کیفیت طاری ہو گئی[2]۔

امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو رفعت دی تھی وہ ان کی اس باطنی کیفیت کی بنا پر تھی جو اس کے لئے مخصوص ہے[3]۔

اخلاق و عادات :

ان کا یہ زہد و اتقاء صرف عبادات ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کے اخلاق و کردار اور ان کے معاملات میں بھی اس کا پورا اثر نمایاں تھا۔

---

[1] کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۷۹ [2] صفوۃ الصفوۃ جلد ۴۔ ص ۱۲۰ [3] ایضاً

مہمان نوازی :

مہمان نوازی اسلامی زندگی کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔اس میں وہ مصروف تھے ان کا دستر خوان ان کے احباب، اعزہ، پڑوسی اور اجنبی سب کے لئے خوان یغما تھا، وہ کبھی بغیر مہمان کے کھانا نہیں کھاتے تھے اس بارے میں کسی نے ان سے پوچھا تو فرمایا کہ مہمان کے ساتھ جو کھانا کھایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا حساب نہیں لیتا۔ سال کے بیشتر حصہ میں وہ روزہ رکھتے تھے جس دن وہ روزہ سے ہوتے اس دن دوسروں کو عمداً عمدہ کھانا پکوا کر کھلاتے۔ ابو اسحٰق کا بیان ہے کہ کسی سفر جہاد یا حج میں جارہے تھے تو ان کے ساتھ دو اونٹنیوں پر بھنی ہوئی مرغیاں لدی ہوئی تھیں۔ یہ سب سامان ان مسافروں کا تھا جو ان کے ہمسفر تھے[1]۔

ادب اور حسن معاشرت :

ادب اور حسن معاشرت کا نمونہ تھے، فرماتے تھے کہ ادب و حسن معاشرت دین کا دو حصہ ہے۔ حدیث کی مجلس میں ان کا یہ ادب دیکھنے کے قابل ہوتا تھا یوں تو عام مجلسوں میں بھی وہ خلافِ اسلام کوئی فعل نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک بار مجلس میں کسی شخص کو چھینک آئی اس نے الحمد للہ نہیں کہا، آپ کچھ دیر منتظر رہے پھر اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائی! جب چھینک آئے تو کیا کہنا چاہئے؟ اس نے کہا: الحمد للہ، آپ نے اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہا اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس شخص کو غلطی کا احساس ہو جائے اور دوسروں کو اتباع سنت کی ترغیب ہو۔

ذریعۂ معاش :

اسلاف میں بے شمار ایسے لوگ گزرے ہیں جن کا ذریعۂ معاش صنعت و حرفت یا تجارت تھا۔ جب تک اسلامی زندگی کے نمایاں آثار باقی تھے اس وقت تک اس چیز کو کم درجہ یا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ امت کے بلند تر افراد حرفہ و پیشہ ہی اختیار کرنا پسند کرتے تھے۔ عبداللہ بن مبارکؒ نے تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا تھا ان کا تجارتی کاروبار بہت وسیع تھا۔ تجارت کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک لاکھ درہم سالانہ صرف فقراء پر خرچ کرتے تھے۔ عموماً وہ خراسان سے سامانِ تجارت حجاز لاتے اور وہیں فروخت کرتے تھے[2]۔

---

[1] طبقات شعرانی   [2] تاریخ بغداد جلد ۱۱۔ ص ۱۶

تجارت کا مقصد :

مگر یہ تجارت محض حصول زر یا دنیا طلبی کے لئے نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد وہی تھا جو اسلام نے مقرر کیا ہے۔ فضیل بن عیاضؒ نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ ہم لوگوں کو تو زہد و قناعت اور دنیا سے بے رغبتی کی ترغیب دیتے ہیں اور خود قیمتی سامانوں کی تجارت کرتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ

اے فضیل ! یہ تجارت اس لئے کرتا ہوں کہ اس سے اپنی ذات کو مصائب سے، اپنی عزت کو ذلت سے بچا سکوں اور خدا کی اطاعت میں اس سے مدد لوں اور اللہ تعالیٰ نے جو مالی حقوق میرے ذمہ ڈالے ہیں ان کی طرف میں سبقت کروں اور انہیں بخوبی پورا کروں[1]۔

ایک بار فضیل بن عیاضؒ سے فرمایا[2]۔

لو لا انت و اصحابک ما اتجرت

''اگر تم اور تمہارے ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا''۔

یعنی میں تمہیں لوگوں کے لئے یہ پریشانی اٹھاتا ہوں۔

ایسے علماء اور طلبا کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر امداد کرتے تھے جو دینی علوم کے حصول یا درس و تدریس میں لگے ہوتے مگر معاشی حیثیت سے پریشان ہوتے ان لوگوں کی مدد کو وہ سب کاموں پر مقدم رکھتے تھے چنانچہ اس کے لئے وہ ہزاروں روپے اپنے شہر سے باہر بھیجتے تھے، بعض لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ آپ اپنا مال اپنے شہر میں اس فراوانی کے ساتھ نہیں خرچ کرتے جس فراوانی کے ساتھ باہر بھیجتے ہیں جواب میں فرمایا۔

میں ان لوگوں پر اپنا مال خرچ کرتا ہوں جن کے علم و فضل اور صداقت و دیانت سے بخوبی واقف ہوں وہ علم دین کی طلب و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں مگر ان کی ذاتی اور (خانگی) ضرورتیں بھی ہیں اگر یہ لوگ ان کے پورا کرنے میں لگ جائیں تو علم ضائع ہو جائے گا اور اگر ہم ان کی مدد کرتے ہیں تو ان کے ذریعہ علم (دین کی) اشاعت ہوتی رہے گی اور منصب نبوت کے اختتام کے بعد علم دین کی اشاعت سے بڑھ کر دوسرا کوئی کام نہیں ہے[3]۔

عام فیاضی :

ان کی سخاوت و فیاضی صرف اہل علم ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ اس سے ہر خاص و عام فائدہ اٹھاتا تھا چند واقعے ملاحظہ ہوں۔

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۱۱۔ ص ۱۶۰　[2] تہذیب جلد ۵۔ ص ۳۸۶　[3] تاریخ بغداد جلد ۱۔ ص ۱۶۰

ایک شخص سات سو درہم کا مقروض تھا کچھ لوگوں نے ابن مبارکؒ سے کہا کہ آپ اس کا قرض ادا کر دیں۔ انہوں نے منشی کو لکھا کہ فلاں شخص کو سات ہزار درہم دے دیئے جائیں یہ تحریر لے کر مقروض ان کے منشی کے پاس پہنچا اس نے خط پڑ کر حامل رقعہ سے پوچھا کہ تم کو کتنی رقم چاہئے۔ اس نے کہا کہ میں سات سو کا مقروض ہوں اور اسی رقم کے لئے لوگوں نے ابن مبارک سے میری سفارش کی ہے۔ منشی کو خیال ہوا کہ ابن مبارک سے سبقت قلم ہوگئی ہے اور وہ سات سو کے بجائے سات ہزار لکھ گئے ہیں، منشی نے حامل رقعہ سے کہا، خط میں کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے تم بیٹھو میں ابن مبارکؒ سے دوبارہ دریافت کر کے تم کو رقم دیتا ہوں، اس نے ابن مبارکؒ کو لکھا کہ خط لانے والا تو صرف سات سو درہم کا طالب ہے اور آپ نے سات ہزار دینے کی ہدایت کی ہے، سبقت قلم تو نہیں ہوگئی ہے؟

انہوں نے جواب میں لکھا کہ جس وقت تم کو یہ خط ملے اسی وقت اس شخص کو تم چودہ ہزار درہم دے دو، منشی نے از راہ ہمدردی ان کو دوبارہ لکھا کہ اگر اسی طرح آپ اپنی دولت لٹاتے رہے تو جلد ہی سارا سرمایہ ختم ہو جائے گا۔ منشی کی یہ ہمدردی اور خیر خواہی ان کو ناپسند ہوئی اور انہوں نے ذرا سخت لہجہ میں لکھا کہ اگر تم میرے ماتحت اور مامور ہو تو میں جو حکم دیتا ہوں اس پر عمل کرو اور اگر تم مجھے اپنا مامور اور محکوم سمجھتے ہو تو پھر تم آ کر میری جگہ پر بیٹھو، اس کے بعد جو تم حکم دو گے میں اس پر عمل کروں گا۔

میرے سامنے مادی دولت وثروت سے زیادہ سرمایہ قیمتی آخرت کا ثواب اور نبی کا وہ ارشاد گرامی ہے کہ جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو اچانک اور غیر متوقع طور پر خوش کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا اس نے مجھ سے سات سو درہم کا مطالبہ کیا تھا، میں نے سوچا کہ اس کو سات ہزار ملیں گی تو یہ غیر متوقع رقم پا کر وہ بہت زیادہ خوش ہوگا اور فرمان نبوی کے مطابق میں ثواب کا مستحق ہوں گا دوبارہ رقعہ میں ۱۴ ہزار انہوں نے اس لئے کرایا کہ غالباً لینے والے کو ۷ ہزار کا علم ہو چکا تھا اس لئے اب زیادہ ہی رقم اس کیلئے غیر متوقع ہو سکتی تھی۔[1]

محمد بن عیسیٰؒ کا بیان ہے کہ ابن مبارکؒ طرطوس (شام) اکثر آیا کرتے تھے راستہ میں رقہ پڑتا تھا، یہاں وہ جس سرائے میں قیام کرتے تھے اس میں ایک نوجوان بھی رہا کرتا تھا جب تک ان کا قیام رہتا یہ نوجوان ان سے سماع حدیث کرتا اور ان کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ ایک بار یہ پہنچے تو اس کو نہیں پایا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ قرض کے سلسلہ میں قید کر دیا گیا ہے۔

---

[1] صفوۃ الصفوۃ جلد ۴۔ ص ۱۱۸

انہوں نے قرض کی مقدار اور صاحب قرض کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ فلاں شخص کا وہ دس ہزار کا مقروض تھا اس نے دعویٰ کیا تھا اور عدم ادائیگی کی صورت میں وہ قید کر دیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے قرض خواہ کو تنہائی میں بلایا اور اس سے کہا کہ بھائی تم اپنے قرض کی رقم مجھ سے لے لو، اس نوجوان کو رہا کرا دو۔ یہ کہہ کر اس سے یہ قسم بھی لی کہ وہ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرے گا اس نے اسے منظور کر لیا۔ ادھر آپ نے اس کی رہائی کا انتظام کیا اور اسی رات رختِ سفر باندھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے نوجوان رہا ہو کر سرائے میں پہنچا تو آپ کی آمد و رفت کی اطلاع ملی۔ اس کو ملاقات نہ ہونے کا اتنا رنج ہوا کہ اسی وقت طرطوس کی طرف روانہ ہو گیا۔ کئی منزل کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے اس کا حال دریافت کیا اس نے اپنے قید ہونے اور رہا ہونے کا ذکر کیا آپ نے پوچھا رہائی کیسے ہوئی؟ بولا کوئی اللہ کا بندہ سرائے میں آ کر ٹھہرا تھا اسی نے اپنی طرف سے قرض ادا کر کے مجھے رہا کرا دیا مگر میں اسے جانتا نہیں فرمایا کہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس مصیبت سے تمہیں نجات ملی۔

محمد بن عیسیٰؒ کا بیان ہے کہ ان کی وفات کے بعد قرض خواہ نے اس واقعہ کو لوگوں سے بیان کیا[1]۔

ان کی زندگی کا ایک خاص معمول زیارت حرمین بھی تھا قریب قریب ہر سال اس سعادت کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے، سفرِ حج کے موقع پر ان کا معمول تھا کہ سفر سے پہلے اپنے تمام رفقائے سفر سے کہتے کہ اپنی اپنی رقم سب لوگ میرے حوالہ کر دیں جب وہ لوگ حوالہ کر دیتے تو ہر ایک کی رقم کو الگ الگ ایک ایک تھیلی میں ہر ایک کا نام لکھ کر صندوق میں بند کر دیتے اور پورے سفر میں جو کچھ خرچ کرنا ہوتا وہ اپنی جیب سے کرتے، ان کو اچھے سے اچھا کھانا کھلاتے ان کی دوسری ضروریات پوری کرتے، جب فریضۂ حج ادا کر کے مدینہ منورہ پہنچتے تو رفقا سے کہتے کہ اپنے اہل و عیال کے لئے جو چیزیں پسند ہوں خرید لیں، سفر حج ختم کر کے جب گھر واپس آتے تو تمام رفقائے سفر کی دعوت کرتے پھر وہ صندوق کھولتے جس میں لوگوں کی رقمیں رکھی ہوئی تھیں اور جس تھیلی پر جس کا نام ہوتا اس کے حوالہ کر دیتے۔ راوی کا بیان ہے کہ زندگی بھر ان کا یہی معمول تھا۔

ان کے سوانح حیات اس طرح کے واقعات سے پُر ہیں یہ چند واقعات اس لئے نقل کئے گئے ہیں کہ اندازہ ہو سکے کہ ان کی تجارت اور حصولِ دولت کا مقصد اور مصرف کیا تھا۔

---

[1] صفوۃ الصفوۃ جلد ۴۔ ص ۱۱۷

اس علم وفضل، زہد وتقویٰ اور فیاضی اور سیر چشمی کے باوجود طبیعت میں تواضع وخاکساری اس قدر تھی کہ وہ اپنی رفتار وگفتار نشست وبرخاست کسی چیز سے اپنی اس امتیازی حیثیت کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ مرو میں ان کے پاس اچھا خاصہ کشادہ مکان تھا جہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا آپ کو یہ عقیدت مندی ناپسند تھی اس لئے وہاں سے کوفہ چلے آئے اور ایک نہایت ہی تنگ وتاریک مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ اتنا وسیع مکان چھوڑ کر اس تنگ وتاریک مکان میں رہتے ہوئے وحشت نہیں ہوتی؟ فرمایا کہ جس بات کو تم پسند کرتے ہو یعنی عقیدت مندوں کا ہجوم وہ مجھے ناپسند ہے، اسی لئے تو میں مرو سے بھاگ نکلا اور یہاں تم گمنام زندگی کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ مجھے یہی پسند ہے[۱]۔

ایک بار کسی سبیل[۲] پر پانی پینے کے لئے گئے اس کے قریب پہنچے تو ایک ہجوم سے انکو ایسا دھکا لگا کہ وہ پانی پینے کی جگہ سے دور جا پڑے جب وہاں سے نکلے تو حسن سے جو ان کے ساتھ تھے فرمایا کہ

ما العیش الا ھکذا یعنی لم تعرف ولم توقر[۳]۔

''زندگی اسی طرح گذارنی چاہئے کہ نہ ہم کو لوگ پہنچانیں اور نہ ہماری توقیر کریں''۔

شوقِ جہاد:

اوپر حضرت سفیان ثوریؒ کا یہ قول گزر چکا ہے کہ ابن مبارکؒ اپنی پوری زندگی میں صحابہ کے نمونہ تھے، صحابہ کرامؓ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ دعوت وتبلیغ، اور اقامت دین کی جدوجہد اور اصلاح حال اور جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری سے خالی نہیں ہوتا تھا، کسی وقت وہ اپنے داخلی دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے جہاد بالنفس میں مشغول رہتے تھے اور کبھی خارجی دشمن کو زیر کرنے کے لئے سینہ سپر رہتے تھے ان کی یہ خصوصیت ضرب المثل بن گئی ہے۔

فی اللیل رھبان وفی النھار فرسان

''رات میں وہ یکسو ہو کر عبادت میں لگے رہتے ہیں اور دن کو میدان میں شہ سوار نظر آتے ہیں''۔

عبداللہ ابن مبارک اس خصوصیت میں صحابہ کرام کا نقش ثانی تھے ایک وقت میں وہ مجلس درس میں رونق افروز ہوتے تو دوسرے وقت میں وہ ارشاد واصلاح کی مسند پر متمکن نظر آتے اور تیسرے

---

[۱] صفوۃ الصفوۃ جلد۴۔ ص۱۰۵ [۲] اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت عام جگہوں پر پانی پینے اور پلانے کا انتظام ہوتا تھا۔
[۳] صفوۃ الصفوۃ جلد۴۔ ص۱۱۰

وقت ایک سپاہی کی طرح میدان جہاد میں سرگرداں دکھائی دیتے انہوں نے سال کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ میں تجارت کرتے، دوسرے حصہ میں درس وتدریس کا کام انجام دیتے اور تیسرے حصے میں جہاد اور سفر حج میں مشغول رہتے تھے۔

ان کے درس وتدریس اور سفر حج کے واقعات کا ذکر اوپر آچکا ہے شرکت جہاد کے دو ایک واقعے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

اس زمانہ میں رومیوں اور مسلمانوں میں برابر آویزش رہتی تھی کبھی رومی اسلامی سرحدوں پر حملہ کرتے اور کبھی مسلمان پیش قدمی کرتے ایک بار مسلمانوں نے پیش قدمی کی عبداللہ بن مبارکؒ بھی جہاد میں ا رضا کارانہ شریک ہوئے۔ رومی فوج سے ایک سپاہی نکلا اور اس نے دعوتِ مبازرت دی۔ حضرت سلیمان مروزی کا بیان ہے کہ اسلامی فوج سے بھی ایک شخص اس کے مقابلہ کے لئے نکلا اور پہلے ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر دوسرا شخص سامنے آیا اس کا حشر بھی وہی ہوا، لگاتار اسی طرح یکے بعد دیگرے کئی آدمی مقابلہ میں آئے اور اس مجاہد نے ان سب کو ڈھیر کر دیا لوگوں نے یہ بہادری دیکھ کر مجاہد کو گھیر لیا، اس نے اپنا چہرہ لپیٹ رکھا تھا جب لوگوں نے چہرے پر سے کپڑا ہٹایا تو دیکھا کہ یہ بہادر مجاہد عبداللہ بن مبارکؒ ہیں [۲]۔

اہل تذکرہ لکھتے ہیں کہ مصیصہ، طرطوس وغیرہ مقامات میں یہ رومیوں کی سرحد سے قریب پڑتے تھے اس لئے بغرض جہاد ان جگہوں پر وہ اکثر جاتے رہتے تھے۔

ایک بار ایک مجوسی سے برسر پیکار تھے کہ اسی اثنا میں مجوسی کی عبادت کا وقت آگیا اس نے اس سے مہلت چاہی جب وہ سورج کے سامنے سربسجود ہوا تو انہوں نے ارادہ کیا کہ اس کا کام تمام کردیں، مگر یہ آیت

اوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولاً.

''عہد کی باز پرس ہوگی''۔

سامنے آئی تو رک گئے جب وہ عبادت سے فارغ ہوا اور اس کو اس بات کا علم ہوا تو وہ یہ کہتا ہوا حلقہ بگوش اسلام ہوگیا کہ

---

[۱] اس وقت تک کرایہ کے سپاہی ہی میدان میں نہیں بھیجے جاتے تھے بلکہ ہر مسلمان شرکت جہاد کو اپنے لئے سب سے بڑی خوش قسمتی اور سب سے افضل عبادت سمجھتا تھا۔ [۲] صفوۃ الصفوۃ

نعم الرب ربٌ یعاتب ولیه فی عدو .

''بہترین رب وہ ہے جو اپنے دوستوں پر دشمن کے معاملہ میں عتاب کرتا ہے''۔

مختصر یہ کہ دوسرے دینی فرائض کے ساتھ انہوں نے فریضۂ جہاد کو بھی اپنے اُوپر لازم کرلیا تھا۔

امراءاورسلاطین سے گریز :

امراء وسلاطین سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے، ہارون رشید نے کئی بار ملاقات کی خواہش ظاہر کی مگر یہ گریز کرتے رہے، ابراہیم موصلی جن کا تعلق دربارشاہی سے بھی تھا وہ ابن مبارکؒ سے غایت درجہ محبت کرتے تھے ان کی روایت ہے کہ ہارون نے متعدد بار ابن مبارکؒ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر میں کسی طرح ٹال دیتا تھا۔ اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ ابن مبارکؒ کے سامنے دین وشریعت کے خلاف کوئی بات ہوگی تو وہ ہارون کو سختی سے روکیں گے بلکہ تنبیہ کریں گے، اور یہ بات ہارون جیسے خود پسند خلیفہ کی ناگواری کا سبب بنے گی اور پھر نہ جانے اس کا کیا نتیجہ ہو۔

یہی نہیں کہ وہ خود دربار سے گریز کرتے تھے۔ بلکہ اپنے تمام احباب واقرباء کو بھی اس سے روکتے تھے۔

ابن علیہ اس وقت کے ممتاز محدث اور امام تھے وہ عبداللہ بن مبارکؒ کے خاص احباب میں تھے، تجارت میں بھی وہ ان کے شریک تھے۔ اٹھنا بیٹھنا بھی ساتھ تھا۔ مگر انہوں نے بعض امراء کی مجالس میں جانا شروع کردیا تھا[1]۔ عبداللہ بن مبارکؒ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا اور ایک روز مجلس میں آئے تو ان سے مخاطب نہیں ہوئے، ابن علیہؒ بے حد پریشان ہوئے، مجلس میں تو کچھ نہ کہہ سکے گھر پہنچے تو بڑے اضطراب کی حالت میں ابن مبارک کو یہ خط لکھا۔

اے میرے سردار! مدتوں سے آپ کے احسانات میں ڈوبا ہوا ہوں قسم ہے خدا کی ان احسانات کو میں اپنے متعلقین کے حق میں برکت شمار کرتا تھا۔ آپ نے مجھ کو نہ جانے کیوں اپنے سے جدا کردیا۔ اور مجھ کو میرے ہم نشینوں میں کم رتبہ بنادیا، میں آپ کے دولت کدہ پر حاضر ہوا لیکن آپ نے میری طرف توجہ تک نہ کی، اسی عدم توجہی سے مجھے آپ کی ناراضگی کا علم ہوا اور مجھے اب تک نہیں معلوم ہوسکا کہ میری کونسی غلطی آپ کے غضب وغصہ کا سبب بنی ہے۔

اے میرے محترم میری آنکھوں کے نور! میرے استاذ! خدا کی قسم آپ نے کیوں نہیں بتلایا کہ وہ کیا خطا ہوئی جس کی بناء پر میں آپ کی ان تمام نوازشوں اور کرم فرمائیوں سے جو میری غایت تمنا تھیں محروم ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے یہ پُر اثر خط پڑھا مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ چند اور اشعار جواباً ان کے پاس لکھ کر بھیج دیئے۔

یا جاعل العلم له بازیاً	یصطاد اموال المساکین
اے علم کو ایک ایسا باز بنانے والے	جو غریبوں کا مال سمیٹ کر کھا جاتا ہے
احتلت للدنیا و لذاتها	بحیلة تذهب بالدین
تم نے دنیا اور اس کی لذتوں کے لئے	ایسی تدبیر کی ہے جو دین کو مٹا کر رکھ دے گی
نصرت مجنونا بها بعد ما	کنت وواءً للمجانین
تم خود مجنون ہو گئے	جب کہ تم مجنونوں کا علاج تھے
این روایاتک فی سردها	عن ابن عون و ابن سیرین
وہ تمام روایتیں آپ کی کیا ہوئیں	جو ابن عون اور ابن سرین سے آپ بیان کرتے ہیں
این روایاتک والقول فی	لزوم ابواب السلاطین
وہ روایتیں کہاں گئیں جن میں	سلاطین سے ربط وضبط رکھنے کی وعید آئی ہے
ان قلت اکرهت فما زالذا	زل حار العلم فی العلین
اگر تم کہو کہ میں اس پر مجبور کیا گیا تو ایسا کیوں ہوا	ہاں جاز یا یہ بروکتا ہے چند، کہ اس طرح ذلت ہوتی ہے

ابن علیہ کے پاس قاصد یہ اشعار لے کر پہنچا اور انہوں نے پڑھا تو ان پر رقت طاری ہوگئی اور اسی وقت اپنے عہدہ سے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا[1]۔

مرجع خلائق:

انہی محاسن اور اوصاف کی بنا پر وہ مرجع خلائق بن گئے تھے، اگرچہ وہ اپنے فضل وکمال کو بہت کم ظاہر ہونے دیتے تھے مگر پھر بھی جس مقام پر پہنچ جاتے تھے لوگ جوق در جوق ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے، ان کو جو قبول عام حاصل تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے۔

ایک بار ابن مبارکؒ رقہ آئے[2]۔ اس کا علم ہوا تو استقبال کے لئے پورا شہر ٹوٹ پڑا، ہارون رشید کی ایک لونڈی محل سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی، اس نے لوگوں سے دریافت کیا یہ کیا ماجرا ہے؟

---

[1] صفوۃ الصفوۃ۔ جلد ۴۔ ص ۱۱۶　　[2] خلفائے عباسیہ عموماً رقہ میں گرمی گزارتے تھے، یہ مقام نہایت ہی سرسبز اور شاداب ہے۔

لوگوں نے اسے بتایا کہ خراسان کے ایک عالم ابن مبارکؒ یہاں آئے ہیں، انھیں کے استقبال کے لئے یہ مجمع اُمڈ آیا ہے۔ اس نے بے ساختہ کہا کہ

هو الملك لا ملك هارون الذى لا يجتمع الناس عليه الا بشروط و اعوان[1]

''حقیقت میں خلیفۂ وقت یہ ہیں ہارون نہیں، اس لئے کہ اس کے گرد کوئی مجمع بغیر پولیس فوج اور اعوان وانصار اکٹھا نہیں ہوتا''۔

حضرت سفیان ثوریؒ ان کو مشرق و مغرب کا عالم کہا کرتے تھے[2]۔

زریں اقوال :

تذکروں میں عبداللہ ابن مبارکؒ کے سینکڑوں قیمتی اقوال ملتے ہیں جن میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں :

معرفت الٰہی :

ایک بار فرمایا کہ اہل دنیا دنیا کی سب سے مرغوب اور لذیذ چیز سے لطف اندوز ہوئے بغیر یہاں سے رخصت ہوجاتے ہیں لوگوں نے پوچھا کہ سب سے لذیذ چیز کیا ہے؟ فرمایا: معرفت الٰہی۔

ورع وتقویٰ :

فرمایا کہ اگر آدمی سو باتوں میں تقویٰ اور خوفِ خدا اختیار کرتا ہے اور ایک بات میں نہیں تو وہ متقی نہیں ہے، فرمایا کہ اگر کوئی شخص سو چیزوں میں پرہیزگاری اختیار کرتا ہے اور ایک چیز میں اسے ترک کردیتا ہے تو اس کو متورع یعنی پرہیزگار نہیں کہا جاسکتا۔

مشتبہ مال :

فرمایا کہ میں ایک مشتبہ[3] درہم کو استعمال نہ کرنے کو سو درہم صدقہ کرنے کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتا ہوں۔

اللہ کے لئے محبت :

فرمایا میں کسی چیز کو تلاش کرنے میں تھکا نہیں بجز ایسے دوست کی تلاش میں جو صرف اللہ کے لئے محبت کرتا ہے۔

---

[1] کردری۔ ص ۱۷۳　[2] ایضاً　[3] مال و دولت کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک حلال، دوسرے حرام اور تیسرے جس کا حلال یا حرام ہونا مشتبہ ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ آدمی جب مشتبہات کے قریب جائے گا تو پھر حرام کھائے گا۔ اس لئے مشتبہ سے بچنا چاہئے۔ یہ اسی ارشاد نبوی ﷺ کی تفسیر ہے۔

شہرت :

فرمایا کہ گم نامی کو پسند کرو اور شہرت سے دور رہو مگر یہ ظاہر نہ کرو کہ تم گم نامی کو پسند کرتے ہو اس لیے کہ اس سے بھی نفس میں بلندی اور غرور پیدا ہوگا۔

تہذیب :

زندگی کے ہر معاملہ میں ادب وتمدن دین کا دوسرا حصہ ہے۔

شاعر اور عوام :

کسی نے پوچھا کہ بازاری لوگ کون ہیں؟ بولے: خزیمہ اور اس کے ساتھی پھر پوچھا کہ گرے ہوئے کون لوگ ہیں؟ بولے: جو قرض پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ہاتھ نہیں ہلاتے[1]۔

جہل :

فرمایا: جس میں جہالت و جاہلیت کی ایک عادت بھی موجود ہوگی اس کو جاہل کہا جائے گا، کیا سنا نہیں کہ حضرت نوحؑ نے جب یہ کہا کہ اے اللہ! میرے لڑکے کو اس طوفان سے بچالے، اس لئے کہ وہ میرے اہل میں ہے اور تو نے میرے اہل وعیال کو بچانے کا وعدہ فرمایا تو خدا تعالیٰ نے جواب دیا کہ میں نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں نہ ہو، تیرا لڑکا جب ایمان کی دولت سے محروم ہوگیا تو پھر اہل میں کہاں رہا صاحب زہد و تقویٰ آدمی دنیا میں بھی ایک بادشاہ وقت سے زیادہ معزز ہوتا ہے، کیونکہ بادشاہ اگر اپنے گرد لوگوں کو جمع کرنا چاہے تو اسے جبر و اکراہ کرنا پڑتا ہے، بخلاف خدا رسیدہ آدمی کے کہ وہ لوگوں سے بھاگتا ہے مگر لوگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

علم وعلمأ :

وہ شخص عالم نہیں ہوسکتا، جب تک اس کے دل میں خوف خدا اور دنیا سے بے رغبتی نہ ہو۔

تواضع :

ایک شخص نے پوچھا کہ تواضع کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اغنیاء کے مقابلہ میں خوددار رہنا۔

فرمایا کہ شریف وہ ہے جسے اطاعت الٰہی کی توفیق ہوئی، اور رذیل وہ جس نے بے مقصد زندگی گذاری ایک شخص نے حسن خلق کی تعریف پوچھی تو فرمایا کہ ترک الغضب غصہ نہ کرنا۔

---

۱ صفوۃ الصفوۃ ـ جلد ۴ ـ ص ۱۱۵ ، ۱۱۴

محاسن ومساوی :

فرمایا کہ کسی آدمی کے محاسن اور مصائب کا اندازہ اس کی کیت سے کرنا چاہئے یعنی اگر کسی کے اندر محاسن زیادہ ہیں تو اس کے معائب کو سامنے نہ لانا چاہئے اور اگر کسی میں معائب زیادہ ہیں تو محاسن کا کوئی شمار نہیں۔

حسن نیت :

فرمایا کہ بہت سے چھوٹے اعمال ہیں جو حسن نیت کی وجہ سے بڑے ہو جاتے ہیں اور بہت سے اعمال ہیں جو سوء نیت کی وجہ سے چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ علم کے لئے سب سے پہلے نیت وارادہ، پھر فہم و پھر عمل پھر حفظ اور اس کے بعد اس کی اشاعت وترویج کی ضرورت ہے۔

اُمت کے طبقے :

ایک روز میتب بن واضح سے ابن مبارک نے پوچھا کہ تم کو معلوم ہے کہ عام بگاڑ اور فساد کیسے پیدا ہوتا ہے؟ میتب نے کہا کہ مجھے علم نہیں، فرمایا کہ خواص کے بگاڑ سے عام بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ امت محمدیہ کے پانچ طبقے ہیں جب ان میں فساد اور خرابی پیدا ہوتی ہے تو سارا ماحول بگڑ جاتا ہے۔

(۱) علماء یہ انبیاء کے وارث ہیں مگر جب دنیا کی حرص وطمع میں پڑ جائیں تو پھر کس کو اپنا مقتدا بنایا جائے۔

(۲) تجار یہ اللہ کے امین ہیں جب یہ خیانت پر اتر آئیں تو پھر کس کو امین سمجھا جائے۔

(۳) مجاہدین، یہ اللہ کے مہمان ہیں جب یہ مال غنیمت کی چوری شروع کریں تو پھر دشمن پر فتح کس کے ذریعہ حاصل کی جائے۔

(۴) زہاد یہ زمین کے اصل بادشاہ ہیں، جب یہ لوگ برے ہو جائیں تو پھر کس کی پیروی کی جائے۔

(۵) حکام یہ مخلوق کے نگران ہیں جب یہ گلہ بان ہی بھیڑیا صفت ہو جائے تو گلہ کو کس کے ذریعہ بچایا جائے۔

غروراور خود پسندی :

ابو وہب مروزی نے غرور کی تعریف پوچھی تو فرمایا کہ لوگوں کو حقیر سمجھنا اور عیب نکالنا غرور ہے، پھر عجب یعنی خود پسندی کی تعریف پوچھی تو بولے کہ آدمی یہ سمجھے کہ جو اس کے پاس ہے وہ دوسرے کے پاس نہیں ہے۔

حقیقی جہاد :

ایک شخص نے جہاد اور اس کی تیاری کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا کہ اپنے نفس کو حق پر جمائے رکھنا یہاں تک کہ وہ خود اس پر جم جائے، سب سے بڑا جہاد ہے، یہ اس حدیث کا بالکل ترجمہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

المجاہد من جاھد نفسہ [۱] ''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے لڑے''۔

تصنیف :

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی زندگی میں مجاہدانہ رنگ غالب تھا اس لئے وہ علم وفن اور تدوین وتالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کر سکے، پھر بھی انہوں نے جو کچھ تحریری یادگاریں چھوڑی ہیں وہ ان کے علم وفضل پر شاہد ہیں، امام ذہبیؒ نے اس سلسلہ میں ان کی صرف ایک کتاب کتاب الذہب کا تذکرہ کیا ہے اور پھر لکھا ہے :

صاحب التصانیف النافعة [۲]۔

''بہت سی مفید کتابوں کے مصنف ہیں''۔

تذکروں میں کتاب الذہب کے علاوہ ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں ہے۔ مگر ابن ندیم نے متعدد کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

(۱) کتاب السنن (۲) کتاب التفسیر (۳) کتاب التاریخ (۴) کتاب الزہد (۵) کتاب البر والصلة [۳]۔

وفات :

ان کی وفات جس طرح ہوئی اس میں ہر مومن کے لئے سامان بصیرت ہے ان کی زندگی زہد واتقا کا مرقع تھی مگر ان کی سب سے نمایاں خصوصیت جہاد فی سبیل اللہ تھی، اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ ان کی وفات بھی اسی مبارک سفر میں ہوئی۔

شام کے علاقہ میں جہاد کے لئے گئے ہوئے تھے کہ اثنائے سفر میں طبیعت خراب ہوئی، ستو پینے کی خواہش کی، ایک شخص نے ستو پیش کیا مگر یہ شخص ہارون کا درباری تھا اس لئے اس کا ستو پینے سے انکار کر دیا، وفات سے کچھ دیر پہلے آواز پھنس گئی، اس گلو بندی کی وجہ سے ان کو گمان ہوا کہ

---

[۱] کردری۔ جلد ۲۔ ص ۱۷۶ [۲] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۲۵۰ [۳] ابن ندیم۔ ص ۳۱۹

زبان سے کلمہ شہادت نکلنا نہ رہ جائے اس لئے انہوں نے اپنے ایک شاگرد حسن بن ربیع سے کہا کہ دیکھو جب میری زبان سے کلمہ شہادت نکلے تو تم اتنی بلند آواز سے دہرانا کہ میں سن لوں جب تم ایسا کرو گے تو یہ کلمہ خود بخود میری زبان سے جاری ہو جائے گا، چنانچہ اسی حالت میں وہ اپنے خالق سے جا ملے۔

سنہ، عمر اور مقامِ وفات :

یہ حادثہ عظمیٰ ۱۸۱ھ میں مقام ہیت میں پیش آیا۔ وفات کے وقت عمر ۶۳ سال تھی۔

مقبولیت :

وفات گو وطن سے سینکڑوں میل دور ہوئی تھی عام مقبولیت کا حال یہ تھا کہ جب لوگوں کو وفات کی اطلاع ملی تو جنازہ پر اس قدر اژدہام ہوا کہ ہیت کے حاکم کو اس واقعہ کی اطلاع دارالخلافہ بغداد بھیجنی پڑی۔ زندگی میں وہ ہارون سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے مگر جب اس کو اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ آج لوگوں کو عام اجازت دے دو کہ ان کی تعزیت لوگ ہمارے پاس آ کر کرے (مقصد یہ تھا کہ ان کی وفات پوری مملکت اسلامی کے لئے ایک حادثہ ہے اور میں اس وقت اس کا ذمہ دار ہوں تو ان کی تعزیت کا میں بھی حقدار ہوں) مگر فضل نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی تو ہارون نے ان کے کچھ اشعار پڑھے اور اس حادثہ کی اہمیت بتلائی۔

راوی کا بیان ہے کہ ان کی وفات کے بعد مجھے اس آیت کا مفہوم واضح ہوا۔

انّ الّذین آمنوا و عملوا الصالحات سیجعل لھم الرّحمن وُدّاً

''جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا ان کی محبت اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں پیدا کرے گا''۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت امام شعبہؒ

امام شعبہؒ کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے مگر وہ اپنے علم وفضل، دیانت وتقویٰ اور بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے تابعین کے زمرہ میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، انہوں نے دو صحابی حضرت انس بن مالک اور عمرو بن سلمہؓ کو دیکھا تھا۔ اگر ان کے تابعی ہونے کے لئے کوئی دوسری وجہ نہ بھی ہوتی تو تنہا روایت صحابہ کا فضل ہی ان کی تابعیت کے لئے کافی تھا مگر ارباب تذکرہ ان کا ذکر تابعین کے ساتھ کرتے ہیں۔ غالباً ان کے نزدیک صرف روایت صحابہ تابعیت کے لئے کافی نہیں اس لئے ان کو اس فہرست میں لے لیا گیا ہے۔

نام ونسب اور ولادت :

شعبہ نام اور ابو بسطام کنیت ہے۔ والد کا نام حجاج تھا، ان کے والد قصبہ واسط کے قریب ایک دیہات تہیمان[1] کے رہنے والے تھے، ۸۳ھ میں یہیں ان کی ولادت ہوئی۔

تعلیم وتربیت :

ان کی ولادت تو ایک گاؤں میں ہوئی مگر ان کے والد غالباً ترک سکونت کر کے شہر واسط چلے آئے۔ واسط کوفہ وبصرہ کے درمیان ایک مرکزی مقام ہے جہاں علم وادب کا کافی چرچا تھا۔ امام شعبہؒ کا نشوونما یہیں کے علم پرور ماحول میں ہوا۔ ان کی علمی زندگی شعر وادب سے شروع ہوئی مگر بہت زیادہ دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ وہ علم حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ امام المحدثین بن گئے۔ خود انہوں نے یہ واقعہ اپنی زبان سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں زیادہ تر مشہور شاعر طرماح کے پاس رہتا تھا اور اس سے شعر وشاعری کے بارے میں سوال کرتا رہتا تھا مگر ایک دن کوفہ کے مشہور محدث حکم بن عتیبہؒ کی مجلس درس سے گذرا تو وہ محدثانہ انداز سے ارشادات رسول ﷺ کی

---

[1] عام تذکرہ نگار ان کی جائے پیدائش واسط کو بتاتے ہیں مگر سمعانی نے لکھا ہے کہ واسط نہیں بلکہ اس کے ایک قریہ میں ان کی ولادت ہوئی۔

روایت کر رہے تھے۔ حدیث نبوی ﷺ کی آواز جب میرے کانوں میں پہنچی تو وہ دل تک اتر گئی[1]۔ میں نے اسی وقت دل میں سوچا کہ شعر و شاعری جس کی طلب اب تک میں نے کی ہے اس کے مقابلہ میں حدیث نبوی ﷺ کی طلب بدرجہا بہتر ہے۔ چنانچہ اس دن سے میں علم حدیث کے حصول میں لگ گیا۔ افسوس[2] کے ساتھ فرماتے تھے کہ میں اگر شعر و ادب میں نہ لگ گیا ہوتا تو امام شعبیؒ کی حدیث میں استفادہ کیا ہوتا[3]۔

شیوخ حدیث :

امام شعبہؒ نے اس وقت کے تمام ممتاز محدثین سے سماع حدیث کیا تھا۔ عام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کے شیوخ حدیث میں تقریباً چار سو تابعین شامل ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان کے شیوخ کی جو فہرست دی ہے اس میں تین سو سے اوپر نام ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ کوفہ کے تین سو شیوخ حدیث سے روایت کی ہے۔

یہ شیوخ کسی ایک دو مقام پر نہیں بلکہ ممالک اسلامیہ کے لاکھوں مربع میل علاقہ میں پھیلے ہوئے تھے، پھر راستہ کی دشواری اور اس زمانہ کے محدود حمل و نقل کے ذرائع پر غور کیجئے، گدھے، اونٹ یا کسی خوش قسمت کو گھوڑے میسر ہو جاتے تھے ان کے ذریعہ یہ لاکھوں میل کا فاصلہ طے کرنا کتنا دشوار کام تھا پھر ایسا بھی ہوتا تھا کہ بسا اوقات ایک ایک حدیث کے لئے ہزاروں میل کا سفر طے کرنا پڑتا تھا اور پھر امام شعبہؒ کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو چکا تھا۔ انہوں نے انتہائی عسرت کی حالت میں تعلیم حاصل کی، خود فرماتے تھے کہ عسرت کی وجہ سے میں نے سات دینار میں اپنی والدہ کا طشت فروخت کر ڈالا تھا، ظاہر ہے کہ ان کو یہ تمام سفر پیدل ہی طے کرنے پڑے ہوں گے۔

(تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۷۴)

قوت حافظہ :

خدائے تعالیٰ نے قوتِ حافظہ بھی غیر معمولی دیا تھا، وہ حدیث نبوی ﷺ بہت کم لکھتے تھے، مگر لمبی لمبی حدیثیں نوک زبان رہتی تھیں، ایک بار علی بن المدینی نے یحییٰ بن قطانؒ سے پوچھا کہ

---

[1] امام شعبہ اور اعمش دونوں حکم بن عتیبہ کے شاگرد ہیں، مگر احمد بن حنبل" کہا کرتے تھے کہ شعبہ حکم کے احادیث کے سب سے بڑے محافظ ہیں، اگر وہ نہ ہوتے تو حکم کی مرویات ضائع ہو جاتیں۔

[2] تاریخ بغداد۔ جلد ۹۔ ص ۲۵۷۔ تاریخ بغداد انہوں نے حدیث کی طرف توجہ کی تو امام شعبی وفات پا چکے تھے، جسکا ان کو افسوس تھا۔

[3] تاریخ بغداد۔ جلد ۹۔ ص ۲۶۴۔

سفیان ثوریؒ اور امام شعبہ میں کون لمبی لمبی حدیثوں کو زیادہ اچھی طرح یاد رکھتا تھا، بولے شعبہ اس میں بہت آگے تھے[1]۔ غیر معمولی قوت حافظہ اور اس کدوکاوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلدی حدیث نبوی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان کے سینے میں محفوظ ہو گیا، اور اب وہ مرجع خلائق بن گئے، اسلامی مملکت کے گوشہ گوشہ سے حدیث نبوی کے پروانے آ کر اس شمع علم کے گرد جمع ہونے لگے۔

بصرہ میں قیام اور حلقہ درس :

تحصیل علم کے بعد انہوں نے واسط کے بجائے بصرہ میں جو اس وقت علم وفن کا گہوارہ تھا، قیام کیا اور وہیں اپنا حلقہ درس قائم کیا، بصرہ کی سرزمین ان کو ایسی پسند آئی کہ ساری عمر وہیں ختم کر دی، خلیفہ مہدی نے ان کو بصرہ میں کچھ زمین بھی عطا کر دی تھی مگر انہوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی[2]۔

تلانده :

اس سرچشمہ علم سے جن تشنگان علم نے فائدہ اٹھایا ان کی صحیح تعداد تو نہیں بتائی جا سکتی، حافظ ابن حجر نے ان کے ۴۲ ممتاز تلانده کا ذکر کیا ہے، اسی طرح دوسرے اہل تذکرہ نے بھی کچھ نام گنائے ہیں، امام نووی چند ائمہ کے نام لکھنے کے بعد فرماتے ہیں :

وخلائق لایحصون من کبار الائمة[3]

" ان کے ممتاز تلانده کا بھی شمار نہیں کیا جا سکتا "

چند آئمہ کے نام یہ ہیں :

حضرت سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبدالرحمٰن بن مہدی، کووکیع بن جراح، ایوب سختیانی، اعمش، محمد بن اسحاق، ابوداؤد، عبداللہ بن مبارک اسمٰعیل بن علیہ وغیرہ۔

علم وفضل :

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ ان کی تعلیم شعروادب سے شروع ہوئی تھی، اور مشہور شاعر طرماح کے شاگرد تھے، خود اصمعی ان کے ادبی ذوق کا معترف تھا، اس کے بعد دینی علوم کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی انہوں نے ممتاز حیثیت حاصل کی، خصوصیت سے حدیث میں ان کی امامت اور جلالت تو ضرب المثل بن گئی ہے، حدیث کی کوئی قابل ذکر کتاب ایسی نہیں ہے، جس میں ان کی مرویات

---

[1] تاریخ بغداد۔ جلد ۹۔ ص ۲۶۴　[2] تاریخ بغداد۔ جلد ۹۔ ص ۳۵۶　[3] تہذیب الاسماء۔ ص ۲۴۵

کثرت سے موجود نہ ہوں، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ علی بن المدینی کے واسطہ سے ان کی دو ہزار حدیثیں ہم تک پہنچی ہیں، ابوداؤدؒ کہتے تھے کہ میں نے ان سے سات ہزار حدیثیں سُنی ہیں جن میں سے ایک ہزار حدیثوں پر میں نے ان سے ردوقدح کیا اور ایک ہزار حدیثوں کے دلائل براہین سے خود انہوں نے مجھے واقف کیا[1]۔

علماء کا اعتراف :

اس وقت کے تمام علماو محدثین کو ان کے علم وفضل کا اعتراف تھا، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ علم حدیث میں امام شعبہؒ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے، امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ اگر امام شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں علم حدیث اتنا زیادہ معروف نہ ہوتا، سفیان ثوری فرماتے تھے کہ شعبہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ حدیث کی بصیرت، حفظ واتقان اور رجال کی تنقید میں وہ تنہا ایک اُمت کے برابر تھے۔ مشہور محدث حماد بن زید فرماتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی روایت میں امام شعبہ میری موافقت کرتے ہیں تو میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا، انہی حماد کا بیان ہے کہ ایوب سختیانی نے ایک دن کہا کہ جلد ہی واسط سے ایک محض حدیث کا ماہر آنے والا ہے، اس سے حدیثیں سیکھو، ان کا اشارہ امام شعبہ کی طرف تھا۔ ابوالولید نے یحیٰی بن سعید سے پُوچھا کہ امام شعبہ سے زیادہ اچھا حدیث کا کوئی عالم آپ نے دیکھا ہے یا نہیں۔ فرمایا نہیں! پُوچھا آپ ان کی صحبت میں کتنے دن رہے؟ بولے بیس برس[2]۔

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ ان کی امامت وجلالت پر سب کا اتفاق ہے، حاکم نے لکھا ہے کہ یہ معرفت حدیث میں امام الائمہ تھے، امام ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے بھی قریب قریب یہی الفاظ لکھے ہیں۔

روایت حدیث میں احتیاط :

اس علم وفضل کے باوجود حدیث کی روایت میں بڑی احتیاط کرتے تھے، جب تک وہ کسی حدیث کو کئی کئی بار سُن نہ لیتے تھے، اس کی روایت نہیں کرتے تھے، بسا اوقات ایک ایک حدیث کا سماع وہ بیس بیس مرتبہ کرتے تھے، حماد بن زیدؒ کہتے تھے کہ کسی حدیث میں اگر شعبہ میرے موافق ہوں تو میں کسی دوسرے کی پرواہ نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ کسی حدیث کو سُننے کے بعد فوراً مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ میں نے حدیث نبوی کی روایت میں شعبہ سے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ا۔ ص ۱۷۰ [2] ایضاً۔ تاریخ بغداد

زیادہ کسی کو محتاط نہیں پایا [۱]۔ ان کو صحیح حدیث میں بھی شک ہو جاتا تھا، تو ترک کر دیتے تھے [۲] خود فرماتے تھے کہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں یہ مجھے پسند ہے مگر یہ پسند نہیں کر سکتا کہ میں نے کسی حدیث کو سُنا نہ ہو اور یہ کہوں کہ سمعت میں نے سُنا ہے [۳]۔

اس زمانہ میں حدیث میں بعض لوگ تدلیس کرتے تھے، تدلیس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی راوی کسی وجہ سے اپنے اس شیخ کا نام نہ لے جس سے اس نے روایت سُنی ہے بلکہ اُوپر کے راوی کا نام لے، یہ ایک طرح کی غلط بیانی ہے، اس لئے ائمہ نے اس کو بہت ناپسند کیا ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مشکوٰۃ کے مقدمہ میں لکھا ہے :

بالغ شعبة فی ذمه

''امام شعبہ تدلیس کی بہت زیادہ مذمت کرتے تھے''۔

خود اپنے بارے میں فرماتے تھے کہ میں یہ پسند کروں گا کہ میں آسمان سے گر پڑوں اور میرے جسم کے ٹکڑے ہو جائیں مگر یہ بات پسند نہیں کر سکتا کہ میں کسی حدیث کی روایت میں تدلیس کروں۔

وہ روایت حدیث میں خود ہی احتیاط نہیں کرتے تھے، بلکہ دوسروں کو بھی اس سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے، جب کسی نااہل آدمی کو حدیث کی روایت کرتے سُنتے تھے تو اس کے پاس جاتے اور اس سے کہتے کہ تم حدیث نبوی ﷺ کی تحدیث چھوڑ دو ورنہ میں بادشاہ کے پاس تمہاری شکایت لے جاؤں گا۔

تنقید رجال کی ابتداء :

اس وقت حدیث کی روایت میں جو بے اعتدالیاں شروع ہو گئی تھیں اور حدیث کا مبارک علم جس طرح آہستہ آہستہ نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں جا رہا تھا، اگر بروقت اس کی روک تھام نہ کی جاتی تو اُمت میں ایک نئے فتنے کا آغاز ہو جاتا، خدا جزائے خیر دے امام شعبہ کو کہ وہ ہر وقت اس فتنے کے خلاف صف آرا ہو گئے، انہوں نے رواۃ حدیث پر کلام کیا، ان کے صفات بتائے، ان کے لئے کچھ اصول مقرر کئے، اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے اعتدالیاں کم ہونے لگیں اور ہر کس و ناکس کو روایت حدیث کی جُرأت نہیں ہوتی تھی، امام شعبہؒ نے جس کام کی ابتدا کی تھی گو اس کی تکمیل دوسرے آئمہ یعنی

۱۔ تاریخ بغداد　۲۔ ایضاً　۳۔ تہذیب التہذیب

امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ وغیرہ نے کی مگر بہر حال تقدم کا شرف امام شعبہؒ کو حاصل ہے[1]۔
امام نوویؒ نے صالح بن محمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ۔

اول من تکلم فی الرجال شعبہ ثم تبعہ یحییٰ القطان ثم احمد بن حنبل و یحییٰ بن معین[2]۔

''راویوں پر سب سے پہلے تنقید امام شعبہ نے شروع کی، پھر امام یحییٰ القطان نے ان کے بعد امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے''۔

حافظ ابن حجرؒ نے بھی اپنی کتاب تہذیب میں ابوبکر ابن منجویہ کا قول نقل کیا ہے کہ :

وھو اول من فتش بالعراق عن امر المحدثین و جانب الضعفاء والمتروکین۔ (جلد ۴ ص ۳۴۵)

''عراق، میں سب سے پہلے امام شعبہ نے عام محدثین اور ضعیف اور متروک راویوں کے بارے میں چھان بین شروع کی''۔

تنقید رجال کے بارے میں امام شعبہؒ کی حیثیت اتنی مسلم ہو چکی تھی کہ جن راویوں سے وہ روایت نہیں کرتے تھے، دوسرے محدثین بھی ان کی روایت سے گریز کرتے تھے، ممتاز محدث ابن عون سے کسی نے پوچھا کہ آپ فلاں آدمی سے روایت نہیں کرتے آخر اس کا سبب کیا ہے؟ بولے ! شعبہ اس سے روایت نہیں کرتے تھے[3]۔

حدیث میں ان کی امامت وجلالت مسلم تھی، مگر اس کے باوجود وہ انسان تھے۔ اس لئے ان سے روایت حدیث میں لغزشیں ہوئی ہیں۔ جن کی طرف بعد کے علماء نے توجہ دلائی ہے۔

علامہ عجلیؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث میں ثقہ اور قابلِ اعتماد ہیں، مگر اسماء رجال میں ان سے کبھی کبھی غلطی ہو جاتی تھی۔ دار قطنی نے لکھا ہے کہ متن حدیث کے یاد کرنے میں اتنا زیادہ مشغول رہتے تھے کہ ان کی توجہ رواۃ کی طرف نہیں ہونے پاتی تھی۔ اس وجہ سے رجال کے ناموں میں کبھی کبھی غلطی ہو جاتی تھی۔ مگر ان کی اس غلطی کا اثر روایت کی صحت اور عدم صحت پر نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ صرف اتنا ہوتا تھا کہ روایت کرتے وقت کبھی کسی راوی کا نام بھول گئے یا اس کا نام غلط لے لیا کرتے تھے۔

---

[1] اب یہ ایک مستقل فن اسماء الرجال کے نام سے بن گیا ہے، جس میں رواۃ حدیث کی سیرت و کردار پر پوری بحث ہوتی ہے۔ [2] تہذیب الاسماء [3] تہذیب التہذیب

چنانچہ حضرت سفیان ثوریؒ سے کسی نے ان کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ امام شعبہ اسماء الرجال میں غلطی کرتے ہیں مگران کی غلطی،

لا یضره ویعاب علیه .

''ایسی نہیں ہے جس سے ان کی عظمت پر حرف آتا ہو یا ان کی وجہ سے ان کو مطعون کیا جائے''۔

زہد وتقویٰ اور سیرت وکردار :

امام شعبہؒ اس علم وفضل کے ساتھ اپنے سیرت وکردار اور زہد وتقویٰ میں بھی ممتاز تھے۔

نماز نہایت ہی حضور قلب اور خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھتے تھے۔ رکوع وسجدہ میں اتنی تاخیر کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو شبہ ہوتا کہ وہ بھول گئے۔ ابوقطن کا بیان ہے کہ امام شعبہؒ جب رکوع یا سجدہ کرتے تھے تو مجھے گمان ہوتا تھا کہ شاید یہ بھول گئے ہیں، اس لئے اتنی تاخیر ہو رہی ہے[1]۔

نماز میں انہیں اس قدر لطف آتا تھا کہ جب بھی ان کو فرصت ملتی تو وہ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ روزہ سے بھی ان کو خاص شغف تھا، سال کے اکثر ایام میں وہ روزے سے ہوتے تھے، کثرت صوم وعبادت کی وجہ سے نہایت ہی کمزور اور نحیف ہو گئے تھے، اور چہرہ کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا، مگر صوم صلوٰۃ کی یہ کثرت حقوق عباد کی ادائیگی یا خدمت خلق میں سدّ راہ نہیں بنتی تھی بلکہ وہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کی بھی پوری نگہداشت کرتے تھے غریبوں اور مسکینوں کے تو وہ ملجاو ماویٰ تھے، خود ان کی مالی حالت کچھ اچھی نہیں تھی، مگر جب بھی ان کے ہاتھ میں کوئی رقم آجاتی تو وہ فوراً فقراو مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے، ایک بار خلیفہ مہدی نے تین ہزار درہم ان کے پاس بھجوائے، انہوں نے پوری رقم اہل حاجت میں تقسیم کرادی، کسی مسکین کو دیکھ لیتے تو ان کا دل بھر آتا تھا، اوران کے پاس جو کچھ ہوتا تھا، دے ڈالتے تھے۔

حضرت نصر بن شمیل بیان کرتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ غریبوں پر رحم کرنے والا آدمی نہیں دیکھا، ان کی یہ کیفیت تھی کہ جب کوئی غریب آدمی ان کے پاس سے گزرتا تھا تو جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا تھا، اس کی طرف نظر ترحم سے دیکھتے رہتے تھے[2]۔

ایک بار وہ گدھے پر سوار ہو کر کہیں جارہے تھے، راستے میں مشہور محدث سلیمان بن مغیرہ ملے[3]۔ انہوں نے اپنے فقر وفاقہ کی شکایت کی، امام شعبہؒ نے کہا کہ واللہ میرے پاس اس

---

[1] تذکرۃ الحفاظ　[2] تاریخ بغداد، تذکرۃ الحفاظ　[3] یہ تمام واقعات تاریخ بغداد سے لئے گئے ہیں

گدھے کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے، یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گئے اور گدھا سلیمان کے حوالہ کر دیا، ایک بار کسی پڑوسی نے ان سے کچھ مانگا، ان کے پاس کچھ موجود نہیں تھا، فرمایا ایسے وقت میں تم نے مجھ سے سوال کیا کہ کچھ موجود نہیں ہے اچھا یہ سواری کا گدھا لے لو، اس نے گدھا لینے سے انکار کیا، آپ نے پھر اصرار کیا تو اس نے لے لیا، وہ گدھے کو لے کر کچھ آگے گیا تھا کہ ان کے بعض احباب نے دیکھا اور پہچانا کہ یہ تو امام شعبہ ؒ کی سواری کا گدھا ہے، وہ چونکہ ان کی طبیعت سے واقف تھے اس لئے صورت حال سمجھ گئے، انہوں نے سائل سے پانچ درہم میں گدھے کو خرید لیا اور پھر اس کو لا کر امام شعبہ کو ہدیہ کر دیا، امام شعبہؒ اس وصف میں بالکل انصارؓ کے نمونہ تھے، قرآن نے جن کے بارے میں کہا ہے۔

ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصه

"انصار کا حال یہ ہے کہ وہ خود تنگی میں ہوتے ہوئے بھی ایثار سے کام لیتے تھے"

اس صفت، میں وہ اس قدر معروف ومشہور تھے کہ ان کو لوگ ابوالفقراء وامہم (مساکین کے ماں باپ) کہنے لگے تھے، اپنے تلامذہ سے کہا کرتے تھے کہ اگر (میرے درس میں) مساکین نہ ہوتے تو تم لوگوں کے لئے یہ مجلس نہ برپا کرتا[1] مقصد یہ ہے کہ غریبوں کے پاس وہ اسباب وذرائع نہیں ہیں جن کی مدد سے وہ وطن سے باہر جا کر تحصیل علم کر سکیں، اس لئے میں درس دیتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی یہیں رفع ہو جائے اور ان کو باہر نہ جانے کا کوئی غم نہ ہو۔

سادگی :

امام شعبہ ؒ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی مگر ان کے دو بھائی شاد اور حماد جو صرافہ کا کام کرتے تھے بہت مالدار تھے، یہ دونوں بھائی امام شعبہ ؒ کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے، ان کی اور ان کے اہل وعیال کی کفالت بھی انہی کے ذمہ تھی، پھر خلفاء کے یہاں بھی ان کی قدر ومنزلت تھی، اگر وہ چاہتے تو ان دونوں ذرائع سے کام لے کر بڑی آرام وسکون کی زندگی بسر کر سکتے تھے، مگر انہوں نے ہمیشہ نہایت ہی سادگی بلکہ فقر وفاقہ کی زندگی بسر کی، اپنی ضرورت سے زیادہ انہوں نے نہ تو اپنے بھائیوں سے لینا پسند کیا اور نہ اُس کے لئے کبھی دربار خلافت کا رُخ کیا، اور اگر ضرورت سے زیادہ کوئی رقم ہدیۃً وتحفۃً آ گئی تو فوراً اسے اہل حاجت میں تقسیم کر ڈالا۔

---

[1] تاریخ بغداد

امام شعبہؒ کا لباس عموماً کرتا پائجامہ اور ایک چادر پر مشتمل ہوتا تھا، وہ بھی نہایت ہی کم قیمت، ان کے ایک شاگرد سلیمان کا بیان ہے کہ ان کا پورا لباس دس درہم (دو روپیہ) سے بھی کم قیمت کا ہوتا تھا، ایک بار وہ سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے، احباب نے ان کی سواری اور لباس کی قیمت کا اندازہ لگانا شروع کیا تو ان کا تخمینہ ۱۸ درہم چار پانچ روپے سے زیادہ نہیں ہوا، ان کی سادگی اور کسر نفسی کا اندازہ اس سے لگائے کہ وفات کے بعد جب گھر کا سامان جمع کیا گیا تو پورا اثاثہ ایک گدھا، اس کی زین اور لگام، بدن کا کپڑا موزہ اور ایک جوڑا جوتا تھا جس کی مجموعی قیمت ۱۶ درہم تھی، خود فرمایا کرتے تھے کہ اگر میرے گھر میں آٹا اور پانی پینے کا برتن موجود ہے تو مجھے اور کسی چیز کے نہ ہونے کا کوئی غم نہیں ہے[1]۔

خود ہی سادہ زندگی بسر نہیں کرتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرتے تھے، ابونوحؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار انہوں نے مجھے قیمتی کپڑا پہنے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ کتنے میں تیار ہوا ہے؟ میں نے کہا آٹھ درہم میں، بولے بندۂ خدا! اللہ سے ڈرتے نہیں آٹھ درہم کا صرف کرتا پہنتے ہو، کیا حرج تھا اگر چار درہم کا کرتا بنواتے اور چار درہم کسی مستحق کو دے دیتے۔

خوفِ آخرت:

آخرت کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا تھا، حدیث کی روایت میں وہ جس قدر احتیاط کرتے تھے اس کا ذکر اُوپر آ چکا ہے، مگر اس احتیاط کے باوجود آخرت کی بازپُرس سے ہر وقت خائف رہتے تھے کہ کوئی غلطی ہوگئی ہو اور قیامت کے دن خدا کے حضور شرمندہ ہونا پڑے، فرماتے تھے کہ کاش میں ایک معمولی فرد ہوتا اور مجھے حدیث کی معرفت نہ حاصل ہوتی، بسا اوقات جب ان کے سامنے کوئی حدیث بیان کی جاتی تو وہ چیخ اُٹھتے تھے، ان کا یہ خوف اور ڈر ان ذمہ داریوں کے احساس کی وجہ سے تھا جو حدیث کے راوی کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی تھیں ایک ذمہ داری روایت کی تھی، دوسرے اس کے عمل واتباع کی، ظاہر ہے کہ ایسی بہت سی احادیث خود انہوں نے روایت کی ہوں گی جن میں ان دونوں ذمہ داریوں کی طرف حضور انور ﷺ نے توجہ دلائی ہوگی تو ان کا یہ خوف لازمی تھا، اگر کسی کو خوف نہ ہو تو تعجب ہے۔

---

[1] صفوۃ الصفوۃ

انہی اوصاف وکمالات اور اخلاقی خوبیوں کی بناء پر حضرت یحییٰ بن معینؒ جو خود علم وتقویٰ میں آپ اپنی نظیر تھے امام شعبہ کو امام المتقین کہتے تھے، حضرت یحییٰ بن معین کے متعدد شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے یحییٰ بن معینؒ کی زبان سے سنا ہے کہ۔

شعبہ امام المتقین

'' شعبہ متقیوں کے امام ہیں ''

دربارِ خلافت سے تعلق :

اُموی اور عباسی دور کے متعدد خلفا کا زمانہ پایا، مگر اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے کبھی ان کے پاس نہیں گئے، خصوصیت سے مہدی ان کا بہت قدردان تھا، اوپر ذکر آچکا ہے، کہ ایک بار اُس نے ان کو کچھ زمین دی اور تیس ہزار درہم نقد تحفۃً دیئے، مگر انہوں نے نہ تو زمین سے فائدہ اُٹھایا اور نہ اس رقم کو اپنے مصرف میں لائے، بلکہ یہ پوری رقم فقراء میں تقسیم کردی، اوپر ذکر آچکا ہے کہ امام شعبہؒ کے دو بھائی بڑے مالدار تھے، ایک بار انہوں نے خلیفہ مہدی سے کئی ہزار دینار کا غلہ خریدا، اتفاق سے اس میں ان کو گھاٹا ہوا، اور وہ غلہ کی رقم حسب وعدہ مہدی کو ادا نہ کر سکے، عدم ادائگی کے جُرم میں ایک بھائی کو سزا ہوگئی، امام شعبہ کو جب اطلاع ہوئی تو اس کو بہت رنج ہوا، اور ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے بھائی کی رہائی کے لئے دربار خلافت میں گئے، وہ اس کے پاس پہنچے اور کچھ ایسے اشعار پڑھے جن میں اپنے مدعا کی طرف اشارہ تھا، مہدی سمجھ گیا، اور بولا کہ ابو بسطام اس بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ جس مقصد کے لئے تشریف لائے ہیں اسے ابھی پورا کئے دیتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے فوراً حکم دیا کہ امام شعبہؒ کے بھائی کو ان کے ساتھ کردو، اور ان سے کوئی مطالبہ نہ کیا جائے۔

امام شعبہؒ دربار خلافت میں دنیا طلبی یا کسی وجاہت کے حصول کے لئے نہیں گئے تھے، مگر پھر بھی یہ واقعہ بالکل انوکھا تھا، اس لئے اس پر چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، خاص طور سے اہل عزیمت علماء جو دربار سے کسی طرح کے تعلق کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کے لئے یہ خبر بڑی افسوس ناک تھی، چنانچہ امام سفیان ثوریؒ کو جب اطلاع ملی تو انہوں نے کہا کہ لیجئے یہ امام شعبہ بھی خلفاء کے پاس پہنچنے لگے جب امام شعبہؒ کو اس بات کی اطلاع ہوئی بولے کہ ہاں سفیان کو کبھی بھائی کی گرفتاری کا صدمہ نہیں پیش آیا ہے، مقصد یہ تھا کہ انتہائی مجبوری کی بنا پر میں دربار خلافت میں گیا اگر ایسی مجبوری ان کو بھی پیش آجاتی تو وہ بھی جانے پر مجبور ہوتے۔

وفات :

۱۶۰ھ میں ۷۷ برس کی عمر میں بصرہ میں وفات پائی، ان کی وفات کی خبر حضرت سفیان ثوریؒ کو پہنچی تو بولے کہ مات الحدیث حدیث کا علم آج ختم ہوگیا۔

خاندان :

خطیب بغدادی نے ان کے ایک لڑکے سعد اور دو بھائی حماد و شاد کا ذکر کیا ہے، ان کے خاندان میں علم وفضل کا چرچا انہی کی ذات سے شروع ہوا اور غالباً انہیں پر ختم بھی ہوگیا۔

زرّین اقوال :

ان کے دو چار زرین اقوال جو تذکروں میں ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے نہ جانے کتنے ایسے مقولے ان کی زبان سے نکلے ہوں گے، فرماتے تھے کہ عقل کے اعتبار سے لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں کچھ لوگ ہوئے ہیں جن کی عقل ان کے ساتھ رہتی ہے، اور کچھ لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کی عقل ہمیشہ ان سے دور رہتی ہے، اور بعض لوگ عقل سے بالکل کورے ہوتے ہیں، جن میں پہلے گروہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بات کرنے ہی سے پہلے سوچ لیتے ہیں کہ ان کو کیا کہنا ہے[1]۔

ان کے عہد میں حدیث کا چرچا اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ لوگوں کی توجہ قرآن کی طرف سے قدرے کم ہوگئی تھی، ان کو جب اس کا احساس ہوا تو وہ لوگوں سے برابر کہا کرتے تھے کہ اگر تم حدیث سے بہت زیادہ شغف رکھو گے تو پھر قرآن کے علم میں پیچھے رہ جاؤ گے، مقصد یہ ہے کہ دونوں دین کے سرچشمے ہیں، اس لئے ان دونوں سے برابر فائدہ اُٹھانا چاہئے۔

امام شعبہؒ کے اس جملہ سے دینی تاریخ کے ایک بہت بڑے حادثہ کا پتہ چلتا ہے، وہ یہ کہ دوسری صدی میں جتنا عام چرچا اور شغف حدیث سے رہا ہے قرآن سے اس کا دسواں حصہ بھی نہیں تھا، خالص حدیث کی تحدیث وروایت کے لئے ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں مجلسیں برپا تھیں، لیکن خاص طور سے قرآن کی تعلیم وتفسیر کے لئے مشکل سے دو چار مجالس درس قائم تھیں۔

---

[1] یہ مقولہ پورا تذکروں میں منقول نہیں ہے

تصنیف :

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علم قرآن کی ترویج کے لئے خود ایک تفسیر لکھی، صاحب کشف الظنون نے تفسیر شعبہ کے نام سے اس کتاب کا ذکر کیا ہے، صاحب مفتاح السعادہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، اس وقت اس کے موجود ہونے کا کوئی علم نہیں ہے، مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری صدی کے ابتدائی زمانہ ہی سے علم تفسیر کی بھی تدوین شروع ہوگئی تھی، اور غالباً علم تفسیر پر پہلی کتاب تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مسعر بن کدامؒ

نام ونسب :

مسعر نام ہے، ابوسلمہ کنیت ، نسب نامہ یہ ہے :

مسعر بن کدام بن ظہیر بن عبیداللہ بن حارث ابن عبداللہ بن عمرو بن عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصہ قرشی عامری۔

فضل وکمال :

حضرت مسعر علمی اور مذہبی دونوں کمالات کے اعتبار سے ممتاز ترین تبع تابعین میں تھے۔ حضرت یعلی بن مرہ کا بیان ہے کہ مسعر کی ذات علم اور ورع دونوں کی جامع تھی [1]۔ عراق میں ان کے پایہ کے علماء کم تھے۔ ہشام بن عروہؒ کا بیان ہے کہ عراقیوں میں مسعرؒ اور ایوبؒ سے افضل ہمارے یہاں کوئی نہیں آیا [2] امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی جلالت پر سب کا اتفاق ہے [3]۔

حدیث :

حدیث کے وہ اکابر حفاظ میں سے تھے۔ امام ذہبیؒ انہیں حافظ اور علمائے اعلام میں لکھتے ہیں [4]، ان کے حافظہ میں ایک ہزار حدیثیں محفوظ تھیں [5]۔

حدیث میں انہوں نے عمرو بن سعید نخعی، ابواسحٰق سبیعی، عطاء معن، سعید بن ابراہیم، ثابت بن عبداللہ انصاری، عبدالملک بن نمیر، بلال بن جناب، حبیب بن ابی ثابت، علقمہ بن مرثد، قتادہ، معن ابن عبدالرحمٰن، مقدام بن شریح اور اعمش وغیرہ ایک کثیر جماعت سے استفادہ کیا تھا [6]۔

ان کی مرویات کا پایہ :

ان کی روایات کی صحت کے لئے یہ کافی ہے کہ امام شعبہؒ جیسے محدث انہیں مصحف [7] کہتے تھے ان کی ذات احادیث کی جانچ کے لئے معیار تھی میزان ان کا لقب ہو گیا تھا [8]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۱۷۰ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۴ [3] تہذیب الاسماء۔ جلد اول۔ ق اول۔ ص ۸۹
[4] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول ص ۱۶۹ [5] ایضاً [6] تہذیب التہذیب۔ جلد ۱۰۔ ص ۱۱۳ و تہذیب الاسماء۔
[7] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱۔ ص ۱۶۹ [8] تہذیب۔ جلد ۱۰۔ ۱۱۴

کم ایسے محدثین نکلیں گے جن کی مرویات پر کسی نہ کسی حیثیت سے تنقید کی گئی ہو لیکن حضرت مسعر ؒ کی ذات اس سے مستثنیٰ تھی [1]۔

آئمہ حدیث شک اور اختلاف کے موقع پر ان کی طرف رجوع کرتے تھے، حضرت سفیان ثوریؒ کا بیان ہے کہ جب لوگوں میں (حدیث کی) کسی چیز کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا تو مسعرؒ سے پوچھتے تھے [2]۔ ابراہیم بن سعد کہتے تھے کہ جب سفیان اور شعبہ میں کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا تو میزان یعنی مسعر کے پاس جاتے تھے [3]۔

احتیاط :

اس محدثانہ کمال کے باوجود وہ روایت حدیث میں بڑے محتاط تھے اس ذمہ داری سے وہ اس قدر گھبراتے تھے کہ فرماتے تھے کہ " کاش حدیثیں میرے سر پر شیشوں کا بار ہوتیں کہ گر کر چور چور ہو جاتیں " [4]۔ ان کی احتیاط شک کے درجہ تک پہنچ گئی تھی، ابونعیم ؒ کا بیان ہے کہ مسعرؒ اپنی احادیث میں بڑے شکی تھے لیکن وہ کوئی غلطی نہ کرتے تھے۔ اعمش کہا کرتے تھے کہ مسعر کا شیطان ان کو کمزور کر کے شک دلاتا رہتا ہے [5]۔

ان کے اس شک نے ان کی احادیث کا درجہ اتنا بلند کر دیا تھا کہ محدثین ان کے شک کو یقین کا درجہ دیتے تھے۔ اعمشؒ سے بعض لوگوں نے کہا کہ مسعرؒ اپنی حدیثوں میں شک کرتے تھے، انہوں نے کہا ان کا شک اوروں کے یقین کے برابر ہے [6]۔

فقہ :

فقہ میں گو کوئی قابلِ ذکر شخصیت نہ تھی تاہم کوفہ کے صاحب افتا جماعت میں تھے [7]۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے تعلق خاطر :

یہ امام ابوحنیفہؒ کے حلقۂ تلامذہ میں تو نہ تھے مگر ان کی ذات اور ان کے اصحاب سے ان کو بڑا تعلق خاطر تھا اور ان کے علم و فضل کے مداح تھے۔ کوفہ میں امام ابوحنیفہ کے حلقہ درس کے قریب ہی ان کا حلقہ درس بھی تھا، بسا اوقات درس سے فارغ ہو کر استفادہ کی غرض سے امام اور ان کے اصحاب کی مجلسِ درس میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے بعض تلامذہ کو یہ چیز ناگوار ہوئی اور انہوں نے ان

۱۔ تہذیب التہذیب جلد ۱۰۔ص ۱۱۴ ۲۔ تہذیب الاسماء جلد ۱۔ص ۸۹ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ جلد اول۔ص ۱۷۰
۴۔ تذکرۃ الحفاظ جلد اول۔ص ۱۷۰ ۵۔ تہذیب التہذیب۔جلد ۱۰۔ص ۱۱۴ ۶۔ تذکرۃ الحفاظ جلد اول۔ص ۱۲۹
۷۔ اعلام الموقعین ص ۲۸

سے کہا کہ ہم تو آپ سے احادیث رسول کے سماع کے لئے آتے ہیں اور آپ اہل بدعت (یعنی امام ابوحنیفہؒ اوران کے اصحاب) سے سماع کرتے تھے یہ سن کران کو غصہ آگیا، فرمایا کہ درس سے اٹھ جاؤ اگر ان میں ان کا کوئی معمولی آدمی بھی زمانہ حج کے پورے مجمع میں پہنچ جائے توان کے دامن کو علم سے بھردے[1]۔

حلقۂ درس :

مسجد میں حلقۂ درس تھا، عبادت کے معمولات کے بعد روزانہ مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور شائقینِ علم حدیث اردگرد حلقہ باندھ کر استفادہ کرتے تھے[2]۔

زہد و عبادت :

ان کی ماں بڑی عابدہ خاتون تھیں۔ان کے فیض تربیت کا مسعرؒ پر بڑا گہرا اثر پڑا تھا،ان کی ماں بھی مسجد میں نماز پڑھتی تھیں اکثر دونوں ماں بیٹے ایک ساتھ مسجد جاتے،مسعر نمدہ لئے ہوتے تھے۔مسجد پہنچ کر ماں کے لئے نمدہ بچھادیتے جس پر کھڑے ہو کر وہ نماز پڑھتیں،مسعر مسجد کے دوسرے حصہ میں نماز میں مشغول ہوجاتے،نماز تمام کرنے کے بعد ایک مقام پر بیٹھ جاتے اور شائقین حدیث آکر جمع ہوجاتے،مسعر انہیں حدیثیں سناتے اس درمیان میں ان کی ماں عبادت سے فارغ ہوجاتیں مسعرؒ درس ختم کرنے کے بعد ماں کا نمدہ اٹھاتے اوران کے ساتھ گھر واپس آتے،ان کے صرف دوٹھکانے تھے گھر یا مسجد[3]۔کثرتِ عبادت سے پیشانی پر اونٹ کے گھٹنے کی طرح نہایت موٹا گھٹا پڑ گیا تھا[4]۔

روزانہ شب کو نصف قرآن تمام کرڈالتے تھے۔ان کے صاحبزادے محمد کا بیان ہے کہ والد آدھا قرآن ختم کئے بغیر نہ سوتے تھے[5]۔تلاوت قرآن ختم کرنے کے بعد چادر لپیٹ کر سوجاتے،ایک ہلکی سی جھپکی لینے کے بعد پھر اس طرح چونک پڑتے جیسے کسی کی کوئی چیز کھوگئی ہو اور وہ پریشان ہو کر اس کی تلاش کررہا ہو،اٹھ کر وضو اور مسواک کرتے پھر نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے یہاں تک کہ نمازِ فجر کا وقت ہوجاتا تھا مگر اس زہد و عبادت کو انتہائی مخفی رکھتے تھے۔ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ

وکان یجتھد علی اخفاء ذالک جداً (صفوۃ الصفوۃ جلد ۳ ص ۷۲)

''وہ اس زہد و عبادت کو انتہائی مخفی رکھتے تھے''۔

آخرت کا خوف اور رقتِ قلب :

آخرت کی بازپرس سے ہر وقت ترساں اور لرزاں رہتے تھے ان کے ایک پڑوسی کا بیان ہے کہ ایک دن یکا یک مسعرؒ پر گریہ طاری ہوگیا ان کی یہ کیفیت دیکھ کر ان کی والدہ بھی رونے لگیں،مسعرؒ

---

[1] مناقب کی۔جلد ۲۔ص ۱۲۶ [2] ابن سعد۔جلد ۶،ص ۱۰۵۳ [3] ابن سعد۔جلد ۶۔ص ۲۵۳

[4] ایضاً۔ص ۳۵۴ [5] تذکرۃ الحفاظ جلد اول۔ص ۱۷۰

نے پوچھا اماں جان! آپ کیوں رو رہی ہیں؟ بولیں! بیٹا میں نے تم کو روتے دیکھا اس لئے میں بھی رو پڑی۔ بیٹے نے کہا اماں! کل جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کے تصور سے میں اس قدر روتا ہوں، پوچھا وہ کیا؟ اس پر مسعرؒ پھر پھوٹ پڑے اور روتے ہوئے جواب دیا کہ اماں! قیامت اور اس کی ہولناکی، یہ کہہ کر ماں کے پاس سے اٹھے اور چلے گئے تاکہ ان کی اس کیفیت سے ان کو مزید رنج نہ پہنچے۔

علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور نماز پڑھتے ہر وقت ان پر رقت طاری رہتی تھی۔ (صفوۃ الصفوۃ۔ ص ۷۳)

وہ اس درجہ پر پہنچنے کے بعد بھی رکے نہیں بلکہ ان کے روحانی مدارج ہمیشہ ترقی پذیر رہے۔ ابن عیینہؒ کا بیان ہے کہ میں نے مسعرؒ کو خیر میں ہر روز ترقی کرتے دیکھا[1]۔

معن کا بیان ہے کہ ہم نے ان کا ہر دن پہلے دن سے افضل پایا وہ عبادت و ریاضت اور فضائل اخلاق کے اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ لوگ ان کے جنتی ہونے میں شک نہ کرتے تھے۔ حضرت حسن بن عمارہ کہا کرتے تھے کہ اگر مسعرؒ جیسے آدمی بھی جنت میں داخل نہ ہوں گے تب تو جنتیوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی[2]۔

علامہ ابن مبارکؒ یا اسی درجہ کے کسی اور بزرگ نے ان کے فضائل سے متاثر ہو کر ان کی شان میں یہ اشعار کہے تھے[3]۔

من كان ملتمسًا جليسًا صالحًا	فليات حلقة مسعر بن كدام
جس شخص کو اچھے جلیس کی تلاش ہو	اس کو مسعر بن کدام کے حلقہ میں آجانا چاہئے
فيها السكينة والوقار واهلها	اهل العفاف وعلية الا قوام
اس میں سکینہ ہے اور وقار ہے اور اس کے ارکان	پاکباز اور اونچے درجے کے ہیں

دولتِ دنیا سے بے نیازی:

اس زندگی کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ وہ دنیا اور اس کی شان وشکوہ سے بالکل بے نیاز تھے چنانچہ حکومت کے عہدوں کو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ ابو جعفر عباسی آپ کا عزیز تھا اس نے ان کو کسی مقام کا والی بنانا چاہا انہوں نے کہا کہ میرے گھر والے تو مجھے دو درہم کا سودا لانے کے لائق بھی نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہم تمہارا دو درہم کا سودا کرنا بھی پسند نہیں کرتے اور تم مجھے والی بنانا چاہتے ہو، خدا تم

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۰ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۶۹ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۱

کو صلاحیت دے، ہماری قرابت داری ہے اس لئے ہمارا حق ہے (کہ ہم بھی کچھ کہہ سکیں) ان کے اس عذر پر ابو جعفر نے ان کو اس خدمت سے معاف کر دیا[1]۔

وفات :

باختلاف روایت ۱۵۲ھ یا ۱۵۵ھ میں کوفہ میں وفات پائی[2]۔ مرض الموت میں حضرت سفیان ثوری جو خود صاحب زہد و اتقا تھے، ملنے گئے تو دیکھا کہ مسعرؒ پر گھبراہٹ اور رقت طاری ہے، بولے آپ کے اوپر موت کی گھبراہٹ طاری ہے حالانکہ میں تو ہر وقت موت کے لئے تیار رہتا ہوں اور اس وقت بھی تیار ہوں۔ مسعرؒ نے حاضرین سے کہا کہ ان کو بٹھاؤ، حضرت سفیانؒ بیٹھ گئے اور پھر وہی بات دہرائی، مسعرؒ بولے کہ آپ کو اپنے اعمال پر اعتماد ہے اس لئے آپ مطمئن ہیں مگر میری کیفیت تو یہ ہے کہ میں اپنے کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر سمجھتا ہوں اور نہیں جانتا کہ یہاں سے کس طرح اور کہاں گرایا جاؤں گا۔ یہ پر درد الفاظ سن کر حضرت سفیانؒ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں اور فرمایا کہ آپ مجھ سے بھی زیادہ خدا سے ڈرنے والے ہیں[3]۔

عادات و اخلاق :

نہایت خوش اخلاق تھے۔ دوسروں کے جذبات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے جب کبھی کوئی انہیں ایسی حدیث سناتا جس سے وہ خود اس شخص سے زیادہ واقف ہوتے تو محض اس کی دل شکنی اور احترام حدیث کے خیال سے انجان بن کر نہایت خاموشی سے سنتے تھے[4]۔ زیادہ بولنا پسند نہیں کرتے تھے یہ عادات عنفوان شباب ہی سے پیدا ہو گئی تھیں۔ ماں کی خدمت اور ان کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔

ایک بار ماں نے عشاء کے بعد پانی مانگا وہ پانی لے کر آئے تو وہ سو چکی تھیں، انہوں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور پوری رات کھڑے رہے کہ نہ جانے کس وقت ماں کی نیند ٹوٹ جائے۔

(طبقات شعرانی)

حکیمانہ اقوال :

فرماتے تھے کہ میں پسند کرتا ہوں کہ محزون و غمگین آواز سنوں اس لئے کہ اس سے موت اور آخرت کا تصور سامنے آتا ہے۔ (بخلاف قہقہہ اور چہچہے کے سننے سے آدمی کے اندر خدا سے غفلت پیدا ہوتی ہے)

فرماتے تھے کہ آدمی کے نفس کا جو تقاضا بھی ہوتا ہے اس کے اوپر وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ گویا ترجمہ ہے اس حدیث کا۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ ص ۱۷۰　[2] ایضاً　[3] صفوۃ الصفوۃ۔ جلد ۳۔ ص ۷۳　[4] ابن سعد۔ جلد ۶۔ ص ۲۵۳

الاثم ماحاک فی نفسک

''گناہ وہ ہے جو آدمی کے دل میں کھٹکے''۔

کسی نے ان سے کہا کہ آپ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ کوئی آپ کے عیوب آپ کے سامنے بیان کرے، فرمایا کہ ہاں اگر وہ خیر خواہی کی بناء پر بیان کرتا ہے تو میں اس کو پسند کروں گا اور اگر مقصد محض شماتت ہے تو پھر پسند نہیں کروں گا۔

اکثر حزینہ اور آخرت کا تصور دلانے والے اشعار ان کی زبان پر ہوتے تھے۔ مثلاً

الا قد فسد الدھر فاضحی حلوہ مرّا

زمانہ اس قدر بگڑ گیا ہے کہ اس کی شیرینی بھی تلخ ہوگئی ہے

فالزم نفسک الیاس من الناس تعش مرّا

لوگوں سے کوئی امید نہ رکھو تو زندگی آزادی سے گزرے گی

تفنی اللذازۃ من نال صفوتھا من الحرام ویبقی الاثم والعار

وہ لذتیں اور آسائشیں جو حرام ذرائع سے کسی کو حاصل ہوں اور جس کے پیچھے گناہ اور ذلت بھی ہو

تبقی عواقب سوء من بغیتھا لا خیر فی لذۃ من بعدھا النار

ان کے نتائج انجام کار برے ہی ہوتے ہیں اور ایسی لذت و آسائش میں کوئی خوبی اور بھلائی نہیں جس کا نتیجہ دوزخ کی آگ ہو

حضرت عبداللہ بن وہبؒ

امام مالکؒ کے جو تلامذہ ان کے علم وفضل کے وارث ہوئے اور جن کے ذریعہ مشرق ومغرب میں ان کے فقہی مسلک کی ترویج ہوئی، ان میں سب سے زیادہ ممتاز اسد بن فرات، ابن قاسم، اشہب، عبداللہ بن عبدالحکیم، یحییٰ بن یحییٰ اور عبداللہ بن وہب تھے۔

ان میں سے ہر ایک کی کچھ امتیازی خصوصیتیں اور خدمات ہیں۔ عبداللہ بن وہبؒ چند باتوں میں ممتاز تھے۔ ان میں حفظِ حدیث، وسعتِ علم اور کثرتِ تصانیف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دیگر تصانیف کے علاوہ ان کو موطا امام مالک کی تدوین کی سعادت بھی حاصل ہے گو شہرت ان کے مرتب کردہ نسخہ کے بجائے یحییٰ کے نسخہ کو ہوئی مگر خود یحییٰ نے امام مالکؒ کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ میں سب سے پہلے ابن وہبؒ ہی سے سماعِ موطا کیا تھا۔ اس طرح ابن یحییٰ کی تدوین میں بھی بواسطہ ان کا ہاتھ تھا۔

نام ونسب :

عبداللہ نام ہے۔ ابو محمد کنیت تھی، قریش کے ایک خاندان بنوفہر کے غلام تھے آبائی وطن مصر تھا اور یہیں آپ ۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے[1]۔

تعلیم :

ایک مدت تک ان کو حصولِ علم کا موقع نہ مل سکا یا طبیعت کا میلان نہیں ہوا مگر جب ان کی عمر ۱۷ سال کی ہوئی تو حصولِ علم کا شوق ہوا۔ مصر میں اس وقت لیث بن سعد کے درس فقہ وحدیث کی ہر طرف شہرت تھی، ابن وہبؒ نے بھی ان سے کسبِ فیض کیا۔ مصر میں اس وقت فقہ و حدیث کی متعدد ممتاز مجلسیں موجود تھیں مگر اس کے باوجود ابن وہبؒ کے ذوقِ طلب کو تسکین نہیں ہوئی اور انہوں نے مکہ، مدینہ، بغداد وغیرہ کا سفر کیا اور وہاں کے آئمہ علم وفضل سے استفادہ کیا۔ بغداد کے زمانۂ قیام یعنی ۱۴۶ھ میں یہ ممتاز تابعی ہشام بن عروہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر ان سے کسبِ فیض کا موقع نہ مل سکا اور اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔ اربابِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے تقریباً چار سو اربابِ فضل وکمال سے اکتسابِ علم کیا تھا[2]۔

---

[1] ابن خلکان۔ جلد ۱۔ ص ۴۴۵ [2] الانتقاء۔ ص ۴۸ بستان المحدثین ص ۲

ان کے طلب علم کا سب سے طویل زمانہ امام مالکؒ کی خدمت میں گذرا، قریب قریب بیس سال تک وہ امام مالکؒ کی خدمت میں رہے ان کی ذہانت وذکاوت اور غیر معمولی حافظہ کی بناء پر امام مالک ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے امام مالک سے تخلیل اصابع (انگلیوں میں خلال) کے بارے میں اسوۂ نبوی ﷺ دریافت کیا، انہوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، ابن وہب مجلس میں موجود تھے بولے کہ ہاں! ہمارے پاس ایک ارشاد نبوی ﷺ موجود ہے اور پھر لیث بن سعدؒ کے واسطہ سے یہ روایت سنادی کہ ''جب وضو کرو تو پیر کی انگلیوں کا خلال کرلیا کرو''۔

اس کے بعد امام مالکؒ سے جب کوئی شخص یہ مسئلہ پوچھتا تو اس کو انگلیوں کے خلال کا حکم دیتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے کہ میں نے اب تک یہ روایت نہیں سنی تھی یعنی اس کا علم مجھے ابن وہب کے ذریعہ ہوا ہے۔ ابن وہبؒ جب مصر چلے جاتے اور امام مالک ان کو خط لکھتے تو خط کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی۔

عبد الله ابن وهب الى فقيه مصر الى مفتي مصر

''عبداللہ بن وہب کی طرف جو مصر کے فقیہ ومفتی ہیں''۔

یہ جملے نقل کرنے کے بعد ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ اتنی قدر افزائی امام مالکؒ نے کسی کو نہیں کی[۱]۔ حالانکہ مصر میں اس وقت لیث بن سعد، ابن لہیعہ جیسے ائمہ روزگار کے علاوہ خود امام مالکؒ کے بیشمار صاحب علم وفضل تلامذہ موجود ہیں۔

مدینہ منورہ جہاں امام مالکؒ کا چشمۂ علم تقریباً نصف صدی جاری رہا ان کی وفات کے بعد وہاں کے ارباب علم میں جب کسی مسئلہ یا حدیث نبوی ﷺ کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا تو وہ لوگ ابن وہبؒ کی رائے کے منتظر رہتے تھے کہ اس کا آخری فیصلہ وہی کریں گے جب وہ حج کو تشریف لاتے تو یہ لوگ ان کی رائے دریافت کرتے اور اسی پر فیصلہ ہو جاتا تھا۔

ابن وہبؒ نے جن ممتاز شیوخ سے استفادہ کیا تھا ان کی فہرست بہت لمبی ہے چند مشاہیر کے نام یہ ہیں۔

عمرو بن حارث، قاضی حیاۃ بن شریح ابن لہیعہ، یونس بن یزید، معاویہ بن صالح، سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ا۔ ص ۲۷۹ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ وتہذیب التہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۷۳

علم وفضل :

ان اساتذہ کی صحبت اور اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر زمرۂ تبع تابعین میں ممتاز حیثیت کے مالک ہو گئے جس کا اعتراف تمام معاصرین نے کیا ہے۔

امام احمدؒ فرماتے تھے کہ ابن وہب کو قدرت نے عقل، دین اور اصلاح سب کچھ دیا تھا وہ حدیث کی صحت کا بڑا لحاظ کرتے تھے کسی نے کہا مگر حدیث کے اخذ کرنے میں غلطی کرتے ہیں، فرمایا کہ ہاں ! یہ بات ضرور ہے مگر میں نے ان کی روایتوں کے کل ذخیرہ کو جو انہوں نے اپنے اساتذہ سے روایت کیا ہے، پرکھا مجھے سب صحیح نظر آیا[۱]۔

ابن معین فرماتے تھے کہ یہ ثقہ ہیں۔ ابوحاتم کا قول ہے کہ صادق اور ان کی مرویات عمدہ ہیں ان کو ولید بن مسلم سے زیادہ پسند کرتا ہوں، امام وقت ابن عیینہ جب ان کا ذکر کرتے تو شیخ اہل مصر کہتے، ابوزرعہ رازیؒ کا بیان ہے کہ میں نے ابن وہب کی تیس ہزار حدیثوں کو بنظرِ غائر دیکھا مگر مجھے اس میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملی جس کی کوئی بنیاد نہ ہو، یہ واقعی ثقہ تھے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ حجاز اور مصر کے اہلِ علم میں احادیثِ نبوی ﷺ کا جو ذخیرہ پھیلا ہوا تھا، اس کو انہوں نے یاد کیا پھر اس کو جمع کر کے مدون ومرتب کیا، حتیٰ کہ ان کے مسانید ومقاطیع[۲] سب کو جمع کر ڈالا۔ میں نے ان کے ذخیرۂ روایات میں کوئی منکر روایت نہیں دیکھی[۳]۔

حارث بن مسکین ان کو "دیوان العلم" ذخیرۂ علم کہا کرتے تھے۔ امام مالکؒ کے مشہور شاگرد ابن قاسمؒ کہتے تھے کہ اگر ابن عیینہؒ کا انتقال ہو گیا تو اہلِ علم کی سواریاں مکہ کے بجائے مصر ابن وہب کے پاس جایا کریں گی۔ حدیث کی جمع وتدوین کا جو کام ابن وہب نے کیا کسی نے نہیں کیا، ان کے سامنے بڑے بڑے اربابِ علم کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ ابن سعد نے ان کو کثیر العلم اور ثقہ لکھا ہے، محمد بن عبداللہ کہتے تھے کہ ابن وہب ابن قاسم سے زیادہ فقیہ تھے مگر غایت احتیاط سے فتویٰ نہیں دیتے تھے[۴]۔ ابن قاسم سے ان کو افقہ قرار دینا بڑی اہمیت رکھتا ہے، ابن قاسم کا تفقہ ضرب المثل ہے اسی طرح کی رائے یحییٰ بن بکیرؒ نے بھی دی ہے۔ (ذہبی)

ان کو کثرت سے احادیث نبوی یاد تھیں۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ایک لاکھ روایتیں ان کی نوکِ زبان تھیں۔ ان کی تصانیف کے ذریعہ تقریباً سوا لاکھ روایتیں مدون ہو گئیں۔

---

۱ تہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۷۲

۲ مقطوع جس کی سند تابعی پر ختم ہو۔

۳ یہ تمام اقوال تہذیب۔ جلد ۶ ص ۷۲ سے لئے گئے ہیں۔

۴ ایضاً۔ ص ۷۳

جامعیت :

یہ محض روایت حدیث ہی نہیں تھی بلکہ حدیث نبوی سے مسائل کے اجتہاد اور استنباط کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ امام ذہبیؒ نے ان کو حافظ حدیث کے ساتھ مجتہد بھی لکھا ہے[1]، حدیث کے علاوہ ان کو حدیث اور مغازی میں بھی درک تھا۔ کسی نے امام مالک سے ابن قاسم اور ابن وہب کے علم و فضل کے بارے میں پوچھا تو فرمایا، ابن قاسم فقیہ اور یہ عالم ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ ابن قاسم کو علوم دینیہ کے ایک شعبہ فقہ میں درک ہے اور ابن وہب کے علم میں وسعت و ہمہ گیری تھی[2]۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے بستان المحدثین میں ابن وہب کا تذکرہ تدوین موطاء کے سلسلہ میں کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :

> ''عبداللہ ابن وہب اپنے زمانے میں حجت تھے، تمام لوگ ان کی مرویات پر کمال وثوق ور اعتماد رکھتے تھے، وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے بلکہ خود مجتہد تھے البتہ طریقہ اجتہاد و تفقہ میں وہ امام مالکؒ اور لیث بن سعد کا اتباع کرتے تھے''۔ (ص ۱۶)

جرح و تنقید :

اس فضل و کمال کے باوجود بعض اہل علم ان کی مرویات اور طریقہ اخذ روایات پر تنقید کرتے ہیں۔ اوپر امام احمدؒ کا ارشاد گزر چکا ہے کہ وہ اخذ روایت میں غلطی کرتے تھے، نسائی کہتے تھے کہ وہ قبول روایت میں کچھ تساہل ضرور برتتے تھے مگر ان کی مرویات کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ساجی کا بیان ہے کہ یہ سماعی حدیثوں کے بارے میں کچھ تساہل واقع تھے اور تساہل اس وجہ سے تھا کہ اہلِ مصر اجازتِ حدیث کو تحدیث کے لئے کافی سمجھتے تھے[3]۔ (چنانچہ ان روایتوں کو جو اجازۃً ان کو پہنچی ہیں) ان کو حدثنی فلاں وغیرہ الفاظ سے بیان کرتے تھے[4] (حالانکہ یہ الفاظ سماع کے لئے مخصوص ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ اخذ روایت میں ان پر جو تساہل کا الزام لگایا گیا ہے اس کا مدار اہلِ مصر اور اہلِ حجاز کے طریقہ اخذ روایت کے اختلاف پر ہے ورنہ وہ تحدیثِ روایت میں حد درجہ محتاط تھے۔

ایک بار کسی نے ان سے کہا کہ فلاں شخص آپ کے واسطہ سے یہ روایت کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ فتنوں کو برا نہ سمجھو، اس سے منافقین کی جڑ کٹ جاتی ہے یہ سن کر ان کو غصہ

---

[1] تذکرہ۔ ص ۲۷۸ [2] بستان المحدثین ذکر ابن وہب [3] محدثین کی اصطلاح میں ان روایتوں جن کو شیخ نے سنا نہ ہو بلکہ شیخ کی اجازت سے روایت کر رہا ہو اس کو حدثنا یا حدثنی کے لفظ سے روایت نہ کرنا چاہئے۔

[4] تہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۷۳

آ گیا اور فرمایا کہ اے اللہ اگر یہ جھوٹ ہے تو اس کو اندھا کر دے چنانچہ ان کی دعا قبول ہوگئی اور وہ اندھا ہو گیا[1]۔

حلقۂ درس :

امام مالکؒ کی وفات کے بعد موطا کے سماع کے لئے سب سے پہلے تشنگانِ علم نبوی انہی کی طرف متوجہ ہوئے۔ خود یحییٰؒ نے جو موطا کے متداول نسخہ کے مرتب ہیں، اس کا ایک حصہ جو امام مالک سے وہ سماع نہیں کر سکے تھے ان سے پورا کیا[2]۔

امام مالکؒ کے مشہور شاگرد سحنون کا بیان ہے کہ ابن وہبؒ نے پورے سال کو تین کاموں کے لئے تقسیم کر دیا تھا جس میں چار ماہ درس و تدریس کے لئے مخصوص تھے[3]۔ ان کو یہ فخر بھی حاصل تھا کہ خود ان کے اساتذہ میں لیث اور امام مالک نے ان سے روایتیں کی ہیں۔ مثلاً انگلیوں کے خلال کے سلسلہ میں امام مالکؒ کی ایک روایت کا ذکر اوپر آ چکا ہے، تذکروں میں ہے کہ امام مالک نے ایک دوسری حدیث بھی ان سے روایت کی ہے، وہ ہے بیع عربان کے سلسلہ میں یعنی آپ نے بیع عربان سے منع کیا ہے[4]۔

ایک دن آپ درس دے رہے تھے کہ ایک سائل آیا اور اس نے کہا کہ اے ابو محمد (آپ کی کنیت ہے) کل آپ نے جو درہم مجھ کو عطا کئے تھے وہ سب کے سب کھوٹے تھے، ابن وہب نے کہا کہ بھائی ہمارے پاس عموماً ہدیہ اور عاریت کی رقمیں آتی ہیں جیسی رقمیں آتی ہیں ہم تم کو دے دیتے ہیں۔ سائل کو اس جواب سے تسکین نہیں ہوئی وہ غصہ میں آ کر برا بھلا کہنے لگا، یہاں تک کہہ ڈالا کہ خدا کی رحمت ہو جناب رسول اللہ ﷺ پر جنہوں نے یہ فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئیگا جب صدقات و خیرات کے ذرائع امت کے منافقوں کے ہاتھ میں چلے جائیں گے، ابن وہب تو اس تلخ کلامی پر خاموش رہے مگر ایک نوجوان عراقی شاگرد کو بہت برا معلوم ہوا اور اس نے درس سے اٹھ کر اس فقیر کو ایسا طمانچہ رسید کیا کہ وہ زمین پر گر گیا، اس نے شور مچانا شروع کیا اور پھر آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا، اے ابو محمد! آپ کی مجلس میں لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ ابن وہب کو بھی یہ حرکت بری معلوم ہوئی وہ مجلس سے اٹھ کر واقعہ کی تفتیش کرنے لگے، معلوم ہوا یہ حرکت فلاں عراقی نوجوان نے کی ہے۔

---

[1] تہذیب۔ جلد ۶۔ ص ۷۴ [2] انتقاد ذکر یحییٰ ص ۵۹ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ ص ۲۷۹

[4] بیع عربان اسی خرید و فروخت کو کہتے ہیں جس میں خریدار کچھ رقم پیشگی بائع کو اس لئے دیتا ہے کہ اگر خرید و فروخت ہوگی تو وہ رقم محسوب ہو جائے گی جیسے ایڈوانس اور بیعانہ کہتے ہیں۔

آپ نے اس سے باز پرس کی وہ نواجوان بولا استادِ محترم میں نے آپ ہی کی زبان سے یہ ارشادِ نبوی ﷺ سنا ہے کہ

من حمی لحم مومن من منافق یغتابہ رحمی اللہ لحمہ من النار

''جو شخص کسی مومن کی عزت کی حفاظت اس منافق سے کرے جو اس کی برائی کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ دوزخ سے اس کی حفاظت کرے گا''۔

جب خدا نے عام مسلمانوں کی حمایت میں اتنے ثواب واجر کا وعدہ کیا ہے تو آپ تو امام و پیشوا ہیں، آپ کی حمایت سے تو نہ جانے کتنا ثواب دربارِ الٰہی سے ملے گا۔ ابن وہب نے فرمایا کہ اگر تمہاری یہ نیت تھی تو خدا تعالیٰ تم کو اس کا بدلہ دے گا پھر فرمایا کہ اچھا اس سلسلہ کی دوسری حدیث بھی سن لو، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کچھ ایسے مساکین ہوں گے جو مالدار ہوں گے جو نہ نماز کے لئے وضو کرتے ہوں گے اور نہ ناپاکی دور کرنے کے لئے غسل، جو مسجدوں اور عیدگاہوں میں جا کر اپنا فضل اور اپنی بزرگی جتلا کر لوگوں سے سوال کریں گے اور یہ خیال بھی ان کو ہوگا کہ یہ تو ہمارا حق ہے جو ہم لوگوں سے وصول کرتے ہیں اور اپنے اوپر خدا کا کوئی حق نہ سمجھتے ہوں گے[1]۔

تلامذہ :

جن لوگوں نے ان کے درس سے فائدہ اٹھایا ان میں چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:

عبدالرحمٰن ابن مہدی، یحییٰ بن یحییٰ، عبداللہ بن یوسف، علی بن (المدینی) یحییٰ بن بکیر، احمد بن صالح، اصبغ بن الفرج۔ یہ ابن وہب کے سب سے معتمد اور کثیر الراوایت شاگرد ہیں، سحنون، احمد بن سعید بن الدرامی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

عہدۂ قضا سے انکار :

حکومت کی عام بے راہ روی اور اس کی غیر اسلامی روش کی بنا پر عام ائمہ تبع تابعین نے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی مگر اس سے کسی طرح کا تعلق رکھا پسند نہیں کیا اس لئے جو ارباب فضل و کمال اس سے تعلق رکھتے تھے وہ عوام و خواص میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ ابن وہب ؒ بھی انہی بزرگوں میں تھے جو دربارِ خلافت سے اپنا دامن بچاتے رہے گو اس سلسلہ میں ان کو کچھ مصائب بھی برداشت کرنے پڑے۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ عباد بن محمد والی مصر نے ان کو بلایا اور ان کے سامنے عہدہ قضا پیش کیا انہوں نے اس سے کسی طرح پیچھا چھڑایا اور چھپ گئے، عباد کو ان کے غائب ہو جانے کی

---

[1] بستان المحدثین ذکر ابن وہب

اطلاع ملی تو اس نے غصہ میں ان کا گھر گرا دیا مگر اس کے باوجود انہوں نے اس عہدے کو قبول کرنا پسند نہیں کیا[1]۔

اس سلسلہ میں دوسری روایت ابن خلکان نے یونس بن عبدالاعلیٰ سے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ خلیفۂ وقت نے خود ان لکھا کہ آپ مصر میں عہدۂ قضا قبول کرلیں مگر آپ نے اسے پسند نہیں کیا اور روپوش ہوکر خانہ نشین ہو گئے ایک دن وہ گھر کے صحن میں وضو کر رہے تھے کہ اسد بن سعد آ گئے، انہوں نے کہا کہ کیا یہ بہتر بات نہیں تھی کہ آپ گھر سے باہر نکل کر کتاب وسنت کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرتے (یہ اشارہ تھا کہ عہدۂ قضا کے قبول کر لینے کی طرف) یہ سن کر ابن وہب نے سر اٹھایا اور بولے بس تمہاری عقل اسی قدر ہے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ علماء کا حشر انبیاء کے ساتھ ہوگا اور قضاۃ کا سلاطین کے ساتھ[2]، انہوں نے اس جملے میں اس وقت کے سلاطین کی غیر اسلامی روش اور اس کے انجام کی طرف کیسے بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عباد والی مصر نے ان کو عہدۂ قضا پیش کیا اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے خود خلیفہ نے براہ راست ان کو لکھا مگر ان دونوں میں تضاد نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہوگا کہ خلیفہ نے والی مصر عباد کو لکھا ہوگا اور اس نے ابن وہب کو بلا کر یہ حکم سنایا ہوگا اور عدم تعمیل میں اس نے یہ روش اختیار کی ہوگی جیسا کہ عموماً نیچے کے افسران کرتے رہتے ہیں مگر یہ توجیہ اس وقت صحیح معلوم ہو سکتی ہے جب یہ واقعہ ۱۶۴ھ کے بعد کا مانا جائے اس لئے کہ قضاۃ کا تقرر ۱۶۴ھ سے پہلے صوبوں کے والیوں کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۶۴ھ سے خود خلفا نے اپنے ہاتھ میں اسے لے لیا تھا[3]۔

زہد وعبادت :

زہد وعبادت میں ممتاز تھے۔ خاص طور پر زیارتِ حرمین کا جذبہ ان میں عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ سال کے چار مہینے وہ دیارِ حبیب ﷺ کی آمد ورفت میں گزار دیتے تھے انہوں نے قریب قریب ۳۶ حج کئے تھے[4]۔ دوسری عبادات کا بھی حال یہی تھا، ساجی کا قول ہے کہ

وکان من العباد "یہ عبادت گزاروں میں تھے"۔[5]

خوفِ خدا اور قیامت کی باز پرس کا خیال :

خدا کا خوف اور قیامت کی باز پرس کا خیال ایک مومن کی نمایاں صفت ہونی چاہئے۔ یہ چیز اس کی زندگی میں جتنی شدت کے ساتھ موجود ہوگی اس کی زندگی اتنی ہی پاکیزہ اور صالح ہوگی۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ا۔ ص ۲۷۹ [2] ابن خلکان۔ جلد ا۔ ص ۴۴۶ [3] ابن خلکان۔ جلد ا۔ ص ۴۴۶
[4] تذکرہ۔ جلد ا۔ ص ۲۷۹ [5] تہذیب۔ جلد ۲۔ ص ۷۴

ابن وہبؒ پر خوفِ خدا کی کیفیت ہمہ وقت طاری رہتی تھی ذرا قیامت کی ہولنا کی کا ذکر آیا اور ان کی آنکھیں بہہ پڑیں، بسا اوقات بیہوش ہو جاتے تھے ایک بار کسی نے ان کے سامنے یہ آیت تلاوت کی :

واذیتحاجون فی النار فیقول الضعفاء للذین استکبروا انا کنا لکم تبعًا فھل انتم مغنون عنا نصیباً من النار قال الذین اسکتبروا انا کل فیھا.

''یاد کرو جب دوزخی (اہل کفر) ایک دوسرے سے حجت کریں گے، ایک گروہ کہے گا کہ ہم نے تمہاری بات مانی تھی ذرا کچھ عذاب کو ہلکا کر دو تو وہ کہیں گے ہم تو خود ہی اس میں مبتلا ہیں''۔

آپ نے سنا تو غشی کی کیفیت طاری ہوگئی اور بہت دیر تک یہ حالت رہی، خوف کی یہی شدت ان کی موت کا سبب بن گئی۔

وفات :

انہوں نے ایک کتاب الاحوال قیامت (قیامت کی ہولنا کیاں) کے نام سے مرتب کی تھی۔ ایک دن کسی نے ان کے سامنے یہ کتاب پڑھنی شروع کی، ان پر اس دن اتنا اثر ہوا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، اٹھا کر گھر لائے گئے اور اسی حالت میں جاں بحق ہو گئے۔ یہ حادثہ شعبان ۱۹۷ھ میں پیش آیا۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو انا للہ پڑھا اور بڑے درد و رنج میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں فرمایا کہ یہ عامۃ المسلمین اور خواص اہلِ علم دونوں کا حادثہ ہے[1]۔

سیرت و کردار :

ان کی سیرت و کردار کے واقعات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں مگر ایک ہی واقعہ سے ان کی سیرت کے خط و خال دیکھے جا سکتے ہیں ان کا دستور تھا کہ جب وہ کسی کی غیبت کرتے تو اس کی پاداش میں ایک روزہ رکھتے تھے۔ ایک دن لوگوں سے کہا کہ مجھے روزہ رکھتے رکھتے ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ اب نفس کے اوپر روزوں کا رکھنا شاق نہیں گزرتا۔ اس لئے اب میں نے یہ طے کیا ہے کہ اب اگر کسی کی غیبت کروں گا تو ایک درہم خیرات کروں گا، چنانچہ ایک درہم کا صدقہ کرنا مجھ پر (تنگی کی وجہ سے) اتنا شاق گزرا کہ غیبت کرنے کی عادت ہی چھوٹ گئی[2]۔

۱؎ تہذیب جلد ۶۔ ص ۷۳ ۲؎ بستان المحدثین

شوقِ جہاد :

میدانِ جہاد کی پُر شور زندگی، علم وفن کی پر سکون زندگی کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہے مگر تبع تابعین میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور ابن وہب ان دونوں اوصاف کے جامع تھے۔ ابن وہب نے پورے سال کو تین کاموں کے لئے تقسیم کر دیا تھا چار ماہ درس وتدریس کے لئے، چار ماہ سفرِ حج کے لئے، چار ماہ باطل کو سرنگوں اور حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کے لئے[1]۔

تصنیف :

علامہ ابن قاسم ان کے بارے میں کہتے تھے ان کے جیسا تدوین وتالیف کا کام کسی نے نہیں کیا[2]۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ

وله مصنفات فی الفقه معروفة

''علم فقہ میں ان کی تصانیف معروف ومشہور ہیں''۔

ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی کافی تحریری یادگاریں چھوڑیں تھیں مگر اربابِ تذکرہ صرف ان کی دو کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

موَطا :

اس میں انہوں نے ان مرویات کو جمع کیا تھا جو انہوں نے امام مالکؒ سے سنی تھیں ۔ موَطا کے جامعین ہزاروں ہیں مگر ان میں محض پندرہ سولہ نسخے موجود ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہمیت تین موطاؤں کو ہے۔ موطا امام محمد، موطا یحییٰ بن یحییٰ (آج کل یہی متداول ہے) اور موطا ابن وہب۔

غالباً انہوں نے اس کا اختصار بھی کیا تھا جس کا نام موطاء صغیر رکھا تھا۔ ان کی تیسری کتاب احوال قیامت ہے اس میں انہوں نے قیامت کی باز پرس اور دوزخ کی ہولناکی کا ذکر کیا ہے[3]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱۔ ص ۲۷۹　　[2] ایضاً۔ ص ۲۷۸

[3] عام تذکرے اور ابن خلکان۔ جلد ۱۔ ص ۴۴۶　جلد ۱۔ ص ۴۴۶

حضرت یحییٰ بن معینؒ

فن حدیث کا ایک اہم شعبہ "اسماء الرجال" ہے۔ اس میں حدیث کے رواۃ پر اس حدیث سے بحث ہوتی ہے کہ کون راوی قابلِ اعتماد ہے اور کون نا قابلِ اعتماد راوی کی اخلاقی زندگی کیسی ہے؟ اس میں عقل وفہم کا ملکہ کس قدر ہے؟ اس کے علم اور قوتِ حافظہ کا کیا حال ہے؟ چونکہ ان ہی بحثوں پر حدیث کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ ہوتا ہے اس لئے اس فن میں کلام کرنے کے لئے غیر معمولی علم و فضل اور عقل وبصیرت کے ساتھ ساتھ خدا ترسی اور احساسِ ذمہ داری کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر کسی راوی کی جرح میں افراط کی گئی اور اس کی روایت ترک کردی گئی تو حدیثِ نبوی کی تکذیب ہوتی ہے اور اگر تعدیل میں تفریط کی گئی تو اقوالِ رسول ﷺ میں غلط باتوں کے داخل ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیثِ نبوی کی تحدیث وروایت کرنے والوں کی تعداد تو آپ کو بے شمار ملے گی مگر فنِ رجال کے جاننے والوں کی تعدا بہت کم ملے گی۔ حضرت یحییٰ بن معین خاص فن کے امام ہی نہیں بلکہ امام آئمہ سمجھے جاتے ہیں ان کے عہد میں اس فن کے متعدد ائمہ تھے مثلاً احمد بن حنبل، ابن مدینی، سعید القطان، ابن مہدی وغیرہ، مگر ابن معینؒ کو ان سب بزرگوں میں ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔

حضرت یحییٰ بن معینؒ کے حالاتِ زندگی ان کے علم وفضل کے علاوہ اس حیثیت سے بھی قابلِ ذکر ہیں کہ ان کی زندگی اسلامی معاشرہ کی مساوات اور رفعت کا صحیح مرقع ہے۔

غلام خاندان سے تھے:

اسلامی معاشرہ میں خواہ وہ غلام ہو یا آزاد ہر شخص کو مساوی طور پر پروان چڑھنے اور ترقی کا موقع حاصل ہوتا ہے اس لئے یحییٰ بن معینؒ اگر چہ ایک غلام خاندان کے فرزند تھے مگر اسلامی معاشرہ کی مساوات پسندی نے ان کی فطری صلاحیتوں کو پورے طور پر ابھرنے کا موقع دیا یہاں تک کہ وہ بڑے بڑے آزاد علمی خانوادوں کے اربابِ فضل وکمال سے بھی سبقت لے گئے اور ان کی یہ غلامی ان کے اعزاز کی کسی راہ میں مانع نہیں ہوئی۔ ایک بار کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ عرب خاندان سے ہیں؟

بڑی بے نیازی سے فرمایا کہ

''میں عرب نہیں ہوں بلکہ عربوں کا غلام ہوں''۔[1]

نام ونسب :

۱۵۸ھ میں ولادت ہوئی۔ یحییٰ نام اور ابوزکریا کنیت تھی ان کے والد کا نام معین تھا ان کا وطن بغداد کے مضافات میں موضع نقیا میں تھا یہ عباسی حکمران منصور کے عہد حکومت میں رے کے عامل تھے۔ دنیاوی اعزاز کے ساتھ انہوں نے دولت بھی کافی کمائی جوان کی وفات کے بعد حضرت یحییٰ بن معین کو ترکہ میں ملی۔

تحصیلِ علم :

ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے اپنی ساری توجہ علمِ حدیث کی تحصیل کی طرف مرکوز رکھی اور اس کے لئے اپنی جان ومال کا پورا سرمایہ لگایا۔

خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ اپنے والد کی تمام متروکہ رقم جس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ درہم تھی، انہوں نے علمِ حدیث پر صرف کرڈالی یہاں تک کہ وہ اس قدر مفلس ہوگئے کہ پہننے کے لئے جوتے نہیں رہ گئے۔

شیوخ حدیث :

کسی علم کے حاصل کرنے میں اس علم کے اساتذہ اور ماہرین کی صحبت اوران سے اکتساب فیض کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ یحییٰ بن معینؒ کے شیوخ حدیث پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کے تمام آئمہ علم وفن سے مستفید ہوئے تھے۔ چندمشاہیر کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

عبدالسلام بن حرب، عبداللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید القطان، وکیع بن جراح، عبدالرحمٰن بن مہدی، حفص بن غیاث، سفیان بن عیینہ، عبدالرزاق، ہشام بن یوسف وغیرہ۔

کتابتِ حدیث :

وہ صرف حدیث کے سماع پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ سنی ہوئی حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے۔ علی بن المدینی ذکر کرتے ہیں کہ حدیث کی جتنی کتابت یحییٰ بن معینؒ نے کی کسی دوسرے محدث نے نہیں کی، خود ابن معین فرماتے تھے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے لاکھوں حدیثیں لکھی ہیں[2]۔ پھر یہی نہیں

---

[1] تاریخ بغداد ص ۱۷۸۔ جلد ۱۴ [2] بعض روایتوں میں چھ لاکھ، بعض روایتوں میں بارہ لاکھ اور بعض میں ایک لاکھ کی تعیین کی گئی ہے مگر اس طرح کی تعیین عموماً بالکل صحیح نہیں ہوتی اس لئے ہم نے مجملاً لکھا ہے۔

کہ سرسری طور پر جس حدیث کو سن لیتے ،لکھ لیتے بلکہ اس پر کافی غور وخوض کرتے اس غور وخوض میں بعض وقت ایک ایک روایت کو پچاس پچاس مرتبہ لکھتے تھے اوراس کی وجہ یہ بیان کرتے کہ اگر ہم کسی روایت کو بار بار لکھتے اور کاٹتے نہیں تو اس کے مغز سخن کو نہیں سمجھ پاتے [1]۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ یحییٰ بن معینؒ کتابت حدیث میں معروف تھے۔

تلامذہ :

تحصیلِ علم کے بعد وہ اپنا بیشتر وقت رواۃ حدیث کی جرح وتعدیل اور متنِ حدیث کی صحت وعدم صحت پر غور کرنے میں صرف کرتے تھے اس لئے خود ان کو تحدیثِ روایت کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ قریب قریب حدیث کی روایت نہیں کرتے تھے [2] تاہم ان سے اہلِ علم کی ایک کثیر تعداد مستفید ہوئی۔ جن میں بڑے ائمہ شامل ہیں مثلاً امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ رازی، ابویعلی الموصلی، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

حضرت یحییٰ بن معینؒ کا اصلی کارنامہ :

حدیثِ نبوی کی تحدیث وروایت بڑی ذمہ داری کا کام تھا اس لئے عہدِ صحابہ تک اس پر قانونی اور اخلاقی دونوں طرح کی پابندی عائد تھی اس لئے ہر شخص اس کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

حضرت عمرؓ کے سامنے جب کوئی نئی حدیث بیان کی جاتی تو وہ اکابر صحابہ تک سے شہادت طلب کرتے تھے۔ اس قانونی پابندی کے ساتھ صحابہ تک روایتِ حدیث کی اہمیت اور اس کی ذمہ داری کا احساس بھی عام تھا، یعنی جلیل القدر صحابہ تک اس احساس ذمہ داری کی بناء پر تحدیث روایت سے گریز کرتے تھے کہ مبادا نبی ﷺ کی طرف کوئی غلط بات نہ منسوب ہو جائے [3]۔

ان ہی اخلاقی اور قانونی بندشوں کا اثر یہ تھا کہ بہت کم لوگ روایت حدیث کی جرأت کرتے تھے مگر بعد میں نہ تو قانونی گرفت باقی رہی اور نہ وہ پہلا سا اخلاقی اثر ہی رہا۔ پھر رواۃ حدیث کو معاشرہ میں ایک عزوشرف کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا اس لئے اہل اور صاحب کمال لوگوں کے ساتھ بہت سے نااہل بھی اس مجد وشرف میں سہیم وشریک بننے کے لئے اس منصب پر متمکن ہو گئے اور انہوں نے نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ طور پر حدیث نبوی کی روایت شروع کردی، خصوصیت سے پیشہ ور واعظوں اور

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، تہذیب جلد ۱۱، ص ۲۸۲ [2] ایضاً [3] یہ احساس ذمہ داری اس ارشادِ نبوی ﷺ کی بنا پر تھا کہ جو شخص میری طرف کوئی غلط بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

قصہ گویوں نے گرمئ مجلس کی خاطر نہ جانے کتنی بے سروپا روائتیں بیان کرنی شروع کردیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار غلط باتیں یا صحیح باتیں غلط طریقہ پر رواج پاکر زبان زد خاص و عام ہوگئیں۔ یہ ایسا فتنہ تھا کہ اگر اس کے سدّ باب کی فوری طور پر فکر نہ کی جاتی تو نہ جانے اس کے نتائج کتنے برے نمودار ہوتے۔ حکومت وقت اس فتنہ کو بڑی آسانی سے دبا سکتی تھی مگر اس کو اس کی بہت زیادہ فکر نہیں تھی۔ امت احمدیہ محدثین اور علماء کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی جنہوں نے اپنی خداداد فہم وبصیرت سے اس فتن کی اہمیت کو بروقت سمجھ لیا اور ہمت وجرات کر کے مقابلہ کے لئے میدان میں آگئے یہ کام پہلی صدی کے آخر ہی سے شروع ہوگیا تھا مگر دوسری صدی میں محدثین نے جس کے سرخیل ابن معینؒ تھے باقاعدہ ایک نئے فن کی بنیاد ڈال کر اس فتنہ کا بڑی حد تک سد باب کردیا۔ اسی فن کو فن اسماء الرجال کہتے ہیں۔ اس میں انہوں نے سندِ حدیث کے کچھ اصول وقوانین مرتب کئے۔ رواۃ کے لئے سیرت وکردار کا ایک معیار مقرر کیا۔ اب جو لوگ اس پر پورے اترتے تھے ان کی روایتیں قبول کی جاتی تھیں اور جو لوگ اس میزان پر پورے نہیں اترتے تھے ان کی روایتیں رد کردی جاتی تھیں لیکن صرف اصول وقوانین مرتب کردینے سے بھی اس فتنہ کا پورے طور پر سد باب نہیں ہوسکتا تھا۔ ضرورت تھی کہ ان غلط روایتوں کو جو عوام میں رواج پاچکی تھیں ان میں سے ایک ایک روایت نیز اس کے راوی کو پرکھ کر دیکھا جائے کہ روایت کا کتنا حصہ صحیح اور کتنا غلط ہے۔ وہ راوی ذمہ دار ہے یا غیر ذمہ دار۔

ظاہری بات ہے کہ یہ کام آسان نہ تھا اس کے لئے غیر معمولی فہم وبصیرت اور قوتِ حافظہ کے علاوہ کتاب وسنت سے غیر معمولی ذوق وشغف کی بھی ضرورت تھی چنانچہ خدا نے جب جن بزرگوں سے یہ کام لیا ان کو فہم وبصیرت کے ساتھ ایسا غیر معمولی حافظہ بھی بخشا تھا کہ ان کے حفظ کے واقعات سن کر حیرت ہوتی ہے، ان ہی لوگوں میں ایک اہم شخصیت حضرت یحییٰ بن معینؒ کی بھی تھی انہوں نے اس سلسلہ میں جو غیر معمولی محنت ومشقت کی ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

انہوں نے صحیح اور عدم صحیح روایتوں کی تمیز اور رواۃ حدیث کے سیرت وکردار کے معلوم کرنے میں اپنی پوری ذہنی وعملی قوت صرف کردی تھی، وہ ایک حدیث کو پچاس پچاس[1] بار اس لئے لکھتے تھے کہ ان کے عیوب ونقائص معلوم ہوجائیں۔

---

[1] ایک بات کو جب متعدد آدمی بیان کرتے ہیں تو اس میں کچھ نہ کچھ اختلاف تو ضرور ہوجاتا ہے جو لوگ جتنے ذمہ دار ہوتے ہیں وہ اتنی ہی ذمہ داری سے روایت کرتے ہیں اس لئے ہر شخص کا بیان جب سامنے آتا ہے تو صحیح بات معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے اسی لئے یحییٰ بن معین یہ کرتے تھے کہ تمام روایتوں کے سلسلوں کو لکھ لیتے تھے پھر کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی بصیرت سے صحیح وغلط ہونے کا فیصلہ کرتے تھے۔

وہ واعظوں، کاذب راویوں کی روایتوں کو بھی اس لئے لکھ لیا کرتے تھے کہ ان کی پھیلائی ہوئی غلط روایتوں کے انبار سے صحیح باتیں اخذ کر لی جائیں خود فرماتے ہیں کہ

میں کاذبین کی روایتوں کو لکھ لیتا ہوں اور ان کو تنور میں ڈال کر ان سے پکی پکائی روٹیاں نکال لیتا ہوں[1]۔

مقصد یہ ہے کہ روایت و درایت کے معیار پر ان روایتوں کو پرکھتا ہوں اس میں جو صحیح ہیں انہیں لے لیتا ہوں اور جو غلط ہیں ان کی غلطی کو واضح کر کے ان کی حدیث نبوی ہونے کی حیثیت کو ختم کر دیتا ہوں۔ علامہ عجلیؒ جو خود اس فن کے امام ہیں، ان کا بیان ہے کہ ابن معینؒ کے سامنے بہت سی ملتبس احادیث لائی جاتیں تو سب کی حیثیت کو واضح کر دیتے تھے[2]۔

جن روایتوں کی غلطی پر بڑے بڑے ائمہ حدیث کی نظر نہیں جاتی تھی یحییٰ بن معین بیک نظر ان کو پا لیتے تھے۔ ابو سعید حدادؒ کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب کسی محدث کی خدمت میں جاتے تو اس کی کتابوں میں جو احادیث درج ہوتیں ان کو صحیح سمجھ کر قبول کر لیتے مگر جب وہی روایتیں ابن معین کے سامنے پیش کی جاتیں تو ان کی نظر عفوراً غلطیوں پر پڑ جاتی اور وہ غلطی اتنی باریک ہوتی تھی کہ وہ اگر توجہ نہ دلاتے تو ہم کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا۔

احساسِ ذمہ داری :

آئمہ رجال کا کام بڑا اہم، نازک اور بڑی ذمہ داری کا ہے اگر وہ کہیں نقد و جرح میں افراط سے کام لیتے تو ایک طرف راوی پر ناحق کذب بیانی وافتراء پردازی کا الزام عائد ہو جاتا اور دوسری طرف بہت سی احادیث نبوی ﷺ کی تکذیب یا کم از کم ان کی صحت میں تشکیک پیدا ہو جاتی اور یہ دونوں باتیں دینی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں تھیں۔ اسی طرح اگر انہوں نے تعدیل و توثیق میں نرمی اور تفریط سے کام لیا ہوتا تو ایک طرف بہت سے نا اہلوں کو تحدیث روایت کے منصب پر متمکن ہونے کا موقع مل جاتا تو دوسری طرف ارشاداتِ نبوی ﷺ میں بے شمار غلط باتوں کے شامل ہو جانے کا خطرہ تھا اور یہ دونوں باتیں دین کے حق میں مضر ثابت ہوتیں۔

پھر جرح و تعدیل کی زد میں بسا اوقات وہ علماء و مشائخ تک آ جاتے ہیں جن کی شہرت اور وثاقت پر ایک زمانہ کو اعتماد ہوتا ہے اس لئے اس منصب کے لئے جہاں غیر معمولی علم و فضل، فہم و بصیرت اور ہمت و جرأت کی ضرورت تھی وہیں تقویٰ، خشیتِ الٰہی، احساسِ ذمہ داری اور

---

[1] تاریخ بغداد تہذیب [2] تہذیب۔ جلد ۱۱۔ ص ۳۸۸

بے نفسی کی بھی بہت زیادہ ضرورت تھی ورنہ پھر اس نازک ذمہ داری سے عہدہ برآمد ہونا بہت مشکل تھا۔

امام یحییٰ بن معین میں دونوں طرح کے اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے، بڑے بڑے ائمہ سے بھی اگر بیان و روایت میں غلطی ہو جاتی تھی تو وہ ان کی غلطی واضح کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ابن الرومی کا بیان ہے کہ

"شیوخ حدیث کے بارے میں میں نے یحییٰ بن معین سے زیادہ حق بات کہنے والا نہیں دیکھا"[1]۔

مگر اس اظہار حق میں ذب عن حدیث الرسول کے علاوہ کوئی دوسرا نفسانی جذبہ نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ دعا فرماتے تھے کہ

"بار الہا اگر میں نے کسی شخص کے اوپر تنقید و جرح کر کے اس کی کذب بیانی واضح کی ہو مگر اس میں وہ بات نہ ہو تو میری مغفرت نہ کرنا"[2]۔

ظاہر ہے کہ اگر وہ جرح و تعدیل میں احساس ذمہ داری کو پورے طور پر ملحوظ نہ رکھتے تو آخرت میں فلاح و مغفرت سے محروم ہو جانے کی دعا بھی نہ کرتے کیونکہ ایک مومن کا سب سے قیمتی سرمایہ یہی ہے۔ جس طرح دوسروں کی روایت قبول کرنے میں محتاط تھے اسی طرح خود بھی روایت کرنے میں حد درجہ محتاط تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ

میں ایک روایت بیان کر دیتا ہوں مگر پھر اس خوف سے رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے کہ شاید روایت میں غلطی ہو گئی ہو[3]۔

فرماتے تھے کہ حدیث کے معاملے میں آدمی کو "سخی" یعنی فیاض اور سیر چشم نہیں ہوگا تو کذب بیانی کرے گا۔ لوگوں نے پوچھا کہ حدیث میں آدمی کیسے سخی ہو؟ فرمایا کہ

اذا شک فی الحدیث ترکه[4]

"جب کسی حدیث میں شک ہو تو اسے چھوڑ دے"۔

مقصد یہ ہے کہ حدیث کے قبول کرنے میں اگر وہ بہت زیادہ محتاط نہیں رہے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نادانستہ طور پر وہ بہت ہی غلط روایتوں کو صحیح سمجھ کر ان کی تحدیث کرے گا اور اس طرح سے کذب بیانی کا مرتکب ہو جائے گا۔

---

[1] تہذیب جلد ۱۱۔ ص ۲۸۴ [2] ایضاً [3] تاریخ بغداد جلد ۱۱۔ ص ۱۱۲ [4] تہذیب جلد ۱۱۔ ص ۲۸۷

قبول درایت میں حد درجہ محتاط ہونے کے باوجود کسی راوی کی کوئی غلطی دیکھتے تھے تو اسے حتی الامکان چھپاتے تھے کہ وہ خود اس کو مان لے اگر وہ نہیں مانتا تھا تو پھر اس کی غلطی کو برملا بیان کرتے تھے اور پھر اس کی دوسری روایت قبول نہیں کرتے تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ

جب میں کسی شخص کی کوئی غلطی دیکھتا ہوں تو اس کو پوشیدہ رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ حسن وخوبی سے اس کی غلطی اس پر واضح ہو جائے اور کبھی میں ایسے راوی سے ملتا ہوں جس کے چہرے سے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غلطی ایسی ہے جس کے اظہار کو وہ پسند نہیں کرتا تو میں اس کی غلطی اس پر واضح کرتا ہوں اگر وہ اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہے تو اس کو اپنے تک محدود رکھتا ہوں ورنہ پھر اس کو متروک قرار دیتا ہوں"۔

آئمہ حدیث کی رائے :

ان کے ان ہی اوصاف وکمالات اور علم وفضل کی بنا پر تمام معاصر ائمہ حدیث ان کی جلالت شان کے قائل تھے۔ امام احمد حنبل ؒ فرماتے تھے کہ جو روایت یحییٰ بن معین کو نہ معلوم ہو اس کی صحت مشکوک ہے[1]۔

ایک شخص نے احمد بن حنبلؒ کے سامنے کچھ احادیث بیان کیں اور ان سے پوچھا کہ ان میں کوئی غلطی ہو تو بتا دیجئے، فرمایا کہ

علیک بابی زکریا فانه یعرف الخطاء[2]

''ان احادیث کو یحییٰ بن معین کے سامنے پیش کر و روایات کی غلطیوں کو وہ خوب پہچانتے ہیں''۔

امام احمد حنبل ؒ فرماتے تھے کہ یحییٰ بن معین کے ساتھ سماع حدیث کرنے میں یہ فائدہ ہوتا تھا کہ قلب میں جو کچھ خلش ہوتی تھی نکل جاتی تھی۔

فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا شخص پیدا کر دیا ہے کہ جو کاذبوں کی کذب بیانی ظاہر کر دیتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ غایت احترام میں اپنی مجلس میں ان کے نام کے بجائے ان کی کنیت ابوزکریا سے ان کا ذکر کرتے تھے۔

حضرت ابوسعید حداد ؒ کہتے تھے کہ اگر یحییٰ بن معین نہ ہوتے تو میں حدیث نہ لکھتا مقصد یہ تھا کہ حدیث کی صحت اس زمانے میں اس قدر مشتبہ ہوگئی تھی کہ صحیح اور غلط میں کوئی تمیز باقی نہیں رہ گئی تھی مگر یحییٰ بن معینؒ نے اس میں حدِ فاصل قائم کر دی تھی۔ اس لئے اب لکھنے میں

---

[1] تہذیب جلد ۱۱۔ ص ۲۸۶   [2] ایضاً ص ۲۸۳

کوئی حرج نہیں، علی بن المدینی جو خود امام جرح وتعدیل تھے فرماتے ہیں میں بغداد میں چالیس سال تک مقیم تھا اس مدت میں امام احمد سے مجھ سے برابر حدیث کا مذاکرہ ہوتا تھا، جب کسی حدیث کے بارے میں ہم دونوں میں اختلاف ہوتا تھا تو اسے یحییٰ بن معین کے سامنے پیش کرتے تھے وہ فوراً حدیث کے مالہ وماعلیہ کو بتادیتے تھے[۱]۔

ان ہی کا قول ہے کہ یحییٰ بن آدم کے بعد علم کے مرکز یحییٰ بن معین ہیں۔

ابوعبید فرماتے تھے کہ امام احمد بن حنبل علی بن المدینی اور ابوبکر بن شیبہ اور یحییٰ بن معین پر علم ختم ہوگیا مگر ان چاروں میں یحییٰ بن معین حدیث کی صحت وسقم کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے[۲]۔

صالح بن محمدؒ کا قول ہے کہ یحییٰ بن معین معاصر ائمہ حدیث میں سب سے زیادہ رجال سے واقف ہیں۔ یحییٰ بن معین نے بعض بڑے بڑے ائمہ پر بھی جرح کردی ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی جرح سے وہ ائمہ مجروح یا متروک قرار دیئے جائیں گے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں بعض ایسی احادیث رواج پاگئیں تھیں کہ جو تھیں تو واقعی ضعیف مگر وہ چونکہ مشہور ومعروف ہوگئی تھیں اور شرعی احکام کے خلاف بھی نہیں تھیں اس لئے ان روایتوں میں بعض آئمہ نے زیادہ احتیاط نہیں کی یا انہوں نے ان کے قبول کرنے میں تسہیل سے کام لیا مگر چونکہ دوسرے ائمہ کے نزدیک ان روایتوں کی نسبت نبی ﷺ کی طرف صحیح نہیں تھی اسلئے انہوں نے جرح وتنقید کر کے ان کی حیثیت کو واضح کیا اور بہر حال ائمہ بھی انسان ہی تھے معصوم نہ تھے اس لئے ان کی اس غلطی پر جن لوگوں نے ٹوکا انہوں نے بہت ہی اہم کام انجام دیا اس لئے کہ ان ائمہ پر جرح کرنا اس سے بہت کم درجہ کی بات تھی کہ آنحضرت ﷺ کی طرف کوئی غلط بات منسوب ہوجائے۔

غرض یہ کہ ان پر جو جرح وتنقید کی گئی وہ اپنی جگہ صحیح تھی مگر اس کی وجہ سے ان کی امامت وجلالت پر کوئی حرف نہیں آتا اور نہ اس سے ان کی کوئی تنقیص ہوتی ہے اور نہ وہ متروک قرار پاتے ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر اور علامہ سبکی نے اس پر بڑی لمبی گفتگو کی ہے یہاں ہم اس کا کچھ خلاصہ درج کرتے ہیں:

''جرح وتعدیل کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ جن لوگوں کی امامت وعدالت عام ہو چکی ہو اور ان کے مادحین کی تعداد زیادہ اور جرح وقدح کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہو تو ایسے اشخاص پر جو جرح کی جائے گی وہ قابلِ التفات نہیں ہے ورنہ اگر یہ راستہ کھول دیا جائے تو پھر ائمہ میں کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہ سکتا''۔

۱۔ تہذیب　　۲۔ تہذیب جلد ۱۱۔ ص ۲۸۳

محدثین کا یہ اصول کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے، علی الاطلاق صحیح نہیں ہے۔ خصوصیت سے ان لوگوں کے بارے میں جن کی امامت اور جلالت علم پر ایک دنیا کا اتفاق ہو۔

مثلاً ابن ابی ذیب نے امام مالکؒ پر اور ابن معینؒ نے امام شافعیؒ پر اور امام نسائیؒ نے احمد بن صالحؒ وغیرہ پر جو جرح کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ائمہ کے بارے میں یہ اصول کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے بالکل ہی غلط ہے ان کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی[1]۔

وفات :

وفات ایسی پائی کہ خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے۔ امام نے متعدد حج کئے تھے حج سے فارغ ہو کر مدینۃ النبی کا قیام بھی ان کا معمول تھا۔ ۲۳۳ھ میں آخری بار یہ موقع نصیب ہوا تو حسب معمول حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ دیارِ حبیب ﷺ کی زیارت کے بعد واپس ہونا چاہتے تھے مگر جوار نبی کا شرف ہمیشہ کے لئے ان کی قسمت میں مقدر تھا اس لئے پھر رک گئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے وہ پیغام اجل آپہنچا۔

مدینہ میں جب آپ کی وفات کی خبر عام ہوئی تو جنازہ میں شرکت کے لئے ایک مخلوق ٹوٹ پڑی سب سے بڑی سعادت یہ نصیب ہوئی کہ آپ کا جنازہ اسی تابوت میں اٹھایا گیا جس میں آنحضرت کا جسدِ مبارک اٹھایا گیا تھا۔ جس وقت آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو لوگوں کی زبان پر عام طور یہ جملہ تھا کہ

"یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو کذب بیانی سے بچاتا تھا"[1]۔

جنۃ البقیع جہاں ہزاروں گنج ہائے گراں مایہ مدفون تھے اسی میں آپ بھی سپردِ خاک کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

بہت سے لوگوں نے آپ کا مرثیہ کہا۔

۱؎ طبقات الشافعیہ۔ جلد ۱۔ ص ۱۸۸　　　۲؎ سنہ وفات میں تو تمام اہل تذکرہ متفق ہیں مگر عمر میں کچھ اختلاف ہے۔

حضرت یحییٰ بن سعید القطان رحؒ

حضرت یحییٰ بن سعید ؒ بھی غلام خاندان سے تھے مگر علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار ممتاز تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ بصرہ آبائی وطن تھا اور وہیں ۱۲۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی[1]۔

تعلیم وتربیت :

شیخ ابن سعیدؒ نے جس زمانہ میں آنکھ کھولی اس وقت مملکت اسلام کا ہر قصبہ اور ہر قریہ قال اللہ وقال الرسول کی آواز سے گونج رہا تھا۔ خدا کو ان سے حدیث نبوی کی تدوین کا کام لینا تھا اس لئے اس نے ان بزرگوں کی خدمت میں جانے کی توفیق عطا کی جو اس فن کے امام تھے۔ ان کے شیوخ کے ناموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے تمام ممتاز محدثین سے خواہ وہ کسی خطہ کے ہوں انہوں نے استفادہ کیا تھا۔ خصوصیت سے امام شعبہ جو اس وقت مرجع خلائق تھے ان کی خدمت میں یہ بیس برس متواتر سماع حدیث کرتے رہے۔ جن محدثین سے انہوں نے استفادہ کیا تھا اس کی فہرست کافی طویل ہے۔ چند مشاہیر کے نام یہ ہیں :

امام مالک، امام اوزاعی، امام شعبہ، سفیان ثوری، ابن ابی عروبہ، یحییٰ بن سعید الانصاری تابعی، ہشام بن عروہ، امام اعمش، مسعر بن کدام، سفیان بن عیینہ اور سلیمان اعمش وغیرہ۔

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ یحییٰ بن سعیدؒ نے پچاس ایسے شیوخ حدیث سے سماع کیا تھا جو سفیان ثوری جیسے محدث روزگار کے اساتذہ میں تھے۔

وہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور قوتِ حافظہ میں زمانہ طالب علمی سے ممتاز تھے۔ امام شعبہ اور سفیان ثوری جو خود ان اوصاف میں فائق تھے وہ ان کی ذہانت اور قوتِ حافظہ پر حیرت کرتے تھے۔ ان کے ان اوصاف کی شہرت ہوئی تو حدیث نبوی کے پیاسے ہر طرف سے ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ تذکروں میں ان کے حلقۂ درس کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں مگر بعض ممتاز ائمہ کا برسوں ان کی خدمت میں رہ کر کسبِ فیض کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ان کا باقاعدہ حلقۂ درس تھا ان سے استفادہ کرنے والوں کے چند نام یہ ہیں۔

---

[1] تہذیب الاسماء جلد ۲۔ ص ۱۵۴

امام احمد حنبل، یحییٰ بن معین، اسحٰق بن راہویہ، عبدالرحمٰن بن مہدی، سفیان بن عیینہ، ابوبکر بن شیبہ، علی بن المدینی رحمہم اللہ تعالیٰ ان میں سے ہرایک کا شمار کبار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بے شمار افراد نے ان سے استفادہ کیا تھا جن میں ان کے لڑکے محمد اور ان کے پوتے احمد بھی ہیں[1]۔ ان کی جلالت علم کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امام احمد، ابن معین اور ابن المدینی جیسے ائمہ روزگار ان کے سامنے بیٹھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے اور ان سے جو کچھ پوچھنا ہوتا تھا کھڑے کھڑے پوچھ لیتے تھے۔

علم وفضل :

اپنے فضل وکرم اور زہد واتقا کے لحاظ سے زمرۂ تبع تابعین کے گوہر شب چراغ تھے۔ تمام ائمہ حدیث وفقہ نے ان کے فضل وکمال کا اعتراف کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل "فرماتے تھے کہ میری آنکھوں نے یحییٰ جیسا عالم نہیں دیکھا۔ ایک بار کسی نے ان سے پوچھا کہ وکیع بن جراح اور یحییٰ بن سعید میں کون زیادہ صاحب علم ہے؟ فرمایا کہ میں نے یحییٰ جیسا صاحب علم ...... نہیں دیکھا[2]۔ امام احمد بن حنبل سے اسی طرح کے اور بھی بے شمار جملے منقول ہیں ان کا یہ اعتراف بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ وہ امام شافعی وامام محمد جیسے آئمہ فقہ وحدیث سے استفادہ کر چکے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی جن کی جلالت علم ہر کہ ومہ کو مسلم تھی انہوں نے بھی یحییٰ بن معینؒ سے کہا کہ تمہاری آنکھیں ان کے جیسا صاحب فضل وکمال نہ دیکھیں گی۔ شیخ بندار جوان کی خدمت میں بیس برس رہے تھے وہ انہیں امام زمانہ کہتے تھے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ ان کے علم و فضل، امامت وجلالت اور صلاح وتقویٰ پر سب کا اتفاق ہے۔

ان کے علم وفضل کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب کسی مسئلہ میں ائمہ حدیث کے درمیان اختلاف ہوتا تھا تو یہ حکم مقرر ہوتے تھے۔ ایک بار امام شعبہ کے سامنے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوا، اختلاف کرنے والوں نے ان سے کہا کہ آپ کسی کو حکم بنا دیجئے؟ امام شعبہؒ کی نظرِ انتخاب حضرت یحییٰ بن سعیدؒ پر پڑی۔ چنانچہ ان کے سامنے وہ مسئلہ رکھا گیا۔ انہوں نے امام شعبہؒ جیسے امام وقت اور استاد کے خلاف فیصلہ دیا مگر استاد کی حق پرستی بھی دیکھئے کہ شاگرد کے فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اے یحییٰ تمہاری غیر موجودگی کیسے برداشت کی جائے گی؟"[3]۔

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۱۱۔ ص ۲۱۶ [2] تاریخ بغداد جلد ۱۴۔ ص ۱۳۹ [3] تہذیب التہذیب جلد ۱۱۔ ص ۲۲۰

حدیث :

علم حدیث ان کا خاص فن تھا اور اس میں ان کا مرتبہ امام کا تھا۔ ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ عراق میں علم حدیث کا عام رواج ان ہی کی ذات سے ہوا[1]۔ آئمہ حدیث کے یہاں انکی مرویات کا جو مرتبہ تھا اس کا صحیح اندازہ ان راویوں سے ہوسکتا ہے جو ان کے بارے میں انہوں نے ظاہر کی ہیں۔

مشہور محدث علی بن المدینی '' کہتے تھے کہ ہمارے معاصرین میں تین آدمی ایسے تھے جنہوں نے بدء شعور سے علم حدیث کی طرف توجہ کی اور اس سے زندگی بھر لپٹے رہے یہاں تک کہ وہ خود مسند تحدیث پر فائز ہوگئے۔ ان تین آدمیوں میں سب سے پہلا نام انہوں نے یحییٰ بن سعید'' کا لیا[2]۔ عبدالرحمٰن بن مہدی جو ان کے معاصر اور علم و فضل میں ان سے کم تر نہ تھے انہوں نے اپنے مجموعہ حدیث میں دو ہزار حدیثیں یحییٰ بن سعید کی سند سے داخل کر لی تھیں جنہیں وہ ان کی زندگی ہی میں راویت کرتے تھے[3]۔ ابن مہدی جیسے یگانہ روزگار کا ان کی زندگی ہی میں ان سے روایت کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے، امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ ابن مہدی نے ان کے واسطہ سے تیس ہزار روایتیں لکھی ہیں یعنی لکھی تو انہوں نے تیس ہزار تھیں مگر روایت صرف دو ہزار کی کرتے تھے۔

اگر کسی حدیث کے تذکرہ میں یہ ذکر ملے کہ ان کو کئی لاکھ حدیثیں یاد تھیں اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اتنے ارشادات نبوی ﷺ یاد تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اتنی روایتیں یا سلسلۂ بیان یاد تھا۔

ائمہ ان تمام سلسلۂ سند کو اس لئے یاد کرتے تھے کہ سب کو سامنے رکھ کر کسی حدیث کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ مثلاً ایک ہی حدیث کے متعدد راوی ہوتے ہیں ان میں ایک ناقص روایت کرتا ہے، دوسرا کامل، ایک مفصل روایت کرتا ہے اور دوسرا مجمل۔ اب دونوں کو سامنے رکھنے کے بعد فیصلہ آسان ہوتا ہے کہ کون سی روایت زیادہ صحیح اور قابلِ قبول ہے۔

روایتوں کی کثرت تعداد دیکھ کر بعض بے سوادوں کو احادیثِ نبوی ﷺ کے موجودہ ذخیرہ کے بارے میں شبہ ہونے لگتا ہے کہ آخر کار اتنا بڑا ذخیرہ حدیث کہاں سے آ گیا مگر یہ ان کی کم علمی ہے کہ وہ روایت اور حدیث میں فرق نہیں کرتے۔ روایت اس سلسلۂ بیان کو کہتے ہیں جو راوی حدیث کو سند کو رسول اللہ ﷺ تک پہنچانے کے لئے بیان کرتا ہے اس لئے بسا اوقات ایک ہی حدیث کے لئے متعدد سلسلۂ بیان ہوتے ہیں اس لئے روایات کی کثرت کو حدیث کی کثرت پر قیاس کرنا غلطی ہے۔

---

[1] تہذیب جلد ۱۱۔ ص ۲۰۰ [2] تاریخ بغداد جلد ۱۱۔ ص ۱۳۷ [3] ایضاً

حضرت یحییٰ بن سعید ؒ کو یہ شرف واعزاز کچھ تو ان کی فطری ذہانت واستعداد کی وجہ سے ملا تھا لیکن اس کا بڑا سبب خود ان کی ذاتی جدوجہد ہے۔ حدیثِ نبوی سے ان کو عشق تھا اس کے حصول کے لئے انہوں جو محنت اور کوشش کی اس کی مثال کم ملے گی۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ وہ صرف امام شعبہ ؒ کی خدمت میں بیس برس تک حدیث کا سماع کرتے رہے، وہ بھی کس اہتمام کے ساتھ خود ان کی زبانی اس کی تفصیل سنئے۔ فرماتے ہیں:

''کامل بیس برس تک میں امام شعبہ ؒ کی خدمت میں حاضر رہا اور روزانہ زیادہ سے زیادہ تیرہ حدیثیں ان سے سماع کر کے لوٹتا تھا۔ غور کیجئے کہ ابن سعید جیسے ذہین وذکی آدمی کا روزانہ صرف تیرہ حدیثوں کا سماع کرنا بلاوجہ نہیں تھا، اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہوسکتی تھی کہ وہ جو کچھ پڑھتے تھے اس پر پورے طور پر غور وخوض کرتے اور اس سے معانی کا استنباط کرتے تھے۔ محض حصولِ تبرک کے لئے وہ حدیثیں نہیں سنتے تھے اسی بناء پر حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ تمام آئمہ حدیث روایت حدیث میں ان کو حجت سمجھتے تھے۔ آئمہ حدیث کا یہ مقولہ ضرب المثل ہے کہ جو شخص یحییٰ بن سعید ؒ کی روایات کو چھوڑ دے گا ہم اس کو چھوڑ دیں گے[1]۔

تنقید رواۃ وروایت :

حضرت یحییٰ بن سعید صرف حافظ حدیث ہی نہیں تھے بلکہ ان کا شمار ائمہ جرح وتعدیل میں بھی ہوتا ہے۔ حدیث کی روایت میں سلسلۂ سند کا بڑا اہتمام ہوتا ہے یعنی اس بات کا بڑا لحاظ کیا جاتا ہے کہ حدیث نبوی ﷺ کی روایت جو لوگ کر رہے ہیں ان کی یادداشت کیسی ہے؟ ان کے شیوخ کون ہیں؟ ان کے اخلاق وعادات کا کیا حال ہے؟ غرض یہ کہ ایک روایت کے جتنے راوی ہوتے ہیں ان کے بارے میں جب تک یہ باتیں نہ معلوم ہوں اس وقت تک کوئی روایت قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جاسکتی۔ تبع تابعین کے زمانہ میں روایت وتحدیث کرنے والے بے شمار اہلِ علم تھے مگر جو لوگ روایت ورواۃ کے بارے میں پوری تنقید وتفتیش کرتے تھے ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ یحییٰ بن سعید بھی ان ہی میں تھے۔ ابن منجویہ کا بیان ہے کہ

هو الذی مهد لاهل العراق رسم الحديث ومعّن فی البحث عن الثقاة وترک الضعفاء[2]۔

''اہلِ عراق کے لئے حدیث کی بساط انہی نے بچھائی اور ثقہ راویوں کے قبول کرنے اور ضعیف راویوں کے ترک کردینے میں انہوں نے کافی غور وخوض اور تلاش تفتیش کی''۔

---

[1] تہذیب الاسماء، جلد ۲۔ ص ۵۵ [2] ایضاً

علی بن المدینیؒ کا جوخود جرح وتعدیل کے اساطین میں ہیں، قول ہے کہ میں نے یحییٰ بن سعیدؒ سے زیادہ علم رجال کا اور عبدالرحمٰن بن مہدیؒ سے زیادہ حدیث کی خطا وصواب کا جاننے والا کسی کو نہیں پایا، چنانچہ یہ دونوں جس راوی کو ضعیف قرار دیتے ہیں اس کو ترک کردیتا ہوں اور جن رواۃ سے یہ روایتیں قبول کر لیتے ہیں میں بھی قبول کر لیتا ہوں[1] خود عبدالرحمٰن بن مہدی بھی ان کے اس وصف کے ثناخواں تھے۔ ابراہیم بن محمد تیمی کا بیان ہے کہ

ما رایت اعلم بالرجال من یحییٰ

''میں نے یحییٰ سے زیادہ رواۃ حدیث کا جاننے والا نہیں دیکھا''[2]۔

قوتِ حافظہ :

علم حدیث میں درک پیدا کرنے کے لئے ہزاروں حدیثوں کے الفاظ اور سینکڑوں راویوں کے حالات پر نظر رکھنی پڑتی ہے اس لئے جب تک کوئی شخص غیر معمولی قوتِ حافظہ کا مالک نہ ہو فنِ حدیث میں غیر معمولی حیثیت حاصل نہیں کر سکتا۔ یوں تو عام ائمہ حدیث کو خدا نے اس نعمت سے نوازا تھا مگر بعض آئمہ اس اعتبار سے ضرب المثل تھے ان ہی میں یحییٰ بن سعیدؒ بھی ہیں۔

عموماً محدثین کا دستور تھا کہ جن احادیث کو درس میں طلبہ کے سامنے بیان کرنا ہوتا تھا وہ پہلے سے لکھ لیا کرتے تھے تاکہ غلطی نہ ہو مگر یحییٰ بن سعیدؒ کو اپنے حافظہ پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ بڑی سے بڑی حدیث زبانی سنا دیا کرتے تھے۔ ایک بار سلیمان بن اشعث نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ کیا یحییٰ آپ کو زبانی روایتیں سناتے تھے؟ فرمایا کہ ہاں! ہم نے ان کے پاس کبھی کتاب نہیں دیکھی، عام طور پر وہ اپنے حافظہ سے روایت کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ طویل طویل روایتیں جو ہم کتابوں میں لکھ لیا کرتے تھے، وہ ان کو بے تکلف سنا دیا کرتے تھے[3]۔

ایک بار ان کے استاد امام ثوری نے غالباً امتحان کی غرض سے ایک روایت کا سلسلہ سند قصداً ذرا مجمل بیان کیا۔ یحییٰؒ نے سنا تو فوراً بولے اس روایت میں یہ اجمال ہے۔ امام ثوریؒ حیران رہ گئے اور کہا کہ میں نے تمہارے جیسا فن رجال جاننے والا نہیں دیکھا تم سے کوئی غلطی پوشیدہ نہیں رہتی[4]۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک راوی محمد بن سالمؒ جو اپنے نام سے معروف تھے، ان کی کنیت ابوسہل اہل علم میں زیادہ معروف نہیں تھی، امام ثوریؒ نے روایت کرتے وقت نام کے بجائے ان

---

[1] تہذیب الاسماء جلد ۲۔ ص ۵۵ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] یہ اقوال تہذیب التہذیب میں ملیں گے۔

کی کنیت کا ذکر کیا خیال یہ تھا کہ یحییٰ کو راوی کی کنیت کا علم نہ ہوگا اور وہ اسے کوئی نئی روایت سمجھیں گے لیکن امام ثوری کی یہ توقع صحیح ثابت نہیں ہوئی، یحییٰ نے سنتے ہی فرمایا کہ ابوسہل تو محمد بن سالم ہیں۔ اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل کے متعدد اقوال تذکروں میں ملتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے فرمایا کہ یحییٰ بن سعید حد درجہ قوی الحافظہ اور واقعی محدث تھے، ان کا ایک قول ہے کہ میں نے یحییٰ بن سعید جیسا آدمی نہیں دیکھا ان پر تثبت فی الحدیث ختم ہے[1]۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ائمہ حدیث نے حدیث نبوی کی تدوین میں جتنی دیدہ ریزی و محنت کی ہے اور راویوں کی تنقید و توثیق میں جس قدر تلاش اور تفحص سے کام لیا ہے اس کی نظر دنیا کی مذہبی تاریخ میں ناپید ہے۔ انہوں نے اپنے راہنمائی کے اقوال و افعال کو مدون نہیں کیا بلکہ جن لوگوں نے اس کے کسی قول کو بیان کیا ہے ان کی زندگی کے احوال و کوائف بھی لکھ لئے تاکہ غلطی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

جرح وتعدیل :

ائمہ حدیث نے تدوین حدیث میں راوۃ کی جرح و تعدیل میں جس حزم و احتیاط سے کام لیا ہے اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی مگر پھر بھی وہ انسان تھے اس لئے ان سے بھی بعض تسامحات ہوئے ہیں اور ان پر ان کے دوسرے ہم عصر یا بعد کے محدثین نے گرفت کی ہے چنانچہ بڑے بڑے ائمہ کے تذکرہ میں جہاں ان کے محاسن و اوصاف کا تذکرہ ملے گا وہیں ان پر جرح و تنقید بھی ملے گی یعنی اس بات کی تفصیل بھی ملے گی کہ ان سے روایتِ حدیث میں کیا کیا غلطیاں ہوئی ہیں۔ اسی جرح و تنقید ہی کا یہ فیض ہے کہ سنتِ نبوی ﷺ کا چشمہ صافی گدلا نہیں ہونے پایا۔ ورنہ دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کی طرح حضور ﷺ کی سیرت بھی افسانوں میں گم ہو جاتی۔ اتنی احتیاط اور دیدہ ریزی کے بعد بھی اہلِ بدعت نے بہت سے افسانے گھڑ کر عوام میں پھیلا ہی دیئے۔

حضرت یحییٰ بن سعیدؒ کے تذکرہ میں ان کے محدثانہ محاسن کی تفصیل تو بہت ملتی ہے مگر ان کی کسی مخصوص غلطی کا ذکر نہیں ملتا، صرف امام احمد بن حنبلؒ کا ایک قول ملتا ہے۔

امام احمدؒ نے فرمایا کہ انہوں نے متعدد احادیث کے بیان کرنے میں غلطی کی ہے مگر غلطی سے کون بچا ہے؟[2] اس کے ساتھ یہ فرمانا کہ غلطی سے کون بچا ہے، بڑی اہمیت رکھتا ہے مقصد یہ تھا کہ بڑے بڑے آئمہ سے روایت حدیث میں غلطی ہوتی ہے اس لئے ان سے بھی

---

[1] تہذیب الاسماء [2] تاریخ بغداد۔ جلد ۱۴۔ ص ۱۱۰

غلطیاں ہوئی ہیں مگر امام احمدؒ نے غلطیوں کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

عبادت اور اخلاق و کردار :

حضرت یحییٰ بن سعیدؒ اپنے اخلاق و کردار اور اتقاء، پرہیزگاری میں اسلام کی زندہ تصویر تھے۔ ان کی ہر ادا سے خدا کی اطاعت و فرماں برداری کا اظہار ہوتا تھا، ان کی زندگی میں خدا کی نافرمانی کی کوئی مثال ڈھونڈھے سے نہیں ملتی۔ ان کے ایک شاگرد بندار جوان کی خدمت میں بیس سال مسلسل رہے تھے، فرماتے ہیں

اختلف الی یحییٰ بن سعید عشرین سنة فما اظن انه عصی الله[1]

''میں نے بیس برس تک ابن سعید کی خدمت میں آمد ورفت رکھی، میرا گمان ہے کہ اس مدت میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جسے خدا کی نافرمانی کہا جا سکے''۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ وہ کسی حالت اور کسی کام میں ہوں میں نے ان کے جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ ابن معین کا بیان ہے کہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ ان کی جماعت ترک ہوئی ہو، نماز باجماعت کے حد درجہ پابند ہونے کے ساتھ نوافل کا بھی پورا اہتمام کرتے تھے، جتنی نمازیں شروع کر دیتے تھے ان پر مداومت کی کوشش کرتے[2]۔ کلام الٰہی کی تلاوت سے خاص شغف تھا ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ عموماً دن رات میں ایک قرآن ختم کر لیتے تھے[3]۔

قرآن کا اثر اور خوفِ آخرت :

لیکن وہ محض قرآن خواں نہیں تھے بلکہ ان پر قرآن کا وہی اثر ہوتا تھا جو قلب مومن پر ہونا چاہیے بلکہ بسا اوقات قرآن کی زباں سے آخرت کا تذکرہ سن کر وہ بیخود ہو جاتے تھے۔ ممتاز محدث علی بن المدینیؒ کا بیان ہے کہ ایک بار ہم لوگ ان کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، حاضرین میں سے کسی نے فرمایا کہ قرآن پاک کا کوئی حصہ سناؤ اس نے سورۂ دخان کی تلاوت شروع کی۔ جوں جوں وہ پڑھتا جاتا تھا اس پر رقت طاری ہوتی جاتی تھی جب وہ آیت

ان یوم الفصل میقاتھم اجمعین

''فیصلہ کے دن سب لوگ حاضر ہوں گے''

پر پہنچا تو ان پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر سارا خاندان گھر کے بچے اور عورتیں رو پڑیں، کچھ دیر کے بعد جب ان کی یہ کیفیت دور ہوئی تو ان کی زبان پر یہی

---

[1] تہذیب جلد ۱۱۔ ص ۲۱۹ [2] تہذیب الاسماء جلد ۲۔ ص ۱۵۴ [3] تاریخ بغداد

آیت تھی، ان یوم الفصل میقا تھم اجمعین[1]۔ تسلیم ورضاان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ رنج ہو یا مصیبت کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے۔ مرض الموت میں کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو شفاعطا فرمائے عفاک اللہ! بڑے پرسکون انداز میں فرمایا:

اُحبه فی ما احبهٗ الی اللہ عزو جل

''میں اپنے لئے وہی پسند کرتا ہوں جواللہ عزوجل میرے لئے پسند کرتا ہے''۔

مقصد یہ تھا کہ مصیبت وبیماری میں گھبراہٹ اور پریشانی مومن کی شان نہیں ہے کیونکہ بیماری ومصیبت مردمومن کے لئے کفارہ سیئات ہوتی ہیں اس لئے ان کو خدا کی رحمت سمجھنا چاہئے۔

متانت وسنجیدگی اور سادگی وقناعت پسندی:

متانت وسنجیدگی اور سادگی وقناعت پسندی کے وہ پیکر تھے۔ ان کے پوتے کا بیان ہے کہ میرے دادانہ کبھی مذاق وہنسی کرتے تھے اور نہ قہقہہ لگا کر ہنستے تھے، وہ کبھی حمام میں غسل کے لئے نہیں گئے اور زیبائش وآرائش کے لئے تیل وسرمہ لگانے کے عادی تھے[2]۔ ان کی اس سنجیدگی سے لوگ ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے تھے ایک بار کسی پڑوسی سے کچھ بات چیت ہوگئی، پڑوسی نے ان کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ یحییٰ بن سعیدؒ اس بدزبانی کا جواب دے نہیں سکتے تھے اس لئے رونے لگے اور فرمایا کہ

اس نے سچ کہا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں، غالباً اس نے ان کے غلام ہونے پر کچھ تعریض کی ہوگی۔

اس وقت کے علماء اپنے لباس وضع قطع میں عام لوگوں سے کچھ امتیاز برتتے تھے مگر یحییٰ بن سعیدؒ اپنے غیر معمولی فضل وکمال کے باوجود صحابہ کرامؓ کی طرح نہایت سادہ وضع میں رہتے تھے۔ سادگی کی وجہ سے عام آدمیوں کو ان کے فضل وکمال کا علم بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ ابن عماد کا بیان ہے کہ یحییٰ بن سعیدؒ بالکل معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے مگر جب حدیث نبوی کا درس دینے لگتے تھے تو بڑے بڑے فقہاء کو زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی[3]۔

سادگی لباس ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ کھانے پینے میں بھی طبیعت نہایت سادہ اور قناعت پسند واقع ہوئی تھی، جو کچھ مل جاتا صبر وشکر کے ساتھ خود کھاتے اور بال بچوں کو کھلاتے، ابن ابی صفوان کا بیان ہے کہ ان کا آزوقۂ حیات صرف غلہ تھا کبھی جَو آ گیا تو جَو کھالیا، گیہوں آ گیا تو شکر بھیج کر اس کو کھالیا، کھجوریں آگئیں تو اس سے سدرمق کرلیا[4]۔ غرض کھانے پینے اور لباس میں نہ تو عیش وتنعم سے

---

[1] صفوۃ الصفوۃ جلد ۳۔ ص ۷۷۔ تاریخ بغداد [2] تاریخ بغداد [3] ایضاً جلد ۱۱۔ ص ۱۰۷ [4] ایضاً جلد ۱۴۔ ص ۱۴۰

کام لیتے تھے اور نہ اس کے لئے بہت زیادہ جدوجہد اور پریشانی کو پسند کرتے تھے۔

ان کے نام کا ایک جز قطان ہے اسکے بارے میں سمعانی نے لکھا ہے کہ یہ قطن (روئی) کی طرف نسبت ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں روئی کا کاروبار ہوتا تھا۔

وفات :

اٹھتر (۷۸) برس کی عمر میں ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔

اولاد :

ان کی نرینہ اولاد میں محمد بن یحییٰ کا نام تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ بھی صاحب علم وفضل تھے، محمد کے ایک صاحبزادے احمد کا تذکرہ بھی رواۃ حدیث کے سلسلہ میں ملتا ہے انہوں نے اپنے دادا سے بھی استفادہ کیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ بھی غلامان اسلام میں تھے۔ مگر زمرۂ تبع تابعین میں ان کا شمار ان ممتاز محدثین میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ حدیث نبوی ﷺ کی تدوین وحفاظت ہوئی حدیث ورجال میں ان کی رائے حضرت یحییٰ بن معینؒ اور ابن قطان وغیرہ کے ہمپلہ سمجھی جاتی ہے۔

نام ونسب :

عبدالرحمٰن نام، ابوسعید کنیت تھی۔ والد کا نام مہدی تھا، یہ قبیلہ ازد بصری کے غلام تھے، اس لئے ان کو بھی اہل تذکرہ بصری لکھتے ہیں[1]۔ ان کی ایک اور نسبت لولوی بھی ہے، اس نسبت کے بارے میں سمعانی نے لکھا ہے کہ ان کے یہاں موتیوں (لولو) کی تجارت ہوتی تھی۔ اس پیشہ کی نسبت سے ان کو لولوی بھی کہا جاتا ہے[2]۔

ولادت، ماحول اور تعلیم وتربیت :

خلافت عباسیہ کے آغاز ۱۳۵ھ میں آپ بصرہ میں پیدا ہوئے، عراق میں اس وقت دو مقام کوفہ وبصرہ خاص طور سے گہوارۂ علم وفضل بنے ہوئے تھے، بصرہ میں جہاں دینی علوم کے متعدد چشمے ابل رہے تھے، وہیں دوسری قوموں کے اختلاط سے غیر دینی رجحانات اور غلط افکار بھی دین کے چشمۂ صافی میں مخلوط ہو رہے تھے۔ اس اختلاط سے جہاں بہت سے بُرے نتائج پیدا ہوئے، ان میں ایک مذہبی قصہ گوئی بھی ہے، اس قصہ گوئی کو رواج دینے میں عام مجالس پند ونصائح کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اس وقت بصرہ میں امام حسن بصریؒ کی مجالس پند ونصائح کا بڑا چرچا تھا۔ مگر وہ اس بارے میں انتہائی محتاط تھے، ان کے بعد یہ احتیاط باقی نہیں رہی اور اہل لوگوں کے ساتھ بہت سے نااہل بھی اس بزم کے مسند نشین بن گئے۔ چونکہ یہی دور دینی علوم اور خاص طور پر حدیث کی تدوین وترتیب کا بھی تھا اس لئے بڑی آسانی سے یہ روایتیں ذخیرۂ تفسیر وحدیث میں داخل ہو گئیں۔

---

[1] تاریخ بغداد اور تہذیب وغیرہ [2] کتاب الانساب

ابن مہدیؒ نے آنکھ کھولی تو بصرہ میں قصہ گوئی کا عام رواج ہو چکا تھا۔ چنانچہ ان کے علمی نشوونما کا آغاز قصہ گویوں کی صحبت ہی سے ہوا۔ ابو عامر عقدی کہتے ہیں کہ وہ قصاص کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ ان قصہ گویوں کی صحبت سے تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا، چنانچہ میری یہی نصیحت ان کو علم حدیث کی طرف مائل کرنے کا سبب بن گئی، پھر یہ طلب اتنی بڑھی کہ بصرہ سے سینکڑوں میل دور دیار نبی ﷺ یعنی مدینہ منورہ پہنچے اور امام مالکؒ کے حلقہ درس میں شریک ہو کر طلب علم کی پیاس بجھائی[1]۔

شیوخ :

انہوں نے کبار تابعین کا زمانہ تو نہیں پایا مگر پھر بھی ان کے زمانہ میں تابعین کی ایک معتدبہ تعداد موجود تھی، انہوں نے ان سے اور ممتاز اتباع تابعین سے استفادہ کیا تھا۔ ان کے اساتذہ کے چند نام یہ ہیں۔

حضرت ایمن بن نابل، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، امام مالک، امام شعبہ، مالک بن معول، خالد بن دینار، مہدی بن میمون رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

درس وتدریس :

ذہانت وذکاوت اور قوتِ حافظہ میں ابتداہی سے ممتاز تھے، چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے استاذ بن گئے تھے۔ خود ان کا بیان ہے کہ جس زمانے میں میں امام مالکؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر استفادہ کر رہا تھا، اسی زمانے میں بہت سے طالبانِ حدیث مجھ سے نقل روایت کرتے تھے[2]۔

امام مالکؒ کی مجلس درس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ نہایت باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھی، جب تک درس کا سلسلہ جاری ہوتا تھا کوئی شخص اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔ اور نہ خود امام پہلو بدلتے تھے، یہی حال ابن مہدیؒ کی مجلسِ درس کا بھی تھا۔ احمد بن سنانؒ اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

جب تک درس ہوتا رہتا تھا کوئی مجلس میں بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ نہ کوئی قلم بناتا تھا اور نہ مجلس سے اُٹھ کر جا سکتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حاضرین نماز میں شریک ہیں یا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں[3]۔

---

[1] تاریخ بغداد۔ جلد ۱۰، ص ۲۴۰ [2] تہذیب التہذیب۔ جلد ۶، ص ۲۸۰ [3] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱، ص ۳۰۳

بہت سے ممتاز آئمہ نے ان سے استفادہ کیا تھا، چند استفادہ کرنے والوں کے نام یہ ہیں :

حضرت عبداللہ بن مبارک، اسحاق بن راہویہ، امام احمد حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، امام زہلی استاذ امام بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

ان کے فضل وکمال کے بارے میں معاصرین کی رائے :

حضرت علی بن المدینیؒ کہتے ہیں کہ میں اگر کعبہ میں کھڑے ہو کر یہ قسم کھاؤں کہ میں نے ان کے جیسا عالم نہیں دیکھا تو میں اپنی قسم میں سچا ہوں گا[۱]۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ۱۸۰ھ میں ابن مہدی بغداد آئے، ان کو میں برابر دیکھا کرتا تھا، مگر ان سے کبھی استفادہ نہیں کیا۔ اس کے بعد یہ پھر دوبارہ بغداد آئے تو ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر جم کر ان سے استفادہ کیا، تنہا میں نے ان کے سماع سے تقریباً چھ سات سو روایتیں نقل کیں[۲]۔ یحییٰ بن سعید سے کسی نے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا بولے کہ ابن مہدی کے پاس جاؤ اور خود ان کی چند مرویات میرے سامنے بیان کیں[۳]۔ ابن سعید کہتے تھے کہ میں نے براہ راست جو حدیثیں اعمشؒ سے سماع کی ہیں، وہ روایتیں جب ابن مہدیؒ اعمش سے بواسطہ سفیان بیان کرتے ہیں تو مجھے ان کا بالواسطہ سماع اپنے براہ راست سماع سے زیادہ پسندیدہ معلوم ہوتا ہے[۴]۔ (امام ذہبی ان کو الحافظ الکبیر اور العالم الشہیر لکھتے ہیں، ابن حجرؒ نے انہیں حافظ اور امام علم لکھا ہے۔ امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ ان کے اوپر علوم حدیث میں اعتماد کیا جاتا ہے اور اس علم کے معارف کا ان کے اوپر دارومدار ہے۔

قوتِ حافظہ :

قوتِ حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ تمام ائمہ حدیث نے ان کے قوت حافظہ کا اعتراف کیا ہے، اس کا اندازہ عبداللہ کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک بار ابن مہدیؒ نے بیس ہزار حدیثیں مجھے اپنے حافظہ سے املاء کرائی تھیں[۵]۔

علمِ حدیث میں ان کا مرتبہ :

علم حدیث میں ان کا شمار ان اساطین امت میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ یہ فن اہل ہوس کی دست برد سے محفوظ و مامون رہا۔ تمام ائمہ حدیث نے ان کی خدمت حدیث اور اس میں ان کی امامت وجلالت کا اعتراف کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ یہ حدیث نبوی ﷺ کی خدمت ہی کے

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۳۵ [۲] ایضاً ص ۲۴۱ [۳] ایضاً [۴] ایضاً ص ۲۴۲ [۵] صفوۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲

لئے پیدا کئے گئے تھے[۱]۔ابن مہدیؒ جس شخص کی روایت قبول کرلیں سمجھو کہ وہ حجت ہے[۲]۔ابن مدینیؒ جو خود رجال کے امام ہیں کہتے تھے کہ ابن مہدی اور ابن قطان جس راوی سے روایت کرنا چھوڑ دیتے ہیں، میں بھی اسے ترک کر دیتا اور جب کسی راوی کی روایت قبول کرنے میں یہ دونوں امام مختلف الرائے ہو جاتے ہیں تو میں ابن مہدی کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں،اس لئے کہ یہ رائے دینے میں زیادہ معتدل اور محتاط ہیں اور ابن قطان میں تشدد زیادہ ہے[۳]۔ابن معینؒ فرماتے تھے، میں نے فن حدیث میں ابن مہدیؒ سے زیادہ پختہ کار نہیں دیکھا[۴]۔ابو حاتم کا قول ہے کہ وہ ثقہ تھے فکر ونظر کی پختگی میں ان کا درجہ وکیعؒ سے بھی بڑھا ہوا تھا[۵]۔ابو ربیع زہرانی بیان کرتے تھے کہ ان کی خصوصیت بصیرت فی الحدیث تھی۔ابن عمارؒ کہتے تھے کہ وکیع اور ابن مہدی دونوں قابل وثوق ہیں مگر ابن مہدیؒ کی بصیرت فی الحدیث بڑھی ہوئی تھی۔انہی کا قول ہے کہ حدیث کے الفاظ کے اختلاف سے خوب واقف تھے،امام احمدؒ فرماتے تھے کہ ابن مہدی وکیع بن جراحؒ سے اس لئے زیادہ قابل وثوق ہیں کہ یہ عہد تدوین وتحریر سے زیادہ قریب تھے[۶]۔یعنی ان کے زمانہ میں حدیث کی تدوین وترتیب کا کام عام طور پر شروع ہوگیا تھا،اور وکیع بن جراح کے زمانہ میں ائمہ زیادہ تر زبانی ہی روایت کرتے تھے۔

حدیث کی صحت کا معیار درایت بھی ہے:

حدیث کی صحت اور عدم صحت کا فیصلہ دو چیزوں پر ہے،ایک روایت یعنی سلسلۂ سند اور دوسرے درایت یعنی کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ وہ ثقہ اور قابلِ وثوق لوگوں کے ذریعہ بیان ہوئی ہے بلکہ اس میں یہ بھی غور کرنا چاہئے کہ یہ روایت اسلامی تعلیم کی کسی روح کے خلاف تو نہیں ہے۔وہ کسی حدیث صحیح سے متصادم تو نہیں ہوتی ہے۔اس میں مقام نبوت سے گری ہوئی کوئی بات تو بیان نہیں ہوئی ہے،وہ قرآن کے کسی بیان سے ٹکراتی تو نہیں ہے درایت کا استعمال عہد نبوت ہی سے شروع ہوگیا تھا۔عہد صحابہ میں بھی ہمیشہ یہ اصول برتا جاتا تھا۔حضرت عمرؓ خصوصیت سے اس میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔تابعین اور اتباع تابعین کے زمانہ میں بھی حدیث کے رد وقبول میں صرف حدیث کا کام آسان ہے،اس لئے حاملین روایت کی تعداد تو کثرت سے نظر آتی ہے اس کے مقابلہ میں صاحب درایت خال خال نظر آتے ہیں۔اس کی وجہ ظاہر ہے،روایت حدیث کا دارومدار زیادہ تر قوت حافظہ پر ہے جو شخص اس نعمت سے بہرہ ور ہے وہ تھوڑی سی ذہانت و

۱؎ تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۵ ۲؎ تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۳ ۳؎ ایضاً ۴؎ تہذیب الاسماء ص ۳۰۵
۵؎ تاریخ بغداد ص ۲۴۲ ۶؎ تاریخ بغداد ج ۲۴۲ ص ۲۴۳

ذکاوت کے ساتھ اس فرض کو انجام دے سکتا ہے مگر صاحب درایت کے لئے محض قوت حافظہ ہی کی نہیں بلکہ غیر معمولی ذہانت وذکاوت کے ساتھ وسعت نظر اور وقت فکر کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اس کے حاملین کی تعداد تو کم ہونی ہی چاہئے۔

اتباع تابعین میں جن بزرگوں کو یہ خصوصیت حاصل تھی ان میں ابن مہدیؒ بھی تھے۔ اُوپر جو اقوال نقل ہوئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ علم حدیث میں ان کی بصیرت اور دقیقہ سنجی کے تمام اکابر معترف ہیں، خود فرماتے تھے کہ کسی شخص کا امام (جس کا اتباع کیا جائے) بننا اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک اس کو روایت کی صحت اور غلطی کا علم نہ ہو جائے تاکہ وہ ہر روایت سے استدلال نہ کرنے لگے اس کے ساتھ اس کو علم کے اصل ماخذ ومنبع کا بھی علم ہونا چاہئے یعنی کتاب وسنت کی روح سے پورے طور پر واقف ہونا چاہئے درایت کے پورے مفہوم کو اردو میں کسی کے لئے مہارت فن اور ذوق علم کے الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ یعنی کسی علم کی ممارست اور انہماک سے جو ایک ذوق حاصل ہو جاتا ہے اور اس ذوق سلیم کی روشنی میں اس فن کے بارے میں جو فیصلہ کیا جاتا ہے، اس کو روایت کہتے ہیں خود ابن مہدیؒ نے درایت کے مفہوم کو ایک بڑی عمدہ مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

ابن مہدیؒ بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا کہ اے ابو سعید آپ کسی روایت کو ضعیف اور کسی کو قوی قرار دیتے ہیں۔ کسی کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ صحیح ہے اور کسی کے غلط ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں تو یہ رائے اتنی جلد آپ کس طرح قائم کرتے ہیں؟ (یعنی وہ کونسا معیار ہے جس پر جانچ کر آپ صحیح وغیر صحیح ہونے کا حکم لگاتے ہیں)۔

فرمایا کہ تم کسی صراف یا روپے کے پارکھ کے پاس روپئے وریزگاری لے جاتے تو وہ فوراً دیکھتے ہی کہتا ہے کہ یہ سکہ کھرا ہے اور یہ کھوٹا یہ اچھا ہے اور یہ ردی تو کیا تم اس سے پوچھتے ہو کہ یہ حکم تم نے کیوں اور کیسے لگایا؟ یا اس کی بات تسلیم کر لیتے ہو؟ اس نے کہا ہاں! اس بارے میں تو اس کی رائے بے چون وچرا تسلیم ہی کرنی پڑتی ہے؟ فرمایا کہ روایات کا حال بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ مگر یہ منصب ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے بڑی ممارست، اہل علم کی صحبت تبادلہ خیال اور وفور علم کی ضرورت ہوتی ہے[۱]۔ معرفت حدیث کے بارے میں ان کا قول تھا کہ حدیث کی معرفت ایک طرح کا الہام ہے[۲]۔ ان کا یہ جملہ درایت حدیث کی بہترین تفسیر ہے۔

---

۱ تہذیب الاسماء۔ ص ۳۰۵ ۲ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ۱ ص ۳۰۳

روایت باللفظ :

حدیثِ نبوی کا جوذخیرہ ہمارے پاس روایات کے ذریعہ پہنچا ہے اس میں کچھ قولی ہیں۔اور کچھ فعلی۔فعلی حدیثوں کو تمام صحابہ نے اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے مگر احادیث کا وہ حصہ جو آپ کے ارشادات پر مشتمل ہے اس میں کچھ حصہ تو صحابہ نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے یعنی روایت بالمعنی کی ہے،اور کچھ حصہ ایسا ہے جس میں ارشاد نبوی کو لفظ بلفظ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔صحابہ کرام کے عہد سے عہد اتباع تابعین تک بے شمار ایسے اکابر گذرے ہیں جو غایت احتیاط میں ارشاد نبوی کی معناً روایت کرنے کی بجائے لفظاً روایت کرنے کو پسند کرتے تھے۔ان ہی بزرگوں میں عبدالرحمٰن بن مہدی بھی تھے۔امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے پوچھا کہ ابن مہدی حافظ حدیث تھے؟ فرمایا کہ حافظ حدیث ہی نہیں تھے انتہائی محتاط محدث تھے۔اوران کی ایک خاص خصوصیت تھی کہ

وکان یحب ان یحدّث باللفظ[1]

’’کلام نبوی کی لفظ بلفظ روایت کرنا پسند کرتے تھے‘‘۔

حدیث میں ان کی ایک اور خصوصیت کا ذکر خطیب بغدادی نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ

برع فی معرفة الاثرو طرق الروایات واحوال الشیوخ

’’آثار نبوی۔۔۔۔روایات کے مختلف سلسلۂ سند اور شیوخ حدیث کے احوال سے واقفیت میں ان کو پوری مہارت حاصل تھی‘‘۔

تفقہ :

جس شخص میں روایت ودرایت حدیث کے تمام اوصاف موجود ہوں جو دین کی رُوح اور اس کے ماخذ ومنبع سے پوری واقفیت رکھتا ہو،اس کے تفقہ فی الدین میں کیا شبہ ہوسکتا ہے،امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بصرہ میں دو غیر معمولی عالم پیدا ہوئے۔ایک یحیٰی بن سعیدؒ دوسرے عبدالرحمٰن بن مہدیؒ مگر تفقہ میں ابن مہدیؒ کا پلّہ بھاری تھا۔کمال تفقہ ہی کے بناء پر معاذ بن معاذؒ کہتے تھے کہ بصرہ میں عہدہ قضا کا اگر کوئی اہل ہے تو صرف ابن مہدیؒ ہیں مگر ان میں کمی یہ ہے کہ ان کا خاندان یہاں نہیں ہے اگر وہ کسی بڑے آدمی کے خلاف کوئی فیصلہ کردیں تو وہ بڑے ان کو اس فیصلہ سے روکنے کی کوشش کریں گے[2]۔(اوران کا کوئی ہمنوانہ ہوگا)اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عجمی اثرات کی وجہ سے

---

[1] تہذیب۔جلد ۶۔ص ۲۸۰ [2] تاریخ بغداد۔جلد ۱۰۔ص ۲۴۲

اسلامی معاشرہ میں دوبارہ خاندانی عصبیت کس طرح گھس آئی تھی کہ اس وقت کا قاضی اگر اپنی پشت پر اپنے ہمنواؤں کی ایک جماعت نہیں رکھتا تو اس کے اپنے فیصلے بھی بے اثر ہوسکتے تھے، اور حکومت اس میں کچھ نہ کرپاتی تھی۔

سیرت واخلاق :

اپنی سیرت واخلاق کے اعتبار سے بھی وہ ممتاز تھے۔ ابن جوزی نے ان کو صاحب زہد وتقوی اتباع تابعین میں شمار کیا ہے، ایوب بن متوکل کا بیان ہے کہ جب ہم کو کسی ایسے شخص سے ملنے کی خواہش ہوتی ہے، جو دین ودنیا کا جامع ہو تو ابن مہدی ؒ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے تھے، حسان ازرق لکھتے ہیں کہ ان کے دیکھنے سے آنکھیں ٹھنڈی ہوجاتی تھی[1]۔

ان کے ورع وتقویٰ کا حال یہ تھا کہ اگر ان کو کسی چیز میں حرام ہونے کا شبہ بھی ہوجاتا تھا تو اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاتے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ جو چیز تم خدا کی رضا اور خوشنودی کے لئے چھوڑ دو گے خدا تعالیٰ اس کو تمہارے پاس ضرور واپس کردے گا۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ میں نے اور میرے بھائی نے مشترکہ تجارت کی جس میں کافی نفع ہوا مگر جب نفع تقسیم ہونے لگا تو اس مال میں کچھ شبہ ہوا۔ میں اپنے حصہ سے دستبردار ہوگیا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ میری زندگی میں وہ تمام دولت پھر میرے لڑکوں کے پاس آ گئی وہ اس طرح کہ میرے بھائی نے اپنی تین لڑکیوں کی شادی میرے تین لڑکوں سے کردی تھی اور میں نے اپنی لڑکی کی شادی ان کے لڑکے سے کردی۔ اتفاق سے کچھ دن بعد بھائی کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کے سارے مال کی وارث میرے والد اور مرحوم بھائی کی لڑکیاں جو میرے لڑکوں سے منسوب تھیں ہوئی اس کے بعد والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور وہ کل دولت میرے گھر میں آ گئی۔

ایک بار کسی نے زمین بیچنے کا ارادہ کیا۔ ڈھائی سو دینار فی جریب پر معاملہ طے ہوگیا۔ وہاں جس کے ذریعہ غالباً یہ معاملہ طے ہوا تھا اس نے آپ سے کہا کہ خریدار نے زمین کو ویران اور غیر آباد سمجھ کر اتنی قیمت لگائی ہے، اگر میں اور آپ کا غلام دونوں مل کر اس زمین میں کھاد وغیرہ ڈال کر اس کو آباد کردیں تو اس زمین کی قیمت فی جریب پچاس دینار (پانچ چھ سو روپے) سے زیادہ ہوجائے گی، اس طرح پوری زمین میں آپ کو چار ہزار دینار مزید مل جائیں گے۔ گو ایسا کرنا غلط نہیں تھا، اس لئے کہ اس نے ابھی قیمت نہیں ادا کی تھی، مگر پھر بھی انہوں نے محض تھوڑے سے فائدے کے لئے وعدہ کرنے

---

[1] صفوۃ الصفوۃ۔ جلد ۴۔ ص ۳

کے بعد اس کو مایوس کرنا ایک طرح کی بدمعاملگی اور بداخلاقی سمجھی، اس لئے دلال کی گفتگو سے بہت ناراض ہوئے اور بولے کہ تم چار ہزار دینار کا لالچ دیتے ہو، میں اس چار ہزار سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں پھر اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی:

لایستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرة الخبیث

''حرام اور حلال مال برابر نہیں ہو سکتے اگر چہ حرام مال کی کثرت تمہارے لئے کتنی ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو''۔

پھر کہا کہ میں ہرگز اس معاملہ سے باز نہیں رہ سکتا۔ خواہ چار ہزار کے بجائے ایک لاکھ دینار کا فائدہ کیوں نہ ہو۔ حصول ثواب کا انہیں عشق تھا۔ فرماتے تھے کہ اگر مجھے اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ خدا کی نافرمانی ہوگی تو میں یہ تمنا کرتا کہ اس شہر کا ہر ہر شخص میری غیبت کرے۔ بھلا اس نیکی سے عمدہ کون سی نیکی ہو سکتی ہے جس کو اس نے نہ تو کیا ہو اور نہ اسے اس کا علم ہو مگر قیامت کے دن محاسبہ ہو تو اس کے صحیفۂ اعمال میں وہ نیکی موجود ہو۔ یہ اشارہ اس حدیث نبوی کی طرف ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جب کسی بندہ کی ناحق برائی کی جاتی ہے، تو ہر برائی کے بدلہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے۔

نصیحت:

اہل علم کو وہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ جب آدمی اپنے سے زیادہ صاحب فضل وکمال سے ملے تو اس کی صحبت کو غنیمت سمجھے۔ اگر اپنے برابر سے ملے تو اس سے استفادہ اور مذاکرہ کی کوشش کرے اور اگر اپنے سے کمتر آدمی سے ملے تو اس کے ساتھ تواضع سے پیش آئے اور اس کو اپنے علم وفضل سے فائدہ پہنچائے۔

جو شخص ہر سنی سنائی روایت کو نقل کر دیتا ہو جو ہر کہ ومہ کی روایت قبول کر لیتا ہو وہ علم حدیث کا امام بننے کے لائق نہیں ہے [1]۔

علم وفضل اور اخلاق وسیرت کے ساتھ عبادت وریاضت میں بھی وہ ممتاز تھے۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ وہ اکثر اوقات پوری رات نفل نماز تلاوت قرآن میں گزار دیتے تھے ان کا عام معمول یہ تھا کہ ہر روز نصف قرآن تلاوت کر ڈالتے تھے۔ یہ ایک بار پوری رات جاگتے رہے مگر عین صبح کے وقت آنکھ لگ گئی اور نماز فجر قضا ہو گئی۔ ان کو اس کا اتنا رنج ہوا کہ اس کی تلافی کے لئے بہت دنوں تک زمین پر پیٹھ نہیں لگائی [2]۔

---

[1] صفوۃ الصفوۃ۔ جلد۴۔ ص [2] ایضاً

خلقِ قرآن کے مسئلہ میں ان کی رائے :

یونانی فلسفہ اور دوسری قوموں کے اختلاط سے اس زمانہ میں بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو گئے تھے جن کا وجود عہد نبوی اور عہد صحابہ میں نہیں ملتا، ابتداً علماء محدثین ان مسائل کے جواب سے گریز کرتے تھے مگر جب یہ مسائل بہت زیادہ عام ہوئے تو ان کو ان کے بارے میں اپنی رائے دینی ہی پڑی، انہی مسائل میں ایک مسئلہ قرآن کے مخلوق ہونے کا ہی تھا، اس بارے میں قریب قریب اس عہد کے پیشتر علماء محدثین سے سوال کیا گیا تھا۔ ان سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر مجھے اقتدار حاصل ہوتا تو قرآن کو مخلوق کہنے والے کی میں گردن اڑا دیتا اور پھر اس کی لاش دجلہ میں پھنکوا دیتا[1]۔

فرماتے تھے، فرقہ جہمیہ چاہتا ہے کہ خدا کے لئے نہ تو صفت کلام ثابت ہو سکے اور نہ قرآن اس کا کلام ثابت ہو سکے حالانکہ یہ ثابت ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰ ؑ سے کلام کیا اور پھر تاکید کہا کہ

وکلمه الله موسیٰ تکلیماً

''اللہ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا''۔

وفات :

اس پیکر فضل وکمال نے تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۹۸ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔

رحمه الله رحمة واسعة

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ جلد ا۔ ص ۳۰۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت علی بن مدینیؒ

اتباع تابعین کے زمرہ میں جن محدثین کو جرح وتعدیل کا امام سمجھا جاتا ہے۔ان میں ایک حضرت علی بن المدینی بھی ہیں۔ گویا یہ عمر میں چھوٹے تھے مگر علم وفضل کے وجہ سے ان کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا تھا۔

نام ونسب :

ابوالحسن کنیت اور علی نام تھا۔ان کا خانوادہ بنوسعد کے ایک شخص عطیۃ السعد کا غلام تھا۔آبائی وطن مدینہ تھا۔اس نسبت سے مدینی مشہور ہیں۔بعد میں یہ خاندان بصرہ میں آباد ہوگیا تھا۔یہیں ۱۶۱ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور وہیں ان کی نشوونما اور ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ان کے دادا اور والد دونوں صاحب علم وفضل تھے۔ان کے والد کے بارے میں تو خطیب نے لکھا ہے کہ یہ مشہور محدث تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم انہی کی آغوشِ تربیت میں ہوئی۔

بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اختتام تعلیم سے پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔چنانچہ جب انہوں نے سماع حدیث کے لئے یمن کا سفر کیا تو اس وقت ان کے اخراجات کی ساری ذمہ داری ان کی والدہ کے سر تھی۔

طلبِ علم کا شوق :

ان کے شیوخ کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے طلب علم کے شوق میں دُور دُور کی خاک چھانی تھی۔مکہ،مدینہ،بغداد،کوفہ،غرض ممالک اسلامیہ کے ہر مشہور مقام تک طلب علم کے لئے گئے۔خصوصیت سے یمن میں وہ تین سال تک مقیم رہے۔علم حدیث سے ان کو فطری لگاؤ بھی تھا اور وراثۃً بھی یہ علم ان کے حصہ میں آیا تھا۔اس لئے ان کے علم کا سارا جوہر اس فن میں کھلا۔سماع حدیث کے لئے جس وقت انہوں نے یمن کا سفر کیا تھا،اس وقت یہ مبتدی نہیں تھے، بلکہ اپنے حفظ وسماع سے حدیث کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ اپنے پاس جمع کر چکے تھے۔

خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے سلسلہ سفر کے اعتبار سے ایک سند جمع کی تھی۔میں جب یمن جانے لگا تو اس کو بحفاظت ایک بکس میں بند کرتا گیا،لیکن تین برس کے بعد واپس ہوا

تو یہ سارا ذخیرہ مٹی کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ مجھ پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ پھر دوبارہ اس کے جمع کرنے کی ہمت نہ کر سکا[1]۔

والدہ کی طرف سے طلبِ علم کی ہمت افزائی :

والد کے انتقال کے بعد گھر کا کوئی نگران نہیں تھا۔ صرف ان کی والدہ تنہا تھیں۔ ان کے قیام یمن کے زمانہ میں ان کو نہ جانے کتنی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، مگر انہوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان تکالیف کی اطلاع دے کر اپنے نورِ چشم کے سمندِ شوق کی راہ میں روڑہ ڈالیں، بلکہ جن لوگوں نے اس کا مشورہ دیا ان کو انہوں نے اپنے لڑکے کا دشمن سمجھا۔

چنانچہ جس وقت علی بن المدینیؒ یمن سے واپس آئے تو انہوں نے بیان کیا کہ بیٹا میں نے تمہارے دوستوں اور دشمنوں کو اچھی طرح پہچان لیا۔ بیٹے نے پوچھا، اماں جان! یہ کیسے؟ بولیں جب تم یمن میں تھے تو فلاں فلاں آدمی میرے پاس آتے اور ادب سے سلام کرتے اور مجھ کو تسلی دیتے اور کہتے کہ آپ ان کی مفارقت سے گھبرائیں نہیں، جس وقت علی واپس آئیں گے تو ان کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی اور دل باغ باغ ہو جائے گا۔ میں نے اس سے سمجھ لیا کہ یہ لوگ تمہارے مخلص اور بہی خواہ ہیں۔

ان کے برخلاف فلاں فلاں اشخاص آئے اور کہنے لگے کہ آپ ان کو خط لکھئے کہ وہ جلد واپس آ جائیں، اگر نہ آئیں تو پھر پریشان کن خط لکھئے۔ ان باتوں سے میں سمجھی کہ یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں دوست نہیں[2]۔

علمی شغف :

ان کے علمی شغف کا یہ حال تھا کہ رات کو سوتے سوتے کوئی حدیث یاد آ گئی یا کسی شبہ ہوا تو فوراً لونڈی سے کہتے کہ چراغ جلا۔ چراغ جل جاتا اور وہ جب اپنی تسکین کر لیتے تب جا کر پھر ان کو نیند آتی تھی[3]۔

اساتذہ :

جن اساتذہ سے انہوں نے کسب فیض کیا تھا، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چند مشاہیر کے نام یہ ہیں۔

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۷۔ ص [2] تاریخ بغداد جلد ۱۱۔ ص ۴۶۳ [3] ایضاً ص ۴۶۳

ان کے والد عبداللہ بن جعفر، حمادی بن زید، سفیان بن عیینہ، یحیٰ بن سعید القطان، عبدالرحمن بن مہدی، ابوداؤد طیالسی، ابن علیہ، سعید بن عامر رحیم اللہ تعالیٰ وغیرہ۔

اعتراف فضل:

ان کے علم و فضل کا ہر کہ دمہ کو اعتراف تھا۔ حضرت یحیٰ بن سعید القطان ان کے اساتذہ میں تھے، مگر وہ کہا کرتے تھے کہ علی بن المدینی نے جتنا مجھ سے استفادہ اس سے کہیں زیادہ میں نے ان سے استفادہ کیا ہے[1]۔

اسی طرح مشہور محدث اور ان کے شیخ ابن مہدیؒ کہا کرتے تھے کہ میں نے احادیث نبوی کا اتنا جاننے والا نہیں دیکھا[2]۔ حضرت سفیان بن عیینہ کے یہ خاص اور محبوب تلامذہ میں تھے۔ بعض لوگوں کو ابن المدینیؒ کے ساتھ ان کی یہ نسبت و محبت ناگوار گزرتی تھی۔

ایک دن انہوں نے فرمایا کہ مجھے لوگ علی کی محبت پر ملامت کرتے ہیں۔ خدا کی قسم! انہوں نے مجھ سے جتنا کسب فیض کیا ہے، اس سے کچھ زیادہ میں نے ان سے استفادہ کیا ہے[3]۔ حضرت سفیانؒ ان کو حدیث کا مرجع و ماویٰ کہتے تھے۔ کہتے تھے کہ اگر ابن المدینی نہ ہوتے تو میں درس دینا بند کر دیتا۔ امام احمد حنبلؒ ان کا اتنا احترام کرتے تھے کہ ادب سے ان کا نام نہیں لیتے تھے، بلکہ ہمیشہ ان کی کنیت ہی سے ان کو مخاطب کرتے تھے[4]۔

امام بخاریؒ ان کے تلامذہ میں ہیں۔ ان کا قول ہے کہ میں نے علی بن المدینیؒ کے علاوہ کسی کے سامنے اپنے کو حقیر نہیں سمجھا[5]۔

ان کے انتقال کے بعد کسی نے امام بخاری سے پوچھا کہ آپ کے دل میں کوئی خواہش باقی ہے؟ بولے ہاں! ایک خواہش ہے، وہ یہ ہے کہ ابن مدینی زندہ ہوتے اور عراق جا کر ان کی صحبت میں بیٹھتا[6]۔

ابن ماجہ اور نسائیؒ نے ان سے بالواسطہ روایتیں کی ہیں۔ امام نسائی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم حدیث ہی کے لئے پیدا کیا ہے[7]۔

۱؎ تہذیب التہذیب جلد ۷۔ ص ۳۵۱　۲؎ ایضاً　۳؎ ایضاً۔ ص ۳۵۹　۴؎ ایضاً　۵؎ ایضاً۔ ص ۳۵۲
۶؎ ایضاً۔ ص ۳۵۱　۷؎ ایضاً

خصوصیت :

ان کے اساتذہ اور دوسرے ائمہ نے ان کے بارے میں جو رائیں دی ہیں، ان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ ابن مدینی کو جو خصوصیت حاصل تھی، اس میں ان کے اساتذہ اور معاصر ائمہ میں بہت کم لوگ ان کے سہیم وشریک تھے۔

امام ابن مدینیؒ حدیث کے حافظ اور محض راوی نہیں تھے بلکہ حدیث نبوی ﷺ کے عارف و ماہر تھے۔ سند و متن رواۃ و روایت ہر چیز پر نظر تھی۔ خامیوں اور نقائص کا پورا علم رکھتے تھے۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ علی معرفت حدیث و علل میں ایک علامت ونشان تھے [۱]۔

محدث فریابی سے کسی نے امام احمد، یحییٰ بن معین اور ابن مدینیؒ کے بارے میں سوال کیا، تو انہوں نے کہ یحییٰ کو رجال میں درک تھا اور امام احمدؒ میں تفقہ زیادہ تھا اور ابن مدینیؒ کے بارے میں کہا کہ

اعلمهم بالحديث و العلل .

''حدیث اور اس کی سندوں اور علتوں سے خوب واقف تھے'' [۲]۔

حضرت محمد بن یحییٰؒ کا بیان ہے کہ میں نے ان کے پاس ایک کتاب دیکھی جس کی پشت پر لکھا تھا کہ ابن مدینیؒ کہا کرتے تھے کہ مجھے ایک حدیث کی علت سے واقفیت ہو جائے تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ بے جانے بوجھے میں بیسیوں حدیثیں یاد کرلوں۔

اسی خصوصیت کی بنا پر روایت کی صحت و عدم صحت پر جب بحث و مباحثہ ہوتا تو اپنے معاصرین میں یہی حکم بنائے جاتے اور انہی کی رائے پر بحث کا خاتمہ ہوتا تھا۔ بغداد اس وقت علم وفن کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مگر وہاں ابن المدینیؒ پہنچ جاتے تو ایک نیا حلقۂ درس قائم ہو جاتا اور تمام ائمہ پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو جاتے اور جب ان کے درمیان کوئی مختلف فیہ مسئلہ آجاتا اور فیصلہ نہ ہو پاتا تو پھر اس میں ابن مدینی اپنی رائے دیتے تھے [۳]۔

روایت حدیث میں شدتِ احتیاط :

اس زمانہ میں روایت حدیث عام طور پر ایک علم و فضل کی چیز بن گئی تھی۔ اس لئے بعض نااہلوں نے بھی روایت حدیث کی مسند سنبھالی تھی اور ان کی وجہ سے بے شمار قصے اور افسانے احادیث

---

۱ تہذیب التہذیب　　۲ ایضاً جلد ۷ ص ۳۵۲　　۳ ایضاً

نبوی ﷺ کے نام سے عوام میں مشہور ہو گئے تھے۔ آئمہ حدیث کا یہ غیر معمولی کارنامہ ہے کہ انہوں نے ایسے افسانوں اور قصوں کو ذخیرۂ حدیث سے چھانٹ کر الگ کر دیا۔

خود ابن مدینیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ایک لاکھ مرویات جن میں تیس ہزار ایک راوی عباد بن صہیبؒ سے مروی تھیں ترک کر دیں، اس لئے کہ قابلِ اعتبار نہیں تھیں[1]۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ائمہ حدیث اور خاص طور سے ابن مدینی نے صحیح حدیث کی تفتیش و تنقید میں کتنی جانکاہی کی تھی۔

عادات و اخلاق :

اپنے اخلاق و عادات میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ عباس عنبری کہتے ہیں کہ اگر ان کی عمر نے کچھ زیادہ وفا کی ہوتی تو اپنے اخلاق و عادات میں وہ حسن بصریؒ سے بڑھ جاتے۔ ان کی زندگی کا ہر گوشہ اتنا پاکیزہ اور پرکشش تھا کہ

كان الناس يكتبون قيامه وقعوده ولباسه وكل شئ يقول ويفعل[2]۔

''ان کی چال ڈھال، نشست و برخاست ان کے لباس کی کیفیت غرض ان کے ہر قول و عمل کو لوگ اسوہ سمجھ کر لکھ لیا کرتے تھے''۔

ان ہی اوصاف کا کرشمہ تھا کہ جب تک یہ بغداد میں رہتے تھے، سنت کا چرچا بڑھ جاتا تھا اور شیعیت کا زور گھٹ جاتا اور جب کچھ دنوں کے لئے یہ بصرہ چلے جاتے تو یہ فتنہ پھر زور پکڑ لیتا، حضرت یحییٰ بن معینؒ فرماتے تھے :

وكان علي بن المديني اذا قدم علينا اظهر السنة واذا ذهب الى البصر اظهر التشيع . (تهذيب . جلد ۷ . ص ۳۵۳)

''علی بن مدینی جب بغداد آ جاتے تو سنت کا چرچا ہو جاتا تھا اور جب وہ بصرہ چلے جاتے تو شیعیت زور پکڑ جاتی''۔

تصنیف :

یہ ان ائمہ تبع تابعین میں ہیں، جنہوں نے اپنی تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ انہوں نے حدیث میں دو سو ایسی تصنیفیں چھوڑی ہیں، جس کی مثال ان سے پہلے

---

[1] ایضاً جلد ۷ ص ۳۵۳　[2] تاریخ بغداد جلد ۱۱ ص ۴۶۱

نہیں ملتی۔مگران میں بیشتر ضائع ہوگئیں۔حافظ ابن حجر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ صاحب تصانیف تھے۔ابن ندیمؒ نے ان کی چند تصانیف کے نام بھی گنائے ہیں :

کتاب المسند بعللہ، کتاب المدلسین، کتاب الضعفاء، کتاب العلل، کتاب الاسماء والکنی، کتاب الاشربہ، کتاب التنزیل۔　　(ص۔۳۲۲)

فتنہ خلق قرآن اور ابن مدینیؒ کی آزمائش :

متعدد ائمہ کے حالات میں مسئلہ خلق قرآن کا ذکر آچکا ہے۔اس فتنہ کی شدت اور ہمہ گیری کا اندازہ اس وقت نہیں لگایا جاسکتا،مگر دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی کے شروع کے حالات و واقعات کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس کی اہمیت اور شدت کا کچھ اندازہ ہوجائے گا۔اس مسئلہ نے سب سے زیادہ اہمیت خلیفہ معتصم کے زمانہ میں اس وقت اختیار کرلی تھی، جب اس نے پوری مملکت میں یہ اعلان کرادیا تھا اور اپنے گورنروں کے ذریعہ یہ گشتی کرادی تھی کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل نہیں،اس کو حبس وضرب ہی نہیں بلکہ دارورسن کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

اس اعلان کے بعد بڑے بڑے ائمہ اور محدثین کے پیروں میں لغزش آگئی اور انہوں نے اس کا اقرار کرلیا۔ کتنے رُوپوش ہوگئے،مگر کچھ مردانِ خدا ایسے بھی تھے، جو نہ رُوپوش ہوئے اور نہ ان کے پیروں میں لغزش آئی، بلکہ آخر وقت تک اس بات کا اظہار کرتے رہے کہ یہ عقیدہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔اس کے نتیجہ میں ان کو وہ سب کچھ بھگتنا پڑا جس کا اس سے پہلے اعلان ہوچکا تھا۔ان ظاہرین علی الحق کے سرخیل امام احمد بن حنبلؒ تھے۔

اس مسئلہ میں جن بزرگوں نے کمزوری دکھائی یا یوں کہئے کہ عزیمت کے بجائے رخصت اختیار کی ان میں علی بن المدینیؒ بھی تھے۔اُوپر ذکر آچکا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔مگر اس مسئلہ میں جب سے ان سے لغزش ہوئی تو انہوں نے اپنا رویہ بدل لیا۔اس واقعہ کی تفصیل خطیب بغدادی نے یہ بیان کی ہے۔

معتصم باللہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ امام احمد حنبلؒ اور بعض دوسرے ائمہ اس مسئلہ میں اس کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں تو اس نے ان کو دربار میں طلب کیا اور برسرِ دربار شاہانہ انداز میں ان سے مخاطب ہوکر کہا کہ

''میں نے سُنا ہے کہ آپ اس بات کے قائل ہیں کہ قیامت میں خدا کا دیدار ہوگا، حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ خدائے تعالیٰ کی ذات لامحدود ہے اور ہماری آنکھوں کی بصارت محدود تو محدود چیز لامحدود کو کیسے دیکھ سکتی ہے؟ آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ قیامت میں رویت باری ہوگی''؟

آپ نے نہایت ہی صفائی اور جرأت سے فرمایا ''میرے پاس جو دلیل ہے وہ محض ظنی و قیاسی نہیں بلکہ نقل و روایت پر مبنی ہے''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ہے کہ ''تم قیامت میں خدائے تعالیٰ کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہو''[۱]۔

معتصم یہ دلیل سن کر کچھ گھبرا سا گیا اور اس نے قاضی احمد بن داؤد[۲] سے مخاطب ہو کر پوچھا، تمہارے پاس اس حدیثِ نبوی کا کوئی جواب ہے؟ یہ بیچارہ کیا جواب دیتا۔ بولا، کہ ''میں اس حدیث کی سند پر غور کر لوں تو جواب دوں۔ علی بن المدینیؒ سے غالباً اس کے تعلقات پہلے سے تھے۔ دربار سے نکل کر سیدھا ان کے پاس پہنچا اور ان کے سامنے کچھ نذر پیش کی اور کوئی گفتگو کئے بغیر چلا گیا۔ پھر دوبارہ دس ہزار درہم ان کی خدمت میں یہ کہلا کر بھیجے کہ یہ امیر المؤمنین نے آپ کو ہدیۃً بھیجے ہیں اور انہوں نے یہ حکم دیا ہے کہ آپ کو جس چیز کی ضرورت وہ فراہم کر دی جائے۔

یہ دام زریں بچھانے کے بعد پھر ابن مدینیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے پوچھا کہ رویت باری کے سلسلہ میں حضرت جریر بن عبداللہؓ سے جو روایت مروی ہے کیا وہ صحیح ہے؟ آپ کے نزدیک اس میں کوئی سقم تو نہیں ہے؟

ابن مدینیؒ نے فرمایا کہ مجھے اس بارے معاف ہی رکھئے (مقصد یہ تھا کہ یہ حدیث صحیح ہے، مگر چونکہ یہ فتنہ کا سبب بنی ہوئی ہے، اس لئے میں اس بارے میں کوئی رائے دینا نہیں چاہتا)۔ ابن ابی داؤد نے دیکھا کہ اس کا وار خالی جانا چاہتا ہے تو اس نے ابن مدینیؒ سے کہا کہ یہ موجودہ زمانہ حالات کی ضرورت ہے، جس کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد پھر ان کی خدمت میں کچھ تحائف پیش کئے اور اس حدیث کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی۔ اب ابن مدینیؒ کے پائے ثبات میں لغزش آ گئی اور انہوں نے جواب دے دیا جو ابن داؤد کا منشا تھا۔

---

[۱] یہ فرما کر امام نے اس کی عقل پرستی پر ایک ضرب لگائی تھی۔
[۲] اسی شخص کی بدنفسی اور جاہ پسندی کی وجہ سے اس مسئلہ نے زور پکڑا تھا۔

انہوں نے کہا کہ اس حدیث کے سلسلۂ سند میں ایک سقم ہے، وہ یہ کہ اس کا ایک راوی قیس بن حازم قابلِ ترک ہے۔ ابن ابی داؤد یہ سن کر خوشی سے اُچھل پڑا اور ابن مدینی ؒ کو گلے سے لگالیا اور وہاں سے دربارِ خلافت کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے معتصم کے سامنے روایت کے اس ضعف کو ظاہر کیا۔ معتصم کو جب یہ بہانہ ہاتھ آگیا تو امام احمد ؒ کو اس نے سزا دینے کا حکم دیا۔

خطیب نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد خود ہی اسے ناقابلِ اعتبار ٹھہرایا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کئی باتیں لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ جن لوگوں نے امام احمد کی آزمائش کا ذکر کیا ہے، ان میں کسی نے بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ رویت باری کے بارے میں امام احمد سے سوال و جواب ہوا۔ دوسرے قیس بن حازم کو ناقابلِ اعتبار کہنا صحیح نہیں ہے۔ ان کا شمار ممتاز تابعین میں ہوتا ہے۔ تمام ائمہ حدیث ان کی وثاقت پر متفق ہیں اور ان سے روایت کرتے ہیں۔ خود ابن مدینی ؒ نے بھی ان سے متعدد روایتیں کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابن مدینی ؒ جس راوی سے خود روایت کرتے ہوں اس کو وہ ناقابلِ اعتبار ٹھہرائیں، یہ کیسے ممکن ہے؟

پھر انہوں نے لکھا ہے کہ اگر بفرض محال یہ بات صحیح ہو کہ اس موضوع پر معتصم کے سامنے مناظرہ ہوا تو بھی یہ بات قطعی غلط ہے کہ ابن مدینی ؒ نے مذکورہ روایت کے راوی قیس بن حازم کو قابلِ ترک قرار دیا ہو۔ یہ بھی ابن ابی داؤد کی چال تھی کہ اس نے خود اپنی طبیعت سے ایک اعتراض پیدا کیا اور اس کو ابن مدینی کی طرف منسوب کردیا[۱]۔

ممکن ہے کہ یہ واقعہ اس صورت میں صحیح نہ ہو، مگر اتنی بات یقینی ہے کہ ابن مدینی ؒ سے مسئلہ خلقِ قرآن کے بارے میں لغزش ہوئی اور انہوں نے امام احمد ؒ کی رائے کے خلاف رائے دی۔ جس کی وجہ سے معتصم کی پوزیشن مضبوط ہوگئی اور اس میں وہ تنہا نہیں تھے بلکہ بہت سے اور بھی علماء شریک تھے یہ اور بات ہے کہ یہ لغزش ان سے حبس و ضرب اور دار و رسن کے خوف سے ہوئی۔ خود ابن مدینی ؒ کو اس غلطی کا زندگی بھر افسوس رہا۔ کسی نے ان سے کہا کہ احمد کے مقابلہ میں اب آپ کی روایت کو اہل علم وقعت نہیں دیتے تو نہایت ہی شرمساری کے ساتھ بولے کہ ہاں ! ایسا تو ہونا ہی چاہئے۔ امام احمد ؒ تو کوڑوں شدید مار سہار لے گئے، میں تو ایک کوڑا بھی نہیں برداشت کرسکتا[۲]۔

محمد بن عبداللہ ؒ موصلی کا بیان ہے کہ علی بن مدینی ؒ جہمیت کے عقائد کی ہمیشہ تردید کیا کرتے تھے۔ مگر جب انہوں نے ابتلاء کے زمانے میں اپنی پہلی رائے کے خلاف رائے دی تو میں نے ان کو

۱؎ تاریخ بغداد جلد ۱۱۔ ص ۶۶　　۲؎ تہذیب التہذیب جلد ۷۔ ص ۳۵۷

ایک خط لکھا۔ اس میں ان کو خدا کا واسطہ دے کر لکھا کہ آپ نے اس سے پہلے جن خیالات کی تردید کی تھی، آج ان ہی تائید کر رہے ہیں۔

جب خط ان کو ملا تو رو پڑے اور بڑے افسوس کے لہجہ میں کہا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محض قتل کے خوف سے لکھا ہے، ورنہ میرا دل اس رائے سے بالکل ابا کرتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کمزور آدمی ہوں۔ اگر مجھ کو ایک کوڑا بھی لگتا تو میں جان بر نہیں ہو سکتا تھا[1]۔

جس وقت یہ ابتلائے عام پیش آیا، اس وقت ظاہری طور پر امام احمد کا ساتھ آخر وقت تک کسی نے نہ دیا، مگر چونکہ رائے یہی صحیح تھی اس لئے ہر خاص و عام کے دل میں ان کی رائے کی وقعت تھی اور جن لوگوں نے ان کے خلاف رائے دی وہ ان کی نگاہوں سے گر گئے تھے۔

حدیث کے بارے میں ابن مدینی کی شخصیت کے مسلّم ہونے میں کیا شبہ ہے مگر مسئلہ خلق قرآن میں امام احمدؒ کی رائے سے اختلاف کی بناء پر عام ائمہ حدیث کی نظروں میں وہ اتنا گر گئے کہ ان کی روایت کے قبول کرنے میں لوگ پس و پیش کرنے لگے تھے، حتیٰ کہ بعض نے تو ان کے بارے میں بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے ان کی تصانیف کی طرف کوئی اعتنا نہیں کیا اور اکثر تصانیف ہونے کے باوجود ان کی کوئی تحریری یادگاریں موجود نہیں رہی، مگر بہر حال یہ بات صحیح نہیں ہے کہ ان کی ایک لغزش کی وجہ سے جس پر ان کو ندامت اور شرمندگی بھی تھی، یہ رائے قائم کی جائے کہ ان کی تمام روایتیں ضعیف تھیں۔

حضرت ابو جعفرؒ کہتے ہیں کہ ان کا رجحان ابن ابی داؤد اور جہمیت کی طرف ہو گیا تھا۔ مگر ان کی مرویات نہایت ہی درست ہیں[2]۔

امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ابن مدینیؒ کے مناقب و فضائل بہت زیادہ ہیں۔ کاش وہ اس فتنہ میں مبتلاء نہ ہوئے ہوتے[3]۔ اگرچہ اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی۔ اس لئے انہوں نے بعد میں اس پر اپنی ندامت کا اظہار کیا اور جن خیالات کا وہ پہلے اظہار کر چکے تھے، ان سے رجوع بھی کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ خلقِ قرآن کے قائلین تکفیر کرنے لگے تھے[4]۔

وہ برسرِ منبر کہتے تھے کہ کلام اللہ مخلوق نہیں ہے۔ حضرت عمرو بن علی ان پر بہت سخت تنقید کرتے تھے۔ یحییٰ بن معین کو معلوم ہوا تو وہ اس پر بہت خفا ہوئے اور فرمایا کہ ان کو مرتد یا فاسق بنانا انتہائی غلط بات ہے۔ محض جان کے خوف کی وجہ سے مسئلہ خلقِ قرآن میں ان سے چوک ہو گئی۔

۱؎ ایضاً۔ ص ۴۵۵ ۲؎ تہذیب التہذیب جلد ۷۔ ص ۳۷۶ ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً۔ ص ۳۵۶

علامہ ابن اخرمؒ نے اپنی مجلس میں ایک دن ابن مدینیؒ کی تعریف کی۔ اس پر کسی نے کہا کہ عمرو بن علی تو ان پر جرح کرتے ہیں۔ ابن اخرم نے عمرو کو بہت سخت سست کہا[1]۔

ان کے علاوہ امام بخاریؒ، ابن حبانؒ اور دوسرے تمام ائمہ حدیث نے ان کی توثیق کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ہی آئمہ پر جراح وتعدیل کا دارومدار ہے۔ انہوں نے جب ان کی توثیق کر دی تو ان روایت کے بارے میں ضعف کا شبہہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

وفات :

ان کے سنہ وفات اور مقام اور وفات دونوں میں اختلاف ہے۔ سنہ وفات کسی نے ۲۳۲ھ کسی نے ۲۳۵ھ اور کسی نے ۲۳۸ھ لکھا ہے۔ مگر خطیب بغدادی نے ۲۳۴ھ کو صحیح قرار دیا ہے۔ بعض اہل تذکرہ نے لکھا ہے کہ ان کا انتقال بصرہ ہی میں ہوا مگر خطیب بغدادی اور ابن ندیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال سامرا میں ہوا اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے[2]۔

۱۔ ایضاً ۲۔ خطیب بغدادی جلد ۱۱۔ ص ۴۷۲۔۴۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت امام لیث بن سعدؒ

امام لیث بن سعدؒ ممتاز تبع تابعین میں ہیں۔ جن کی مجلس درس میں بڑے بڑے آئمہ نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ امام شافعیؒ نے ان کا زمانہ پایا تھا۔ مگر کسی وجہ سے اکتساب فیض نہ کر سکے، جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا۔ ان کے مجتہدات اور مسائل فقہ مدون کئے گئے ہوتے تو ان کا شمار آئمہ مجتہدین میں ہوتا۔ اسی بنا پر امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ ان کے تلامذہ نے ان کو ضائع کر دیا[1]۔ یعنی ان کے افادات کو انہوں نے مدون نہیں کیا کہ ان کی امامت وجلالت کا صحیح اندازہ بعد کے لوگوں کو ہو سکے۔

علم وفضل، تفقہ فی الدین، فیاضی وسیر چشمی اور تواضع و مدارات ان کے سوانح حیات کی جلی سرخیاں ہیں۔

خاندان :

آبائی وطن اصفہان تھا۔ مگر ان کا خانوادہ کسی جنگ میں قبیلہ قیس کی ایک شاخ فہم کا غلام ہو گیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے آبائی وطن چھوڑ کر ان کو مصر متوطن ہونا پڑا۔ ان کے خاندان کے بزرگوں نے ان کی پیدائش سے پہلے اصفہان کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر لیث بن سعد کے دل میں اصفہان کی محبت ہمیشہ باقی رہی۔ لوگوں سے کہتے تھے کہ اصفہان کے رہنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو[2]۔

نام ونسب :

لیث نام ہے۔ ابوالحرث کنیت تھی۔ والد کا نام سعد اور دادا کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ ان کے والد اور دادا کے نام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غلام خاندان قدیم الاسلام تھا۔ مصر کے قریب ایک بستی قرقشندہ میں ان کا خانوادہ آباد تھا اور یہیں ان کی ولادت ہوئی۔ یہ بستی مصر کے اس سرسبز وشاداب مقام پر واقع تھی جس کو ریف مصر کہا جاتا ہے[3]۔

---

[1] بعض تذکروں میں ان کو کنانہ کا غلام لکھا ہے۔ مگر ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بنو کنانہ کا تعلق بھی بنو قیس ہی سے تھا۔ الرحمۃ الغیثیہ۔ ص ۳ [2] ایضا [3] ریف عربی میں سرسبز وشاداب مقام کو کہتے ہیں۔ اس مقام کو ریف مصر اس وجہ سے کہتے تھے کہ یہ اپنی سرسبزی وشادابی میں پورے ملک میں ممتاز تھا۔

یاقوت نے لکھا ہے کہ اس بستی میں حضرت لیثؒ کا ایک مکان تھا۔ جس کو ان کے چچازاد بھائی ابن رفاعہ نے دشمنی کی وجہ سے دوبارہ گرادیا تھا، مگر امام نے تیسری بار پھر اسے تعمیر کرایا۔ یہ ابن رفاعہ اس وقت مصر کا امیر تھا۔ ابن رفاعہ کو امام لیثؒ سے کیوں اس قدر عناد تھا کہ اس نے آپ کا مکان تک گرادیا، اس کی کوئی وجہ ارباب تذکرہ نہیں لکھتے، مگر قرائن سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے۔

ان کے بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ غلّہ کی پیداور سے لیث بن سعد کو ۲۵ ہزار سے ۴۰، ۵۰ درہم سالانہ آمدنی ہوجایا کرتی تھی[۱]۔

اگرچہ اس کی تصریح نہیں ملتی کہ یہ جائیداد جس سے اتنی کثیر آمدنی ہوئی تھی کہاں پر تھی۔ مگر غالب گمان یہ ہے یہ قرشندہ ہی میں ہوگی۔ اس لئے کثیر پیداوار یہیں ہوتی تھی۔ اس لئے ممکن ہے کہ لالچ کی وجہ سے ابن رفاعہ نے یہ کوشش کی ہو کہ اگر ان کی بود وباش یہاں نہ رہے گی تو اس جائیداد پر اس کو تصرف کا حق ملک مل جائے گا۔

دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ منصور نے لیث بن سعد کے سامنے مصر کی امارت (گورنری) پیش کی تھی، مگر انہوں نے انکار کردیا۔ ممکن ہے ابن رفاعہ نے اسی وجہ سے ان کو پریشان کیا ہو کہ منصور کی ناراضگی کا اثر اس کے اقتدار پر نہ پڑے۔ اس آبائی مکان اور جائیداد کے علاوہ بھی امام لیث بن سعدؒ نے ایک مکان اور مسجد مصر میں تعمیر کرائی تھی۔ یہ مکان و مسجد جس جگہ پر واقع تھے، اس کو ''زقاق لیث'' (کوچۂ لیث) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا[۲]۔

سنہ ولادت :

امام لیث بن سعدؒ کے سنہ ولادت میں تھوڑا سا اختلاف ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ ان کی ولادت ۸۴ھ میں ہوئی۔ خود فرماتے تھے کہ میرے خاندان کے بعض لوگوں کا بیان ہے کہ میں ۸۲ھ میں پیدا ہوا، لیکن صحیح یہ ہے کہ میری ولادت ۸۴ھ میں ہوئی، اس لئے کہ جس وقت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا انتقال ہوا میں ۷ برس کا تھا اور یہ معلوم ہے حضرت عمر عبدالعزیزؒ کا انتقال ۱۰۱ھ میں ہوا[۳]۔

تعلیم وتربیت :

ان کی ابتدائی تعلیم اور تربیت کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں مگر ان کو نحو وادب اور شعر وسخن سے بھی دلچسپی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے عام دستور کے مطابق ان کی

---

۲ تاریخ بغداد جلد ۳۔ ص ۱۱ — صفوۃ الصفوۃ جلد ۴۔ ص ۲۸۵ — ۳ معجم البلدان جلد ۷۔ ص ۵۸

۳ الرحمۃ الغیثیہ۔ ص ۳

ابتدائی تعلیم ان ہی علوم سے شروع ہوئی، مگر بعد میں ان پر فقہ وحدیث کا اتنا غلبہ ہوا کہ ان کے صحیفۂ زندگی کے اصل عنوان یہی علوم بن گئے اور دوسرے علوم ان میں گم ہو گئے۔

سن شعور کو پہنچتے ہی انہوں نے حدیث وفقہ کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے اپنے وطن مصر کے مشائخ فقہ وحدیث سے استفادہ کیا۔ پھر اسلامی ممالک کے دوسرے مقامات کا سفر کر کے تمام معروف ومشہور اساتذہ سے مستفیض ہوئے۔ ان کے اساتذہ میں پچاس (۵۰) سے زیادہ کبار تابعین ہیں۔

حضرت نافعؒ کی خدمت میں :

مشہور تابعی حضرت نافع جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے خاص تربیت یافتہ تھے، لیث بن سعدؒ کے زمانہ میں مجمع خلائق تھے۔ یہ ان کی خدمت میں بھی پہنچے۔ حضرت نافع نے ان کا نام ونسب اور وطن پوچھا۔ جب یہ بتا چکے تو عمر دریافت کی، کہا بیس برس۔ فرمایا، مگر ڈاڑھی سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری عمر چالیس (۴۰) سال سے کم نہ ہوگی[1]۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ میں نے لیث بن سعدؒ کا ایک مرتب کردہ حدیث کا ایک مجموعہ دیکھا تھا، جس میں انہوں نے سو کے قریب حدیثیں صرف حضرت نافع کی روایت سے جمع کی تھیں۔

حضرت نافع مولی ابن عمر کے علاوہ ان کے چند تابعی شیوخ کے نام یہ ہیں :

امام زہری، سعید المقبری، عبداللہ بن ابی ملکیہ، یحییٰ الانصاری وغیرہ۔

ان کے علاوہ بے شمار اتباع تابعین سے بھی فیض حاصل کیا۔ امام نووی ان کے چند ممتاز شیوخ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں

وخلائق لا یحصون من الائمة [2]۔

"ان کے علاوہ اتنے آئمہ سے انہوں نے استفادہ کیا ہے کہ ان کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے"۔

امام زہریؒ سے سماع :

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کو امام زہریؒ سے بھی سماع حدیث حاصل ہے[3]۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ امام زہری کے علم وفضل سے انہوں نے فائدہ ضرور حاصل کیا تھا، لیکن یہ

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ ص ۴ [2] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۴۷ [3] بغدادی نے لکھا ہے کہ یہ ۱۱۳ھ میں حج کے لئے گئے تھے۔ اسی سال مکہ میں امام زہری سے انہوں نے سماع کیا تھا۔ حافظ ابن حجر نے بھی تہذیب میں یہی لکھا ہے۔ مگر الرحمۃ الغیثیہ میں اس کے خلاف ایک روایت نقل کی ہے۔ ابن خلکان نے ان سے استفادہ کا تو ذکر کیا ہے، مگر سماع کا نہیں۔

استفادہ بالواسطہ تھا، بالمشافہ نہیں تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ امام لیثؒ امام زہریؒ کی روایتیں کبھی ایک، کبھی دو اور تین اور اس سے زائد واسطوں سے روایت کرتے ہیں۔ خود امام لیثؒ کا یہ قول متعدد تذکروں میں منقول ہے:

كتبت من علم الزهري كثيرًا (يعني عن غيره) فاردت ان اركب البريد اليه الى الرصافة فخفت ان لا يكون ذالك الله فتركت ذالك (يعني فصار يروى عنه بالواسطة) (الرحمة الغيثية . ص ۴)

"میں نے زہری کی روایتوں کی ایک کثیر مقدار لکھ لی تھی (یعنی غیروں کے واسطے سے) پھر میں نے ارادہ کیا کہ رصافہ جا کر ان سے بالمشافہ روایت کروں مگر اس خوف سے باز آیا کہ ممکن ہے کہ میرا یہ عمل اللہ کی رضا کے لئے نہ ہو (مقصد یہ ہے کہ پھر وہ بالواسطہ ہی روایت کرتے رہے)"۔

فضل وکمال:

امام لیث بن سعدؒ اپنی فطری صلاحیت اور غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے آغاز شباب میں تابعین اور تبع تابعین دونوں کے علوم کے جامع بن گئے اور ہر طرف ان کے علم وفضل کا چرچا شروع ہو گیا۔ خود ان کے شیوخ تک ان کے فضل وکمال کا اعتراف کرتے تھے [۱]۔

حضرت شرحبیل بن زیدؒ کا بیان ہے کہ میں ممتاز اور معمر آئمہ حدیث کو دیکھا ہے کہ وہ امام لیث کے علم وفضل کا اعتراف کرتے تھے اور ان کو آگے بڑھاتے تھے، حالانکہ ابھی بالکل نوجوان تھے۔ حضرت یحییٰ بن سعید ان کے شیوخ میں ہیں۔ انہوں نے کسی بات سے ان کو ٹوکا اور پھر فرمایا کہ تم امام وقت ہو جس کی طرف نظریں اٹھتی ہیں [۲]۔

امام شافعیؒ نے ان کا زمانہ پایا تھا مگر ان سے استفادہ نہ کر سکے تھے، جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا۔ فرماتے تھے، مجھے امام لیث بن سعدؒ اور ابن ابی ذیبؒ کے علاوہ کسی سے نہ ملنے کا افسوس نہیں ہے [۳]۔

مشہور محدث عبداللہ بن وہب فرماتے تھے کہ اگر امام لیث اور امام مالک نہ ہوتے تو میں گمراہ ہو جاتا۔ ابو اسحاق شیرازی نے لکھا ہے کہ مصر میں تابعین کا علم لیث پر ختم ہو گیا۔ امام ابن حبان کا قول ہے کہ علم وفضل، تفقہ اور قوت حافظہ میں اپنے زمانہ کے ممتاز لوگوں میں تھے [۴]۔

۱۔ ابن خلکان نے اردت کے بجائے طلب کا لفظ لکھا ہے۔ جس کا مفہوم بھی یہی ہے۔ ۲۔ الرحمۃ الغیثیہ ص ۵

۳۔ ایضاً ص ۲ ۴۔ ایضاً

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ ان کی امامت و جلالت شان اور حدیث و فقہ میں ان کی بلندی مرتبت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ اپنے زمانہ میں مصر کے امام تھے[1]۔ یعقوب بن داؤد مہدی کا وزیر تھا، اس کا بیان ہے کہ جب لیث بن سعدؒ عراق آئے تو مہدی نے کہا کہ اس شیخ کی صحبت اختیار کرو۔ اس وقت ان سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ میں نے اختلاف آئمہ پر نظر ڈالی تو بجز ایک مسئلہ کے لیث بن سعد کو کسی دوسرے مسئلہ میں صحابہ و تابعین سے الگ نہیں پایا۔ وہ مسئلہ جس میں وہ منفرد تھے، وہ یہ ہے کہ وہ مری ہوئی ٹڈی کھانا حلال نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اس کی تحریم کا کوئی قائل نہیں۔ (الرحمۃ الغیثیہ۔ ص۹)

حدیث :

علم حدیث میں ان کی حیثیت مسلّم ہے۔ حدیث کی کوئی متداول کتاب نہیں ملے گی جس میں امام لیث بن سعد کی مرویات نہ موجود ہوں۔ ان سے سماع حدیث کو بڑے بڑے آئمہ اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے مگر اس کے باوجود روایت حدیث میں حد درجہ محتاط تھے۔ ابوالزبیر ان کے مشائخ حدیث میں تھے۔ مگر وہ جن روایتوں میں تدلیس کرتے تھے[2]۔ ان روایتوں کی تحدیث کو امام لیث ترک کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے محدثین نے لکھا ہے کہ ابوالزبیر کی وہ مرویات جو امام لیث سے مروی ہیں بہت زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔ غیر معمولی ذہانت اور قوت حافظہ کے باوجود تحدیث روایت میں کسی پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔

حتیٰ کہ جو روایتیں ان کے یہاں لکھی ہوتی تھیں، انہیں بھی خود اپنی زبان سے روایت کرتے تھے[3]۔

بہت سے محدثین کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی مرویات کی دوسروں کے ذریعہ تحدیث کراتے تھے۔ ان کے صاحبزادے شعیب کا بیان ہے کہ ایک بار تلامذہ نے ان سے پوچھا کہ آپ بسا اوقات ایسی روایتیں بھی کر دیتے ہیں جو آپ کے مرتب کردہ مجموعوں میں نہیں ہیں؟ فرمایا کہ جو کچھ میرے سینے میں محفوظ ہے وہ سب اگر سفینوں میں منتقل کر دیا جاتا تو ایک سواری کا بوجھ ہو جاتا[4]۔

حدیث کی روایت اور اس کی حفاظت میں جو درک ان کو حاصل تھا، اس کا اعتراف تمام ممتاز اہلِ علم اور آئمہ جرح و تعدیل نے کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے کہ لیث کثیر العلم اور صحیح

---

[1] تہذیب الاسماء جلد ۲۔ ص ۷۴
[2] تدلیس فن حدیث کی ایک اصطلاح ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ راوی بیچ کے آدمی کا تذکرہ چھوڑ دے اور اوپر کے راوی کا نام لے۔ اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ اس نے اوپر کے راوی سے براہ راست روایت کی ہے۔
[3] الرحمۃ الغیثیہ۔ ص ۴
[4] تہذیب التہذیب جلد ۸۔ ص ۴۶۳

الحدیث تھے۔ابوداؤد کا بیان ہے کہ میں نے امام احمد سے سنا ہے،وہ فرماتے تھے کہ مصر میں صحیح احادیث کی روایت اور ان کے حفظ واتقان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔اس مرتبہ میں عمرو بن حارث ان سے کچھ قریب تھے۔کسی نے ان سے کہا کہ فلاں نے ان کی تضعیف کی ہے۔فرمایا کہ میں نہیں جانتا۔ جرح وتعدیل کے امام یحییٰ بن معین ان کو ثقہ کہتے تھے۔کسی نے ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ لیث اور ابن ابی ذہب میں کس کو حدیث کا محافظ پاتے ہیں۔فرمایا دونوں کو۔ پھر کہا کہ یزید بن حبیب کی مرویات میں ان کا درجہ محمد بن اسحاق سے بلند ہے۔

ایک شخص نے ابن معین سے پوچھا کہ حضرت نافع ؒ سے جو احادیث انہوں نے روایت کی ہیں،ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟فرمایا نہایت ہی صالح اور قابلِ وثوق ہیں۔ابن المدینیؒ کا قول ہے کہ لیث ثقہ اور قابلِ اعتماد تھے۔اسی طرح عجلی،نسائی،ابوزرعہ،یعقوب بن ابی شیبہ جیسے آئمہ نے ان کی توثیق کی ہے۔آئمہ جرح وتعدیل جب کسی محدث یا امام کی توثیق یا تجریح کرتے ہیں تو اس وقت عموماً ان کے پیشِ نظر نہ ان کی امامت وجلالت ہوتی ہے اور نہ جذبہ، بلکہ ان کے سامنے روایت ودرایت کے وہ اصول ہوتے ہیں جن کو انہوں نے کتاب وسنت سے اخذ کر کے تحدیث وروایت کی اساس قرار دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات بڑے بڑے آئمہ کی مرویات پر ان کو جرح کرنا اور ان کو رد کرنا پڑتا ہے اور بہت سے کم درجہ محدث کی روایتوں کو قبول کر لینا اور ان کی توثیق کرنی پڑتی ہے۔اس لئے علم حدیث میں کسی امام محدث کے درجہ کی تعین کرنے میں ان کے اقوال وآراء سے بڑی مدد ملتی ہے اور ان کی روشنی میں ان کے علم وفضل کے خط وخال بھی بخوبی نمایاں ہوجاتے ہیں۔اسی وجہ سے جن آئمہ نے حدیث کی تدوین وتربیت اور اس کی حفاظت میں حصہ لیا ہے،ان کے سوانح حیات میں آئمہ جرح وتعدیل کے اقوال کو بڑی اہمیت حاصل ہے،اسی ضرورت کے پیشِ نظر یہ نقل کئے گئے۔

فقہ :

علم فقہ ایک مخصوص فن بن گیا ہے۔مگر دوسری صدی کے نصف تک یہ کوئی مرتب ومدون فن نہیں تھا اور نہ تو مختلف حلقے اور مدارس فقہ قائم ہوئے تھے۔بلکہ جن ارباب علم میں ملکۂ اجتہاد تھا وہ ضرورت کے مطابق کتاب وسنت سے اجتہاد کرتے تھے۔قریب قریب ہر اسلامی ملک میں دو چار ایسے آئمہ مجتہدین موجود تھے،جو حالات وضرورت کے مطابق پیش آمدہ مسائل کا جواب دیا کرتے تھے۔ جس شخص کو امام پر اعتماد تھا،وہ ان کے مجتہدات پر عمل کرتا تھا۔امام لیث ابن سعدؒ کے زمانہ میں ایک

---

۱ الرحمۃ الغیثیہ۔ص ۴　۲ تہذیب التہذیب۔جلد ۸۔ص ۴۶۳

طرف عراق اور شام میں امام اوزاعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے مجتہدات کا چرچا تھا تو دوسری طرف حجاز میں امام مالک کے تفقہ واجتہاد کا غلغلہ تھا۔ ابھی مصر کی سرزمین میں کوئی ممتاز مجتہد نہیں پیدا ہوا تھا۔ امام لیث بن سعدؒ کے وجود سے یہ کمی پوری ہوگئی۔ ان میں پورا ملکۂ اجتہاد موجود تھا اور انہوں نے نہ جانے کتنے مسائل قرآن وسنت سے مستنبط بھی کیے، مگر افسوس ہے کہ دوسرے آئمہ کی طرح ان کے استنباطات اور مجتہدات مدون ومرتب نہیں ہوسکے، جس کی وجہ سے نہ تو ان کو شہرت ہی ہوسکی اور نہ ان کے فقہ واجتہاد کا عام چرچا ہی ہوسکا۔ تفقہ واجتہاد میں ان کا جو مرتبہ تھا، اس کا اندازہ آئمہ محدثین کے اقوال سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ لیث بن سعد امام مالک سے زیادہ آثار واحادیث کے لئے (تفقہ کے اعتبار سے) نافع تھے۔ ان ہی کا قول ہے کہ

اللیث افقه من مالک الا ان اصحابه ضیعه .

"لیث امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے، لیکن ان کے تلامذہ نے ان کو ضائع کردیا"۔

اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :

یعنی لم یلو نوفقهه کما دو نوا فقه مالک [1]

"جس طرح امام مالک کی فقہ کی تدوین کی گئی اس طرح لیث کے شاگردوں نے ان کی فقہ کی نہیں کی"۔

حضرت یحیٰ بن بکیرؒ کہا کرتے تھے کہ حضرت لیث امام مالکؒ سے افقہ تھے، (مگر شہرت وعظمت) ان کے حصہ میں آئی۔ مشہور محدث ابن وہبؒ کا بیان ہے کہ حضرت لیث کے مستنبط مسائل ان کی مجلس میں پیش کیے گئے تو ایک دن ایک مسئلہ پر حاضرین نے بڑی تحسین کی اور کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیث امام مالک سے سن کر جواب دے دیتے ہیں۔ اس پر ابن وہب بولے یہ نہ کہو، بلکہ یہ کہو امام مالکؒ لیثؒ سے سن کر جواب دے دیتے ہیں۔ میں بخدا کہتا ہوں کہ میں حضرت لیث سے زیادہ فقیہ نہیں دیکھا۔

یہ ابن وہبؒ امام مالکؒ کے خاص تلامذہ میں ہیں۔ اس لئے ان کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی تفقہ واجتہاد کی وجہ سے منصور خلیفۂ عباسی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ مصر میں قضاء کا تقرر بغیر ان کی مرضی سے نہیں ہوتا تھا۔ منصور نے یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ مصر کی امارت قبول کرلیں، مگر انہوں نے اس سے انکار کیا۔ بعض تذکروں میں ہے کہ یہ مصر کے قاضی بنادیئے گئے تھے۔ مگر بعض قرائن کی بنا پر یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کمال فقہ کے باوجود جب ان کو کوئی مسئلہ نہیں معلوم ہوتا تھا، وہ دوسرے

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ۔ ص۹

اہلِ علم سے دریافت کرنے میں تکلف محسوس نہیں کرتے تھے۔ایک بار یحییٰ بن ایوب ؒ ادھر سے گزر رہے تھے۔ان کو روکا اور کسی مسئلہ کے بارے میں ان سے دریافت کیا وہ جواب دے کر واپس چلے گئے گھر پہنچ کر انہوں نے اس احسان کا بدلہ یہ چکایا کہ ایک ہزار دینار ان کو ہدیۃً بھیج دیئے۔

(الرحمۃ الغیثیہ ۔ص ۵)

دوسرے علوم :

حدیث وفقہ کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی انہیں دستگاہ تھی۔یحییٰ بن بکیر ؒ کا قول ہے کہ میں نے امام لیث ؒ سے زیادہ جامع آدمی نہیں دیکھا، وہ مجسم فقیہ تھے۔ان کی زبان خالص عربی تھی۔قرآن نہایت ہی اچھا پڑھتے تھے۔نحو میں بھی درک تھا اور اشعارِ عرب اور حدیث کے حافظ تھے۔بات چیت بھی عمدہ کرتے تھے[1]۔یہی قول امام نووی نے امام احمد بن حنبل ؒ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ان کی یہ جامعیت صرف علم وفن ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ دوسرے اوصاف کے بھی وہ جامع تھے۔

روزمرّہ کے عام معمولات :

ان کی اسی جامعیت کی وجہ سے ہر طبقہ اور ہر زمرہ کے لوگ ان کی خدمت میں آتے اور اپنی ضرورت پوری کرتے تھے۔حکومت کے ذمہ دار اور اہلِ علم سے لے کر عوام تک اس میں شامل تھے۔روزانہ ان کی چار مجلسیں ہوتی تھیں۔ایک مجلس حکومت وارکانِ حکومت کی ضروریات کے لئے مخصوص ہوتی تھی، دوسری مجلس میں وہ تشنگانِ حدیثِ نبوی کی پیاس بجھاتے تھے تیسری مجلس ان لوگوں کے لئے ہوتی تھی جو فقہ ومسائل دریافت کرنے آتے تھے اور چوتھی مجلس عام لوگوں کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ان مجلسوں میں ان کا سلوک نہایت ہی فیاضانہ ہوتا تھا۔نہ تو افادہ وتعلیم میں کسی کی دل شکنی کرتے تھے اور نہ اہلِ حدیث کی حاجت روائی میں دل گیر ہوتے تھے۔بلکہ راوی کا بیان ہے کہ

لا یسئله احد فیرده صغرت حاجة او کبرت [2]۔

''یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص سوال کرے اور وہ اسے رد کر دیں، خواہ اس کی ضرورت چھوٹی ہو یا بڑی''۔

تلامذہ :

اُوپر ذکر آ چکا ہے کہ وہ عنفوانِ شباب ہی میں اہلِ علم کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔اس وقت سے لے کر وفات تک وہ مصر ہی میں رہے۔پوری عمر میں مشکل سے دو تین بار وہ مصر سے باہر گئے تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول۔ص ۲۰۴ [2] الرحمۃ الغیثیہ۔ص ۹

اس پوری مدت میں جو کم از کم ۵۰، ۶۰ برس ہوتی ہے وہ اپنے اوقات کا نصف حصہ تعلیم وافادہ تحدیث روایت اور تفریع مسائل میں صرف کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی لمبی مدت میں ان سے ہزاروں آدمیوں نے اکتساب فیض کیا ہوگا۔ ان تمام مستفیدین اور تلامذہ کا استقصا تو ناممکن ہے، چند ممتاز فیض یافتگان درس کے نام یہاں درج کیے جاتے ہیں :

حضرت شعیب[۱]، محمد بن عجلان، ہشام بن سعد (یہ دونوں بزرگ ان کے شیوخ میں تھے)، ابن علیہ، ہشیم بن بشیر، قیس بن الربیع، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن وہب، ابوالولید بن مسلم، ابوسلمۃ الخزاعی، عبداللہ ابن الحکم، سعید بن سلیمان، آدم بن ایاس، عبداللہ بن یزید المقری، عمرو بن خالد، عیسیٰ بن حماد رحمہم اللہ وغیرہ۔ حافظ ابن حجرؒ نے تقریباً ۵۰ تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر طوالت کے خیال سے ان کا نام یہاں درج نہیں کیا گیا ہے۔

سیرت وکردار :

ان کے صحیفۂ زندگی کا یہ باب نہایت ہی روشن ہے۔ وہ اپنے اخلاق و اوصاف اور سیرت وکردار میں اسلامی زندگی کا نمونہ تھے۔ ابن مریم فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ جامع اوصاف آدمی نہیں دیکھا۔ ہر وہ عادت وخوبی جس سے خدا کا قرب حاصل ہوسکتا ہو، وہ ان میں موجود تھی[۲]۔ ابن وہب کا بیان ہے کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے ان سب کو وہ اپنی زندگی میں برتتے تھے۔ (بغدادی۔ جلد ۱۳۔ ص ۷)

ایک بار مصر کا ایک قافلہ امام مالکؒ کی خدمت میں گیا۔ انہوں نے ملنے سے کچھ تاخیر کی۔ یہ لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کسی نے کہا کہ یہ اخلاق میں ہمارے امام کی طرح نہیں۔ امام مالکؒ نے یہ بات سنی تو ان کو فوراً اندر بلالیا اور پوچھا تمہارے امام کون ہیں؟ لوگوں نے کہا امام لیث بن سعدؒ۔ فرمایا: مجھے ان کے ساتھ تشبیہ نہ دو۔ پھر ان کے کچھ اخلاقی اوصاف بیان کیے[۳]۔

ایک بار بعض تاجروں نے ان سے کچھ پھل خریدے، خریداری کے بعد ان کو پھل گراں محسوس ہوئے اس لئے آپ سے پھل واپس کرلینے کی خواہش کی۔ آپ نے پھل واپس کرلئے۔ جب معاملہ ہوگیا تو روپے کی تھیلی مانگی اور اس میں سے پچاس دینار نکال کر تاجروں کو ہدیۃً دیئے۔ ان کے صاحبزادے بھی اس موقع پر موجود تھے۔ ان کو یہ برا معلوم ہوا اور انہوں نے حضرت لیثؒ سے اس کا اظہار بھی کیا، مگر آپ نے فرمایا: خدا تمہیں معاف کرے۔ یہ پھل فائدے ہی کی امید

---

۱ تہذیب۔ یہ ان کے صاحبزادے تھے۔ ۲ الرحمۃ الغیثیہ۔ ص ۷ ۳ صفوۃ الصفوۃ، جلد ۴۔ ص ۲۸۲

اور غرض سے تو خریدا تھا۔ مگر جب ان کو فائدہ محسوس نہیں ہوا تو انہوں نے واپس کرنے کے بعد ان کے فائدے کی امید بھی ختم ہوگئی، تو میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کی اس امید وتوقع کا کچھ تو بدلہ دے دوں [۱]۔

سخاوت :

سخاوت وفیاضی گویا ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ وہ اپنی دولت مستحقین پر بے دریغ صرف کرتے تھے۔ لوگوں کو پیسہ جمع کرنے میں لطف آتا ہے اور ان کو اس کے خرچ کرنے میں لذت محسوس ہوتی تھی۔ ابن جوزی کا بیان ہے کہ صرف غلہ سے ان کو ۵۰ ہزار دینار سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ تجارت کا کاروبار بھی تھا۔ ان کے تمام سوانح نگار لکھتے ہیں، ان کی سالانہ آمدنی ۷۰، ۸۰ ہزار دینار تھی، مگر اس پوری آمدنی پر کبھی زکوٰۃ دینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ پوری آمدنی فقراء، ومساکین اور مستحق اہلِ علم پر خرچ ہو جاتی تھی۔ خود فرماتے تھے کہ میں جب سے بالغ ہوا ہوں، مجھ پر ایک درہم بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی [۲]۔ کسی سال آمدنی کم ہوتی تو قرض کی نوبت آجاتی تھی۔

جب تک زندہ رہے سو دینار سالانہ مستقل طور سے امام مالکؒ کے پاس بھیجتے تھے۔ ایک بار امام مالکؒ نے انہیں لکھا کہ مجھ پر کچھ قرض ہوگیا ہے۔ فوراً سو دینار ان کے یہاں بھجوا دیئے۔ ایک بار امام مالکؒ نے ان سے تھوڑی سی مصفر (زرد رنگ کی گھاس) لڑکوں کے کپڑے رنگنے کے لئے مانگی (غالباً یہ مصر کی خاص پیداوار تھی)۔ انہوں نے اتنی مقدار میں بھیجی کہ امام مالکؒ کا بیان ہے کہ ہم نے اپنے گھر کے بچوں کے کپڑے رنگے، پڑوسیوں نے استعمال کی، پھر بھی اتنی بچ گئی کہ ایک ہزار دینار میں اسے فروخت کیا گیا [۳]۔

امام لیث بن سعد ۱۱۳ھ میں حج کو گئے تھے۔ حج سے فارغ ہو کر زیارت نبوی ﷺ کی غرض سے مدینہ تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچے تو امام مالکؒ نے عمدہ کھجوروں کا ایک طشت ان کے پاس ہدیہ بھیجا۔ انہوں نے اس طشت میں ایک ہزار دینار رکھ کر واپس کیا [۴]۔

ابن لہیعہ مشہور محدث ہیں۔ اتفاقاً ان کے گھر میں آگ لگ گئی اور سارا اثاثہ جل گیا۔ حضرت لیث بن سعدؒ کو اطلاع ہوئی تو ایک ہزار دینار بطور اعانت ان کے پاس بھیج دیئے۔

---

۱ صفوۃ الصفوۃ جلد ۴۔ ص ۲۸۲ ۲ تاریخ بغداد جلد ۱۳۔ ص ۱۳ وصفوۃ الصفوۃ والرحمۃ الغیثیہ وغیرہ

۳ الرحمۃ الغیثیہ ص ۵ خطیب نے اس واقعہ کے بیان میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔

۴ تہذیب الاسماء جلد ۲۔ ص ۴۷

بسا اوقات وہ اپنی اس دادودہش کو اپنے لڑکوں سے بھی پوشیدہ رکھتے تھے، تاکہ پانے والے کو یہ ذلیل نہ سمجھیں۔

ایک بار منصور بن عمار کو انہوں نے ایک رقم دی اور کہا کہ دیکھو میرے لڑکے کو نہ معلوم ہو ورنہ تم اس کی نگاہ میں حقیر ہو جاؤ گے۔ جب ان کے صاحبزادے شعیب کو معلوم ہوا تو اس کی تلافی میں انہوں بھی اپنے والد کی رقم سے ایک دینار کم منصور کو دی اور کہا میں نے ایک دینار کم اس لئے کر دیا ہے کہ عطیہ میں والد کے برابر نہ ہو سکوں[1]۔

اسد بن موسیٰ کا بیان ہے کہ جب عراق میں عباسیوں نے بنو امیہ کو قتل کرنا شروع کیا تو میں بھاگ کر مصر چلا گیا۔ مصر میں بڑی بے سروسامانی اور پریشانی کی حالت میں پہنچا تھا۔ اتفاق سے اسی حالت میں لیث بن سعدؒ کی مجلس درس میں گیا۔ جب مجلس برخاست ہوگئی، تو ان کا خادم میرے پاس آیا اور کہا کہ میں جب تک واپس نہ آجاؤں یہیں ٹھہریں۔ تھوڑے دیر بعد وہ آیا اور اس نے مجھے سو دینار کی ایک تھیلی دی اور کہا کہ امام لیثؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے اپنا سامان درست کر لیجئے۔ اسد کا بیان ہے کہ اس وقت میری کمر میں ایک ہزار دینار بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اس کو نکالا اور خادم سے کہا کہ میں شیخ سے ملنا چاہتا ہوں، تم جاکر اجازت لاؤ۔ چنانچہ میں ان کے پاس گیا۔ اپنا نام ونسب بتایا، پھر اس رقم کو واپس کرنا چاہا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہدیہ ہے صدقہ نہیں ہے، اس لئے قبول کرنے میں تامل نہ ہونا چاہئے، مگر میں نے معذرت کی اور کہا کہ جس چیز سے میں مستغنی ہوں نفس کو اس کا عادی بنانا نہیں چاہتا۔ شیخ نے فرمایا کہ اچھا اگر لینا پسند نہیں کرتے تو مستحق اصحاب حدیث میں یہ رقم تقسیم کر دینا۔ اسد کہتے ہیں، میں نے مجبور ہو کر یہی کیا[2]۔

ایک عورت ایک پیالہ لے کر آئی اور اس نے کہا کہ میرا شوہر بیمار ہے[3]۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ کے یہاں شہد ہے۔ اس پیالہ بھر شہد دے دیجئے۔ فرمایا وکیل[4] کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ تم کو ایک مطر شہد دے دے۔ عورت جب وکیل کے پاس پہنچی تو وکیل امام لیثؒ کے پاس آیا غالباً شہد کی اتنی بڑی مقدار دینے پر کچھ کہا سنا، مگر آپ نے فرمایا کہ جاؤ اس کو دے دو۔ اس نے اپنے ظرف کے بقدر مانگا تھا، ہم اس کو اپنے ظرف کے بقدر دیتے ہیں۔ ایک مطر کا ایک سو بیس رطل ہوتا ہے[5]۔

---

[1] صفوۃ الصفوۃ جلد ۴، ص ۲۸۴
[2] الرحمۃ الغیثیہ ص ۵
[3] بعض تذکروں میں لڑکے کا ذکر ہے اور بعض تذکروں میں مطلق یہ واقعہ مذکور ہے۔
[4] ناظم امور خانہ داری یا پرائیوٹ سکریٹری کو وکیل کہتے تھے۔
[5] الرحمۃ الغیثیہ ص ۵

مہمان نوازی :

سخاوت وفیاضی کا ایک مظہر مہمان نوازی بھی ہے۔ بخل کے ساتھ یہ صفت شاذ و نادر ہی جمع ہوتی ہے۔ حضرت لیث بن سعدؒ جس درجہ کے فیاض تھے، اسی درجہ کے مہمان نواز بھی تھے۔ حضرت عبداللہ بن صالحؒ ان کے خاص شاگرد اور کاتب تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں تقریباً بیس برس ان کی خدمت میں رہا مگر کبھی ان کو تنہا کھانا کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ کے پاس جب کوئی مہمان باہر سے آجاتا تھا تو وہ جب تک رہتا تھا، اس کو وہ اپنے اہل وعیال کی طرح اپنی کفالت میں لے لیتے تھے۔ جب وہ جانا چاہتا تھا، پورا زادِ سفر دے کر رخصت کرتے تھے[1]۔

یہ مہمان نوازی صرف حضر ہی تک محدود نہیں تھی، بلکہ سفر میں بھی مہمانوں کا ہجوم ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان کے شاگرد قتیبہ بن سعیدؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار امام لیث بن سعدؒ کے ساتھ اسکندریہ سے سفر کرنے کا اتفاق ہوا تو اس سفر میں تین کشتیاں تھیں۔ ایک کشتی میں کھانے کا سامان تھا، دوسری میں اہل وعیال اور تیسری کشتی مہمانوں کے لئے مخصوص تھی۔

اشہبؒ کا بیان ہے کہ لیث بن سعد کبھی کسی سائل کو واپس نہیں کرتے تھے اور ان کے یہاں ایک لنگر خانہ جاری رہتا تھا۔ عموماً جاڑوں میں ان کے یہاں ہریسہ، شہد و گائے کے گوشت کے ساتھ مہمانوں کو ملتا تھا اور گرمی میں اخروٹ کا ستو شکر کے ساتھ، ان کا معمول تھا کہ ہر نماز کے بعد مساکین پر کچھ رقم صدقہ ضرور کرتے تھے[2]۔

ذاتی زندگی نہایت سادہ تھی :

مگر یہ ساری فیاضی اور سیر چشمی دوسروں کے لئے تھی۔ ان کی ذاتی زندگی نہایت سادہ تھی۔ محمد بن معاویہؒ کا بیان ہے کہ ایک بار اپنے گدھے پر سوار جارہے تھے تو میں نے ان کی سواری اور سامان وغیرہ کا اندازہ کیا تو سب کی قیمت ۱۸، ۲۰ درہم سے زیادہ نہ تھی، یعنی زیادہ سے زیادہ چار روپے۔

ایوانِ حکومت سے بے نیازی :

خلافت راشدہ کے بعد اُموی حکومت جب ملوکیت کا شکار ہوئی اور حق و ناحق کا فیصلہ ایک شخص کی رائے کے تحت ہونے لگا، اس وقت سے ممتاز صحابہ اور محتاط تابعین نے حکومت سے تعلق رکھنا پسند نہیں کیا۔ تبع تابعین کے زمانہ میں گویا یہ احتیاط کم ہوگئی تھی، مگر پھر بھی ممتاز اور خدا ترس تبع تابعین کی اکثریت نے حکومت کے ساتھ تعاون و تعلق میں صحابہ و تابعین ہی کی روش اختیار کی۔

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ۔ ص ۵ [2] گیہوں کو کوٹ کر اس میں گوشت کی آمیزش کر کے بناتے تھے۔

حضرت لیث بن سعدؒ کا رویہ اس بارے میں ذرا معتدل تھا[1]۔ انہوں نے نہ تو اتنا تعلق پیدا کیا کہ وہ درباری عالم ہو کر رہ گئے اور نہ اتنے بے تعلق رہے کہ اس شجرِ ممنوعہ کے قریب جانا بھی پسند نہ کرتے۔ انہوں نے نہ تو حکومت کی کوئی ذمہ داری قبول کی اور نہ اس کے سامنے اپنی کوئی غرض لے کر گئے کہ اظہار حق میں یہ مانع ہو، مگر اسی کے ساتھ وہ خلفاء و امراء سے ملتے اور ان کی بہت سی ملکی وانتظامی مشکلات میں ان کا ہاتھ بھی بٹاتے رہے۔ اُوپر ذکر آ چکا ہے کہ ان کی مجلس خاص طور سے ارکان حکومت کی حاجت روائی کے لئے ہوتی تھی[2]۔

ان کی اسی اعتدال پسندی کی وجہ سے عوام اور حکومت دونوں پر ان کا اثر تھا۔ ان کے حکم پر مصر کے امراء وقضاۃ کا عزل ونصب ہوتا تھا۔ ایک بار قاضی اسمٰعیل بن الیسع نے ایک مسئلہ میں ایسا فتویٰ دے دیا جسے اہل مصر پسند نہیں کرتے تھے، ان کے خلاف ایک ہنگامہ ہو گیا۔ جب امام لیثؒ کو اطلاع ہوئی تو وہ ان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ نے یہ فتویٰ کیسے دے دیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا عمل اس کے خلاف موجود ہے۔ غالباً قاضی صاحب نے رجوع نہیں کیا۔ اس لئے انہوں نے ان کے معزول کرنے کے لئے لکھا[3]۔ چنانچہ ان کے معزول کئے جانے کا شاہی فرمان آ گیا۔ چونکہ اس معزولی میں قاضی اسمٰعیل کی ہر طرح کی بدنامی تھی، اس لئے خط میں خاص طور سے یہ بات امام لیثؒ نے لکھ دی تھی کہ ہم کو نہ تو ان کی دیانتداری میں کوئی شبہ ہے اور نہ انہوں نے درہم ودینار میں کوئی خیانت کی ہے۔ مگر ان سے شکایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک سنت جاریہ کے خلاف فتویٰ دیا اور فیصلہ کیا ہے[4]۔

کندی نے کتاب القضاۃ میں ان کے معزول کئے جانے کی ایک وجہ اور بھی لکھی ہے، ممکن ہے دونوں وجہیں جمع ہو گئی ہوں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ مصر کے امراء ان کے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے تھے۔ (الرحمۃ الغیثیہ۔ ص ۷)

خلیفہ منصور نے ان سے خواہش کی تھی کہ وہ پورے ملک میں اس کی نیابت قبول کر لیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ پورے ملک کی نیابت نہیں بلکہ مصر کی امارت پیش کی تھی، مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس نے پھر اصرار کیا تو اپنی کمزوری کا اظہار کیا، اس پر منصور نے بڑے زوردار الفاظ میں بلکہ شاہانہ

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ ص ۶ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد اول۔ ص ۲۰۵

[3] یہ بات بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ پہلے مصر میں قضاۃ کا تقرر مصر کے امراء کے ہاتھ میں تھا، مگر بعد میں یعنی ۱۶۴ھ سے براہ راست خلفاء ان کا تقرر کرتے تھے۔ اسمٰعیل دوسرے قاضی تھے، جن کو مہدی نے خود مقرر کیا تھا۔ کندی نے کتاب القضاۃ میں اس کی تفصیل دی ہے۔ [4] الرحمۃ الغیثیہ ص ۸

انداز میں کہا میری موجودگی میں آپ کو کسی کمزوری کا احساس نہ کرنا چاہئے۔ مگر اس شدید اصرار کے باوجود اپنے فیصلہ پر جمے رہے اور یہ ذمہ داری قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔

اگر پہلا بیان صحیح ہے[1] تو منصوران کے سامنے پوری مملکت اسلام کی وزیر اعظمی پیش کررہا تھا اور دوسرا بیان صحیح ہے تو اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے اور مالدار صوبہ کی گورنری پیش کی جارہی تھی، مگر انہوں نے اس سے گریز کیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ گو اس وقت سارا نظام اسلامی ہی تھا، مگر اقتدار اعلیٰ جمہوری نہیں شخصی تھا۔ اس لئے حکومت میں منسلک ہونے کے بعد کسی معاملہ میں اظہار حق کی گنجائش نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ محتاط بزرگوں نے دربار سے بالکل بے تعلقی رکھی یا کم از کم اس کی ذمہ داری کے قبول کرنے سے گریز کیا اور جن بزرگوں نے قبول کیا وہ بڑی آزمائش میں رہے۔ اس آزمائش میں پڑنے کے بعد دو چار ہی بزرگ ایسے تھے جو اپنی حق گوئی اور جرأت سے سلامت بچ گئے، ورنہ زیادہ تر لوگوں کا دامن اس آزمائش میں داغدار ہوکر رہا۔

کیا عہدۂ قضا قبول کرلیا تھا

ابن خلکان اور صاحب شذرات الذہب نے لکھا ہے کہ انہوں نے عہدۂ قضا قبول کرلیا تھا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کی متعدد وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے امارت کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا۔ ظاہر ہے کہ جب انہوں نے امارت کی ذمہ داری تک قبول نہیں کی تو پھر اس سے کم درجہ کا عہدہ قضا قبول کرنے کے کیا معنی۔ دوسرے یہ کہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ جب ان کے حکم سے مصر کے امراء اور قضاۃ کا عزل و نصب تک ہوتا تھا، تو پھر ان کو اس عہدہ کے قبول کرنے کی کیا ضرورت تھی جو خود ان کے اثر و اختیار کے تحت ہو۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ کندی نے مصر کے ولاۃ و قضاۃ کی مکمل تاریخ لکھ دی ہے، جو ہر کتب خانہ میں مل سکتی ہے۔ اس میں ولاۃ یا قضاۃ کی جو فہرست دی ہے اس میں کہیں لیث بن سعدؒ کا نام نہیں ملتا، بخلاف اس کے کتاب میں ایسے واقعات ملتے ہیں، جن سے ان کی تردید ہوتی ہے۔

مگر اس بے تعلقی کے باوجود وہ دربار میں جاتے اور موقع آجاتا تو خلفاء کو نصیحت و موعظت بھی کرتے۔ ایک بار ہارون رشید سے ملنے گئے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ مصر کی خوشحالی

---

[1] یہ بیان حافظ ابن حجر اور امام ذہبی کا ہے۔

اور فارغ البالی کا دارومدار کس چیز پر ہے۔ نہایت صفائی سے فرمایا کہ :

اجراء النیل وصلاح امیرہا ۔

''نیل کے جاری رہنے اور مصر کے امیر کے صلاح وتقویٰ پر''۔

پھر فرمایا کہ نیل کے منبع کی طرف سے گندگی آتی ہے، جس کی وجہ سے پوری نہر پٹ جاتی ہے۔ اس کی صفائی کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں سننے کے بعد ہارون رشید نے کہا کہ آپ نے بہت صحیح فرمایا[1]۔

اس زمانہ میں خلفاء وامراء کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کا عام رواج تھا۔ بسااوقات یہ بدعت مسجدوں تک میں کی جاتی تھی۔ ایک بار معروف شاعر عمار بن منصور مصر آیا اور اس نے مسجد میں خلیفۂ وقت کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا۔ ابھی اس نے اپنا قصیدہ ختم ہی کیا تھا کہ دو آدمی اس کے پاس آئے اور کہا کہ تم کو امام لیث ابن سعد بلا رہے ہیں۔ جب یہ ان کے پاس آیا تو اس سے کہا کہ مسجد میں کیا پڑھ رہے تھے؟ قصیدہ، دہرایا۔

سننے کے بعد ان پر افسوس اور رقت کی کیفیت طاری ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد جب یہ کیفیت دور ہوئی تو نام پوچھا، پھر اس کو روپے کی ایک تھیلی دی اور اس سے کہا کہ اپنے کلام کو سلاطین کے دربار سے بچائے رکھو اور (سلاطین ہی پر کیا ہے) کسی مخلوق کی مدح نہ کرو۔ بس خدا کی حمد وثنا تمہارے لئے کافی ہے۔ انشاء اللہ میں ہر سال تم کو اتنی ہی رقم بھیجتا رہوں گا[2]۔ غالباً اس کے بعد کسی کی مدح نہیں کی اور امام کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گیا۔

اہلِ مصر کو حضرت عثمانؓ کی تنقیص سے روکا :

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جہاں اور بہت سے فتنے پیدا ہوئے وہاں ایک فتنہ بزرگوں پر طعن وتشنیع اور سب وشتم کا بھی تھا۔ جو لوگ حضرت عثمانؓ کے حامی تھے، وہ حضرت علیؓ کی تنقیص کرنا ضروری سمجھتے تھے اور جو لوگ حضرت علیؓ کے مددگار تھے وہ حضرت عثمانؓ پر چھینٹے ڈالنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مصر کے باشندے عام طور پر حضرت علیؓ کے حمایتی تھے اس لئے وہ حضرت عثمانؓ کی مذمت وتنقیص کیا کرتے تھے۔ مصر میں جب امام لیث بن سعدؒ کا اثر ورسوخ بڑھا تو انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور حضرت عثمانؓ کے فضائل عام طور پر بیان کرنے شروع کر دیئے، یہاں تک کہ تنقیص عثمانؓ کی بدعت سیئہ مصر سے ختم ہو گئی[3]۔

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ۔ ص [2] ایضاً۔ ص ۷ [3] تاریخ بغداد جلد ۱۳۔ ص ۷

وفات :

اس مجسمۂ حسن وخوبی اور مجموعہ فضل وکمال نے نصف شعبان بروز جمعہ ۱۷۵ھ کو وفات پائی اور جمعہ کی نماز کے بعد مصر کے ممتاز قبرستان قرافہ صغری میں جس میں نہ جانے کتنے گنجہائے گراں مایہ مدفون تھے، سپرد خاک کئے گئے۔ موسیٰ بن عیسیٰ ہاشمی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جنازہ میں بے شمار مجمع تھا، مگر پورا مجمع اس طرح پیکرغم بنا ہوا تھا کہ گویا یہ ہر شخص کے گھر کی میت ہے۔ خالد بن عبدالسلام صدفی کا بیان ہے کہ میں اپنے والد عبدالسلام کے ساتھ جنازہ میں شریک تھا۔ میں نے ایسا عظیم الشان جنازہ نہیں دیکھا، پورا مجمع پیکرغم بنا ہوا تھا، ہر ایک دوسرے سے اظہار تعزیت کررہا تھا، غم کا یہ عالم دیکھ کر میں نے اپنے والد سے کہا کہ مجمع کا ہر شخص ایسا غم زدہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ جنازہ اسی کے گھر کا ہے۔ والد نے کہا کہ بیٹا یہ ایسے جامع فضل وکمال عالم تھے کہ شاید تمہاری آنکھیں پھر ایسا عالم نہ دیکھیں [1]۔

اولاد :

ان کے دو صاحبزادوں کے نام تذکروں میں ملتے ہیں۔ ایک شعیب دوسرے حرث۔ آپ کی کنیت ابوالحرث ان ہی صاحبزادہ کے نام پر تھی۔ ان صاحبزادگان کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے، مگر جستہ جستہ جو واقعات ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صاحب علم تھے، حضرت شعیب کے صاحب علم ہونے کا پتہ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام لیث بن سعدؒ انہی کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتے تھے [2]۔

تصانیف :

افسوس ہے کہ ان کہ مرویات اور ان کے فتاویٰ ومجتہدات باقاعدہ مدون نہیں کئے گئے ورنہ ان کے علم وفضل کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہوتا۔ اب بھی اگر احادیث وفقہ کی کتابوں سے ان کی مرویات اوران کے اقوال وفتاویٰ کو الگ کرلیا جائے تو حدیث وفقہ کا ایک اچھا خاصہ گلدستہ اس سے تیار کیا جاسکتا ہے، مگر اب اس طرح کام کون کرے اور اگر کربھی لیا جائے تو اس کی قدر کون کرے۔ تذکروں میں ان کی جن تحریری یادگاروں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں :

امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ یہ کثیر التصانیف تھے [3]، لیکن انہوں نے ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہ عموماً تصانیف کا تذکرہ کم کرتے بھی ہیں۔

۱۔ الرحمۃ الغیثیہ۔ ص ۹ ۲۔ تاریخ بغداد۔ جلد ۱۳۔ ص ۱۰ ۳۔ تذکرۃ الحفاظ۔ جلد اول۔ ص ۲۰۷

حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب میں تو ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا، مگر الرحمۃ الغیثیہ میں لکھا ہے کہ میں نے ان کی مرویات کا وہ مجموعہ دیکھا ہے جو حضرت نافعؒ کے واسطہ سے مروی ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں لیث بن سعدؒ کی روایت کردہ چالیس ایسی احادیث بھی نقل کی ہیں، جو ان تک صرف آٹھ واسطوں سے پہنچی ہیں۔ ایسی روایات جو کم سے کم راویوں کے ذریعہ مروی ہوں ان کو محدثین کی اصطلاح میں عوالی حدیث کہا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی تک ان کی مرویات کے بعض مجموعے متداول تھے۔ کسی شاگرد نے ان سے پوچھا کہ آپ بسا اوقات ایسی روایتیں کرتے ہیں جو آپ کی کتابوں میں نہیں ملتیں؟ بولے:-

او کلھافی صدری فی کتبی [1]

''کیا جو کچھ سینہ میں ہے، وہ سب کچھ میری تمام کتابوں میں آ گیا ہے''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود لیث بن سعدؒ نے اپنی مرویات اور ممکن ہے کہ بعض فتاوے بھی مرتب کر لئے تھے، جو ان کے تلامذہ کی عدم توجہی کی وجہ سے ضائع ہو گئے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے۔ ضیعه اصحابه ان کے تلامذہ نے ان کو (یعنی ان کے علم و فضل کو) ضائع کر دیا۔

ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں کا خاص طورر سے ذکر کیا ہے۔ ایک کتاب التاریخ وغیرہ کتاب مسائل فی الفقہ۔ (ص۔۲۸۱)

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۸۔ ص ۴۶۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت فضیل بن عیاضؒ

تبع تابعین میں جن بزرگوں کا زہد و اتقاء ضرب المثل تھا، ان میں حضرت فضیل بن عیاضؒ بھی تھے۔ علم و فضل کے لحاظ سے بھی معاصرین میں یہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر دلوں میں ان کی فضیلت اور عظمت و جلالت ان کے زہد و اتقاء ہی کی وجہ سے تھی۔ ان کی زندگی توبۂ و انابت الی اللہ کی صحیح تصویر تھی۔

خاندان :

ان کا خاندان صوبہ خراسان کی ایک بستی طالقان کا رہنے والا تھا، جو بعد میں فندین میں آباد ہو گیا تھا۔ اس فندین کے قریب ایک بستی اَبِیْوَرْد تھی، وہیں ان کی ولادت ہوئی[1]۔

ابتدائی حالات :

حضرت فضیلؒ گو ایک آزاد مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، مگر ان کو سازگار ماحول نہیں ملا۔ جس کی وجہ سے ان کی عادتیں بگڑ گئیں اور کچھ دنوں میں وہ ایک مشہور ڈاکو کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان کی ڈاکہ زنی کا اتنا چرچا تھا کہ خراسان کے آس پاس سے قافلے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

توبہ :

ان کی زندگی کے یہی لیل و نہار تھے کہ یکا یک فضل ایزدی نے ان کا دامن پکڑا اور ان کو توبہ کی توفیق ہوئی۔ ان کی توبہ کی داستان میں کتنوں کے لئے سامان بصیرت ہے۔ ان کو کسی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا، مگر خواہش نفس کی تکمیل کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دن موقع پا کر اس کے گھر کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا چاہتے تھے کہ کسی خدا کے بندے نے یہ آیت تلاوت کی۔

الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبهم لذکر الله .

”کیا ابھی اہلِ ایمان کے لئے وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لئے جھک جائیں“۔

---

[1] ابن خلکان جلد ۲۔ ص ۱۵۸

کلام الٰہی کی یہ دل گداز آواز ان کے کانوں میں پہنچی اور کانوں کے ذریعہ دل میں اُتر گئی۔ ایمان کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھیں۔ بے ساختہ بول اُٹھے'' یـــارب آن (اے پروردگار وہ وقت آگیا) کہ میں بحر معاصی سے نکل کر تیرے دامن رحمت میں پناہ لوں''۔ وہاں سے وہ اسی وقت واپس ہوئے، رات کا وقت تھا، اس لئے ایک خرابہ میں ٹھہر گئے۔ پاس ہی کوئی قافلہ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ اہل قافلہ آپس میں مشورہ کر رہے تھے کہ کب رخت سفر باندھا جائے۔

بعضوں کا خیال تھا کہ اسی وقت چل دینا چاہئے، مگر اہل تجربہ نے رائے دی کہ صبح سے پہلے سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اسی راستہ پر فضیل قافلوں پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ حضرت فضیلؒ کا بیان ہے کہ میں نے دل میں سوچا کہ میں رات بھر معاصی میں غرق رہتا ہوں اور بندگان خدا مجھ سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ خدا نے ان کے درمیان مجھے اس لئے نہیں بھیجا۔ پھر صدق دل سے توبہ کی اور یہ دعا کی:

اللّٰھم انی تبت الیک وجعلت توبتی مجاورۃ البیت الحرام[1]۔

''اے پروردگار! میں تیری طرف پلٹتا ہوں اور اس توبہ کے بعد اپنی زندگی کو تیرے گھر کی خدمت کے لئے مخصوص کرتا ہوں''۔

اس توبۂ نصوح کے بعد ان کو علم دین کی تحصیل کا شوق دامن گیر ہوا اور اسی شوق میں وہ ترک وطن کر کے کوفہ آئے۔ یہاں امام اعمش شیخ منصور اور بعض دوسرے آئمہ حدیث سے اکتساب فیض کیا، پھر حسب وعدہ جوار حرم کو اپنا مسکن بنایا اور پھر اسی کے سایہ میں پوری زندگی بسر کر دی[2]۔

علمی مقام:

پچھلی زندگی کا ان پر کچھ ایسا رد عمل ہوا تھا کہ وہ گوشہ گیر ہو کر یک گونہ دنیا سے بے تعلق ہو گئے تھے۔ عام طور پر محدثین ایسے زاہدوں اور گوشہ گیروں کو کوئی علمی مقام نہیں دیتے تھے اور نہ ان کی روایتوں کو قبول کرتے تھے، مگر فضیل بن عیاضؒ کی ذات اس سے مستثنیٰ تھی۔ ان کی روایتوں کو عام محدثین نے قبول کیا ہے، اور خود بھی ان سے روایت کی ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ فضیل بن عیاضؒ کی زہد پسندی نے انہیں حصول علم دین سے بے نیاز نہیں کر دیا تھا، توبہ کے بعد گو ان کی عمر کافی ہو چکی تھی لیکن وہ اس کے باوجود کوفہ پہنچے، اور وہاں ممتاز شیوخ حدیث وفقہ سے استفادہ کیا[3]۔

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۸۔ ص ۲۹۵ [2] ابن خلکان جلد ۲۔ ص ۱۵۸

[3] البدایہ والنہایہ جلد اول۔ ص ۱۹۸ تہذیب جلد ... ص ۵۱

ان کے ممتاز شیوخ فقہ و حدیث یہ ہیں، امام اعمش، سلیمان التیمی، منصور بن معتمر، حمید الطویل، یحییٰ بن سعید الانصاری، محمد بن اسحاق، جعفر بن محمد الصادق، اسمٰعیل بن خالد سفیان ثوری وغیرہ[۱]۔ فقہ میں خاص طور پر انہوں نے فقہ کے سب سے ممتاز ائمہ امام ابوحنیفہؒ اور محمد بن ابی لیلیٰؒ سے استفادہ کیا تھا[۲]۔

زہد و اتقاء میں ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد کا حصر تو ناممکن ہے مگر جن لوگوں نے زہد و اتقاء کے ساتھ ان سے علمی استفادہ کیا تھا۔ ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ گو ان کے شیوخ میں ہیں مگر خود انہوں نے بھی ان سے روایت کی ہے اسی طرح حضرت سفیان بن عیینہ، ابن مبارک اور امام شافعیؒ ان کے تلامذہ میں ہیں ان کے علاوہ یحییٰ بن سعید القطانؒ، ابن مہدیؒ، عبدالرزاق حمیدی، ابن وہب، اصمعی، یحییٰ بن یحییٰ التیمی رحمہم اللہ وغیرہ نے ان سے استفادہ کیا تھا۔

روایت حدیث میں احتیاط :

تمام محدثین نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے، ان کی روایتیں قبول کی ہیں، لیکن اس کے باوجود تحدیث روایت سے حتی للامکان گریز کرتے تھے، امام نوویؒ نے لکھا ہے وہ حدیث نبوی سے سخت خائف رہتے تھے، اور اس کی روایت ان پر بہت گراں گذرتی تھی[۳]۔ خاص طور پر کسی غیر محدث سے حدیث کی روایت کو تو پسند ہی نہیں کرتے تھے، ایک بار کسی نے ان سے کہا کہ آپ جعفر بن یحییٰ سے روایت نہیں کرتے؟ فوراً بولے کہ میں حدیث نبوی ﷺ کو اس سے بلند سمجھتا ہوں کہ اس کی روایت ابن یحییٰ سے کی جائے[۴]۔ فرماتے تھے کہ اگر کوئی مجھ سے درہم و دینار مانگ لے تو یہ میرے لئے آسان ہے، مگر مجھ سے تحدیث کی فرمائش نہ کرے[۵]۔

محدثین کا اعتراف :

ان کے علم و فیض کی زیادہ تفصیل تذکروں میں نہیں ملتی، ابن جوزیؒ ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے، اگر وہ مل جاتی تو البتہ ان کے بارے میں کافی معلومات ملتیں۔ لیکن ممتاز آئمہ حدیث و فقہ نے ان کے بارے میں جو رائے دی ہے، اس سے کسی حد تک ان کے علم و فیض کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

---

۱ البدایہ والنہایہ جلد اول۔ ص ۱۹۸ و تہذیب الاسماء نووی جلد ۲۔ ص ۱۵۱ اور تہذیب التہذیب جلد ۸۔ ص ۲۹۴
۲ الجواہر المضیہ جلد اول۔ ص ۴۰۹ ۳ تہذیب الاسماء جلد ۲۔ ص ۵۱ ۴ ایضاً
۵ الجواہر المضیہ جلد اول۔ ص ۴۰۹

حضرت سفیان بن عیینہؒ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے[1]۔ قاضی شریکؒ نے ان کی حجت کو کہا ہے۔ ابن ناصر الدین نے **امام الحرم ، شیخ السلام قدوۃ الاعلام** وغیرہ کے الفاظ سے ان کا تذکرہ کیا ہے[2]، دار قطنی اور نسائی نے ثقہ اور ابو حاتم نے صدوق کہا ہے۔ ابن سعد نے ان کو ثقہ، فاضل، متقی اور کثیر الحدیث کہا ہے۔ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ ان کی توثیق پر تمام آئمہ کا اتفاق ہے، ۔وہ صحیح الحدیث اور صدوق اللسان تھے۔ ان کی روایت صحیح اور سچی ہوتی تھیں[3]۔ ان کے علم وفضل کی توثیق کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ان سے سفیان ثوریؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ جیسے آئمہ حدیث نے روایت کی ہے، بعض محدثین ان کی روایت کے قبول کرنے میں کچھ تامل کرتے تھے، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

زہد واتقاء :

ان کے صحیفۂ زندگی کا سب سے تابناک باب یہی ہے، علامہ ابن مبارکؒ جن کا زہد واتقاء خود ضرب المثل تھا، وہ فرماتے ہیں کہ فضیل اس زمانے کے سب سے متقی آدمی تھے، دوسری روایت ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میرے نزدیک زمین پر اس وقت ان سے زیادہ افضل آدمی کوئی دوسرا نہیں ہے[4]۔ خلیفۂ وقت ہارون رشید کہا کرتا تھا کہ علماء میں امام مالکؒ سے زیادہ بارعب اور فضیل بن عیاضؒ سے زیادہ متقی آدمی میں نے نہیں دیکھا، ہارون نے جو کچھ کہا تھا وہ سنی سنائی بات نہیں تھی بلکہ خود اس کا ذاتی تجربہ تھا۔

حضرت فضل بن ربیعؒ کا بیان ہے کہ امیر المؤمنین ہارون رشید حج کے لئے نکلے تو وہ مجھ سے بھی ملنے آئے۔ میں نے سنا کہ امیر المومنین آئے ہیں، تو تیزی سے ان کے پاس آیا، اور عرض کیا آپ مجھ ہی کو طلب کر لیتے میں خود حاضر ہو جاتا۔ انہوں نے کہا کہ میرے دل میں کچھ خلش ہے، کسی ایسے آدمی کے پاس لے چلو جس سے میں اپنی تسکین حاصل کرسکوں۔ فضل نے کہا یہاں سفیان بن عیینہ موجود ہیں، آپ میرے ساتھ ان کے پاس چلئے۔ چنانچہ ہم لوگ ان کے دروازے پر پہنچے، دروازہ کھٹکھایا انہوں نے اندر سے پوچھا کون؟ میں نے کہا: امیر المؤمنین آپ سے ملنے آئے ہیں۔ یہ سن کر تیزی سے آئے اور بولے ،

اے امیر المومنین! آپ نے بلا لیا ہوتا، میں حاضر ہو جاتا۔ ہارون نے کہا کہ اچھا جس کام کے لئے ہم آئے ہیں وہ شروع کیجئے۔ ہارون نے ان سے کچھ دیر بات چیت کی، پھر پوچھا کہ آپ پر

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۸۔ص ۵۹۵　　[2] شذرات الذہب جلد اول۔ص ۳۱۷

[3] تہذیب التہذیب اور تہذیب الاسماء۔ جلد ۲۔ ص ۵۲　　[4] تہذیب التہذیب جلد ۸۔ ص ۱۹۵

کسی کا قرض تو نہیں ہے۔ ابن عیینہ نے اثبات میں جواب دیا، ہارون اس کی ادائیگی کا حکم دے کر ان سے رخصت ہوا۔ جب باہر آیا تو اس نے فضل سے کہا کہ تمہارے دوست سے مجھے تسکین نہیں ہوئی، کسی دوسرے صاحب علم کے پاس لے چلو۔ فضل عبدالرزاق بن ہمامؒ کی خدمت میں لے گئے۔ وہاں بھی ہارون کو تسکین نہیں ہوئی، پھر یہ قافلہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کے پاس پہنچا۔

حضرت ابن عیاضؒ اس وقت نماز میں تھے اور ایک ہی آیت کو بار بار دہرا رہے تھے۔ غالبًا وہ جب فارغ ہو گئے تو انہوں نے دستک دی۔ انہوں نے اندر سے پوچھا کون؟ فضل نے کہا امیر المؤمنین آپ سے ملنے آئے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے بڑی بے نیازی سے فرمایا، مجھ سے امیر المؤمنین کو ملنے کی کیا ضرورت ہے؟ فضل نے کہا کہ کیا آپ پر اطاعت ضروری نہیں ہے۔ اس کے بعد ابن عیاضؒ کوٹھے سے نیچے اُترے اور دروازہ کھولا۔ ہم لوگ ان کے پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے چراغ گل کر دیے اور خود ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔

اتفاق سے اندھیرے میں ہارون رشید کا ہاتھ فضیلؒ کے بدن پر پڑ گیا۔ فضیلؒ نے کہا کہ کتنا نرم ہاتھ ہے، کاش کل یہ عذاب دوزخ سے بچ جائے۔ ہارون رشید نے اس کے بعد کچھ ہدایتیں کرنے کی فرمائش کی۔ ابن عیاضؒ نے بڑے پُر اثر انداز میں فرمایا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ منتخب ہوئے تو انہوں نے سالم بن عبداللہ، محمد بن کعب القرظی، اور رجاء بن حیوۃ کو بلایا اور پُر درد لہجہ میں فرمایا کہ میں اس آزمائش میں ڈال دیا گیا ہوں، آپ لوگ مجھے اس سلسلہ میں مشورہ دیجیے، تو انہوں نے خلافت کی ذمہ داری کو (آزمائش) قرار دیا اور آپ اور آپ کے اصحاب نے اس کو محض نعمت قرار دیا۔

حضرت سالم بن عبداللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے فرمایا کہ اس دنیا میں ایک روزہ دار کی طرح رہنا چاہئے۔ ابن کعبؒ نے کہا کہ جو مسلمان آپ سے بڑے ہیں، انہیں آپ اپنے والد کی طرح سمجھیں۔ جو متوسط عمر کے ہیں، انہیں بھائی سمجھیں اور جو چھوٹے ہیں انہیں اپنا لڑکا سمجھیں۔ اور باپ کی توقیر کیجئے، بھائی کا اکرام و اعزاز کیجئے اور لڑکے سے پوری شفقت و محبت سے پیش آیئے۔ رجاء بن حیوۃ بولے، اگر آپ قیامت کے دن عذاب الٰہی سے بچنا چاہتے ہیں تو مسلمان کے لئے وہی پسند کیجئے جو آپ اپنے لئے پسند کرتے ہیں اور ان کے لئے وہ پسند نہ کیجئے جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں۔ ابن عیاضؒ نے ہارون رشید کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس دن جس دن لوگوں کے پیر اپنی جگہ سے ڈگ رہے ہوں گے۔ آپ کے لئے میں بہت خائف ہوں، آپ پر خدا رحم کرے کہ آپ کے قریب ایسے لوگ نہیں ہیں جو آپ کو اس طرح کا مشورہ دے سکیں۔

یہ سن کر ہارون رشید پھوٹ پڑا اور اس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ پھر جب یہ کیفیت دور ہوئی تو ہارون نے کہا آپ پر خدا رحم کرے کچھ ارشاد ہو۔ ابن عیاضؒ نے پھر اسی انداز میں فرمایا، اے امیر المؤمنین! مجھے یہ بات معتبر طریقے معلوم ہوئی ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک عامل نے ان کو خط کے ذریعے اپنی کسی تکلیف کا اظہار کیا، جواب میں انہوں نے لکھا کہ میرے بھائی میں تم کو اہلِ دوزخ میں ابد الآباد تک جاگتے رہنے کی یاد دلاتا ہوں اور ڈرو کہیں تم خدا کے پاس اس حالت میں واپس ہو کہ تم کو بخشش کی کوئی امید نہ رہ جائے۔ جب یہ خط اس عامل نے پڑھا تو سارے کام چھوڑ کر عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے وجہ دریافت کی تو بولا کہ آپ کا خط پڑھ کر میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ اب موت تک کسی ذمہ داری کو قبول نہ کروں گا۔ یہ سن کر ہارون پر ایک بار پھر رقت طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس نے مزید ہدایت کی خواہش ظاہر کی۔ ابن عیاضؒ نے فرمایا کہ

اے امیر المؤمنین! نبی ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ ایک بار خدمت نبوی میں آئے اور خواہش ظاہر کی کہ مجھے کسی جگہ کا امیر بنا دیجئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ”امارت کی ذمہ داری قیامت کے دن سراسر حسرت وندامت ہوگی، تو اس کی خواہش نہ کیجئے“۔ اس پر ہارون رشید ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور مزید کچھ کہنے کی خواہش کی۔ آپ نے فرمایا کہ اے خوبرو چہرے والے! قیامت کے دن اپنی خلق کے بارے میں خدا تعالیٰ پوچھ گچھ کرے گا۔ اگر آپ یہ چہرہ آگ سے بچانا چاہتے ہو تو اس طرح بچایئے کہ کبھی کسی رعیت کی طرف اپنے دل میں کوئی کھوٹ، کینہ نہ رکھئے، کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”جو شخص لوگوں کی طرف کینہ اور کھوٹ رکھتا ہے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے“۔ یہ سن کر ہارون پھر رو پڑا۔ جب سکون ہوا، تو اس نے پوچھا کہ آپ پر کسی کا قرض تو نہیں ہے؟ ابن عیاضؒ نے فرمایا کہ

ہاں میرے رب کا قرض میرے اوپر ہے، جس کا وہ محاسبہ کرے گا۔ میری تو ہلاکت ہی ہے، اگر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ میری بربادی ہی ہے، اگر اس نے پوچھ گچھ کی اور اس کا جواب اس نے کافی نہیں سمجھا۔ ہارون رشید بولا، میں بندوں کے قرض کے بارے میں آپ سے سوال کر رہا ہوں؟ بولے

میرے رب نے اس کا حکم مجھے نہیں دیا۔ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تنہا اسی کو رب سمجھوں اور اسی کی اطاعت کروں۔ پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی :

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ما ارید منهم من رزق وما اریدان یطعمون ان اللہ هو الرزاق ذو القوة المتین

ہارون رشید نے کہا کہ یہ ایک ہزار دینار (دس ہزار روپے سے زیادہ) حاضر ہیں۔ اسے قبول کیجئے اور اپنے اہل وعیال پر صرف کیجئے۔ بولے

سبحان اللہ! میں تو آپ کو نجات کا راستہ بتاتا ہوں، اور آپ اس شکل میں بدلہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ فرمانے کے بعد بالکل خاموش ہوگئے۔ ہارون رشید اپنے قافلے کے ساتھ وہاں سے واپس ہوا اور باہر نکل کر فضل سے کہا کہ آئندہ اگر کسی کے پاس لے چلنا ہو تو انہی جیسے کے پاس لے چلنا۔ یہ واقعۂ سیّد المسلمین ہیں [1]۔

اس گفتگو سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں :

(۱) ایک یہ کہ حکومت کی ذمہ داری کو عیش وطرب کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ بلکہ اسے ایک آزمائش سمجھ کر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اسلامی حکومت کے حکمرانوں کی زندگی آخرت کی باز پرس اور احساسِ ذمہ داری سے خالی نہ ہونا چاہئے۔ اگر اس سے ان کی زندگی خالی ہوگی تو وہ کبھی عدل وانصاف نہ کر سکیں گے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ انہوں نے اس میں مثال زیادہ تر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی دی، جو اُموی خلیفہ تھے۔ جن کے بارے میں عباسی حکمران بدگمان بھی رہا کرتے تھے اور ان سے اپنے کو برتر سمجھا کرتے تھے۔ حضرت ابن عیاضؒ نے مثالیں دے کر ان کے اس پندار کو توڑنے کوشش کی۔ اس سے ان کی حد سے بڑھی ہوئی جرأت کا پتہ چلتا ہے اور حکومتِ وقت سے ان کی ناراضگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ حضرت عباسؓ کو امارت کے قریب جانے سے آپ ﷺ نے اس لئے منع فرمایا کہ یہ کوئی موروثی چیز نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ﷺ ان کو یہ ذمہ داری سونپ دیتے۔ لیکن چونکہ اس کا مدار اہلیت وصلاحیت پر ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اس ان کو روک دیا۔

حلال ذریعۂ رزق :

وہ اکل حلال کے سلسلہ میں حد درجہ محتاط تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے نہ تو امراء و خلفاء کی مدد قبول کی اور نہ عوام کی۔ اپنے ہاتھوں کی کمائی سے جو کچھ مل جاتا تھا وہ کھا لیتے تھے۔ امام شعرانیؒ کے الفاظ ہیں :

---

[1] صفوۃ الصفوۃ

یسقی علی الدوام وینفق من ذالک علی نفسہ وعیالہ . (ص ۱/۵۸)

''ہمیشہ بہشتی کا کام کرتے تھے اور اس سے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا خرچ چلاتے تھے''۔

ذکرِ الٰہی اور قرآن سے شغف :

قرآن کے ساتھ ان کو عشق تھا اور اُو پر ذکر آ چکا ہے، ہارون رشید جب ان کے پاس گیا تو وہ قرآن کی ایک آیت دہرا رہے تھے۔ خادم خاص ابراہیم بن اشعثؒ کہتے ہیں کہ فضیلؒ کے دل میں خدا کی جس قدر عظمت تھی اتنی میں نے کسی کے دل میں نہیں دیکھی۔ ان کے سامنے جب خدا کا ذکر آ جاتا یا وہ قرآن کی کوئی آیت سن لیتے تھے تو

ظھر بہ الخوف والحزن وفاضت عیناہ فبکی حتی یرحمہ من بحضرتہ[۱]۔

''ان پر خوف وغم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اس طرح روتے تھے کہ دیکھنے والوں کو رحم آنے لگتا تھا''۔

امام احمد بن حنبلؒ کا بیان ہے کہ ایک بار ہم لوگ فضیل بن عیاضؒ کے پاس گئے اور ان سے اندر آنے کی اجازت چاہی، تو اجازت نہیں ملی۔ کسی نے کہا کہ وہ اگر قرآن کی آواز سن لیں تو نکل آئیں گے۔ ہمارے ساتھ ایک بلند آواز آدمی تھا، ہم نے اس سے کہا کہ قرآن کی کوئی آیت پڑھو۔ اس نے بلند آواز سے سورۂ تکاثر پڑھنی شروع کر دی، وہ فوراً نکل آئے۔ اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ خود قرآن پڑھتے تو ان کی آواز نہایت غمگین اور پسندیدہ ہوتی اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی انسان کو مخاطب کر رہے ہیں[۲]۔

وفات :

محرم ۱۸۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ عمر ۸۰ سے متجاوز تھی۔

اہل وعیال :

ان کے اہل وعیال کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ بعض واقعات سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ شادی ہوئی تھی اور ایک اولاد بھی تھی، جن کا نام علی تھا۔ یہ عادات وخصائل میں ان کے مثنیٰ تھے، مگر عین عالم شباب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ابن خلکان کا بیان ہے :

۱؎ تہذیب التہذیب۔　　۲؎ صفوۃ الصفوۃ جلد ۲۔ ص ۱۳۵

كان ولده شاباسريا من كبار الصالحين وهو معدود في جملة من قتله محبة الباري سبحانه.

''ان کے یہ صاحبزادے موت کے وقت جوان، ممتاز اور کبار صالحین میں تھے۔ ان کا شمار ان لوگوں کے زمرہ میں ہوتا ہے جن کی موت کا سبب خدا کی محبت ہوتی ہے''۔

لیکن صبر و شکر کا عالم یہ تھا کہ نوجوان صالح اولاد کے انتقال پر بھی وہ بے قابو نہیں ہوئے، بلکہ ایک غم آمیز تبسم سے فرمایا: خدا نے جو پسند کیا، میں بھی اس پر راضی ہوں۔ (ابن خلکان۔ ص ۱۵۸)

زرّیں اقوال:

اُوپر کی تفصیل سے زہد و اتقاء سے بھرپور زندگی کا ایک خاکہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، مگر ان کے سوانح حیات کے پورے خط و خال دیکھنے کے لئے ان کے ان گراں مایہ اقوال پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے، جو ان کی پُر حکمت زبان سے گاہ بگاہ صادر ہوتے رہے ہیں۔ فرماتے تھے کہ:

ہماری صحبت میں اس نے کچھ نہیں پایا، جس نے نماز اور روزہ کی کثرت سیکھی، بلکہ اس کے لئے طبیعت کی سخاوت، قلب کی سلامتی اور اُمت کی خیر خواہی کی ضرورت ہے۔

جس نے انسان کو پہچان لیا وہ راحت پا گیا[1]۔ (مقصد یہ ہے کہ یہ حقیقت جس نے پالی کہ کوئی انسان کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتا تو پھر ان سے بالکل بے پرواہ ہو جائے گا اور اپنی ساری توجہ خدا کی طرف مبذول کرے گا)۔

فرماتے تھے کہ جب کبھی خدا کی کوئی نافرمانی کر بیٹھتا ہوں تو میں اپنے گدھے، اپنے خادم اور اپنی بیوی میں اس کا اثر محسوس کرتا ہوں، یعنی یہ سب میرے نافرمان ہو جاتے ہیں۔

جب خدا تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کو رنج و غم زیادہ دیتا ہے، اور جب کسی سے ناخوش ہوتا ہے تو اس پر دنیا وسیع کر دیتا ہے۔

فرماتے تھے کہ اگر دنیا اپنی ساری آسائشوں اور زینتوں کے ساتھ مجھے دی جائے اور اس کے استعمال میں محاسبہ کا بھی کوئی خوف نہ ہو، جب بھی میں اس سے اسی طرح بچوں گا، جس طرح تم لوگ مُردار کھانے سے بچتے ہو۔

---

[1] تہذیب الاسماء جلد ۲۔ ص ۵۲

فرماتے تھے کہ اگر مجھے مقبولیت دعا کی سعادت ملتی تو میں صرف امام وقت کے لئے دعا کرتا۔ کیونکہ امام وقت کی صلاح پر رعیت کی صلاح کا مدار ہے۔ جب یہ صالح ہوجائے گا، تو ملک اور اہلِ ملک دونوں امن وسلامتی پاجائیں گے۔

اپنے ہم نشینوں سے ملاطفت اور حسن خلق کا برتاؤ کرنا، رات بھر نفل نماز پڑھنے اور دن بھر نفلی روزہ رکھنے سے زیادہ ثواب کا کام ہے۔

ایک بار ہارون رشید نے ان سے کہا آپ کے زہد کا کیا کہنا، جواب میں فرمایا: آپ تو مجھ سے بھی بڑے زاہد ہیں کیونکہ میں نے تو دنیا سے بے رغبتی اختیار کی ہے اور یہ ایک مچھر کے پَر سے بھی کم درجہ کی چیز ہے۔ لیکن آپ نے اس آخرت سے بے نیازی اختیار کی ہے جس میں دنیا کی کوئی قیمت نہ ہوگی تو میں فانی کا زاہد ہوں اور آپ باقی کے زاہد ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ بات آپ نے سلیمان بن عبدالملک سے کہی تھی۔

فرمایا کہ دوسروں کے دکھاوے کے لئے کوئی عمل کرنا شرک ہے اور دوسروں کی وجہ سے کوئی عمل چھوڑ دینا ریا ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں سے محفوظ رکھے[1]۔

فرماتے تھے کہ جب تم رات کو اٹھ کر نفل پڑھنے اور دن کو روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو سمجھ لو کہ محروم ہو اور تم کو تمہارے گناہوں نے گھیر لیا ہے۔ حضرت محمد بن حسانؒ کہتے ہیں کہ ایک بار فضیلؒ کی خدمت میں گیا۔ وہاں امام بن عیینہؒ بھی موجود تھے۔ وہ امام سے مخاطب ہوکر کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ یعنی علمائے دین زمین کا چراغ ہیں، جن سے روشنی کی جاسکتی ہے، مگر آپ لوگ ظلمت کا سبب بن گئے ہو۔ آپ لوگ ستاروں کے مانند تھے، جن سے گم کردہ راستہ پاسکتے تھے۔ مگر آپ سراپا حیرت بن گئے ہیں۔ آپ میں کوئی آدمی بھی ایسا نہیں ہے، جو ان ظالم حکمرانوں کا مال لینے اور پھر مسند درس پر بیٹھ کر حدثنا فلاں عن فلاں کہنے سے شرمائے[2]۔

فرماتے تھے کہ کوئی صاحب فضل وکمال اسی وقت صاحب وکمال ہے جب تک وہ خود اپنے کو صاحب فضل وکمال نہ سمجھے۔

---

[1] یہ تمام اقوال البدایہ والنہایہ جلد ۱۰۔ ص ۱۹۹ اور ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۵۸ سے لئے گئے ہیں۔

[2] صفوۃ الصفوۃ۔ جلد ۲۔ ص ۱۳۵ حضرت فضیلؒ نے غایت تشدد میں ایسی بات کہہ دی ہے، ورنہ تبع تابعینؒ کی ایک متعدبہ تعداد ایسی تھی، جو نہ حکومت سے کوئی مدد لیتی تھی اور نہ ان کو پسند کرتی تھی۔ کتاب میں ایسے متعدد بزرگوں کے حالات آچکے ہیں۔

فرماتے تھے، اخیر زمانہ میں قوموں اور قبیلوں کے سردار منافق قسم کے لوگ ہو جائیں گے تو اس وقت ان سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ یہ ایسا مرض ہے کہ اس کی کوئی دوا نہیں ہے۔ لوگوں سے دُور بھاگو، مگر جماعت ترک نہ ہونے پائے۔ یہ زمانہ خوشی کا نہیں بلکہ رنج و غم کا ہے[1]۔

فرماتے تھے کہ ہر چیز کا ایک دیباچہ ہوتا ہے۔ علماء کا دیباچہ یہ ہے کہ سب سے پہلے غیبت ترک کر دیں۔ فرماتے تھے کہ حامل قرآن کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی کوئی ضرورت امراء و اہلِ دولت کے پاس لے جائے۔ بلکہ ان کا منصب یہ ہے کہ خلق خدا اپنی حاجتیں اس کے پاس لے جائیں۔

دوستی کے بارے میں قیمتی ہدایت :

فرماتے تھے کہ رحمان کے بندے وہ لوگ ہیں جن میں خشوع اور تواضع ہوتی ہے اور دنیا کے بندے وہ ہیں جن میں تکبر اور خود پسندی ہوتی ہے اور وہ عام لوگوں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔

فرمایا کرتے تھے کہ کہ جو شخص بے عیب دوست تلاش کرتا ہے، وہ بغیر دوست ہی رہے گا۔ ایسے شخص سے دوستی نہ کرو کہ جب تم سے خفا ہو تو تمہارے اُوپر بہتان تراشے، وہ تمہارا دوست نہیں ہے، جس نے تم سے کوئی چیز مانگی اور تم نے نہیں دی تو وہ غضبناک ہو گیا۔ اب آپس میں وہ اخوت و ہمدردی نہیں رہی کہ ایک بھائی ایک دوست، اپنے بھائی یا دوست کے مر جانے کے بعد اس کی اولاد کو اپنی نگرانی میں لے لیتا تھا اور بالغ ہونے تک اپنے بچوں کی طرح ان کی پرورش کرتا تھا۔

علم و زہد کے بارے میں جامع ہدایات :

جو شخص قرآن پڑھتا ہے۔ اس سے اس طرح سوال کیا جائے گا، جس طرح انبیاء سے تبلیغ و رسالت کے بارے میں سوال ہوگا۔ کیونکہ قرآن پڑھنے والا انبیاء کا وارث ہے۔

آخرت پسند عالم کا علم پوشیدہ رہتا ہے اور دنیا پسند عالم[2] کے علم کی نشر و اشاعت ہوتی ہے۔ عالم آخرت کی پیروی کرو اور عالم دنیا کی صحبت سے بچو۔ کیونکہ یہ اپنی فریب خوردگی اور دنیاوی زیب

---

[1] مقصد یہ ہے کہ دینی زندگی کا جب رواج کم ہو جائے، تو پھر مسلمان رہتے ہوئے خوش رہنا مناسب نہیں ہے، بلکہ کم سے کم اس پر افسوس ہی کرنا چاہیے۔

[2] یہ اصول اس صورت میں ہے کہ جب اپنے علم کو شہرت کی غرض ہی سے شائع و ذائع کرے۔

وزینت کے پھندے میں تمہیں ڈال دے گا۔ اس کی دعوت بغیر عمل کے ہوتی ہے اور اس کے عمل میں کوئی صداقت نہیں ہوتی۔ زہد کی ایک علامت یہ ہے کہ جب امراء اور اس کے ہم نشینوں کے یہاں ان کے جہل کا ذکر کیا جائے تو وہ خوش ہوں۔

اکلِ حلال :

جو شخص یہ جان لے کہ اس کے پیٹ میں کیا جارہا ہے، وہ خدا کے یہاں صدیق شمار کیا جائے گا۔ تو چاہئے کہ تم یہ دیکھو کہ تمہارا رزق کہاں سے اور کس ذریعہ سے آرہا ہے[1]۔

[1] الطبقات الکبریٰ جلد اول۔ ص ۵۸۔۵۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت امام سفیان ثوریؒ

جن ائمہ فقہ وحدیث کو زمرۂ تبع تابعین کا گل سر سبد کہا جاسکتا ہے ان میں ایک امام ابوسفیان ثوریؒ بھی ہیں۔ علم وفضل کے لحاظ سے ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے جو ایک جدا فقہی مسلک کے بانی تھے، گو ائمہ اربعہ کے مسلک کے سامنے یہ مسلک زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکا مگر اس کے باوجود فقہ وحدیث کی تمام قدیم کتابوں میں ائمہ اربعہ کے ساتھ سفیان ثوری کی رایوں اور مجتہدات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ حدیث کی مشہور کتاب ترمذی ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، قریب قریب ہر باب میں وعلیہ سفیان الثوری وغیرہ کے الفاظ آپ کو ملیں گے۔ اس عہد میں جن بزرگوں کو قرآن اور اسکی تفسیر وتاویل سے خاص شغف تھا اور جنہوں نے اس فن میں اپنی تحریری یادگاریں چھوڑیں ان میں امام موصوف بھی تھے، تذکرہ نگاروں نے امام کو بحیثیت فقیہ اور محدث تو پیش کیا ہے مگر طبقات المفسرین میں ان کا شمار نہیں کیا ہے حالانکہ اس فن میں ان کا کارنامہ حضرت سفیان بن عیینہ، وکیع بن جراح، اسحٰق بن راہویہ سے کم نہیں تھا۔ حیرت ہے کہ ان بزرگوں کو تو مفسرین کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے اور سفیان ثوریؒ کو اس شرف سے محروم رکھا گیا۔

علم وفضل کے ساتھ زہد واتقا میں بھی ضرب المثل تھے ان کے بارے میں عام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ دنیا ان کی طرف بڑھی مگر انہوں نے اس سے اپنی نظر پھیر لی ان مجمل اشارات کے بعد مفصل حالات زندگی ملاحظہ ہوں۔

نام ونسب اور ولادت :

سفیان نام، ابوعبداللہ کنیت۔ ان کے سلسلۂ نسب میں ایک نام ثور بن مناۃ آتا ہے اسی کی نسبت سے وہ ثوری[1] کہلاتے ہیں باختلاف روایت ان کی ولادت سلیمان ابن عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں ۹۶، ۹۷ھ میں ہوئی[2]۔

---

[1] تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ثور نام کے دو آدمی تھے ایک کا تعلق مشہور عرب قبیلہ مضر سے اور دوسرے کا مشہور قبیلہ ہمدان سے۔ امام سفیان ثوری کے بارے میں عام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ وہ ثور سے مضر ہیں اور بعض لکھتے ہیں کہ ثور ہمدان سے ہیں۔

[2] تہذیب جلد ۴ ص ۱۱۴ اور تذکرۃ الحفاظ جلد ۱۔ ص ۱۹۲۔ بعض لوگوں نے ان کا سنہ ولادت ۹۵ھ لکھا ہے مگر یہ اس لئے غلط ہے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سلیمان کے خلافت میں پیدا ہوئے تھے اور سلیمان ۹۶ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا تھا۔

خاندان :

علم وفضل کے لحاظ سے ان کا خاندان کوفہ کے معروف خاندانوں میں تھا۔ ان کے والد سعید بن مسروقؒ خود صاحب علم وفضل تھے، خاص طور پر حدیث نبوی ﷺ کی تحدیث و روایت میں وہ معروف تھے۔ عام ارباب تذکرہ ورجال نے ان کی توثیق کی ہے حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں مستقلاً ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی والدہ بھی نہایت عفت مآب، پاکیزہ، سیرت اور صاحب علم خاتون تھیں۔

سفیانؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار رات کو آسمان پر نگاہ اٹھائی تو معلوم ہوا کہ میرا دل میرے پہلو میں نہیں ہے، اس کیفیت کا ذکر میں نے اپنی والدہ سے کیا تو بولیں معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آسمان پر حسرت پذیری اور غور وفکر کی غرض سے نگاہ نہیں ڈالی بلکہ تمہارا مقصد صرف لہو ولعب تھا[1]۔

والدین کے علاوہ ان کے دو بھائی عمر و مبارک کا بھی شمار اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اور خطیب نے ان کے حالات لکھے ہیں، مشہور امام حدیث اعمشؒ مبارک بن سعید سے اپنی مجلس درس میں حد درجہ شگفتہ رہتے تھے جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سفیان کے بھائی ہیں تو پھر ان کو اپنے پہلو میں بٹھاتے تھے، ان کو ھذا السید، یہ سردار ہیں کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی تھی[2]۔ دوسرے بھائی عمر بن سعید بھی صاحب علم تھے عمر کے ایک صاحبزادے حفص بھی علم وفضل میں باپ کے جانشین تھے[3]۔

تعلیم وتربیت :

امام سفیانؒ نے کوفہ میں آنکھ کھولی جو حرمین کے بعد علوم دینیہ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ خاص طور پر فقہ وحدیث کے تو بے شمار حلقائے درس قائم تھے ماشاء اللہ گھر کا ماحول بھی قال اللہ اور قال رسول کی صدا سے پرشور تھا، اسی علم افزا اور روح پرور ماحول میں ان کی تعلیم وتربیت شروع ہوئی۔ تذکروں میں ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا کوئی ذکر نہیں ملتا مگر ان کے والد کے تلامذہ کی جو فہرست رجال کی کتابوں میں ملتی ہے اس میں ان کا نام بھی ملتا ہے بعض واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گھر کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی جو ان کے حصول علم کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہورہی تھی مگر ان کی والدہ کے جذبۂ دینی اور ہمت مردانہ نے اس کو دور کردیا ایک دن انہوں نے سفیانؒ کو حصول علم کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا :

یابنی اطلب العلم وانا اکفیک بمغزلی[4]

---

[1] الطبقات الکبریٰ جلد ۱ ص ۴۳ [2] تہذیب جلد ۱۰ [3] تہذیب جلد ۷ [4] صفوۃ الصفوۃ جلد ۳ ص ۱۱۶

''اے نورِ نظر تم حصولِ علم میں لگے رہو میں چرخہ کات کر تمہارے اخراجات پورے کروں گی''۔

نیک بخت ماں نے ان کو محض حصولِ علم کی ترغیب ہی نہیں دی بلکہ ان کو یہ نصیحت بھی کی کہ یہ علم ان کے اخلاق و کردار کے سنوارنے کا سبب ہو ان کے بگاڑنے کا سبب نہ ہو، وہ عبادت ہو تجارت نہ ہو، ان کا یار ہو مار نہ ہو۔

علم را بر دل زنی یارے بود

چنانچہ ایک بڑی دل سوزی کے ساتھ نصیحت کی کہ

بیٹے جب تم دس حرف لکھ چکو تو دیکھو کہ تمہاری چال ڈھال اور حلم و وقار میں اضافہ ہوا یا نہیں اگر اس میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوا تو سمجھ لو علم نے تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا[1]۔

والدہ کی اس نصیحت کو انہوں نے زندگی بھر حرزِ جان بنائے رکھا جس کی شہادت ان کی پوری زندگی سے ملتی ہے۔

والدین کی تعلیم و تربیت کے علاوہ کوفہ کے تمام ممتاز شیوخِ حدیث و فقہ سے انہوں نے استفادہ کیا تھا کوفہ میں اس وقت جن تابعین کی مجلس درس و افتا کو امتیاز حاصل تھا ان میں امام اعمش اور ابواسحٰق سبیعی سرفہرست تھے، ان دونوں بزرگوں سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا خاص طور پر امام اعمش کی روایات کے وہ بہت بڑے امین تھے۔ امام وقت یحییٰ بن معینؒ فرماتے تھے:

سفیان الثوری اعلم الناس بحدیث الاعمش[2]

''سفیان ثوری اعمش کی روایتوں کے سب سے بڑے جاننے والے تھے''۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ اس عہد میں حدیث کا دفتر سفینوں سے زیادہ سینوں میں تھا اس لئے حدیث کے طالب علموں کو ان جواہر ریزوں کی تلاش میں دور دور کی خاک چھاننی پڑتی تھی اور جو ریزہ جہاں سے بھی ملتا تھا اسے اپنے سفینوں میں جمع کر جاتے تھے۔ برسوں کی اس محنت شاقہ کے بعد کہیں جا کر کوئی شخص تحدیث و روایت کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ امام سفیان ثوریؒ بھی ان ہی بزرگوں میں تھے جن کو حدیث نبوی سننے کے لئے سینکڑوں میل کا سفر کرنا پڑا۔ پہلے انہوں نے کوفہ کے تمام ممتاز شیوخِ حدیث سے استفادہ کیا اور پھر بصرہ اور حجاز کے مختلف مقامات کے شیوخ حدیث کی خدمت میں پہنچے اور ان سے سماعِ حدیث کیا۔ حافظ ابن حجرؒ کوفہ، بصرہ اور حجاز کے بعض ممتاز شیوخ کا نام لے کر لکھتے ہیں:

وخلق من اهل الكوفة وجماعة من اهل البصرة وطوائف من اهل الحجاز. (تهذيب جلد ۴ ص ۱۱۲)

---

[1] صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۱۶ [2] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۷

''اہلِ کوفہ کی ایک بڑی تعداد سے استفادہ کیا اسی طرح بصرہ کی ایک بڑی جماعت سے فیض اٹھایا اور حجاز کے مختلف حلقہائے درس سے بہرہ مند ہوئے''۔

وثوق علم :

اپنے علم وفن پر وثوق واعتماد ہر علم وفن کے لئے ضروری ہے۔ خاص طور پر تحدیث روایت میں یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے اگر ریب وشک سے کوئی شخص حدیث نبوی کی روایت کرے گا تو وہ اس روایت میں بھی شک پیدا کرے گا اور اس سے دوسروں کے دل میں بھی بے اعتمادی پیدا ہوگی۔ عام طور پر محدثین کو اپنی یادداشت اور اخذ روایت پر اعتماد ہوتا تھا مگر امام سفیان ثوری اس میں خاص طور پر ممتاز تھے۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ اعمش کے تلامذہ میں سفیان ثوری ان کی روایتوں کے سب سے بڑے امین تھے انہوں نے ان سے جو روایتیں کی تھیں ان پر اتنا وثوق تھا کہ اس سلسلہ میں استاد سے تسامح ہو جاتا تھا مگر ان سے نہیں ہوتا تھا۔ مشہور محدث زائدہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت اعمش کی خدمت سے حدیث لکھ کر واپس ہوتے تھے تو ان مکتوبہ روایتوں کو امام سفیان کی خدمت میں پیش کرتے تھے وہ دیکھ کر بعض روایتوں کے بارے میں فرماتے تھے کہ فلاں فلاں روایت تو حضرت اعمش کی بیان کردہ نہیں ہے، ہم کہتے کہ انہوں نے بھی ہم سے ان کی تحدیث کی ہے، فرماتے کہ جاؤ اور ان سے یہ بات کہو چنانچہ ہم لوگ جاتے اور ان سے کہتے تو وہ غور کر کے فرماتے کہ صدق سفیان سفیان نے ٹھیک کہا ہے اور پھر اپنے صحیفہ[1] سے اس کو مٹا دیتے تھے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی جو خود امام حدیث ہیں، فرماتے تھے :

ما رایت صاحب الحدیث احفظ من سفیان الثوری[2]

''میں نے سفیان ثوری سے زیادہ حدیثیں یاد رکھنے والا نہیں دیکھا''۔

یہ کہنے کے بعد انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک بار انہوں نے حماد بن ابی سلیمان بن عمرو بن عطیہ بن سلیمان الفارسیؓ کے واسطہ سے ایک روایت بیان کی میں نے ان سے عرض کیا کہ ابو عبداللہ! اس میں آپ سے غلطی ہوئی ہے، پوچھا کیسے کسی اور واسطہ سے روایت منقول ہے، میں نے کہا ہاں! حماد سے ربعی نے، ربعی نے سلیمان فارسیؓ سے روایت کی ہے۔ فرمایا کس نے اس واسطہ سے روایت بیان کی ہے میں نے امام شعبہؒ نے فرمایا امام شعبہ سے غلطی ہوئی ہے پھر کچھ دیر خاموش

---

[1] یعنی اس کے حدیث نبوی ہونے میں شبہ نہیں تھا اور نہ امام سفیان کو اس بات پر اعتراض تھا بلکہ ان کے اعتراض کا مطلب یہ تھا کہ اس روایت کو ان روایتوں میں شامل نہ کیا جائے جو امام اعمش نے اپنے شیوخ سے براہ راست سنی ہیں۔ اندازہ کیجئے کہ تدوین حدیث میں محدثین نے کتنا دیدہ ریزی کی ہے۔ تاریخ بغداد جلد ۹　[2] ایضاً

ہوکر سوچتے رہے پھر پوچھا اچھا اس روایت میں امام شعبہ کی کسی اور نے بھی تائید کی ہے میں نے ہشام الدستوائی، سعید بن عروبہ اور حماد بن زید کا نام لیا۔ فرمایا کہ حماد سے غلطی ہوئی ہے ان ہی نے مجھ سے عمرو بن عطیہ کے واسطہ سے یہ روایت بیان کی ہے۔

ابن مہدی کہتے ہیں کہ میری دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جب چار آدمی ایک بات پر متفق ہیں تو وہی صحیح ہوگی لیکن ایک سال بعد یعنی ۱۸۱ھ میں شیخ غندر کے پاس گیا تو انہوں نے امام شعبہ کا مرتب کردہ صحیفۂ حدیث مجھ کو دکھایا اس میں یہ روایت عن حماد عن ربعی کے الفاظ میں موجود تھی۔ امام شعبہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ حماد کبھی اسے عمرو بن عطیہ سے بھی روایت کرتے تھے اور کبھی ربعی سے یہ دیکھ کر ابن مہدی کی زبان سے بے اختیار نکلا ابو عبداللہ! آپ پر خدا رحم کرے آپ جب کوئی حدیث یاد کر لیتے ہیں تو پھر یہ پرواہ نہیں کرتے کہ کون آپ کی مخالفت کرتا ہے[1]۔

امام سفیانؒ اور امام شعبہؒ :

امام سفیانؒ اور امام شعبہؒ تقریباً ہم عصر ہیں، اور دونوں بزرگوں کو امامت فی الحدیث کا درجہ حاصل ہے، مگر ان دونوں کی کچھ جدا جدا خصوصیتیں ہیں، اسی لئے خطیب نے امام شعبہؒ اور امام سفیانؒ کی امتیازی خصوصیات کے ذکر کے لئے ایک الگ باب باندھا ہے، امام شعبہؒ کی خصوصیات کا ذکر اوپر آچکا ہے یہاں امام سفیانؒ کی خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ابن قطانؒ کہتے تھے کہ میری نظر میں امام شعبہؒ سے بڑا اور محبوب آدمی دوسرا نہیں ہے، لیکن جب امام سفیانؒ اور ان میں اختلاف ہوتا ہے، تو میں امام سفیانؒ کی روایت کو لیتا ہوں، یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ سفیان امام شعبہؒ سے زیادہ اثبت ہیں، اور رجال کے عالم ہیں۔

روایات کے مشہور زمانہ ناقد یحییٰ بن معین فرماتے تھے کہ روایات میں سفیان کی جو بھی مخالفت کرے ان ہی کی روایت قابل ترجیح ہوگی، کسی نے کہا کہ شعبہ بھی ان کے مخالف روایت کریں جب بھی؟ فرمایا: ہاں! پھر کسی نے کہا کہ اگر بصریوں کی روایات میں شعبہ ان کی مخالفت کریں تو کس کو ترجیح ہوگی فرمایا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ امام شعبہ بصریوں کی روایات میں ان کی مخالفت کریں[2]۔

امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے اہل علم کا اعتراف :

امام ابوحنیفہؒ ان کے فضل وکمال کے حد درجہ معترف تھے، ایک بار فرمایا کہ اگر وہ تابعین کے عہد میں بھی ہوتے تو ابھی ان کا ایک خاص مقام ہوتا، ایک دفعہ امام کے پاس ایک شخص آیا اور بولا کہ

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۹۔ ص ۱۶۸ [2] تاریخ بغداد جلد ۹۔ ص ۱۶۹

آپ نے سنا نہیں کہ سفیان ثوری نے کیا روایت کی ہے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہ کہوں کہ سفیان حدیث کی روایت میں غلطی کرتے ہیں، اگر سفیان ابراہیم نخعی (امام ابوحنیفہ کے استاذ الاساتذہ) کے زمانہ میں ہوتے تو بھی لوگ حدیث میں ان کے محتاج ہوتے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر ابراہیم کے زمانہ میں بھی سفیان کی موت ہوتی تو لوگوں کو ان کی عدم موجودگی محسوس ہوتی[1]۔

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ نے بھی ان کے علم وفضل کا بڑی وسعت قلب کے ساتھ اعتراف کیا ہے، کسی نے پوچھا کہ سفیان ثوری احفظ تھے، یا سفیان بن عیینہ، بولے سفیان ثوری احفظ تھے، اور بہت کم غلطی کرتے تھے اور سفیان بن عیینہ حافظ تھے[2]۔

حضرت ابن مہدیؒ فرماتے تھے کہ میں نے امام مالکؒ سے عاقل، عبداللہ بن مبارک سے زیادہ امت کا خیر خواہ، امام شعبہؒ سے زیادہ متقشف اور امام سفیان ثوریؒ سے زیادہ حدیث کا جاننے والا نہیں دیکھا[3]۔

امام نسائی کہا کرتے تھے کہ وہ اس سے زیادہ بلند تھے کہ ان کی توثیق کی جائے، امام مالکؒ فرماتے تھے کہ عراق ہم پر درہم ودینار کی بارش کرتا تھا۔ اس نے سفیان کے بعد علم کی بارش شروع کردی[4]۔

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ بات زبانوں پر ہے کہ امیر المومنین عمر بن الخطابؓ اپنے زمانہ میں راس الناس تھے، اور ان کے بعد ابن عباسؓ راس الناس ہوئے اور ان کے بعد امام شعبی (تابعین میں) اور امام سفیان (تبع تابعین) میں راس الناس قرار پائے۔

مرویات کی تعداد:

دوسری صدی کے بعد جب حدیث کا منتشر ذخیرہ بڑی حد تک جمع ہو گیا تو محدثین کے لئے لاکھوں کی تعداد میں روایات اور ان کے سلسلہ اسناد کا یاد رکھنا آسان ہو گیا۔ لیکن جب یہ ذخیرہ منتشر تھا تو پھر دو چار ہزار حدیثوں کا بھی سینوں اور سفینوں میں محفوظ رکھنا مشکل تھا اس لئے تبع تابعین کے عہد میں دس ہزار سے زیادہ کسی امام حدیث کو حدیثیں مشکل سے یاد تھیں لیکن امام سفیانؒ کو اس حیثیت سے بھی امتیاز حاصل تھا کہ ان کی مرویات کی تعداد جو ان کے سینہ میں ہر وقت محفوظ رہتی تھیں تیس ہزار تھی[5]۔

۱؎ تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۹ ۲؎ ایضاً ص ۱۷۰ ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً ۵؎ تہذیب جلد ۴ ص ۱۱۴

درس وافتا :

اس غیر معمولی علوم وفضل اور تحدیث روایات میں وثوق کی وجہ سے بہت ہی کم سنی میں مسند درس وافتا پر متمکن کردیئے گئے۔ ولید بن مسلم کہتے ہیں کہ ابھی سبزۂ خط بھی نہیں نکلا تھا کہ مکہ میں ان سے فتویٰ پوچھا جاتا تھا[1]۔ خطیب کا بیان ہے کہ ان کے درس کی سب سے پہلی مجلس بخارا (خراسان) میں برپائی، اس وقت ان کی عمر کل ۱۸ سال کی تھی[2]۔

جن لوگوں نے ان سے استفادہ کیا تھا ان کی تعداد کا حصر تو ممکن نہیں، حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

روی عنه خلائق لایحصون

''ان سے اتنے بیشمار لوگوں نے روایت کی ہے کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا''۔

تمام ممتاز تبع تابعین نے یا تو ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔ یا ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔ مثلاً:

عبداللہ بن مبارک امام اوزاعی، امام مالک جیسے ائمہ روزگار نے ان سے سماع کیا تھا، ابن مبارک فرماتے ہیں کہ میں نے گیارہ سو شیوخ سے حدیثیں لکھی تھیں، ان میں سب سے افضل سفیان ثوری کو پایا، کسی نے پوچھا کہ آپ نے تو مشہور تابعی سعید بن جبیر وغیرہ کا زمانہ پایا ہے؟ فرمایا کہ ہاں جو میں کہتا ہوں وہ صحیح ہے۔

امام اوزاعیؒ ان کے ہم عصر اور درجۂ اجتہاد میں ان کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نماز میں ہنسنے والے کے بارے میں میں نقض صلوۃ کا فتویٰ تو دیتا تھا مگر اس کی دلیل نہیں جانتا تھا۔ لیکن جب امام سفیان سے ملا تو ان سے اس مسئلہ میں تسکین ہوگئی اور میں نے اسی رائے کو اختیار کرلیا[3]۔

امام احمد بن حنبلؒ گو ان کے زمانہ میں موجود تھے مگر براہ راست ان سے سماع نہیں کرسکے تھے، لیکن ان کے تلامذہ کے ذریعہ سے ان کے علم وفضل ہی کو نہیں۔ ان کی سیرت وکردار کو بھی اپنالیا تھا۔ اور ان کے مثنیٰ ہوگئے تھے۔ اور صوری ملاقات نہ ہونے کے باوجود، امام احمد کی سیرت پر ان کا گہرا اثر پڑا تھا۔ اسی وجہ سے وہ احمد فرمایا کرتے تھے، میرے دل میں امام سفیان ثوری سے زیادہ کسی کی منزلت نہیں ہے امام احمدؒ صرف امام سفیانؒ ہی کو امام کے لفظ سے یاد کرتے تھے ایک بار کسی شاگرد سے فرمایا جانتے ہو امام کون ہے؟ امام ایک ہی ہیں۔ اور وہ سفیان ثوری ہیں[4]۔

فقہی مسلک :

ان کے علمی فضائل صرف درس وتدریس ہی تک محدود نہیں تھے، اور نہ وہ محض قرآن وحدیث کے ناقل تھے، بلکہ قرآن وحدیث پر ان کی نظر مجتہدانہ تھی۔ ان کا شمار ان چھ سات ائمہ مجتہدین میں ہوتا

---

[1] تہذیب جلد ۴۔ ص ۱۷۱ [2] تاریخ بغداد جلد ۱۔ ص ۱۵۳
[3] تاریخ بغداد جلد ۹۔ ص ۱۶۲ [4] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰۔ ص ۱۳۴

ہے جو تبع تابعین میں صاحب مذہب شمار کیے جاتے ہیں امام نووی لکھتے ہیں۔

هو احد اصحاب المذاهب الستة المتبوعة (تهذيب الاسماء ص ۲۲۲)

''ان کا شمار ان چھ صاحب مذہب ائمہ میں ہوتا ہے جو متبوع خلائق ہیں''۔

ان کے مجتہدات کا کوئی الگ مجموعہ ہوتا تو ان کے درجۂ اجتہاد کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی تفسیر کے چند اجزاء کے علاوہ اور کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ البتہ حدیث کی کتابوں میں اور خاص طور پر ترمذی میں ان کے اجتہادات اور رایوں کا کثرت سے ذکر آتا ہے، اگر ان سب کو جمع کر لیا جاتا امام اوزاعی کی طرح ان کے تفردات بھی عام لوگوں کے سامنے آجاتے، گو خواص اہل علم ان سے واقف ہیں۔

امام اوزاعیؒ کی طرح ان کا مسلک بھی کئی صدی تک زندہ رہا ابن خلکان کے بیان کے مطابق تیسری صدی تک بعض علماء ان کے مسلک کے مطابق تفقہ حاصل کرتے تھے چنانچہ شیخ جنید بغدادی متوفی ۲۹۷ھ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے انہی کے مسلک کے مطابق تفقہ کیا تھا ابن رجب کے بیان کے مطابق چوتھی صدی تک یہ مسلک زندہ رہا ابن عماد سے ابن رجب کی یہ رائے نقل کی ہے کہ

وجد في اخر القرن الرابع سفيانيون (شذرات ج۱ ص ۲۵۱)

''چوتھی صدی کے آخر تک سفیان ثوری کے متبعین موجود تھے''۔

آگے ذکر آئے گا کہ تیرہویں صدی تک ان کی بعض کتابیں خواص اہل علم میں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں۔

سیرت و کردار :

امام سفیان ثوریؒ کی ذات علم و عمل دونوں کا مجموعہ تھی ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کا مرتبہ علم و فضل کے لحاظ سے زیادہ بلند تھا یا سیرت و کردار کے اعتبار سے جس طرح ان کا علم و فضل تبع تابعین میں ہر کہ ومہ کے نزدیک مسلم تھا اسی طرح ان کے سیرت و کردار کا نقش بھی ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا اور اس میں ان کی فطری سلامت روی کے ساتھ ان کی والدہ کی تربیت کو بھی بڑا دخل تھا جیسا کہ ابتداء میں انہوں نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا علم کے ذریعہ تمہاری سیرت سنورنی چاہئے ان کے سیرت و کردار کی ایک جھلک اس خط سے ملتی ہے جو انہوں نے اپنے ایک شاگرد کے نام لکھا تھا اس خط کا خلاصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں :

''تم جس زمانہ میں ہو یہ وہ زمانہ ہے جس سے نبی کے صحابہ پناہ مانگتے کہ وہ یہ زمانہ پائیں اور قدامت کی وجہ سے انہیں وہ کچھ حاصل تھا جو ہمیں حاصل نہیں ہے پھر امورِ خیر میں قلت علم قلتِ صبر اور قلت اعوان لوگوں کی فساد انگیزی اور دنیا کی گندگی و ناپاکی کے باوجود ہم نے جس زمانہ کو پایا ہے اس سے کیوں کر علیحٰدہ ہو سکتے ہیں، پس تم پر واجب ہے کہ گمنامی کی زندگی بسر کرو کہ یہ زمانہ گمنامی ہی کے لئے موزوں ہے تم پر لازم ہے کہ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرو اور لوگوں سے ملنا جلنا کم رکھو۔ پہلے زمانہ میں لوگ ملتے تھے تو ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے لیکن اب وہ صورت نہیں رہی بس راہِ نجات یہی ہے کہ ترکِ تعلق کے اصول پر عمل کیا جائے۔ اور ہاں خبردار! امراء کا قرب نہ اختیار کرنا نہ ان سے کسی معاملے میں اختلاط روا رکھنا، خبردار مبتلائے فریب نہ ہونا۔ تم سے کہا جائے کہ اس شخص کی سفارش کر دیجئے، مظلوم کی دستگیری کیجئے، ظلم کے مٹانے کی سعی کیجئے۔ یاد رکھو یہ سب باتیں ابلیس کی فریب کاریاں ہیں اس وقت کے تاجروں نے اپنی سربلندی کے لئے ان باتوں کو سیڑھی بنالیا ہے[1] اور ہاں خبردار! تم اس آدمی کی طرح نہ ہو جانا جو یہ چاہتا ہے کہ اس کے قول پر عمل کیا جائے، اسکی باتوں کی اشاعت کی جائے اور اس کا کلام سنا جائے۔

خبردار! حکومت اور ریاست کی محبت سے بچنا کیونکہ لوگ اقتدار کو سونے اور چاندی سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں''[2]۔

زہد و تقویٰ :

زہد و تقویٰ جیسا کہ مذکورہ خط سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ ان کا خاص وصف تھا ایک شاگرد نے ان سے ایک دن کہا کہ لوگوں میں آپ کا اتنا چرچا ہے اور آپ رات کو سوتے رہتے ہیں، بولے چپ رہو اصل چیز دل کا تقویٰ ہے[3]۔ (عبادت و ریاضت کی کثرت نہیں)

انہوں نے دنیا حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ حصولِ دنیا کے جتنے ذرائع تھے انہوں نے اپنے اوپر مسدود کر لئے تھے۔ خراسان میں ان کو اپنے چچا کی کچھ جائیداد ملی تھی اسی پر ان کا گزر اوقات تھا[4]۔ دنیا سے بے رغبتی کا حال یہ تھا کہ عمر بھر گھر کے اوپر ایک حبہ صرف نہیں کیا۔ فرماتے ہیں :

---

[1] مقصد یہ ہے کہ ظلم کے مٹانے اور خدمتِ خلق کے نام پر اقتدار پرست لوگ تمہیں آلۂ کار بنالیں۔

[2] طبقات الکبریٰ جلد ۱ ص ۴۲ و حلیۃ الاولیاء جلد ۶۔ ص ۳۷۷ [3] صفوۃ الصفوۃ [4] تاریخ بغداد جلد ۹

ماانفقت درهما قط في بناء[1]

''میں نے ایک درہم بھی مکان کے بنانے میں صرف نہیں کیا''۔

امام شعرانیؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر تین باتیں لازم کرلیں تھیں۔ایک یہ کہ وہ کسی سے خدمت نہ لیں گے اور نہ ان کا کپڑا کوئی درست کرے گا اور نہ وہ اینٹ پر اینٹ رکھیں گے۔ (ص ۴۲)

وہ چاہتے تو دنیا میں مال و دولت اقتدار سب کچھ حاصل کرسکتے تھے مگر یحییٰ بن یمانؒ کا بیان ہے۔

اقبلت الدنيا عليه فصرف وجهه عنها (تاریخ بغداد جلد ۹ . ص ۱۵۲)

''دنیا ان کی طرف بڑھی مگر انہوں نے اس سے منہ پھیرلیا''۔

امراء و سلاطین کا ذکر کیا اپنے خاص خاص دوستوں تک کے ہدایا قبول نہیں کرتے تھے۔ان کے بھائی مبارک کہتے ہیں کہ امام سفیان کے ایک دوست تھے جن کے یہاں اکثر ان کی آمدورفت رہتی تھی اور ان کے یہاں ٹھہرا بھی کرتے تھے ان کا ایک لڑکا ایک مرتبہ درہموں سے بھری ہوئی ایک یا دو تھیلی لے کر ان کی خدمت میں آیا، وہ مزاج شناس تھا بولا کہ میرے والد کی طرف سے آپ کو کوئی شکایت تو نہیں ہے، فرمایا کہ نہیں خدا ان پر رحم کرے وہ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دولت ہمارے پاس کن ذرائع سے آتی ہے، اس لئے میری خواہش ہے کہ یہ رقم جو میں لے کر آیا ہوں آپ اسے قبول کرلیں اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کریں۔انہوں نے تھیلی اپنے ہاتھ میں لے کر رکھ لی جب وہ رخصت ہوکر باہر چلا گیا تو مبارک کو بلایا اور فرمایا باہر کے جاکر رقم اسے لوٹا دو۔مبارک کہتے ہیں کہ میں اس سے ملا اور وہ رقم لوٹا دی وہ پھر واپس آیا اور اس نے اصرار کیا کہ وہ دوبارہ اس رقم کو واپس لے لیں، فرمایا کہ میں نے ہاتھ میں لے لی تھی اب پھر تم اس کو واپس لے جاؤ اس نے کہا کہ کوئی ناراضگی تو نہیں ہے؟ فرمایا کہ نہیں! وہ بار بار رقم کے لینے پر اصرار کرتا رہا اور یہ واپسی کے لئے بضد تھے یہاں تک کہ وہ شخص واپس چلا گیا۔جب تنہائی ہوئی تو ان کے بھائی مبارک ان کے پاس آئے اور بولے بھائی آپ کا دل بالکل پتھر ہوگیا ہے آپ کے اگر اہل وعیال نہیں ہیں تو ہم پر تو آپ رحم کرتے آپ اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں پر بھی رحم نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ میں نے اسی طرح ان کو بہت کچھ سنایا، جب یہ سب کچھ کہہ چکا تو فرمایا کہ

يا مبارك تا كلها انت هنيا مر ئيا و اسئال عنها لا تكون هذا ابدا

(تاریخ بغداد جلد ۹ ص ۱۶۱)

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۴

''مبارک تم تو رقمیں لے لے کر مزے سے کھاؤ پیو، اور اس کے بارے میں میری باز پرس ہو ایسا قطعی نہیں ہو سکتا''۔

ہدیہ کی طرح قرض لینے سے بھی سخت گریز کرتے تھے حالانکہ بسا اوقات فاقہ کی نوبت آجاتی تھی اور ہدیہ نہ قبول کرتے اور قرض نہ لینے کی وجہ بیان کرتے تھے کہ لوگ مجھ کو عطیہ وہدیہ دے کر اگر فخر محسوس نہ کرتے تو میں ضرور ان کے ہدایا قبول کر لیتا اور جس سے میں قرض لوں گا وہ غایت خوشی میں اسے چھپانے کے بجائے لوگوں سے فخریہ یہ کہے گا کہ کل سفیان ثوری مجھ سے قرض لینے آئے تھے

(طبقات جلد ۱۔ص ۴۲)

ان کے اسی زہد وورع کی بنا پر لوگ کہا کرتے تھے کہ

لولا السفیان لمات الورع (بغدا جلد ۹۔ ص ۱۶۰)

''اگر سفیان نہ ہوتے تو زہد وورع کا خاتمہ ہو جاتا''۔

رقتِ قلب اور فکرِ آخرت:

نہایت ہی رقیق اور فکر آخرت میں ڈوبا ہوا دل پایا تھا۔ خوفِ آخرت سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہا کرتے تھے، خود فرماتے ہیں کہ میں رات کو سوتا ہوں اور اچانک کوئی آواز آجاتی ہے تو یہ تصور کر کے چونک پڑتا ہوں کہ ہم پر عذاب نہ آگیا ہو[1]۔

ایک بار زوال سے پہلے نفل پڑھ رہے تھے، جب قرآن کی اس آیت

فاذا نقر فی الناقور فذالک یومئذ یوم عسیر (المدثر)

''جس دن صور پھونکا جائے گا وہ دن بڑا ہی سخت ہوگا''۔

پر پہنچے تو چیختے ہوئے سخت دھوپ میں باہر نکل پڑے، یہاں تک کہ لوگوں نے دھوپ سے ان کو واپس کیا[2]۔

ایک بار عشاء کی نماز پڑھ کر ایک شاگرد یوسف سے طہارت کا برتن مانگا، شاگرد نے ان کو دے دیا، برتن کو داہنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی حالت میں پوری گزار دی اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ صبح کو شاگرد نے کہا کہ ابوعبداللہ! صبح ہوگئی، فرمایا کہ جب سے تم نے یہ برتن دیا اسی وقت سے آخرت کے انجام پر غور کرتا رہ گیا۔ یہی شاگرد کہتے ہیں کہ جب سفیان ثوری سوچنے لگتے تھے تو ان کو خون کا پیشاب ہونے لگتا تھا[3]۔

---

[1] صفوۃ الصفوۃ جلد ۳۔ص ۸۴ [2] صفوۃ الصفوۃ جلد ۳۔ص ۸۴ [3] تاریخ بغداد جلد ۹۔ص ۱۵۸

ان کے شاگرد ابواسامہ کہتے ہیں کہ ایک بار بیمار پڑے میں ان کا قارورہ لے کر کسی طبیب کے پاس گیا تو طبیب نے قارورہ دیکھ کو کہا کہ یہ کسی راہب کا قارورہ معلوم ہوتا ہے کہ غم نے اس شخص کا جگر شق کر دیا ہے اس کے لئے کوئی علاج کارگر نہیں ہے[1]۔

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کہتے ہیں کہ ان سے زیادہ رقیق القلب آدمی سے میرا سابقہ نہیں پڑا۔ یکے بعد دیگرے کئی رات ان کو دیکھتا رہا، وہ رات کے پہلے حصہ میں سو جاتے تھے پھر یکا یک گھبرا کر "دوزخ دوزخ" چیختے ہوئے اٹھ جاتے، فرماتے کہ دوزخ کی یاد نے مجھے نیند اور خواہش نفس سے دور کر دیا ہے، پھر وضو کرتے اور وضو کے بعد یہ دعا کرتے کہ "اے اللہ! تو بغیر بتائے ہوئے میری حاجت سے واقف ہے، میں تجھ سے عذاب دوزخ سے نجات کے علاوہ کچھ نہیں مانگتا، اے اللہ! فکر آخرت کی گھبراہٹ نے مجھے رقیق القلب بنا دیا ہے اور یہ میرے اوپر تیرا بڑا انعام ہے، اے اللہ! اگر گوشہ گیری کے لئے کوئی عذر میرے پاس ہوتا تو میں ایک لمحہ بھی لوگوں میں نہ رہتا۔ اس دعا کے بعد نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے، نماز میں گریہ و بکا کی وجہ سے قرات نہیں کر پاتے تھے۔ میں شرم اور ان کی ہیبت کی وجہ سے ان کی طرف دیکھ تو نہیں پاتا تھا مگر کوشش کے باوجود ان کی قرأت صاف سنائی نہیں دیتی تھی[2]۔

ایک بار مجلس میں آپ نے ایک شخص سے سوال کیا کہ تم رات میں کیا کرتے ہو؟ سب نے اپنے معمولات بتائے جب سب لوگ بتا چکے تو کسی نے امام سے پوچھا کہ آپ بھی تو اپنے معمولات سے مطلع فرمائیے؟ فرمایا کہ میں پہلے حصہ میں بھر پور نیند سے سو جاتا ہوں پھر جب اٹھتا ہوں تو دوبارہ ٹیک نہیں لگاتا۔

موت کی یاد:

آخرت کی یاد کا ایک جز موت کی یاد ہے۔ موت کی یاد آدمی کی آنکھوں سے غفلت کے بہت سے پردے اٹھا دیتی ہے اور اس کو دنیا میں غرق ہونے سے بچاتی ہے اسی لئے حدیث میں آیا ہے، واکثرو اذکر بادم اللذات لذتوں کو ختم کرنے والی یعنی موت کو کثرت سے یاد رکھو۔ امام سفیان کے دل میں اس بادم اللذات کی یاد کی اتنی سوزش رہتی تھی کہ ان کے پاس بیٹھنے والے بھی اس کی تپش محسوس کرتے تھے۔ قبیصہ بیان کرتے ہیں کہ میں جب بھی امام سفیان کے پاس بیٹھتا تھا تو موت کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ان سے زیادہ میں نے کسی کو موت کی یاد رکھنے والا نہیں دیکھا۔ (تاریخ بغداد جلد ۹۔ ص ۱۵۷)

---

[1] ان کے بعض اقوال سے گوشہ گیری کی ترغیب معلوم ہوتی ہے، ان اقوال کی نسبت یا تو ان کی طرح صحیح نہیں ہے یا پھر وہ کسی خاص موقع اور محل کے لئے کہے گئے ہیں۔ [1] صفوۃ الصفوۃ جلد ۳۔ ص ۸۴

علم کی ذمہ داری کا احساس :

علمِ دین کا حصول اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا مشکل اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ امام سفیانؒ نے علم وفضل جس جدوجہد سے حاصل کیا تھا اسی اعتبار سے اس کی ذمہ داری کو بھی انہوں نے ادا کیا، انہوں نے اپنے علم کو منفعت کا نہیں خلقِ خدا کی ہدایت کا ذریعہ بنایا وہ اس ذمہ داری سے ہروقت گراں بار رہتے تھے کہ اگر میں کچھ نہ جانتا تو میرا غم کچھ کم ہوتا۔ ان کی والدہ نے ابتدائے عمر ہی میں یہ نصیحت کی تھی کہ تمہارا علم تمہاری سیرت وکردار سنوارنے کا سبب ہو چنانچہ انہوں نے اس کا پورا حق ادا کیا۔ علم کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں۔

علم حاصل کرو اور جب علم حاصل کر چکو تو اس کی رکھوالی کرو، اسے ہنسی مذاق اور کھیل کود سے مخلوط نہ کرو کیونکہ اس طرح دل کی دنیا سونی ہو جاتی ہے[1]۔

فرماتے تھے کہ علم حدیث کا حصول سب سے افضل کام ہے، بشرطیکہ نیت درست ہو دوسری روایت ہے کہ لوگوں کے لئے حدیث سے زیادہ کوئی علم مفید نہیں ہے[2]۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں علم کی ذمہ داری سے اس صورت میں بھی نجات پا جاؤں کہ نہ وہ میرے خلاف حجت بنے اور نہ میرے لئے شفیع تو میں اسے پسند کروں گا، مجھے کسی عمل سے اتنا خوف نہیں جتنا کہ حدیث کی (روایت) سے۔

(تذکرۃ الحفاظ جلد ۱۔ ص ۱۸۴)

قناعت وسادگی :

نہایت سادہ متواضع اور قناعت پسندانہ زندگی گزارتے تھے۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ان کا ذریعہ معاش صرف ان کے چچا کی ایک جائیداد تھی انہوں نے زندگی بھر گھر کے اوپر ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، لباس بھی نہایت سادہ پہنتے تھے۔ علی بن ثابتؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مکہ کے راستہ میں مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی ہر چیز کی قیمت کا اندازہ لگایا تو وہ تین درہم سے زیادہ نہیں تھی[3]۔

وہ مجلس میں بیٹھتے تھے صدر نشین بن کر نہیں بلکہ غایت تواضع میں دیوار کے ایک کنارے سے ٹیک لگا کر اکڑوں بیٹھتے تھے[4] خود بھی فقر وفاقہ کی زندگی گزارتے تھے اور ان کی مجلس میں اہلِ فقر ہی کی عزت تھی۔ اربابِ دولت کی ان کے نزدیک کوئی قدر وقیمت نہیں تھی۔

محمد بن عبدالوہاب کہتے ہیں کہ

---

[1] حلیۃ الاولیاء جلد ۶۔ ص ۳۶۸ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱۔ ص ۱۸۴
[3] تاریخ بغداد جلد ۹۔ ص ۱۶۲ [4] صفوۃ الصفوۃ جلد ۳۔ ص ۸۳

ما رایت الفقر قط اعزو لا ارفع منه فی مجلس سفیان ولا رایت الغنی ازل منه فی مجلس سفیان[۱]۔

''میں نے فقر کو امام سفیان کی مجلس سے زیادہ معزز اور بلند نہیں دیکھا اور غنا یعنی دولت و خوشحالی کو ان کی مجلس سے زیادہ کہیں ذلیل نہیں دیکھا''۔

ان کے ان ہی علمی و عملی اوصاف کی بناء پر امام شعبہؒ جیسے امام وقت فرماتے تھے کہ

ان سفیان ساوالناس بالعلم والورع[۲]۔

''سفیان نے اپنے علم وزہد کے ذریعہ لوگوں پر سیادت کی''۔

حق گوئی اور امراو سلاطین سے بے تعلقی :

خلفاء اور امرا سے ہمیشہ بے تعلق رہے ان کے سامنے عہدۂ قضا بھی پیش کیا گیا مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ حق کے اظہار کا جب بھی موقع آیا تو اس سے باز نہیں رہے وہ نہ صرف یہ کہ خود امراء وسلاطین سے دور رہتے تھے بلکہ اپنے تعلق کے لوگوں کو بھی اس سے روکتے تھے۔ ایک شاگرد کو انہوں نے ایک نصیحت آمیز خط لکھا جس میں بہت سی باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا۔

میرے بھائی! امراء سے قرب اور ان سے میل جول نہ رکھنا، تم سے کہا جائے گا کہ لوگوں کی سفارش کیجئے، مظلوم کی دادرسی اور ظلم کو مٹانے کے لئے ایسا کرنا چاہئے تو یہ ابلیس کا فریب ہے۔ ان باتوں کو علماء نے ان کے قرب اور دنیا کمانے کا زینہ بنالیا ہے۔ فرماتے تھے کہ اگر تم دیکھو کہ کوئی کسی بادشاہ سے چمٹا ہے تو سمجھ لو کہ وہ چور ہے اور اگر دیکھو کہ امیروں کے دروازہ کا چکر کاٹتا ہے تو وہ ریاکار ہے[۳]۔

ایک بار ایک شخص کو امرا سے خلا ملا رکھنے پر تنبیہ کی تو وہ بولا کہ میں بچوں کی وجہ سے مجبور ہوں فرمایا کہ ذرا اس شخص کو دیکھو یہ کہتا ہے کہ جب وہ خدا کی نافرمانی کرے گا تو خدا اس کے بال بچوں کو رزق دے گا اور جب اطاعت کرے گا تو وہ اس کے بال بچوں کو بے یارومددگار چھوڑ دے گا۔

(طبقات جلد ۱۔ ص ۴۱)

یہ ان کا قال ہی نہیں تھا بلکہ حال بھی تھا۔ کبھی اپنی ضرورت کے لئے کسی خلیفہ یا امیر سے ملنے نہیں گئے اور نہ ان کا غیر معمولی اعزاز واکرام کیا۔ ایک بار منصور سے مسجد حرام میں مڈبھیڑ ہوگئی، اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اور کعبہ کی طرف ان کا رخ کر کے کہا کہ

۱۔ تاریخ بغداد جلد ۹۔ ص ۱۶۲ ۲۔ تاریخ بغداد جلد ۹۔ ص ۱۶۲ ۳۔ طبقات الکبریٰ شعرانی جلد ۱۔ ص ۴۲

''قسم ہے اس عمارت (کعبہ) کی مجھے آپ نے کیسا آدمی پایا''۔

یہ وقت بڑا نازک تھا مگر امام سفیانؒ نے بڑی جرات سے اپنے دل کی بات کہہ دی فرمایا کہ کعبہ کے رب کی قسم، میں نے تجھ سے بدترین آدمی نہیں دیکھا۔

غالباً اسی حج کے موقع کا واقعہ ہے کہ انہوں نے سلیمان خواص سے کہا کہ چلو منصور کو نصیحت کریں، اگر وہ ہماری باتیں مان گیا تو اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا منصور اس وقت منیٰ میں تھا، امام سفیان جب پہنچے تو اس نے اپنے قریب بلا کر بٹھانا چاہا مگر قریب جانے کے بجائے فرمایا کہ میں اس چیز پر کیسے قدم رکھ سکتا ہوں جو نہ میری ملکیت ہے نہ آپ کی، منصور نے غلام کو حکم دیا کہ قالین وفرش اٹھا دو۔ امام سفیان آگے بڑھے اور منصور کے روبروز مین پر بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہوئے یہ آیت پڑھی: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۔ (اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں پھر واپس کریں گے اور پھر اسی سے دوبارہ اٹھائیں گے)۔ یہ آیت سن کر منصور کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں، امام سفیانؒ نے بغیر اجازت طلب کئے ہوئے اس کو مزید نصیحت شروع کر دی اور لہجہ اس قدر تیز ہو گیا کہ منصور کے حاجب نے کہا کہ اے شخص! تیری جان کی خیر نہیں ہے مگر انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنی گفتگو جاری رکھی[1]۔

عباسی خلفاء نے منصور کی خودرائی اور جبر و تشدد ضرب المثل ہے۔ وہ اپنے مزاج اور اپنی رائے کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کر سکتا تھا، اسی جرم میں اس نے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ جیسے برگزیدہ لوگوں کیساتھ وہ سلوک روا رکھا جو معمولی انسانوں کے ساتھ بھی ہم روا نہیں رکھ سکتے، یہ واقعات ان ائمہ کے سامنے تھے، مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ امام اوزاعی اور امام سفیان ثوریؒ اس کو نصیحت ہی نہیں بلکہ اس کے اوپر سخت سے سخت تنقید کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا ملاقاتوں کا ذکر مختلف مورخین اور تذکرہ نویسوں نے کیا ہے لیکن ان سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ منصور ان سے کچھ ناراض ہوا مگر بعض دوسرے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ منصور ناراض ہو گیا تھا اور جب وہ آخری حج کے لئے بغداد سے روانہ ہوا تو مکہ پہنچنے سے پہلے ہی یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ ان کو پھانسی دے دی جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ چونکہ ان واقعات کا ذکر اہل تذکرہ نے بالکل بھی غیر مرتب اور بغیر کسی تاریخی ترتیب کے کیا ہے اس لئے ان میں تاریخی ترتیب قائم کرنا مشکل ہے۔ تاہم راقم ان واقعات سے جو ترتیب قائم کر سکا ہے وہ پیش کر رہا ہے۔

---

[1] اس کے آگے کی گفتگو، راقم مہدی سے متعلق سمجھتا ہے اسی لئے اس کا ذکر مہدی سے ان کے تعلقات کے ضمن میں لیا جائے گا۔

ابتدا میں منصور امام سفیانؒ کی ان نصیحتوں اور تنقیدوں کو یا تو اس لئے برداشت کرتا رہا کہ شاید اس طرح اس کی طرف کچھ مائل ہو جائیں گے لیکن جب وہ اس طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے سختی شروع کی[1]۔

اس بات کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔

مفضل بن مہلہلؒ بیان کرتے ہیں کہ میں امام سفیان کے ساتھ حج کے لئے گیا، جب ہم لوگ مکہ پہنچے تو وہاں امام اوزاعی سے ملاقات ہوئی، ہم سب لوگ گھر میں بیٹھے تھے کہ عبدالصمد بن علی الہاشمی نے جو اس سال حج کے موسم میں منصور کی طرف سے امیر بنا کر بھیجا گیا تھا، دروازہ کھٹکھٹایا ہم نے پوچھا کون؟ امیر حج، یہ سن کر امام سفیان تو اٹھ کر الگ چلے گئے اور امام اوزاعی نے اس کا استقبال کیا، اس سے پہلے تو امام اوزاعی کا نام پوچھا تو انہوں نے فرمایا: مجھے ابوعمرو الاوزاعی کہتے ہیں۔ اس نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح سلامت رکھے، آپ کے جو خطوط بھی ہمارے پاس آتے ہیں ہم ان کی تعمیل کرتے ہیں پھر اس نے امام سفیان کے بارے میں پوچھا تو فرمایا وہ اندر چلے گئے ہیں پھر امام اوزاعی ان کے پاس گئے اور فرمایا کہ یہ شخص صرف آپ ہی سے ملنے آیا ہے، امام سفیان باہر نکلے سلام کیا اور مزاج پوچھا، عبدالصمد بولا ابوعبداللہ! میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے مناسکِ حج (کے مسائل) لکھ لوں، فرمایا کہ میں اس سے زیادہ مفید باتیں تم کو کیوں نہ بتاؤں؟ بولا وہ کیا؟ فرمایا تم اس عہدے سے دستبردار ہو جاؤ۔ بولا امیر المومنین کے ساتھ میں یہ معاملہ کیسے کر سکتا ہوں، میری ہمت نہیں پڑتی، فرمایا اگر تم خدا کے لئے ایسا کرو گے خدا تعالیٰ منصور سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ امام اوزاعیؒ نے بات کاٹتے ہوئے فرمایا: ابوعبداللہ! یہ قریشی لوگ ہیں یہ ہم سے اسی وقت راضی ہو سکتے ہیں جب ان کے حسب حیثیت ان کا اعزاز و اکرام کیا جائے۔ امام سفیانؒ نے فرمایا کہ ابوعمرو! ہم ان کو سزا دے کر یا مار پیٹ کر درست کرنے کی تو طاقت نہیں رکھتے اس لئے اس طریقہ سے ہم ان کو تنبیہ و تادیب کرتے ہیں۔ مفضل کہتے ہیں کہ امام اوزاعی نے فرمایا کہ اب ہم کو یہاں سے چل دینا چاہئے مجھے خطرہ ہے کہ یہ ابھی اپنے کارندوں کو بھیج کر ہماری گردنوں میں رسی ڈال دے گا اور امام سفیان کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے[2]۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منصور ابھی تک ان سے اتنا ناراض نہیں ہوا تھا کہ ان کو گرفتاری اور قتل کا حکم دیتا ورنہ عبدالصمد ان سے علی الاعلان اس نیازمندی کے ساتھ نہ ملتا، البتہ اس

---

[1] جیسا کہ وہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے ساتھ کر چکا تھا۔ [2] یہ پورا بیان خطیب بغدادی کا ہے ممکن ہے امام اوزاعی نے کسی خاص وجہ سے ایسا فرمایا ہو، ورنہ ان کی زندگی خود اس طرح کے جرأت آمیز پرخطر واقعات سے پر ہے۔

گفتگو کے بعد جیسا کہ امام اوزاعیؒ نے فرمایا یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان کی جان کی خیر نہیں ہے۔

یہ واقعہ غالباً ۱۵۸ھ سے پہلے کا ہے اس لئے ابن سعد اور طبری کا بیان ہے کہ ۱۵۸ میں منصور نے ان کو گرفتار اور قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور یہ بھی تمام تذکروں میں ہے کہ جس سال اس نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا اسی سال ان کا انتقال ہوا اور اس کے انتقال کا سنہ بھی ۱۵۸ھ ہے کیونکہ جس سال ان کے قتل کا اس نے حکم دیا تھا وہ خود مکہ آنے والا تھا جب وہ آنے والا تھا تو دوسرے امیر حج کیوں مقرر کرتا ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ امیر عبدالصمد کی گفتگو کے بعد جب وہ ان کی معاونت سے بالکل مایوس ہو چکا تھا تب اس نے یہ قدم اٹھایا، گرفتاری اور ارادۂ قتل کی تفصیل یہ ہے۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ ۱۵۸ھ میں منصور نے مکہ کے امیر کو لکھا کہ سفیان اور چند دیگر اصحاب کو گرفتار کر کے دربار خلافت میں بھیج دیا جائے ابراہیم نے امام سفیانؒ کو بلا کر دریافت کیا کہ وہ بغداد جانا چاہتے ہیں یا نہیں؟ انہوں نے صاف انکار کیا۔ ابراہیم کو غالباً ان سے کچھ تعلق خاطر تھا اس لئے ان کو روپوش ہو جانے کا مشورہ دیا۔ وہ روپوش ہو گئے اور اس نے دکھانے کے لئے ان کی روپوشی کا ڈھونڈورا پٹوا دیا۔ اور گرفتاری پر انعام بھی مقرر کیا۔ طبری نے بھی یہ واقعہ لکھا ہے مگر اس نے یہ لکھا ہے کہ اس نے انہیں گرفتار کر کے چھوڑ دیا جس سے منصور ابراہیم سے ناراض ہو گیا۔

غالباً منصور کو یہ علم ہو گیا ہو گا کہ امام سفیانؒ مکہ ہی میں ہیں۔ اس نے جب وہ اسی سال حج کے ارادہ سے چلا تو یہ حکم بھی جاری کر دیا کہ امام سفیان جہاں ملیں ان کو اس کے مکہ پہنچنے سے پہلے پھانسی دے دی جائے[1]۔

خطیب کا بیان ہے کہ منصور جس وقت بغداد سے چلا اسی وقت یہ حکم دیدیا کہ سفیان جہاں ملیں ان کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی جائے چنانچہ یہاں ان کی پھانسی کی پوری تیاری مکمل ہو گئی۔ فضیل بن عیاضؒ اور ابن عیینہؒ جو اس وقت ان کے پاس موجود تھے ان کو خبر ملی تو انہوں نے امام سے کہا کہ ابو عبداللہ! ایسا نہ ہو کہ دشمن ہم پر شماتت کریں اور ہنسیں، چنانچہ امام اسی وقت کعبہ میں پہنچے اور کعبہ کا پردہ پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! منصور کعبہ میں داخل نہ ہونے پائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی اور وہ مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی بیر میمون پہنچ کر انتقال کر گیا جب امام سفیان کو لوگوں نے خبر پہنچائی تو وہ کچھ نہیں بولے[2]۔

---

[1] خطیب کے علاوہ بھی دوسرے تذکرہ نگاروں نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

[2] یہ واقعہ خطیب اور ابن عماد دونوں کے بیان کو سامنے رکھ کر نقل کیا ہے۔

تعجب ہے کہ اس اہم واقعہ کا ذکر تمام تذکرہ نگار کرتے ہیں مگر اس کے کسی متعین سبب پر کلام نہیں کرتے کہ اتنا بڑا قدم منصور نے کیوں اٹھایا جب کہ اس طرح کا قدم اس نے امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے خلاف بھی نہیں اٹھایا تھا حالانکہ امام ابوحنیفہؒ نے علی الاعلان زید ابن علی وغیرہ کی حمایت کی تھی اور امام مالکؒ بھی طلاق مکرہ کے پردہ میں جبریہ بیعت خلافت کی تردید کر چکے تھے۔ اس سلسلہ میں ابن عماد نے صرف اتنا لکھا کہ

کان سفیان کثیرا لخط علی المنصور لظلم فھم بہ واراد قتلہ فما امھلہ اللہ۔[1]

''امام سفیان منصور کے اس کے ظلم وتشدد کی وجہ سے اس پر بہت سخت تنقید کیا کرتے تھے اس لئے وہ ان سے ناراض ہوگیا اور ان کے قتل کا ارادہ کرلیا مگر خدا نے اسے اس کا موقع نہ دیا''۔

مہدی اور امام سفیانؒ:

منصور کے بعد مہدی تخت نشین ہوا۔ امام سفیانؒ نے ابتدا میں اس کیساتھ بھی اپنا وہی طرز عمل رکھا جو منصور کا بیان ہے اور مہدی بھی ان کی تمام تنقیدوں اور نصیحتوں کو گریز کرتا رہا لیکن آخر میں وہ بھی منصور کے نقش قدم پر چل پڑا۔

مہدی کی ان سے ملاقات اور اس کی ناراضگی کے سلسلہ میں دو واقعے تذکروں میں منقول ہے، ایک یہ کہ مہدی خلیفہ ہوا تو امام سفیانؒ اس کے دربار میں گئے اور آداب شاہی کا لحاظ نہ کرتے ہوئے عام مسلمانوں کی طرح اس کو بھی سلام کیا۔ مہدی نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا اور کہا کہ آپ ہم سے ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم آپ کو کوئی گزند پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے؟ آپ کو اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ ہم آپ کے خلاف کوئی قدم خواہش نفس سے مغلوب ہوکر نہ اٹھا ڈالیں۔ امام سفیانؒ نے انتہائی بے نیازی اور جرأت سے فرمایا کہ ہاں! اگر آپ اس وقت میرے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں تو آپ کے اوپر بھی ایک عادل اور مالک قدیر ہے جو حق وباطل کے درمیان فیصلہ کرکے رہے گا۔

ربیع حاجب جو اس وقت مہدی کی پشت پر تلوار لئے کھڑا تھا اور جس کو ان کے عامیانہ آداب اور گفتگو سخت ناپسند ہورہی تھی فوراً بولا میرے آقا! اس جاہل کو یہ مجال کہ آپ کے ساتھ اس طرح پیش

---

[1] شذرات جلد ا، ص ۲۵۰

آئے اگر آپ حکم دیں تو اس کی گردن ماردوں، مہدی نے ربیع کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ کم بخت یہ اور ان کے جیسے حضرات لوگ تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم ان کو قتل کر کے سعادت سے محروم ہو جائیں اور اپنا دامن شقاوت و کم بختی سے بھر لیں۔ اس کے بعد مہدی نے کہا کہ ان کو کوفہ کے عہدۂ قضا کا پروانہ عطا کرو اور پروانہ میں یہ بھی لکھ دو کہ ان کے فیصلہ کی اپیل نہیں ہو سکتی چنانچہ ان کو پورے اختیارات کے ساتھ پروانہ دے دیا گیا، وہ پروانہ لے کر باہر نکلے اور نکلتے ہی اس کو دجلہ کے نذر کر دیا اور روپوش ہو گئے اس نے تمام ممالک اسلامیہ میں ان کی تلاش کرائی مگر جب وہ بالکل مایوس ہو گیا تو ان کی جگہ شریک بن عبداللہؒ کو قاضی مقرر کر دیا۔ اسی واقعہ کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

تحرز سفیان و فرید ینه وامسی شریک مرصد للدراهم

''سفیان نے اس سے گریز کیا اور اپنا دامن بچا کر بھاگ نکلے اور شریک روپیوں کی کمین گاہ بن گئے''

اس واقعہ سے ان لوگوں کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے جو یہ لکھتے ہیں کہ امام سفیانؒ نے آخری بار کوفہ کو ۱۵۵ھ[1] میں یا اس سے پہلے چھوڑا اس لئے کہ مہدی ۱۵۸ھ میں تخت نشین ہوا اور اس کی امام سفیان سے یہ ملاقات بغداد میں ہی ہوئی تھی اس سے معلوم ہوا کہ ۱۵۸ھ کے بعد انہوں نے کوفہ چھوڑا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عہدۂ قضا قبول کرنے کے لئے وہ مصر تو تھا مگر ان کے روپوش ہو جانے پر اتنا ناراض نہیں ہوا تھا کہ ان کی جان کے پیچھے پڑ جاتا اس لئے کہ اس کے کسی نقطہ سے شدید ناراضگی کا پتہ نہیں چلتا اور یہ بات اس لئے بھی قرین قیاس ہے کہ مہدی سے ان کی دو ایک اور ملاقاتوں کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ شعرانی نے طبقات الکبری میں لکھا ہے کہ وہ مہدی کے سامنے بارہا کہہ چکے تھے کہ اپنے ان حاشیہ نشینوں اور جو لوگ اپنی ضرورتیں لے کر آپ کے پاس آتے ہیں ان سے ہوشیار رہیئے کیونکہ انہی کے ہاتھوں آپ کی تباہی ہے، یہ آپ کا کھاتے ہیں آپ سے پیسہ وصول کرتے ہیں اور آپ کو فریب دیتے ہیں اور منہ پر آپ کے وہ اوصاف بیان کرتے ہیں جو آپ میں نہیں ہیں[2]۔

مہدی سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر انہوں نے خود کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار مہدی کے پاس گیا، سلام کے بعد اس نے مزاج پرسی کی، میں نے بیٹھتے ہی اس سے کہا کہ مجھے معلوم

---

[1] اس واقعہ کا ذکر ابن خلکان اور شذرات الذہب نے کیا ہے اور بعض لوگ اس کو منصور کے زمانہ کا واقعہ لکھتے ہیں مگر راقم کے نزدیک یہی زیادہ صحیح ہے۔ [2] طبقات جلد ۱۔ ص ۱۴۱

ہے حضرت عمر بن خطاب نے حج کیا تو صرف ۱۶ دینار صرف کئے[1] اور آپ نے پورا بیت المال خالی کر دیا۔ مہدی نے کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی طرح ہو جاؤں؟ فرمایا کہ ہاں! مجھ سے کچھ بلند (معیار) رہیے مگر اپنی موجودہ (فضول خرچی کی) حالت سے کچھ نیچے بھی اترنا چاہئے۔ اسی درمیان میں اس کے وزیر عبداللہ نے کہا کہ ابوعبداللہ! آپ کے جو خطوط ہمارے پاس آتے ہیں ہم ان کی فوراً تعمیل کرتے ہیں[2]۔ امام سفیان نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ مہدی نے کہا میرے وزیر ہیں، امام نے کہا کہ اس سے بچئے یہ نہایت جھوٹا آدمی ہے پھر اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تمہیں کب کوئی خط لکھا ہے؟ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہدی نے کا ابوعبداللہ! اتنی جلدی کیا ہے، بولے ابھی آتا ہوں انہوں نے چلتے وقت اپنے جوتے چھوڑ دیئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے اور جوتے پہن کر باہر ہی سے واپس چلے گئے۔ (غالباً جب دیر ہوئی تو) مہدی نے پوچھا کہ واپس آنے کو کہہ گئے تھے، آئے نہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ ہاں واپس تو آئے تھے مگر اپنے جوتے پہن کر رخصت ہو گئے، ان کی یہ بے نیازی کو اس نے اپنی توہین سمجھی اور سخت ناراض ہوا اور یہ اعلان کر دیا کہ

قد آمن الناس الا سفیان ''سفیان کے علاوہ ہر شخص مامون ہے''۔

اس کے بعد وہ روپوش ہو گئے کچھ دن تو مکہ میں رہے پھر بصرہ چلے گئے اور وہیں وفات پائی[3]۔

غرض یہ کہ امام سفیان'' خلفا کی طلب پر یا کسی اپنی ضرورت سے خلفاء سے کبھی کبھار مل لیتے تھے مگر نہ تو انہوں نے کوئی عہدہ قبول کیا اور نہ کبھی اپنی کوئی ذاتی غرض ان کے پاس لے گئے بلکہ جب بھی ان سے ملے تو ان کو نصیحت کی اور ان کی خواہش یہ بھی تھی کہ دوسرے لوگ بھی خلفا سے اسی حیثیت سے ملیں، کسی نے ایک بار ان سے کہا کہ فلاں شخص مہدی کے پاس جاتا ہے مگر اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اسکی کمزوریوں اور برائیوں سے دور رہتا ہے کہ فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے مہدی اپنے لباس، کھانے پینے، خدم وحشم سواریوں میں اسراف اور فضول خرچی کرتا ہے کیا اس نے ایک دن بھی مہدی کو اس پر ٹوکا کہ مسلمانوں کے بیت المال میں اس طرح کا اسراف اس کے لئے صحیح نہیں ہے[4]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ میں ۱۲ دینار ہے۔ [2] غالباً اس نے یہ ظاہر کرنے لئے یہ بات کہی تھی۔ اپنی ضروریات میں تو ہم سے مدد لیتے ہیں اور پھر اعتراض کرتے ہیں۔ [3] تاریخ بغداد جلد ۹۔ ص ۱۶۰، اس واقعہ کے پہلے ٹکڑے کو بعض لوگوں نے منصور کے زمانہ کا واقعہ بتایا ہے مگر دونوں واقعوں کی تفصیلات میں بڑا فرق ہے اس لئے ممکن ہے کہ دونوں واقعے صحیح ہوں۔
[4] طبقات الکبریٰ جلد ا۔ ص ۴۱

شہرت سے نفرت :

باایں ہمہ علم وفضل شہرت اور نیاز مندی کو پسند نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے میں چاہتا ہوں کہ ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی پہچانتا نہ ہو[1]۔

اوپر ان کی سیرت وکردار کی جو تفصیل کی گئی ہے اس میں ان کے پورے مثنیٰ ان کے معنوی شاگرد امام احمد بن حنبلؒ تھے۔ انشاء اللہ ان کی زندگی کے خط وخال دوسرے حصہ میں پیش کئے جائیں گے۔

وفات :

اوپر ذکر آچکا ہے کہ مہدی کی ناراضگی کے بعد وہ مصر چلے گئے تھے بصرہ میں ان کا قیام زیادہ تر یحییٰ بن سعید اور الہیثم بن منصور کے یہاں تھا مگر آخر میں مشہور محدث عبدالرحمٰن بن مہدی کے مکان میں چلے آئے تھے اسی غربت کدہ میں اس پیکرِ علم وعمل نے ۱۶۱ھ میں وفات پائی امام ذہبی لکھتے ہیں۔

> مات فی البصرة فی الاختفاء من المهدی فانه کان قوالا بالحق شدید الافکار علیه[2]
>
> ''ان کا انتقال بصرہ میں مہدی سے روپوشی کی حالت میں ہوا۔ روپوشی کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ غیر معمولی طور پر حق گو واقع ہوئے تھے اور اس کے اوپر تنقید کرتے تھے۔ (اور وہ ناراض ہوگیا تھا)''

ابن مہدی ان کی وفات کا حال بیان کرتے ہیں کہ جس وقت ان کی وفات ہوئی اس رات انہوں نے نماز کے لئے کئی بار وضو کیا۔ جب صبح ہونے لگی تو مجھ سے کہا کہ ابن مہدی میرا چہرہ زمین پر رکھ دو اب میں کچھ دیر کا مہمان ہوں، یہ جملہ بھی بار بار زبان پر تھا کہ موت کی تکلیف کس قدر سخت ہوتی ہے۔ ابن مہدی لپکے ہوئے حماد بن زید کو اطلاع کرنے گئے کہ راستے میں ان کی ملاقات ان سے ہوگئی وہ اپنے اصحاب کے ساتھ خود ہی آرہے تھے، ابو سلمہ اور حمادؒ ان کے سرہانے کھڑے تھے، حماد نے کہا کہ آپ کو خوشخبری دوں آپ جس بات سے ڈرتے تھے اس سے نجات پاگئے، غالباً گرفتاری اور قتل کی طرف اشارہ ہے اور اب اپنے رب غفور کے حضور میں جارہے ہیں۔ ابو سلمہ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ تم کو امید ہے کہ مجھ جیسے آدمی کی مغفرت ہوجائے گی ابو سلمہ نے کہا اس میں کیا تعجب ہے، اس سے ان پر ایک بشاشت طاری ہوگئی غالباً اس کے بعد ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے[3]۔

---

[1] طبقات الکبریٰ جلد ۱ ص ۴۲ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۶ [3] صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۸۸

وفات سے کچھ دیر پہلے آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ یہاں میرے وطن کے بھی کچھ لوگ موجود ہیں، لوگوں نے نگاہ دوڑائی تو دو ممتاز آدمی نظر آئے ایک عبدالرحمٰن بن ملک دوسرے حسن بن عیاش چنانچہ عیاش کے سپرد اپنا ترکہ کیا اور عبدالرحمٰن بن عبدالملک کو نماز جنازہ پڑھانے کی وصیت کی، جب جنازہ رکھا گیا اور معلوم ہوا کہ نماز جنازہ عبدالرحمٰن بن عبدالملک پڑھائیں گے تو بعض لوگوں نے اس وجہ سے اعتراض کیا کہ ان کا سفیان کے خانوادہ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کی وصیت ہے تو سب لوگوں نے بخوشی نماز پڑھانے کی ان کو اجازت دی [1]۔

سمعانی کے بیان کے مطابق ان کو قبرستان بنوکلیب میں عشاء کے وقت دفن کیا گیا ان کا انتقال صبح ہی کو ہو چکا تھا غالباً حکومت کی طرف سے رات کو ان کو دفن کیا گیا۔

اولاد :

ابن خلکان لکھا ہے کہ ولم یعقب کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ ابن سعد وغیرہ کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ایک صاحبزادے تھے جس سے وہ بے حد مانوس تھے لیکن وہ ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے [2]۔ جس کا ان کو شدید رنج ہوا۔

تصنیفات :

اپنی کوئی مادی یادگار تو چھوڑی نہیں مگر تحریری صورت میں اپنی معنوی یادگاریں بہت سی چھوڑ گئے۔ خطیب بغدادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتابیں اپنی زندگی ہی میں دریا برد کر دی تھیں، اور اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کوفہ سے نکلے تو اپنی تمام کتابیں چھوڑ گئے، بصرہ پہنچ کر انہوں نے اپنے بعض اصحاب سے فرمائش کی کہ کوفہ جا کر ان کی کتابیں لے آئیں مگر خلیفہ کے خوف سے کسی نے ہمت نہیں کی، چنانچہ انہوں نے اپنے ایک شاگرد سے جب یہ فرمائش کی تو وہ بولے کہ میں آپ کے پاس اپنی آمد و رفت کی وجہ سے اپنی جان کو ڈرتا رہتا ہوں یہ کیسے ممکن ہے کہ میں کوفہ جا کر آپ کی کتابیں لاؤں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ انہوں نے خوف سے اپنی کتابیں پھینک دی تھیں لیکن بصرہ پہنچ کر ان کو اطمینان ہوا تو منگوا لیں اور پھر ان کی تحدیث کی۔ ان کتابوں کی ضخامت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ عبداللہ بن عبداللہ اور یزید بن توبہ کا جنہوں نے یہ ذخیرہ جمع کیا تھا۔ بیان ہے۔

فاخرجنا تسع قمطرات کل واحد الی ھنا واشار الی اسفل من سلدہ (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۱)

---

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۰ [2] ابن سعد ج ۶ ص ۲۵۷

''ہم نے ان کتابوں کو اکٹھا کیا تو نو بکس تھیں اور ہر بکس سینہ کے قریب قریب اونچا تھا''۔

اس سے ابن قتیبہ ؒ کے اس بیان کی تردید ہو جاتی ہے کہ انہوں نے موت کے وقت اپنی کتابیں نذر آتش کر دیں تھی۔

مگر افسوس ہے کہ اس ذخیرہ میں سے صرف دو چار مختصر کتابوں کے علاوہ اس وقت ان کے موجود ہونے کا علم نہیں ہے، مگر جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ چوتھی صدی تک تبعین موجود تھے، اس لئے یہ قیاس کی جا سکتا ہے کہ چوتھی صدی تک کم از کم ان کی فقہی کتابیں ضرور متداول رہی ہوں گی۔

مولانا امتیاز علی صاحب عرشی نے ان کی تصنیفات کی جو تفصیل اپنے مضمون مطبوعہ معارف ۱۹۳۵ء میں دی ہے اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

(۱) **الجامع الکبیر فی الفقہ۔**

یہ کتاب ابوبکر محمد بن ابی الخیر الاموی نے چوتھی صدی ہجری میں اور علامہ محمد عابد بن احمد علی سندی نے تیرھوی صدی ہجری کے نصف اول میں پڑھی تھی [۱]۔

(۲) **الجامع الصغیر۔**

(۳) کتاب الفرائض، یہ کتاب بھی محمد بن عابد سندی نے پڑھی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب بھی ۱۳ ویں صدی تک موجود تھی۔

(۴) کتاب التفسیر یہ کتاب بھی محمد عابد سندی نے پڑھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی تیرہویں صدی تک اہل علم میں متداول رہی ہے، اس تفسیر کا ایک حصہ جو مخطوطہ ہے کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، جسے غالباً مولانا امتیاز علی صاحب عرشی نے طبع بھی کرا دیا ہے، راقم کی نظر سے یہ درمکتوں نہیں گذرا ہے۔

عقیدہ :

پہلی صدی ہجری میں بعض سیاسی اختلافات کی بنا پر شیعیت و خارجیت پیدا ہوئی، لیکن پہلی صدی کے آخر اور دوسری صدی کے شروع میں فلسفہ شیعیت اور خارجیت کے بطن سے بعض اور فرقے بھی پیدا ہوئے جن میں معتزلہ، جہیمہ، قدریہ، مرجیہ وغیرہ بہت زیادہ مشہور ہوئے، ان فرقوں کی اصل گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے ذات وصفات کے بارے میں بیجا موشگافیاں شروع کر دی تھیں، اور مسئلہ کے ایک ہی پہلو پر ان میں اصرار اور غلو پیدا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے شریعت کی سادہ تعلیم اور اس کا

۱۔ ابن ندیم ص ۲۷۵　　　۲۔ حصر الشارد مخطوطہ حرف میم مصنف ۱۲۴۰ھ

دامن اعتدال واغدار ہورہا تھا۔اس بنا پر علمائے اہل حق نے ان خیالات کی تردید کی ہے،اوران کی اس گمراہی پر انہیں متنبہ تو کیا،مگر کسی نے ان کی قطعی تکفیر نہیں کی،ان فرقوں اوران کے پیدا کردہ مسائل کا چرچا زیادہ تر کوفہ اور بصرہ میں رہتا تھا۔گواس سے ممالک اسلامیہ کے دوسرے مقامات کے علماء بھی متاثر ہوئے تھے،مگران کا سب سے زیادہ مقابلہ کوفہ،بغداداور بصرہ کے علماء کوکرنا پڑتا تھاامام سفیان بھی چونکہ یہیں کے باشندے تھے اور یہیں ان کی مجلس درس تھی،اس لئے ان سے بھی ان فرقوں کے خیالات کے بارے میں سوال کئے جاتے تھے،خاص طور پر جن مسائل کے بارے میں ان سے سوال کئے گئے وہ یہ ہیں خلق قرآن،ایمان کی زیادتی،وکمی،ایمان صرف یقین کا نام ہے،یااس میں عمل بھی شامل ہے وغیرہ چنانچہ ان تمام مسائل کے بارے میں اپنی رائے انہوں نے اپنے ایک شاگرد جریر بن شعیب کولکھادی تھی،ان کی اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،قرآن خدا کا کلام ہے،اور غیر مخلوق ہے خدا کی ذات ہی اس کا مبداء اور معاد ہے جواس کے خلاف کہتا ہے وہ کفر کی بات کہتا ہے۔

ایمان،قول عمل اور نیت کے مجموعے کا نام ہے،اوراس میں کمی وزیادتی بھی ہوتی ہے اور دیکھو شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو مقدم رکھنا،اس کے بعد فرمایا کہ شعیب!میں نے جو کچھ لکھایا ہے،وہ تمہیں اسی وقت فائدہ پہنچائے گا جب تم ان باتوں کو بھی صحیح سمجھو وہ باتیں یہ ہیں۔

(۱)موزوں پر مسح کرنا(۲)بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھنے کے مقابلہ میں آہستہ پڑھنا زیادہ بہتر ہے(۳)تقدیر پر ایمان رکھنا(۴)ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھ لینا(۵)جہاد قیامت تک جاری رہے گا(۶)حکومت کے جھنڈے کے نیچے رہنا خواہ حکومت ظالمانہ ہو یا عادلانہ،شعیب نے یہاں سوال کیا کہ تمام نمازیں ہم ان کے پیچھے پڑھ لیا کریں؟ فرمایا صرف جمعہ یا عیدین جن کے پیچھے مل جائے پڑھ لومگر دوسری نمازوں میں تمہیں اختیار ہے کہ جس پر پورا اعتماد ہواوراس کے بارے میں تم کو علم ہو کہ یہ اہل سنت میں ہے اسی کے پیچھے پڑھو،جب تم قیامت میں خدا کے روبرو حاضر ہونا اور تم سے سوال ہوتو عرض کردینا کہ مجھے یہ باتیں سفیان نے بتائی ہیں اور تم میرا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا[1]۔

عام محدثین صفات باری کے سلسلہ میں کسی قسم کی تاویل وتدقیق کو صحیح نہیں سمجھتے تھے،مثلاً استواء علی العرش،ید اللہ،وجہ اللہ وغیرہ کی کیفیت معلوم کرنے اوران کی مادی تحدید یا تردید کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے تھے،چنانچہ امام مالکؒ کا جملہ ضرب المثل بن گیا ہے کہ استواء علی العرش معلوم ہے،اوراس

---

[1] تذکرۃ الحفاظ قلمی ص ۲۱۴

کی کیفیت مجہول ہے، اس پر ایمان واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال اور بحث ومباحثہ بدعت ہے، شہرستانی نے لکھا ہے کہ صفات باری کے بارے میں یہی روش امام سفیان، امام داؤد اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کی بھی تھی۔

اس نے لکھا ہے کہ چونکہ تمام سلف صالحین صفات الٰہی کو صفات خیریہ کہتے ہیں اور اس میں کوئی تاویل نہیں کرتے، اور معتزلہ بالکل ہی اس کی نفی کرتے ہیں، اس لئے سلف کو ہم صفاتیہ اور معتزلہ کو معطلہ کہتے ہیں۔ (جلد ۱ صفحہ ۶۶ ترجمہ فارسی)

امام سفیانؒ فرقہ مرجیہ کے سخت مخالف تھے، حتی کہ ان کی نماز جنازہ تک نہیں پڑھتے تھے اسی طرح اہل نجوم کو بھی بری نظر سے دیکھتے اس وقت بغداد میں ایک مشہور منجم ماشاء اللہ نامی تھا، ایک بار اس سے ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ ماشاء اللہ! تم زحل سے ڈرتے اور مشتری سے امید باندھتے ہو، اور میں زحل کے رب سے خوف کھاتا اور مشتری کے خالق سے آس لگاتا ہوں، تم روزانہ صبح کو پخترد یکھتے ہو اور میں خدا سے استخارہ کرتا ہوں، دیکھو ہم دونوں میں کس قدر فرق ہے، ماشاء اللہ نے اعتراف کیا کہ امام سفیان کا عقیدہ اس کے عقیدہ سے بہتر ہے۔

زرین اقوال :

امام سفیانؒ کا حال اور قال دونوں یکساں تھا حال کی کچھ تفصیل آپ نے اوپر پڑھ لی، اب کچھ قال کے نمونے بھی ملاحظہ فرمایئے۔

علماء کا بگاڑ :

فرمایا کہ جب علماء میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے تو ان کی اصلاح کون کر سکتا ہے، ان کا بگاڑ دنیا کی طرف ان کا میلان ہے، وہ دین کے طبیب ہیں، اور روپیہ پیسہ مرض ہے، تو جب طبیب خود ہی مرض کو پال لینے پر تل جائے تو اس کا علاج کون کر سکتا ہے۔

اگر میں جانتا کہ لوگ علم رضائے الٰہی کے لئے طلب کرتے ہیں تو خود ان کے گھر جا کر ان کو تعلیم دیتا، لیکن لوگ اس لئے علم حاصل کرتے ہیں کہ ان کو لوگوں میں مقبولیت حاصل ہو اور حدثنا سفیان کہہ کر اپنی مجلس میں رونق پیدا کریں۔

اہلِ علم کی فضیلت :

فرمایا کہ جب کوئی خدا سے تقوی اختیار کرنے کے لئے علم حاصل کرتا ہے تو اس جذبہ ہی کی وجہ سے دوسروں پر اس کو فضیلت ہوتی ہے، علماء تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ عالم جو اللہ کو پہچانتا

ہےاوراس کے احکام واوامر کوبھی ،اس کی علامت یہ ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا ہےاوراس کےاوامر اور حدود کالحاظ کرتا ہے،دوسرے وہ عالم جواللہ کو پہچانتا ہےمگراس کےاوامر سے ناواقف ہےاس کی علامت یہ ہے کہ خدا سے ڈرتا تو ہومگراس کےاوامر کی اچھی طرح پرواہ نہ کرتا ہوتیسرے وہ عالم جواوامر ونہی سے تو واقف ہومگر خدا کاعلم اسے نہ ہواس کی پہچان یہ ہے کہ وہ نہ خدا سے ڈرتا ہےاور نہ اس کےاوامر کی پرواہ کرتا ہے۔

زمانہ کی خرابی :

فرمایا کہ مجھے گمان ہے کہ میں اس برے وقت زندہ نہیں رہوں گا کہ جب زندوں کا ذکر کیا جائے تو قلب مردہ ہوجائے ،اور جب مردوں کا ذکر کیا جائے تو قلب میں زندگی پیدا ہوجائے مقصد یہ تھا کہ مسلمانان درگوراور مسلمانی درکتاب کازمانہ آنے سے پہلے ہی میری موت آجائے تواچھا ہے۔

نصیحت پذیری :

بڑے افسوس کے لہجہ میں فرماتے تھے کہ اے اللہ! جانوروں کو جب چرواہا ڈانٹتا ہے،تو اس ڈانٹ کااس پراثر پڑتا ہےاورفوراً اپنی خواہش سے باز آجاتا ہے لیکن میں تیری کتاب کی ہدایتوں اور وعیدوں کااپنی خواہش نفس پرکوئی اثر نہیں رکھتا۔

طالب علم :

فرمایا کہ میں پسند کرتا ہوں کہ علم دین کے طلب کرنے والے اچھے حال میں رہیں اس لئے کہ اگر وہ محتاج اورذلیل ہوں گے توان کوآفتوں اورلوگوں کی زبان درازیوں کاسب سے زیادہ سابقہ پڑے گا۔

حلال کمائی :

فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے نصیحت کی خواہش کی تو فرمایا کہ انـــظـــر خبزک من این ھو ،اس پر نظر رکھو کہ تمہاری روٹی کہاں سے آتی ہے۔

شکایت :

مریض کااپنے کسی بھائی سے اپنا حال کہنا خدا کاشکوہ نہیں ہے۔

ائمہ عدل :

فرمایا کہ ائمہ عدل پانچ ہیں،خلفائے راشدین حضرت ابوبکرؓ ،حضرت عمرؓ ،حضرت عثمانؓ ، حضرت علیؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ ،اگر کوئی شخص ان کے علاوہ کسی کواس فہرست میں داخل کرتا ہے تو زیادتی کرتا ہے۔

دعوت :

فرمایا کہ اپنے اسی بھائی کی دعوت قبول کرو جس کا کھانا کھانے کے بعد تمہارے دل میں صلاح پیدا ہونے کی امید ہو۔

رازق خدا ہے :

ایک دن امراء کے کسی درباری کو نصیحت کی اس نے کہا کیا کروں اپنے بال بچوں کی وجہ سے ایسا کرتا ہوں، لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ذرہ اس شخص کو دیکھو اس کا گمان ہے کہ اگر وہ خدا کی نافرمانی کرے گا تو وہ اس کے اہل وعیال کو روزی دے گا، اور اگر اطاعت کرے گا تو وہ ان کو بے یارومددگار چھوڑ دے گا۔

فرمایا کہ اہل وعیال والے بہت کم حرام اور مشتبہات سے بچتے ہیں، اس پر ان کا عذر یہ ہوتا ہے کہ ہم اہل وعیال رکھتے ہیں۔

دنیا کی محبت :

فرمایا کہ اگر کوئی بندہ تمام مامورات کے ساتھ خدا کی عبادت کرے، مگر دنیا کی محبت میں بھی سرشار ہو تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ علی رؤس الاشہاد فرمائے گا کہ فلان بن فلاں نے ایسی چیز سے محبت کی جو اللہ کو ناپسند تھی، تو یہ سن کر اس پر شدید شرمندگی کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔

دولت سے بچنے کے لئے مال :

فرمایا کہ میں دس ہزار درہم چھوڑ جاؤں اور اس پر میرا محاسبہ ہو، یہ چیز میرے لئے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں فقیر ہو کر لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کروں، اس لئے کہ اس سے پہلے مال کو ناپسند کیا جاتا تھا مگر اب یہ مومن کی ڈھال ہے جو اس کو امراء و اہل دولت سے سوال کرنے کی ذلت سے محفوظ رکھتا ہے (مشکوٰۃ)

عطیہ :

وہ لوگوں کے عطیات واپس کر دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں جان جاؤں کہ مجھ کو دے کر لوگ اس پر فخر نہ محسوس کریں گے تو میں ضرور ان کے عطیات لے لوں اسی وجہ سے وہ بھوکے رہ جاتے تھے، مگر کبھی قرض نہیں لیتے تھے، فرماتے کہ لوگ اس کو چھپا نہیں پاتے اور خوش ہو کر کہنے لگتے ہیں کہ سفیان ثوری کل میرے یہاں قرض لینے آئے تھے۔

کلمۂ حق کا بلند کرنا سب سے افضل ہے:

فرمایا کہ خراسان میں اذان دینا، مکہ کی مجاورت سے زیادہ افضل ہے۔

زہد کی حقیقت :

فرماتے تھے کہ زہد فی الدنیا خواہش وتمنا کو کم کرنے کا نام ہے، موٹا جھوٹا پہننے، روکھا سوکھا کھانے یا عباپوشی کا نام نہیں ہے، فرمایا کہ بہت لوگ مال رکھتے ہوئے بھی زاہد ہوتے ہیں، اور بعض خالی ہاتھ اس کی محبت میں پڑے رہتے ہیں یعنی وہ ظاہر تو کرتے ہیں کہ وہ زاہد ہیں مگر ان کا دل دنیا میں لپٹا ہوتا ہے۔

اپنی حقیقت :

فرمایا کہ جب آدمی اپنے نفس کی حقیقت جان لے تو پھر اس کو کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

سفر کی رفاقت :

فرمایا کہ تم اپنے سے زیادہ دولت مند اور بلند آدمی کے ساتھ سفر نہ کرو کیونکہ اگر تم اس کے برابر خرچ کرو گے تو اس سے تم کو نقصان ہوگا۔ اور اگر وہ زیادہ خرچ کرے گا تو تم کو اپنا غلام بنا لے گا۔

اہلِ علم کا حال :

میں نے جب کسی اہل علم کی مخالفت کی تو جان کا خطرہ محسوس کیا، جب تم کو کسی اہل علم سے کوئی ضرورت ہو تو اس کا ذکر دوسرے اہل علم سے نہ کرو ورنہ وہ اس میں حارج ہوگا۔

فرمایا کہ پہلے علم کی طلب ہونی چاہئے پھر اس پر عمل ہونا چاہئے پھر خاموشی اختیار کرنی چاہئے پھر اس میں غور وفکر کرنا چاہئے فرمایا کہ جو شخص اپنے علم وعمل کو اپنے دوسرے بھائی سے بہتر سمجھنے لگے تو اس نے اپنے علم وعمل دونوں کا اجر ضائع کر دیا کیا عجب ہے کہ اس کا بھائی اس سے زیادہ متورع اور متقی ہو۔

کاش لوگ علم کے مطابق عمل کرنے میں اخلاص برتتے تو یہ بہت افضل تھا۔

دوستوں کی کثرت :

فرماتے تھے کہ دوستوں کی کثرت دین کی کمزوری کی علامت ہے۔

گم نامی:

فرمایا کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں گم نام آدمی بھی (برائی سے) مامون نہیں ہے، تو پھر مشہور آدمی کیسے مامون ہو سکتا ہے۔

بدعت :

فرمایا کہ تم کسی بدعت کا ذکر و چرچا سنو تو اس کو نہ تو دوسروں سے بیان کرو، اور نہ اپنے دل میں اس کو جگہ دو۔

امراء کی صحبت :

کسی نے کہا کہ آپ امراء اور والیوں سے کیوں نہ خلاملا رکھیں، تا کہ آپ بھی محفوظ رہیں، اوروں کو نصیحت کر کے ان کی برائیوں پر ٹو کنے کا موقع بھی ہاتھ آ جائے۔ فرمایا کہ تم لوگ چاہتے ہو کہ میں دریا میں تیروں بھی اور میرے پیر بھی بھیگنے نہ پائیں، میں ان کے یہاں جانے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ میری آؤ بھگت کرنے لگے تو میں ان کی طرف مائل نہ ہو جاؤں، اور میرے سارے اعمال ضائع ہو جائیں۔

ایک بار فرمایا کہ اگر کسی سپاہی کو دیکھو کہ نماز کے وقت سو رہا ہے تو اس کو جگاؤ نہیں اس لئے کہ اٹھے گا تو خلق خدا کو تکلیف پہنچائے گا تو اس کا سونا ہی بہتر ہے مقصد یہ تھا کہ خلق خدا کو ایذا پہنچانا ایک وقت کی نماز چھوڑنے سے بھی زیادہ برا کام ہے۔

بال بچوں کی پرورش کی ذمہ داری :

کسی نے پوچھا کہ ایک شخص اپنے بال بچوں کے لئے محنت مزدوری کر کے کماتا ہے، اگر وہ نماز با جماعت کا انتظار کرتا ہے تو اس سے اس میں رخنہ پڑتا ہے، تو وہ کیا کرے؟ فرمایا کہ اپنے بال بچوں کی روزی حاصل کر اور تنہا نماز پڑھ لے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت یحییٰ بن آدمؒ

خراج اسلامی حکومت کی آمدنی کا ایک شعبہ ہے، اس کا قیام آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں اس میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا۔ حضرت عمرؓ نے البتہ حکومت کے دوسرے شعبوں کی طرح اس کو ایک حد تک منظم کیا، اور اس کے انتظام میں بہت سے تغیرات کئے، اس کے بعد سے برابر اس شعبہ میں اصلاح و ترقی ہوتی رہی لیکن ڈیڑھ صدی تک اس کا کوئی مکمل تحریری دستور مرتب نہیں ہوا، ۱۷۰ھ میں جب ہارون رشید خلیفہ ہوا، تو اس نے کام کی طرف توجہ کی، اور قاضی ابو یوسفؒ سے اس موضوع پر ایک خاص کتاب لکھنے کی درخواست کی، انہوں نے اس مبارک کام کو اپنے ذمہ لیا اور کتاب الخراج کے نام سے ایک کتاب لکھ کر ہارون رشید کے سامنے پیش کی، کتاب کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب صرف خراج یعنی اسلامی ٹیکس سے متعلق ہوگی لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ یہ کتاب اسلامی حکومت کی مالی آمدنی اور خراج کا ایک مکمل دستور ہے۔

امام ابو یوسفؒ ہی کے زمانہ یا اس کے قریب قریب اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، جن میں یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج اور ابو عبیدہ کی کتاب الاموال زیادہ مشہور ہیں۔

اول الذکر یعنی امام ابو یوسفؒ اور ان کی کتاب کا ذکر کتاب کے شروع میں آچکا ہے اور اس کتاب کا خاتمہ ثانی الذکر کے سوانح حیات اور ان کی حیات اور ان کی کتاب کے تعارف پر کیا جاتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ثالث الذکر کا تذکرہ کتاب کے دوسرے حصہ میں آئے گا۔

حضرت یحییٰ بن آدمؒ:

یحییٰ نام ابوزکریا کنیت، پورا سلسلہ نسب یہ ہے، یحییٰ بن آدم[1] بن سلیمان الاموی[2] یحییٰ کے دادا سلیمان کا کوئی تذکرہ رجال کی کتابوں میں نہیں ملتا، ان کے والد آدم البتہ حدیث کے ثقہ راویوں

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۷۵، امام نووی نے آدم اور سلیمان کے درمیان علی کے نام کا ایک اضافہ کیا ہے جو عام تذکروں کے بیان کے خلاف ہے

[2] اموی نسبت ولائی ہے، نسبی نہیں یعنی ان کے والد آدم خالد بن خالد اموی کے غلام تھے اس وقت یہ عام دستور تھا کہ غلام اپنے آقا کی نسبت کے ساتھ منسوب ہوتے تھے، اس طرح یحییٰ بھی غلامان اسلام کی فہرست میں داخل ہیں، لیکن خود خالد اور اس کے باپ اور دادا کے متعلق اہل تذکرہ خاموش ہیں، خالد کا جد اعلیٰ عقبہ بن معیط جو رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں مشہور تھا۔ بدر کے روز گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا البتہ اس کے لڑکے ولید نے فتح مکہ کے روز اسلام قبول کیا۔ خالد کا مختصر تذکرہ ابن سعد نے کیا ہے۔ (ج ۶ ص ۲۳۳)

میں ہیں، ابن سعد اور تہذیب میں ان کا تذکرہ موجود ہے[1]۔ صحیح مسلم میں وکیعؒ کی سند سے ان کی ایک روایت بھی موجود ہے۔

سنہ ولادت :

اہل تذکرہ نے یحییٰ کے سن ولادت کی کوئی تصریح نہیں کی ہے۔ لیکن بعض قوی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۰ھ یا اس کے کچھ قبل یا بعد ان کی ولادت ہوئی وہ قرائن یہ ہیں۔

۱۔ تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ ان کی وفات ۲۰۳ھ میں ہوئی۔

۲۔ ان کے شیوخ میں مسعر بن کدامؒ متوفی ۱۵۵ھ یا ۱۵۳ھ اور قطر بن خلیفہ متوفی ۱۵۵ھ ہیں، اس حساب سے ان کے اور یحییٰ کے سنہ وفات میں تقریباً ۵۰ برس کا فرق ہے۔

۳۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت تک بالکل چھوٹے بچوں کو سماع حدیث (حدیث سنانے) کا دستور نہیں شروع ہوا تھا بلکہ جب وہ سن شعور کو پہنچ جاتے تھے، تب شیوخ انہیں اپنے حلقۂ درس میں لیتے تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ مسعر بن کدام ۱۵۵ھ یا ۱۵۳ھ وغیرہ سے سماع کے وقت کم از کم ان کی عمر ۱۵ برس کی رہی ہوگی۔

اس اعتبار سے اگر مسعر بن کدام کا سنہ وفات ۱۵۳ قرار دیا جائے تو وفات کے وقت یحییٰ کی عمر ۶۵ سال اور اگر ۱۵۳ھ قرار دیا جائے تو ۶۳ برس کی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ ان کا سنہ ولادت ۱۳۸ھ یا ۱۴۰ھ قرار دینا پڑے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تعلیم وتربیت :

تذکرہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی تعلیم وتربیت کہاں اور کس کی نگرانی میں ہوئی اور انہوں نے کیا کیا علوم حاصل کیے، لیکن ان کے شیوخ کی فہرست اور ان کی کتاب کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خالص دینی علوم کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی تھی۔ اور اس کے حصول کے لئے تقریباً تمام علمی مراکز مثلاً: مکہ، مدینہ، کوفہ، حمص وغیرہ میں پہنچے، اور خصوصیت سے قرآن، حدیث کسی حد تک فقہ میں بھی دسترس بہم پہنچائی۔

ان کے شیوخ کی فہرست میں حمزہ بن حبیب الزیات بھی ہیں، جو علم قرأت کے امام ہیں، ان کے تلمذ کی وجہ سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید انہوں نے علم قرأت میں بھی کچھ دستگاہ بہم پہنچائی ہو۔

---

[1] تہذیب جلد اول۔ ص ۱۹۶

شیوخ کی فہرست :

اُن کے شیوخ کے جو نام مل سکے ہیں، ان کی تعداد ۹۰ ہے جن میں سے ۷۳ سے انہوں نے کتاب الخراج میں اور باقی ۱۷ سے دوسری کتابوں میں روایت کی ہے۔ ان کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

ابراہیم بن حمید بن عبدالرحمٰن الرؤاسی، ابراہیم بن حمید الزبرقانی التیمی، ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی، اسرائیل بن یونس بن ابی اسحاق السبیعی، اسماعیل بن ابراہیم بن مقسم بن علیہ، اسماعیل بن عیاش ابن سلم العنصی الحمصی، ابوایاس، (عبدالملک بن جویہ) ایوب بن جابر بن سیار الحنفی السحیمی الیمامی، ابوبکر ابن عیاش بن سالم الاسدی، ابوبکر بن النہشلی الکوفی، جریر بن عبدالحمید الضبی، جعفر بن زیاد الاحمر، حاتم بن اسماعیل المدنی الحارثی، حیان بن علی العنزی الکوفی، حسن بن ثابت الثعلبی الاحول، الحسن ابن صالح بن صالح بن حی، ابوعبداللہ الثوری الکوفی، الحسن بن عیاش بن سالم الاسدی الکوفی، حسین بن زید بن علی بن الحسین، حفص بن غیاث بن طلق القاضی، حماد بن زید بن درہم، حماد سلمہ بن دینار ابوسلمہ، حمید بن عبدالرحمٰن بن حمید الرواسی، زہیر بن معاویۃ الجعفی الکوفی، زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی، سعید بن سالم بن ابی الہیفاء، سعد بن عبدالجبار الزبیدی الحمصی، سفیان بن سعید بن مسروق الثوری الامام، سفیان بن عیینہ ابن ابی عمران الہلالی، سلا بن سلیم ابوالاحوص الحنفی الکوفی، ستان بن ہارون البرجمی، شریک بن عبداللہ ابن ابی شریک القاضی النخعی الصلت بن عبدالرحمٰن الزبیدی، عباد بن العوام بن عمر، عبثر بن القاسم الزبیدی، ابوزبید، عبداللہ بن ادریس بن یزید الاودی، عبداللہ بن المبارک، عبدربہ بن نافع الکنانی ابوشہاب الحناط الاصغر، عبدالرحمٰن بن حمید بن عبدالرحمٰن الرواسی، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، عبدالرحمٰن القاری، عبدالرحیم بن سلیمان المروزی الاشل۔ عبدالسلام بن حرب بن سلم الکوفی، عبدالملک بن جویۃ ابوایاس، عبدۃ بن سلیمان الکلابی۔ عبداللہ بن عبید الرحمٰن الاشجعی، عتاب بن بشیر الجزری، عثمان بن مقسم البری، علی بن ہاشم بن البرید، عمار بن رزیق الضبی ابوالاحوص الکوفی، عمر بن ہارون الخراسانی البلخی، عمرو بن ثابت ابن ہرمز بن ابی المقدام، فضیل بن عیاض بن مسعود بن بشر التیمی، قرائن بن تمام الاسدی ابوالبی، قیس بن الربیع الاسدی، مبارک بن فضالہ، محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی صاحب ابی حنیفہ، محمد بن خازم التیمی ابومعاویۃ الضریر، محمد بن طلحہ بن مصر الیامی، محمد بن فضیل بن غزوان الضبی، مسعود بن سعد الجعفی الکوفی، ہشیم بن بشر بن القاسم السلمی ابومعاویہ ابن واقد المدنی، ورقاء بن عمر بن کلیب الیشکری، ابن مبارک کے شیخ ہیں۔ وضاح بن عبداللہ الیشکری ابوعوانہ،

وکیع بن الجراح ابن ملیح الرواسی، وہب بن خالد بن عجلان الباہلی، یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ، یزید بن ابراہیم التستری ابوسعید، یزید بن عبدالعزیز بن سیاہ الاسدی الحمانی، یونس بن یزید بن ابی النجاد الایلی۔

یہ ان شیوخ کی فہرست تھی جن سے انہوں نے کتاب الخراج میں روایت کی ہے، کتاب الخراج کے علاوہ جن شیوخ سے روایت کی ہے ان کے نام یہ ہیں۔

ابراہیم بن سعد بن ابراہیم الزہری، بشر بن السری ابوعمر والافوہ، جریر بن حازم بن عبداللہ الازدی، حسین بن علی بن ابولید الجعفی، حمزہ بن حبیب الزیات، سعید بن سالم القداح ابوعثمان المکی، عبداللہ ابن عثمان البصری، عبدالعزیز بن سیاہ الاسدی الحمانی۔ عیسیٰ بن طہمان، فضیل بن مرزوق الاغر، قطر بن خلیفہ المخزومی الحناط، قطبہ بن عبدالعزیز بن سیارہ، مالک بن مغول بن عاصم البجلی، محمد بن اسماعیل بن رجاء الزبیدی الکوفی، مسعر بن الکدام بن ظہیر العامری، موسیٰ بن قیس الحضرمی الفراء عصفور الجنۃ، یونس بن ابی اسحٰق السبیعی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ان شیوخ میں بعض ایسے لوگوں کے نام بھی ہیں جو ان کے اصحاب واحباب میں شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً: حسن بن صالح جن سے انہوں نے تقریباً پچاس سے زائد جگہ روایت کی ہے لیکن ابن حزم نے ان کو یحییٰ کے اصحاب میں شمار کیا ہے۔

محدثین کے دستور کے مطابق انہوں نے اپنے ہمعصروں[1] اور چھوٹوں سے بھی روایتیں کی ہیں اور بعض جگہ تو باپ اور بیٹے دونوں سے روایت کرتے ہیں، مثلاً: عبدالرحمٰن بن الرواسی سے بھی روایت کی ہے، اور ان کے لڑکے حمید سے بھی، اسی طرح عبدالعزیز بن سیارہ اور ان کے دونوں لڑکے یزید اور قطبہ سے روایتیں کی ہیں۔

تلامذہ :

حضرت یحییٰ کی روایت اور ان تلامذہ کی کثرت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا حلقۂ درس وسیع رہا ہوگا لیکن اہل تذکرہ میں سے کسی نے بھی ان کے درس وتدریس کے متعلق کوئی تصریح نہیں کی ہے، ان کے تلامذہ کی فہرست میں بعض بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً: اسحٰق بن راہویہ، یحییٰ بن معین بھی شامل ہیں۔ تلامذہ کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ان میں چند نام درج کیے جاتے ہیں جن سے صحاح میں روایت موجود ہے۔

---

[1] محدثین کو اگر اپنے اصاغر سے بھی روایتیں مل جاتی تھیں تو وہ روایت کر لیتے تھے۔

احمد بن ابی رجا عبداللہ الہروی، احمد بن سلیمان الرہاوی، احمد بن عمر الواقدی، احمد بن محمد بن حنبل، اسحٰق بن ابراہیم النجاری، اسحٰق بن راہویہ، مشہور امام حدیث، بشر بن خالد العسکری، حسن ابن علی بن عفان العامری، الحسن بن علی الخلال حافظ حدیث، الحسین بن علی بن الاسود العجلی، حفص ابن عمر المہرقانی یہ ابوحاتم اور ابوزرعہ کے شیخ ہیں۔ سفیان بن وکیع بن الجراح، عباس بن حسین القنطری، ابوبکر عبداللہ بن شیبہ، عبداللہ بن محمد المسندی، عبدالاعلی بن واصل الاسدی۔ عبدالرحمٰن ابن صالح الازدی، عبد بن حمید، عبدہ بن عبداللہ الخزاعی الصفار، عبید بن یعیش الحاملی عثمان بن ابی شیبہ، عصمۃ ابن الفضل النیشاپوری، علی بن عبداللہ بن المدینی، علی بن محمد الطنافسی محمد بن اسماعیل، ابو بکر بن علیہ، محمد بن عبداللہ بن المبارک المخرمی، محمد بن رافع النیشاپوری، ابوکریب محمد بن العلا الہمدانی محمد بن ابوولید الکندی، محمد بن ابوولید بن ابی ولید الفحام محمود بن غیلان المروزی، موسیٰ بن حزام مشہور فقیہ تھے۔ موسی بن عبدالرحمٰن المسروقی، ہارون بن عبداللہ الحمال حافظ حدیث تھے، واصل بن عبدالاعلی ابن ہلال الاسدی، یحییٰ بن معین۔ جرح وتعدیل کے امام تھے۔

دربار سے بے تعلقی:

حضرت یحییٰ نے تقریباً ۶ خلفاء منصور، ہادی، مہدی، ہارون، امین، مامون کا زمانہ پایا لیکن ان میں سے کسی خلیفہ کے دربار سے انہوں نے اپنا تعلق نہیں قائم کیا اور نہ حکومت کا کوئی عہدہ قبول کیا۔

علم وفضل:

علم وفضل کے لحاظ سے حضرت یحییٰ ممتاز حیثیت رکھتے تھے، امام ذہبیؒ نے الحفاظ میں ان کو طبقہ سابعہ میں شمار کیا ہے جس میں امام شافعیؒ، عبدالرحمٰن بن مہدی، ابوداؤد طیالسی وغیرہ ہیں۔

امام ذہبیؒ نے علی بن المدینیؒ سے جو ائمہ حدیث میں سے ہیں، روایت کی ہے کہ حدیث کی سند کا مدار زیادہ تر چھ آدمیوں پر ہے۔ اہلِ مدینہ میں ابن شہاب زہری، اہلِ مکہ میں عمرو بن دینار، اہلِ بصرہ میں قتادہ اور یحییٰ بن ابی کثیر، اہلِ کوفہ میں ابواسحٰق اور اعمش پھر ان چھ کا علم ان بارہ آدمیوں میں پھیلا اہلِ مدینہ میں امام مالک اور ابن اسحٰق اور اہلِ مکہ میں ابن جریج اور ابن عیینہ اور اہلِ بصرہ میں سعید بن ابی عروبہ، حماد بن سلمہ، ابوعوانہ، شعبہ، معمر اور اہلِ کوفہ میں سفیان ثوری اور اہلِ شام میں امام اوزاعی اور واسط میں ہشیم۔ پھر ائمہ کا علم تین آدمیوں یحییٰ القطان، یحییٰ بن زکریا اور وکیع بن جراح میں سمٹ آیا اور پھر ان تینوں سے یہ امانت عبداللہ بن مبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی اور یحییٰ بن آدم کی طرف منتقل ہوئی[1]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱۔ ص ۲۳۰

حضرت یعقوب بن شیبہ ؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ، کثیر الحدیث اور بہت بڑے فقیہ تھے حالانکہ ان کا سن بہت زیادہ نہیں تھا۔علی بن مدینیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ان کے پاس علم تھا، ابواسامہؒ فرماتے ہیں کہ میں جب یحییٰ بن آدم کو دیکھتا ہوں تو امام شعبی یاد آجاتے ہیں یعنی وہ امام شعبی کی طرح جامع العلوم تھے، ابن سعد، یحییٰ بن معین، ابوحاتم ابن حبان وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ یحییٰ بن ابی شیبہ کے الفاظ یہ ہیں کہ

ثقہ، صدوق، ثبت، حجۃ [۱]، یحییٰ قابلِ اعتماد اور حجۃ تھے ان کے علم وفضل کے متعلق ان ائمہ کی رائے سب سے بڑی سند ہے۔

مسلک :

ان کے زمانہ تک تحزب اور عامیانہ تقلید کا دور شروع نہیں ہوا تھا اور نہ اس وقت محدثین اور فقہاء اپنے لئے اس لقب کو پسند کرتے تھے بلکہ علماء قرآن وحدیث وآثار کی روشنی میں اپنی بصیرت کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ اگر کسی مسئلہ میں وہ خود رائے قائم نہیں کر پاتے تھے تو ائمہ میں سے جن کی رائے انہیں پسند ہوتی اس کو اختیار کر لیتے تھے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں تشنگانِ علم بغیر کسی عصبیت اور تحزب وتعصب کے مختلف شیوخ سے سماع حدیث اور مختلف الخیال فقہاء کی خدمت میں جا کر تحصیلِ فقہ کرتے تھے اس لئے ان میں کورانہ تقلید اور تنگ نظری پیدا نہیں ہونے پاتی تھی۔ امام محمدؒ حدیث میں امام مالکؒ کے شاگرد تھے، اسد بن فراتؒ اور امام شافعیؒ نے امام محمدؒ سے فقہ کی تحصیل کی تھی۔ خود امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے درمیان علمی مذاکرے ہوتے رہتے تھے [۲]۔ امام احمد حنبلؒ امام ابو یوسفؒ کے شاگرد تھے ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

یحییٰ بن آدمؒ نے بھی مختلف الخیال محدثین اور فقہاء سے تحصیل علم کی تھی ایک طرف وہ امام محمد سے روایت کرتے ہیں، دوسری طرف حسن بن صالح کے جن کو امام محمدؒ سے شدید اختلاف تھا خاص تلامذۃ میں تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کسی خاص [۳] امام کے مسلک کے پابند نہیں ہوسکے اور نہ انہوں نے اپنی کتاب کو کسی خاص مسلک تک محدود رکھا۔ ان کے مسلک کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کا تعلق محدثین کی جماعت سے تھا چنانچہ کتاب میں جہاں جہاں عند نا یا عندا صحا بنا یا

---

۱ ایضاً۔ ص ۳۳۰، تہذیب التہذیب جلد ۱۔ ص ۱۰۵ ۲ اس وقت تک دو مسلک حنفی اور مالک رواج پاچکے تھے۔ یحییٰ اپنی کتاب میں دونوں میں سے ہر ایک کی کسی جگہ موافقت اور کسی جگہ مخالفت کرتے ہیں۔

۳ ص ۱۶، ص ۱۴۵ اور ص ۱۴۷ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

جمعاً عن اصحابنا وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ مسائل میں ان کا نقطۂ نظر محدثانہ تھا۔

تصانیف :

امام نووی نے یحییٰ کی تصنیفات میں صرف کتاب الخراج کا تذکرہ کیا ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ "ھو صاحب التصانیف" وہ صاحبِ تصانیف ہیں لیکن انہوں نے بھی کتاب الخراج کے علاوہ کسی دوسری کتاب کا تذکرہ نہیں کیا ہے[1]۔ ابن ندیم[2] نے کتاب الخراج کے علاوہ دو اور کتابوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، کتاب الزوال اور کتاب الفرائض[3]۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ بہت بڑی کتاب ہے مگر ان میں کتاب الخراج کے علاوہ کسی اور کتاب کے موجود ہونے کا کوئی علم نہیں ہے۔

کتاب الخراج بھی اب تک ناپید تھی لیکن ایک فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر جانبول کے ذریعہ چند سال ہوئے کہ سامنے آئی ہے۔

ڈاکٹر جانبول کو کتاب الخراج کا ایک قدیم نسخہ ایم۔ شارل سیفر کے یہاں جو پیرس میں علوم مشرقیہ کے صدر ہیں، ملا۔ انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے اس کی تصحیح کی اور اس پر فرنچ میں ایک مقدمہ لکھ کر ۱۸۹۸ء میں مطبعہ بریل، لیڈن سے شائع کیا۔ یہ نسخہ پانچویں صدی کے آخر کا لکھا ہوا ہے اور اس کی ضخامت ۹۵ صفحات ہے۔

کتاب سے صاحب نسخہ کے نام کا پتہ نہیں چلتا لیکن کتاب کی پشت پر انہوں نے اپنے شیخ اور اپنے معاصرین کے سماع کی جو یادداشت لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب نسخہ نے ابو عبدالرحمٰن بن علی الملبری سے جو کتاب کے مرتب اور جن پر اس کتاب کی تمام سندیں ملتی ہوتی ہیں، براہِ راست سماع کیا ہے۔ شیخ بسری کے سماع کی یادداشت یہ ہے۔

سمعت بقراۃ محمد بن علی ابن مخلد الیٰ اٰخرہٖ وسمع ذالک ابو القاسم علی بن حمد بن البسری النبذار وولدہ ابو عبداللہ الحسین و نوفل بن علی محمد بن علی الاسائی[4] فی المحرم سنة ست عشرۃ واربعمائة .

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ا۔ ص ۳۲۷ [2] ڈاکٹر جیونبول اور ابوالاشبال دونوں مصححین میں سے کسی کی نظر ابن ندیم پر نہیں تھی اس لئے انہوں نے تصنیفات میں صرف کتاب الخراج کا تذکرہ کیا ہے۔

[3] ابن ندیم میں کتاب الفرائض کے بعد ڈیش ہے اس کے بعد کبیر الگ، ڈیش کے ساتھ لکھا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو کتابیں ہیں لیکن میں نے اس کو طباعت کی غلطی سمجھ کر کبیر کو کتاب الفرائض کی صفت قرار دے دیا ہے۔

[4] اصل میں اس طرح لکھا ہوا ہے کہ کسی مصحح نے اس کے متعلق کچھ کہا بھی نہیں ہے لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ اسائی ہے۔

''میں نے محمد بن علی کی قرآت سے اس کتاب کو آخر تک سنا ہے اور میرے علاوہ ابوالقاسم، شیخ بسری کے پوتے اور ان کے لڑکے ابوعبداللہ اور نوفل وغیرہ نے بھی سماع کیا ہے اور یہ سماع محرم ۴۱۶ھ میں ہوا''۔

دوسری یادداشت میں کچھ اپنے ہم عصر سامعین کے نام بھی لکھے ہیں ان کے نام کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے جمادی الاولی ۴۸۴ھ میں سماع کیا تھا۔ غالباً یہ اختتام سماع کی تاریخ ہے لیکن کہیں بھی اپنے سماع کی تاریخ نہیں لکھی ہے، کتاب کے ہر حصہ کے شروع میں

اخبرنا الشیخ ابو عبد اللہ البسری ''شیخ بسری نے ہم سے بیان کیا''۔

کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سماع شیخ بسری سے براہ راست ہے اور چونکہ ۴۸۴ھ سے پہلے انہوں نے اپنے یا کسی دوسرے کے سماع کی تاریخ نہیں لکھی ہے اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ ۴۸۴ھ ہی ان کے سماع کی تاریخ ہوگی۔

بسری[1] نے اس کتاب کا سماع اپنے شیخ ابوعبداللہ بن یحییٰ السکری سے ۴۱۶ھ میں کیا تھا۔ سماع کے وقت ان کی عمر ۷، ۸ برس سے زائد نہیں تھی، ظاہر ہے کہ اس عمر کی روایات پر پورے طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا لیکن بسری کی مرویات کو اس درجہ قبولیت حاصل ہوئی کہ ان کی کم عمری اعتماد واعتبار کے لئے مانع نہیں رہی۔

ڈاکٹر جانیول نے کتاب کی تصحیح وتحشیہ میں کافی محنت کی تھی لیکن پھر بھی اس میں کچھ نہ کچھ خامیاں رہ گئی تھیں اس لئے قاضی ابوالاشبال، احمد شاکر مصری نے دوبارہ اس کی تصحیح کی۔ جہاں جہاں ڈاکٹر صاحب کی تصحیح میں غلطی تھی اس کی نشاندہی کی[2] اور دوسرے ماخذوں سے ہر مسئلہ کی مراجعت کر کے اس کی تخریج کی اور یحییٰ بن آدم کے سوانح حیات اور ان کے شیوخ تلامذہ کی فہرست کے ساتھ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں دوبارہ مطبعہ سلفیہ قاہرہ سے شائع کیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

قاضی صاحب نے اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ کتاب کے رجال کی پوری تحقیق کی ہے اور ان کی تعدیل وجرح کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کو نقل کر دیا ہے، علاوہ بریں جو مسائل امام ابویوسفؒ اور یحییٰؒ کی کتابوں میں مشترک ہیں حاشیہ میں ان کی تصریح کر دی ہے۔ یہ حاشیہ اپنی افادیت کے لحاظ سے کتاب کی ایک مختصر شرح ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ اس کتاب کا

۱۔ بسری بغداد کے مشہور محدثین میں ہیں۔ ۴۰۹ھ یا ۴۱۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی تھی اور ۴۹۷ھ میں وفات پائی سمعانی نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ص ۸۱ ۲۔ مثلاً ص ۶۳، ص ۱۲۲، ص ۱۴۳ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

کیا درجہ ہے؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں اور امام ابو یوسف اور یحییٰ کی کتابوں میں...... جو ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں، کیا فرق ہے۔ آئندہ سطور میں اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

پوری کتاب چار حصوں میں ہے جن میں ۲۳ ابواب اور ۶۴۰ مسئلے ہیں۔ مؤلف نے صرف دو آخری حصوں کی تبویب کی تھی باقی دو حصوں کی تبویب مصحح نے کی ہے اور اوپر حاشیہ میں عنوانات کی سرخیاں قائم کر دی ہیں۔

حضرت یحییٰؒ کی روایات اور ان کے اقوال عام طور سے مشہور ہیں اور تمام متقدم اور متاخر محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں ان کو جگہ دی ہے لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ میں ان کی کتاب الخراج کے ساتھ زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا اور اس کے نسخے زیادہ مروج تھے چنانچہ امام مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، امام نووی، حافظ ابن حجر، بلاذری وغیرہ نے متعدد جگہ ان کی روایات اور ان کے اقوال اپنی اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی کتاب الخراج کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ کہیں اس کا حوالہ دیا ہے۔

کتاب کی خصوصیت اور امام ابو یوسفؒ اور ان کی کتاب میں فرق :

۱۔ اسلامی مالیات کے جن شعبوں کے متعلق قرآن پاک کی آیات میں اشارات موجود ہیں، یحییٰ بن آدمؒ نے ان پر عنوان کے تحت ان آیات کا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد حدیث و آثار سے استدلال کیا ہے مثلاً: فئی غنیمت، تجارت، زراعت، صدقات، ما یکرہ فی الصدقہ جذا، ذو حصاد وغیرہ کے سلسلہ میں اس کی تفصیل مل سکتی ہے۔

۲۔ طریقہ تصنیف محدثانہ ہے یعنی ہر مسئلہ میں انہوں نے اپنے شیوخ یا تابعین کے اقوال یا پھر صحابہ کے آثار یا احادیث نبوی کا تذکرہ کیا ہے اور خود اپنی رائے پوری کتاب میں مشکل سے دو چار جگہ دی ہے۔

فقہ میں کسی خاص مسلک کے پابند نہیں تھے لیکن پھر بھی انہوں نے متعدد جگہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور اس کے بعد محدثین کی رائے کو پیش کر کے اس کو ترجیح دی ہے مگر جہاں بھی اختلاف کیا ہے وہاں امام صاحب کا نام نہیں لیا ہے بلکہ بعض وغیرہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

مثلاً! اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی پرتی زمین کو آباد کرنا چاہے تو وہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ دوسرے ائمہ کی رائے ہے کہ اس کو اختیار ہے کہ وہ آباد کر لے اور وہ اس زمین کا مالک ہوگا۔ خود امام ابو یوسف اور

امام محمدؒ کی رائے بھی یہی ہے لیکن امام صاحب کے نزدیک اس میں امام کی اجازت ضروری ہے۔طر فین کے اقوال ذکر کرنے کے بعد یحییٰؒ نے دوسرے ائمہ کے اقوال کی تائید میں یہ حدیث ذکر کی ہے۔

من احیا ارضا سیتة فی غیر حق مسلم و لا معاهد فهی له (ص ۸۶)

''جو کسی ایسی پرتی زمین کو آباد کرے جو کسی مسلم یا مجاہد کی نہ ہو تو وہ زمین اس کی ہے''۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ حدیث میں امام سے اجازت کا ذکر نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ کی رائے ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

بعض جگہ وہ دوسرے ائمہ کی بھی مخالفت کرتے ہیں مثلاً: اس مسئلہ میں کہ خراج کی زمین پر دوسرے محاصل عائد کئے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ ائمہ کی رائے ہے کہ دوسرے محاصل عشر وغیرہ اس میں لئے جاسکتے ہیں، امام صاحب کی رائے ہے کہ خراجی زمین میں خراج کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں لی جاسکتی۔اس مسئلہ میں یحییٰ امام صاحبؒ کے ساتھ ہیں اور فریقین کے استدلالات ذکر کرنے بعد فرماتے ہیں:

قال جماعة من اصحابنا لیس ما علیٰ الارض الخراج عشرا نما علی الارض الخراج ولیس فی ذرعها و لا فی ثمار ها شنیی لمسلم اولغیره (ص ۱۶۷)

''ہمارے اصحاب میں سے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ خراجی زمین پر عشر نہیں ہے اس پر صرف خراج ہے اور اس زمین کی زراعت اور اس کے پھل میں کوئی محصول نہیں ہے، وہ زمین مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی''۔

دوسری جگہ اس مسلک کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے بعض بصری اصحاب کی بھی یہ رائے ہے۔ (ص ۱۶۷)

زکوٰۃ کے سلسلے میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ اگر مختلف قسم کے غلے اتنی تھوڑی مقدار میں پیدا ہوں کہ نصاب زکوٰۃ تک نہ پہنچتے ہوں لیکن اگر ان سب کو یا ان کی قیمت کو ملا دیا جائے تو وہ نصاب تک پہنچ جاتے ہوں تو ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ امام صاحب تو غلہ میں سرے سے نصاب کے قائل ہی نہیں ہیں ان کے نزدیک غلہ کی جتنی مقدار بھی ہو اس میں عشر یا نصف عشر دینا چاہیے۔ بقیہ ائمہ غلہ کا

ا زراعت کے سلسلہ میں آج کل اس قسم کے قوانین روزانہ بنتے رہتے ہیں لیکن اسلام نے آج سے تیرہ سو برس پہلے یہ قانون دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا لیکن برا ہو تعصب کا کہ اس نے دنیا کو اندھا کر دیا ہے۔

نصاب پانچ وسق مقرر کرتے ہیں اس لئے ان کے یہاں یہ سوال اہمیت رکھتا ہے۔ امام شافعیؒ ایک غلّہ کو دوسرے غلّہ سے یا اس کی قیمت کو ملا کر عشر ادا کرنے کو جائز نہیں سمجھتے، امام احمدؒ کا خیال ہے کہ ایک دوسرے کو ملا کر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے، امام مالکؒ صرف جَو اور گیہوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے قائل ہیں یحییٰؒ چونکہ مطلق ایک دوسرے کے ساتھ ملانے کے قائل نہیں ہیں اس لئے انہوں نے امام مالکؒ کے مسلک کو بھی پسند نہیں کیا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اصحاب امام مالک نے جَو اور گیہوں کو یکساں سمجھا ہے لیکن یہ بھی ناجائز نہیں ہے یہی مسلک امام شافعیؒ نے اختیار کیا اور بعد میں انہی کی طرف منسوب ہو گیا۔

۳۔ کتاب میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن میں مصنف منفرد ہیں، مثلاً: یہ روایت

من احیا ارضاً میتۃً فھی لہ و لیس لعرق ظالم حق (ص ۵۸۰)

''جو پرتی زمین آباد کرے وہ اس کی ہے''۔

ان الفاظ کے ساتھ کسی نے بھی یہ روایت نہیں کی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری جلد ۵ صفحہ ۱۳ میں یحییٰؒ کی اس روایت کو نقل کیا ہے، لیکن انہوں نے بھی یحییٰ کے علاوہ کسی دوسرے سلسلۂ سند کا ذکر نہیں کیا ہے۔

اسی طرح "بعل والعشری والغلری" والی حدیث میں بھی غالباً صاحب کتاب منفرد ہیں۔ ابن ماجہ نے اس روایت کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، لیکن ان کا سلسلۂ سند بھی یحییٰ ہی پر ختم ہوتا ہے۔ (ص ۱۲۳)

امام ابو یوسفؒ اور یحییٰ کی کتاب میں چند ظاہری اور معنوی فروق یہ ہیں:

۱۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ یحییٰ کی کتاب الخراج کی طرف علماء نے بہت کم اعتنا کیا ہے۔ بخلاف اس کے ابو یوسف کی کتاب الخراج کو تمام متقدمین و متاخرین آئمہ کے نزدیک ایک خاص درجہ حاصل رہا ہے اور مشکل سے حدیث و فقہ کی کوئی کتاب اس کے ذکر سے خالی ہوگی۔

۲۔ امام ابو یوسفؒ کی کتاب میں ۳۷ ابواب اور یحییٰ کی کتاب میں کل ۳۳ ابواب ہیں۔ اس ظاہری فرق کے علاوہ معنوی حیثیت سے بھی امام ابو یوسف کی کتاب بہت بلند ہے اس میں ہر عنوان کے تحت جزئیات اور بہت سے مجتہدانہ نکات اور متنوع مسائل ملتے ہیں۔

۳۔ امام ابو یوسفؒ کی کتاب میں بعض مباحث ضمناً آگئے ہیں لیکن یحییٰ نے ان کے مستقل ابواب قائم کئے ہیں۔ مثلاً: تحریر، شراب کی تجارت پر ذمیوں سے ٹیکس لینے جذاذ و حصاد یا سبزی میں

زکوٰۃ وغیرہ کے مباحث کو امام ابو یوسفؒ نے ضمناً ذکر کیا ہے لیکن یحییٰؒ نے ان کے لئے الگ الگ باب قائم کئے ہیں۔

۴۔ امام ابو یوسفؒ کی کتاب میں گو جزئیات اور متنوع مسائل زیادہ ہیں لیکن پوری کتاب تقریباً تمام تر حنفی مسلک کے مسائل تک محدود ہے اس لئے مقابلہ میں یحییٰ کا طریقہ تصنیف محدثانہ ہے اور وہ ہر عنوان کے تحت مختلف احادیث، آثار اور اقوال نقل کر دیتے ہیں اور خود اس کا فیصلہ بہت کم کرتے ہیں اس سے یہ فائدہ ہے کہ پڑھنے والے کو ہر موضوع پر خود سوچ کر کسی امام کی رائے کو راجح یا مرجوح قرار دینے کا موقع ملتا ہے۔

علمی حیثیت سے کتاب میں بعض تسامحات بھی ہیں مثلاً:

۱۔ زکوٰۃ پر بحث کی ہے لیکن زکوٰۃ کے مصرف کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے یا دریا سے حاصل کی ہوئی اشیاء کے بارے میں کوئی بحث نہیں کی ہے۔

۲۔ ان کے شیوخ اور سلسلہ سند کے رواۃ میں بہت سے ضعیف اور بعض مجہول اشخاص بھی ہیں، مثلاً: شیوخ میں محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی، ایوب بن جابر بن سیار، عبدالجبار بن زبیدی کو کاذب تک کہا گیا ہے۔ سنان بن ہارون الصلت بن عبدالرحمٰن، عثمان بن مقسم، عمر بن ہارون، عمرو بن ثابت بن ہرمز، قیس بن الربیع، مفضل بن صدقہ وغیرہ۔ عام رواۃ میں مغلس (ص ۲۵) جن کا تذکرہ رجال کی کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ عبدالرحمٰن القاری (۵۱) کا تذکرہ بھی کسی کتاب میں نہیں ملتا، اسی طرح محمد بن مساور، عبادہ بن نعمان، ابوعلی الصفار وغیرہ کا تذکرہ بھی متداول کتابوں میں موجود نہیں ہے اسی طرح ابراہیم بن محمد (ص ۴۷) عبدالرحمٰن بن معاویہ (۷۳)، اسماعیل بن ابی سعید (ص ۱۰۴)، ابوحماد (۱۰۵) وغیرہ کو علماء نے ضعیف اور ان میں سے بعض کو وضاع حدیث تک لکھا ہے۔

پوری کتاب میں سینکڑوں لغات اور فقرے ایسے ہیں جن کی مکمل تشریح کی ضرورت تھی ان کے حل کئے بغیر عبارت کا مفہوم واضح نہیں ہوتا، ضرورت تھی کہ کتاب کے ساتھ ایسے الفاظ کی ایک فہرست بھی منسلک ہوتی، مثلاً: اس اثر

لیس علی عربی ملک　''یعنی عربی النسل پر کسی کی ملکیت نہیں ہے''

کے نقل کرنے کے بعد یہ جملہ ہے۔

ولکنا تقو مهم انملة خمیس من الابل کا مطلب بالکل واضح نہیں ہوتا۔ مصنف سے اس آیت '' فری ظاهرہ '' کی تشریح کے سلسلہ میں بھی فروگذاشت ہوگئی ہے گو عام ائمہ تفسیر کی

طرح انہوں نے بھی اس کی تشریح قری عربیہ کے لفظ سے کی ہے مگر انہوں نے اس سے ایک خاص سرزمین مراد لی ہے جو صحیح نہیں ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ابن عباسؓ کی یہ روایت موجود ہے کہ

هی قری عربیة بین المدینة والشام قری ظاهرة ای بینة واضحة یعرفها المسافرون.

''مدینہ اور شام کے درمیان جو آبادیاں ہیں وہی قری عربیۃ ہیں، اس کو ظاہرہ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کو مسافرین عام طور پر جانتے ہیں''۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مخصوص خطہ کا نام نہیں ہے بلکہ مدینہ و شام کے درمیان کی آبادیوں کو قری ظاہرہ کہتے ہیں پھر معجم البلدان اور کتب لغت تاریخ وغیرہ میں کوئی مقام اس نام کا نہیں ملتا اس لئے ظاہر ہے کہ مصنف کو اس میں سہو ہو گیا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

ضمیمہ

حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ

(امام دارالهجرة)

۹۳ ———— ۱۷۹ھ

از

اُستاذ الحدیث مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمہ اللہ

اُستاذ دارالعلوم دیوبند رفیق ندوۃ المصنفین

تبع تابعین کی اس جلد میں ایک نامور وجلیل القدر تبع تابعی، آئمہ اربعہ میں سے ایک مشہور امام، حدیث کی معروف کتاب ''موطا'' کے مصنف اور محدّثِ وقت، امام اہلِ المدینہ، حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ کے حالات شامل نہ تھے، کتاب کی تکمیل کے پیشِ نظر حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمہ اللہ کی ایک مختصر تحریر کتاب کے آخر میں ملحق کی جارہی ہے۔

مفصل حالات وسوانح کے لئے اس موضوع پر تحریر کردہ عربی اور اُردو کی دیگر مُستند کتب کی طرف مراجعت فرمائیں۔

والسلام ناشر

امام مالک بن انس بن مالک رحؒ

ولادت ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ

آپ اُمت میں امام دارالہجرت کے لقب سے مشہور ہیں۔ دراز قامت، فربہ جسم، زردی مائل سفید رنگ، کشادہ چشم، بلند ناک اور خوبصوت تھے۔ آپ کی پیشانی کی طرف سر پر بال کم تھے، ریش مبارک دراز اور گھنی تھی، مونچھ منڈانے کو مثلہ فرماتے تھے۔ صرف لب کا بالائی حصہ ترشوا لیتے تھے اور دونوں طرف کے بال چھوڑتے تھے۔ اس بارے میں حضرت عمر فاروق ؓ کی تقلید فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے حالات میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ کسی معاملہ میں متفکر ہوتے تو اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی مونچھوں کے دو طرفہ بال دراز تھے۔ آپ خوش پوشاک تھے۔ آپ کا نسب غیمان بن خثیل پر پہنچتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں اس کو بصیغہ خاء معجمہ کے ساتھ ضبط کیا ہے اور دار قطنی نے جیم کے ساتھ۔ خثیل، عمرو بن الحارث کے فرزند تھے اور حارث کا لقب ذواصبح تھا۔ اسی لحاظ سے آپ کو اصبحی کہتے ہیں[1]۔ آپ تبع تابعین کے طبقہ میں تھے۔ آپ کے شیوخ اور تلامذہ کا کیا پوچھنا۔ امام نوویؒ تہذیب الاسماء میں لکھتے ہیں کہ امام کے شیوخ کی تعداد نو سو تھی، جن میں تین سو تابعین اور چھ سو تبع تابعین تھے۔

امام سفیانؒ فرماتے تھے، رجال کی چھان بین کرنے والا مالکؒ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ مالکؒ کو جب حدیث کے کسی ٹکڑے میں شک پڑ جاتا تھا تو پوری کی پوری حدیث ترک کر دیتے تھے۔ وہب بن خالدؒ کہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے درمیان احادیث نبویہ کے بارے میں قابلِ اطمینان شخص مالک سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ترمذی صحیح اسناد کے ساتھ ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں، ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ دُور دُور کا سفر کریں گے، لیکن "عالم مدینہ" سے بڑھ کر عالم انھیں کہیں میسر نہ آئے گا۔

---

[1] بستان المحدثین

امام سفیان بن عیینہ کے نزدیک اس حدیث کا مصداق امام مالکؒ تھے۔ خلف بن عمر کہتے ہیں، میں امام مالکؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ مدینہ کے قاری ابن کثیرؒ نے امام مالکؒ کو ایک پرچہ دیا۔ امام مالک نے اسے پڑھا اور اپنی جانماز کے نیچے رکھ لیا۔ جب وہ کھڑے ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ چلنے لگا، فرمایا بیٹھ جاؤ اور وہ پرچہ مجھے دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں یہ خواب لکھا ہوا تھا کہ لوگ آنحضرت ﷺ کے گرد جمع ہیں اور آپ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ "میں نے اس منبر کے نیچے ایک بہت بڑا خزانہ دفن کیا ہے اور مالکؒ سے کہہ دیا ہے، وہ تمہیں تقسیم کردیں گے۔ اس لئے مالکؒ کے پاس جاؤ۔ لوگ یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے مالکؒ تقسیم کریں گے یا نہیں۔ کسی نے جواب دیا، جس بات کا مالکؒ کو حکم دیا گیا ہے وہ ضرور پورا کریں گے۔ اس خواب سے مالکؒ پر گریہ طاری ہو گیا اور اتنا روئے کہ میں تو انھیں روتا ہی چھوڑ آیا۔

عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کہتے ہیں کہ ہم مالکؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ ایک شخص آیا اور بولا میں چھ ماہ کی مسافت سے ایک مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا ہوں۔ فرمایا کہو کیا ہے؟ اس نے بیان کیا، آپ نے فرمایا: مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔ وہ حیران ہو کر بولا، اچھا تو اپنے شہر والوں سے کیا کہوں۔ فرمایا، کہہ دینا کہ مالکؒ نے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔ آپ کی ہمشیرہ سے پوچھا گیا، مالکؒ گھر میں کیا کرتے ہیں؟ فرمایا، تلاوتِ قرآن۔ آپ کی محفل ایسی بارعب تھی کہ بادشاہوں اور سلاطین کو تابِ سخن نہ تھی۔ ایک خاموشی کا عالم رہا کرتا تھا[1]۔

محدثین کے نزدیک اصح الاسانید میں بحث ہے۔ مشہور یہ ہے کہ جس کے راوی مالک نافع سے اور نافع ابن عمرؓ سے ہوں وہ اسناد سب سے صحیح ہے۔ امام زہریؒ جو آپ کے شیوخ میں شامل تھے وہ بھی آپ سے مستفید تھے۔ لیث ابن مبارک، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ جیسے مشاہیر آپ کے زمرۂ تلامذہ میں داخل تھے۔ امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے، اگر مالکؒ و سفیانؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔ آپ کے حفظ کا یہ عالم تھا کہ جو بات ایک مرتبہ سن لیتے پھر کبھی نہ بھولتے۔ حدیث روایت کرنے کے لئے جب بیٹھتے تو پہلے وضو کرتے، اچھی پوشاک پہنتے، خوشبو لگاتے، ریش مبارک میں کنگھی کرتے۔ لوگوں نے اس تجمل کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کی توقیر کرتا ہوں۔

---

[1] تہذیب الاسماء۔

عبداللہ بن المبارک روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام مالکؒ نے درسِ حدیث شروع کیا تو اثناء درس میں آپ کا رنگ بار بار متغیر ہو ہو جاتا تھا، مگر آپ نے نہ درسِ حدیث بند کیا نہ آپ سے حدیث کی روایت کرنے میں کسی قسم کی لغزش واقع ہوئی۔ فارغ ہونے کے بعد مزاج مبارک دریافت کیا تو فرمایا کہ اثناء درس میں تقریباً دس بار بچھو نے ڈنک مارا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ صبر اپنی شجاعت و استقامت جتانے کے لئے نہیں کیا بلکہ صرف حدیثِ پیغمبر کی تعظیم کے لئے کیا ہے [۱]۔

علامہ یافعی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ امام مالک ؒ کو آنحضرت ﷺ کی ذات پاک سے عشق تھا۔ حتیٰ کہ آپ اپنے ضعف و پیری کے باوجود مدینہ میں سوار نہ ہوتے اور فرمایا کرتے تھے کہ جس شہر میں آپ کا جسدِ مبارک مدفون ہو اس میں میں ہرگز سوار ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ ہارون رشید مدینہ طیبہ آیا۔ اس کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ امام مالکؒ نے کتاب موطا تالیف فرمائی ہے اور آپ لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ ہارون رشید نے اپنے وزیر جعفر برمکی کی آپ کی خدمت میں بھیجا کہ وہ سلام عرض کر دے اور یہ عرض کر دے کہ آپ موطا لا کر مجھے سنا دیں۔ برمکی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور امیر المومنین کا سلام پہنچا کر اس کی درخواست پیش کی۔ امام نے جواب دیا، میرا اُن سے سلام کہنا اور کہہ دینا کہ علم خود کسی کے پاس نہیں آیا کرتا، لوگ اس کے پاس آیا کرتے ہیں۔ جعفر واپس آیا اور امام مالک ؒ کا فرمان عرض کر دیا۔ اتنے میں امام عالی مقام بھی خود تشریف لے آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ ہارون رشید نے کہا میں نے آپ کے پاس ایک پیغام بھیجا تھا آپ نے میرا حکم نہیں مانا۔

امام مالکؒ نے سند کے ساتھ وہ روایت سنائی، جس میں زید فرماتے ہیں کہ نزولِ وحی کے وقت آنحضرت ﷺ کا زانوئے مبارک میرے زانو پر تھا۔ صرف کلمہ غیر اولی الضرر نازل ہوا تھا کہ اس کے وزن سے میرا زانو چور چور ہو جانے کے قریب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا، کہ جس قرآن کا ایک حرف حضرت جبرئیل علیہ السلام پچاس ہزار سال [۲] سال کی مسافت سے لے کر آئے ہوں

---

[۱] بستان المحدثین

[۲] حضرت اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کی مسافت کا پچاس ہزار سال کی مدت ہونا آئمہ کے درمیان بھی مشہور تھا۔

کیا میرے لئے زیبا نہیں کہ میں بھی اس کی عزت واحترام کروں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت وبادشاہت سے نواز ہے، اگر سب سے پہلے آپ ہی اس علم کی مٹی خراب کریں گے تو خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں آپ کی عزت برباد نہ کردے۔

یہ سن کر وہ مؤطا سننے کے لئے آپ کے ساتھ ہوگیا۔ امام مالکؒ نے اپنے ساتھ اس کو مسند پر بٹھالیا۔ جب مؤطا پڑھنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا آپ ہی مجھے پڑھ کر سنائیے۔ امام نے فرمایا، عرصہ ہوا میں خود پڑھ کر سنانا چھوڑ چکا ہوں۔ اس نے کہا اچھا تو اور لوگوں کو باہر نکال دیجئے، تاکہ میں خود آپ کو سنادوں۔ امام نے فرمایا، علم کی خاصیت یہ ہے کہ اگر خاص لوگوں کی رعایت سے عام لوگوں کو اس سے محروم کردیا جائے تو پھر خواص کو بھی اس سے نفع نہیں ہوتا۔

اس کے بعد آپ نے معن بن عیسیٰ کو حکم دیا کہ وہ قرأت شروع کردیں۔ جب انہوں نے قرأت شروع کی تو امام نے ہارون سے کہا، اے امیر المؤمنین! اس شہر میں اہلِ علم کا دستور یہ ہے کہ وہ علم کے لئے تواضع کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہارون یہ سن کر مسند سے اُتر آیا اور سامنے آبیٹھا اور مؤطا سننے لگا۔

ایک مرتبہ جعفر بن سلیمان سے کسی نے شکایت کردی کہ امام صاحب آپ کی خلافت کے مخالف ہیں۔ اس نے آپ کو ستر کوڑے لگانے کا حکم دیدیا۔ اس کے بعد آپ کی عزت اور بڑھ گئی۔ گویا یہ کوڑے آپ کا زیور بن گئے۔ منصور جب مدینہ آیا تو اس نے انتقام لینے کا ارادہ کیا۔ امام مالکؒ نے قسم کھاکر فرمایا، میں تو اس کا ایک ایک کوڑا آنحضرت ﷺ کی قرابت کی خاطر معاف کرچکا ہوں۔

مورخین کہتے ہیں کہ یہ سزا آپ کو اس جرم میں دی گئی تھی کہ آپ نے کوئی فتویٰ ان کی غرض کے موافق نہیں دیا تھا[1]۔

ذہبی کا بیان ہے کہ پانچ باتیں جیسی امام مالکؒ کے حق میں جمع ہوگئی ہیں۔ میرے علم میں کسی اور شخص میں جمع نہیں ہوئیں: (۱) اتنی دراز عمر اور ایسی عالی مسند (۲) ایسی عمدہ فہم اور اتنا وسیع علم (۳) آپ کے حجت اور صحیح الروایۃ ہونے پر آئمہ کا اتفاق (۴) آپ کی عدالت، اتباعِ سنت اور دینداری پر محدثین کا اتفاق (۵) فقہ اور فتویٰ میں آپ کی مسلمہ مہارت[2]۔

---

[1] شذرات الذہب [2] تذکرۃ الحفاظ

آئمہ اربعہ میں صرف ایک آپ ہیں جن کی تصنیف فنِ حدیث کے متعلق اُمت کے ہاتھ میں موجود ہے۔ بقیہ جو تصانیف دوسرے آئمہ کی طرف منسوب ہیں وہ ان کے شاگردوں کی جمع کردہ ہیں، حتیٰ کہ مسند امام احمد بھی۔ گو اس کی تسوید خود امام موصوف نے کی ہے۔ مگر اس کی موجودہ ترتیب خود امام کی نہیں ہے[1]۔ ہارون رشید کے نام بیس صفحات پر مشتمل آپ کا جو خط ہے، قابلِ دید ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں اس کا خلاصہ بھی درج نہیں کیا جاسکتا۔

اور جو خود ہی خلاصہ ہو اس کا خلاصہ اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

مطرف بن عبداللہ منجملہ آپ کے نصیحت آمیز کلمات کے نقل کرتے ہیں کہ بے کار اور غلط باتوں کے پاس پھٹکنا بربادی ہے۔ غلط بات زبان پر لانا سچائی سے دُوری کی بنیاد ہے۔ اگر انسان کا دین و مروت بگڑنے لگے تو دنیا بہت بھی جمع ہو جائے پھر بھی کس کام کی ہے۔ ابن وہب کہتے ہیں کہ امام مالک" کہا کرتے تھے کہ علم آئندہ اور گھٹے گا بڑھے گا نہیں اور ہمیشہ انبیاء علیہم السلام اور کتب سماویہ کے نزول کے بعد گھٹا ہی کرتا ہے۔ سلف میں علم، ہدایت کے علوم ہی کا نام تھا۔ اس لحاظ سے اس مقولہ کے صدق میں کیا تردد ہے[2]۔

قعنبی نقل کرتے ہیں کہ میں مرض الوفات میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کر کے بیٹھ گیا تو امام رو رہے تھے۔ میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا، کیسے نہ روؤں اور مجھ سے زیادہ رونے کا اور کون مستحق ہو سکتا ہے۔ میری آرزو ہے کہ جو مسئلہ بھی میں نے اپنی رائے سے بتایا ہے ہر مسئلہ کے بدلہ میرے کو ایک کوڑا مارا جائے۔ کاش میں نے اپنی رائے سے ایک مسئلہ بھی نہ بتایا ہوتا۔ مجھے گنجائش تھی کہ اس کے جوابات مجھ سے پہلے دیئے جا چکے تھے اُن ہی پر سکوت کر لیتا۔

ماہِ ربیع الاول میں آپ کا انتقال ہوا، اور جس تمنا میں عمر گزاری تھی آخر وہ پوری ہوئی، یعنی دیارِ حبیب کی خاک پاک نے ہمیشہ کے لئے آپ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ آپ سرزمین مدینہ ہی میں آسودۂ خواب ہیں۔

فقہ مالکی :

امام مالک" کی فقہ میں اہلِ مدینہ کے تعامل کا خاص اہمیت حاصل ہے۔ اُن کے نزدیک مدینہ مہبطِ وحی ہے۔ اس کا تعامل حجت ہونا چاہئے۔ حافظ ابوعمر دراوردی سے نقل کرتے

---

[1] بستان المحدثین [2] تذکرۃ

ہیں کہ امام مالکؒ جب یہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر کا عمل اسی مسئلہ پر دیکھا ہے تو اُس سے ان کی مراد ربیعۃ بن ابی عبدالرحمن اور ابن ہرمز ہوتے ہیں [1]۔

فقہ مالکی کا زیادہ چرچا اہلِ مغرب اور اندلس میں ہے۔ ابن خلدون اس کی وجہ یہ لکھتا ہے کہ اہلِ مغرب اور اندلس کا سفر اکثر حجاز ہی کی جانب ہوا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں مدینہ طیبہ علم کا گہوارہ بن رہا تھا۔ یہیں سے نکل کر علم عراق پہنچا ہے۔ ان کے راستہ میں عراق نہ پڑتا تھا، اس لئے ان کے علم کا ماخذ علماء مدینہ تھے۔ علماء میں امام مالکؒ کا رتبہ معلوم ہے۔ اس لئے مغرب اور اندلس کے اصحاب کا علم امام مالک اور ان کے بعد ان کے تلامذہ میں منحصر ہو گیا تھا۔ ان ہی کے وہ مقلد تھے اور جن کا علم انھیں نہیں پہنچا ان کے وہ مقلد بھی نہیں تھے۔

---

[1] جامع بیان العلم جلد ۲۔ ص ۱۴۹